خطباتِ حکیم الامت

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی
کی مؤثر اور انقلاب آفریں تقریروں کا اہم مجموعہ

محاسن اسلام

تکمیل نعمت اسلام
نعمت اسلام مکمل دین ہے
احکام شریعت کا نام اسلام ہے
اسلام کی خوبیاں
اسلام کے منافع
مرتے دم تک اسلام پر قائم رہنا ضروری ہے
حقیقی اسلام

زمزم بک ڈپو دیوبند

خطباتِ حکیم الامّت جلد نمبر ۸

اسلام کی خوبیاں

مجددِ وقت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ

ترتیب مواعظ

منشی عبدالرحمٰن خان

عنوانات

قاری محمد ادریس ھوشیارپوری

زمزم بکڈپو دیوبند
۲۴۷۵۵۴



نام کتاب ---- محاسنِ اسلام

مصنف ---- حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ

باہتمام ---- اسعد واجدی

سنِ طباعت ---- اپریل ۱۹۹۶ء

قیمت



ناشر

زمزم بکڈپو دیوبند

بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ

اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۖ

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝



ترجمہ

جو کوئی شخص بھی اپنا رُخ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا دے اور وہ مخلص بھی ہو
تو ایسے شخص کو اس کا عوض ملتا ہے اس کے پروردگار کے پاس پہنچ کر ،
اور نہ ان پر خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے

——— بیان القرآن ———



ترتیب

۱۔ الاتمام لنعمۃ الاسلام تکمیلِ نعمتِ اسلام

اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ دِیْنِکُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔

۲۔ الاتمام لنعمۃ الاسلام نعمتِ اسلام مکمل دین ہے

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔

۳۔ الاتمام لنعمۃ الاسلام احکامِ شریعت کا نام اسلام ہے

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔

۴۔ محاسنُ الاسلام اسلام کی خوبیاں

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ۔

۵۔ احسان الاسلام اسلام کے منافع

بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰہِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۔

۶۔ الدوام علی الاسلام مرتے دم تک اسلام پر قائم رہنا ضروری ہے

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔

۷۔ الاسلام الحقیقی حقیقی اسلام

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

تفصیل

تکمیلِ نعمتِ اسلام

نعمتِ اسلام مکمل دین ہے

احکامِ شریعت کا نام اسلام ہے

اسلام کی خوبیاں

اسلام کے منافع

مرتے دم تک اسلام پر قائم رہنا ضروری ہے

حقیقی اسلام

زبان کی حفاظت

تالیف
حضرت مولانا
عاشق الٰہی صاحب
بلند شہری

حسن ترتیب
حضرت مولانا شاہ
محمد یحییٰ صاحب
مدظلہ

زبان اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہے لیکن جس طرح یہ ایک بے بہا نعمت ہے اسی طرح یہ ایک خطرناک اور نقصان دہ آفت بھی ہے. حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ لوگ اوندھے منہ جہنم میں اسی زبان کے باعث ڈالے جائیں گے. اس لئے زبان کی حفاظت کے سلسلہ میں حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب بلند شہری کی ایک اہم اور پُر مغز کتاب "زبان کی حفاظت" منظر عام پر آچکی ہے، جس کا مطالعہ تمام مسلمانوں کے لئے بے حد ضروری ہے. پہلی ہی فرصت میں اس کتاب کو حاصل کریں.

حضرت مولانا شاہ محمد زکریا صاحب اس کتاب کے بارے میں فرماتے ہیں:

"تمام مسلمانوں سے عموماً اور اپنے احباب سے خصوصاً درخواست کرتا ہوں کہ اس رسالہ کو خود پڑھیں. گھروں اور مسجدوں میں اور مجلسوں میں سنائیں"

کتاب بہت اہم ہے۔ قیمت صرف ۴۰/ روپے

زمزم بکڈپو دیوبند

الاتمام لنعمۃ الاسلام ۱

کے بارے میں

تکمیل نعمتِ اسلام

یہ وعظ قصبہ ریواڑی میں مولوی عبدالرحیم صاحب کے مکان پر کرسی پر بیٹھ کر بروز بدھ ۲۰ شوال ۱۳۳۱ھ کو ارشاد فرمایا۔ ۳ گھنٹے ۲۵ منٹ تک بیان جاری رہا۔

سامعین کی تعداد تقریباً ایک ہزار تھی۔

مولوی اطہر علی صاحب سلہٹی نے قلمبند فرمایا۔



اسلام کو ظاہری تدابیر کی ضرورت نہیں۔ اس کی قوت خود بہت کامل ہے۔ کسی کے دھوکہ کی اس کو پرواہ نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اپنے ذاتی انوار وبرکات کی وجہ سے پھیلا ہے۔ اس کی ادائیں ہی ایسی دلکش ہیں کہ قلوب کو کھینچ لیتی ہیں اس کے محاسن کو دیکھ کر لوگ خود بخود مسلمان ہوتے رہے کسی نے زور زبردستی نہیں کی۔ بس ثابت ہو گیا کہ اسلام بزورِ شمشیر نہیں پھیلا۔ بلکہ اپنے حسن وخوبی سے پھیلا ہے۔ اور وہ اب بھی علیٰ حالہٖ باقی ہے۔

ہنوز آں ابرِ رحمت در فشان ست
خم وخمخانہ با مہر ونشان ست

(از حضرت حکیم الامتؒ)



الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ، ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ ونشھد ان سیدنا ومولٰنا محمداً عبدہٗ ورسولہ صلی اللہ تعالٰی علیہ واٰلہٖ واصحابہ وبارک وسلم۔ امّا بعد:-

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ○ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

الیوم یئس الذین کفروا من دینکم فلا تخشوھم واخشون۔ الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا فمن اضطر فی مخمصۃ غیر متجانف لاثم فان اللہ غفور رحیم ○

امتنانِ نعمت

یہ ایک لمبی آیت کا ایک ٹکڑا ہے، اس میں حق سبحانہٗ وتعالٰی نے ایک نعمت پر امتنان ظاہر فرمایا ہے اور جس نعمت پر امتنان ظاہر فرمایا ہے وہ نعمت

بھی اتنی بڑی ہے کہ اس کی برابر کوئی نعمت نہیں ہے۔ سب نعمتیں اس کے مقابلہ میں ماند اور ہیچ ہیں۔ اس بڑی نعمت پر اس لئے آگاہ کیا تاکہ اس پر مطلع ہو کر ہم اس کے حقوق ادا کریں۔ اور متنبہ ہو کر اس پر عمل کرنا شروع کریں، کیونکہ نعمت کا حق ہے اس کا شکر ادا کرنا۔ اور شکر یہی ہے کہ اس نعمت کے متعلق منعم کے حکم کا امتثال کیا جائے، جو وہ کہے اس پر عمل کیا جائے۔ مثلاً مال ایک نعمت ہے اس کا حق یہ ہے کہ غربا پر احسان کرے، یتامیٰ و مساکین کی دستگیری کرے کہ منعم کا یہی حکم ہے۔ اسی طرح ہاتھ پاؤں نعمت ہیں۔ اُن کا حق یہ ہے کہ دوسرے کی اعانت کرے۔ نیک کاموں میں ان کو لگاوے۔ غرض ہر نعمت کا ایک حق ہوتا ہے، پھر جیسی نعمت ہوتی ہے ویسا ہی اس کا حق ہوتا ہے۔ تو جو نعمت سب سے بڑی ہو گی اس کا حق بھی بڑا ہوگا، اور جب اس کا حق ادا کرنے میں کوتاہی ہوگی، اُس وقت اس کوتاہی پر متنبہ کرنا بھی ضروری ہوگا یعنی جب اس کی طرف التفات نہ کیا جاوے تو متوجہ کر کے التفات کرایا جاوے گا۔ چنانچہ اس آیت میں حق سبحانہٗ تعالیٰ نے ایک نعمت کو بیان فرمایا ہے جس کا حق ادا کرنے میں ہم سے کوتاہی ہو رہی ہے، کسی کو اس کی طرف توجہ ہی نہیں الا ماشاءاللہ۔ اور یہ تو بڑی بات ہے کہ اس کا حق ادا کریں۔ ستم یہ ہے کہ اس کا نعمت ہونا بھی معلوم نہیں۔ دلیل اس کی کہ لوگ اس کو نعمت بھی نہیں سمجھتے، یہ ہے کہ ہر چیز کے لئے کچھ لوازم ہوتے ہیں، یہ ایک مقدمہ ہے۔ دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ لازم کے منتفی ہونے سے ملزوم بھی منتفی ہو جاتا ہے۔ مثلاً آگ کے لئے گرمی لازم ہے، جہاں آگ ہوگی، اس کے آس پاس گرمی بھی ہوگی۔ اب اگر کہیں آگ ہونے کا دعویٰ کیا جاوے اور گرمی نہ ہو تو یہ سمجھا جائے گا کہ وہاں آگ ہی نہیں ہے۔ اسی طرح ہر لازم و ملزوم میں یہ بات لازم ہے کہ جہاں ملزوم ہوگا لازم بھی ضرور ہوگا، اور اگر لازم نہ پایا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ ملزوم بھی نہیں ہے۔ جب یہ قاعدہ سمجھ لیا تو اب سمجھئے

کہ اس آیت میں جو نعمت مذکور ہے اُس کو نعمت سمجھنے کے بھی کچھ لوازم ہیں۔ اگر وہ ہمارے اندر موجود نہیں تو ملزوم بھی نہیں یعنی یوں کہیں گے کہ اس نعمت کو نعمت ہی نہ سمجھا، اگر نعمت سمجھتے تو اس کے لوازم بھی ضرور پائے جاتے۔ دیکھئے اگر ایک شخص کے پاس بہت بڑا قیمتی ایک کپڑا ہو، اور وہ اس کو زمین پر بچھا کر بیٹھ جاتا ہو، گھسیٹتا پھرتا ہو، نہ اس کے میلا ہونے کا خیال کرتا ہے، نہ پھٹ جانے کی پرواہ کرتا ہے، جہاں چاہتا ہے ڈال دیتا ہے، تو اس موقع پر سب یہی کہیں گے کہ اس نے اس کپڑے کی قدر نہیں کی۔ اس نے اس کو قیمتی ہی نہیں سمجھا، کیونکہ اگر اس کی نظر میں قدر ہوتی تو اُس کی نگہداشت کرتا، ہر جگہ نہ پھینکتا۔ اگر قیمتی سمجھتا تو موقع کا لحاظ کرتا، بے موقع جگہ سے اُس کی حفاظت کرتا، جب حفاظت نہ کی تو سمجھا جاوے گا کہ اس کو قیمتی ہی نہیں سمجھا گیا۔ غرض اسی طرح ہر لازم و ملزوم میں یہ قانون ہے کہ انتفائے لازم سے ملزوم منتفی ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی یہاں بھی ایک بڑی نعمت ہے جو اس آیت میں مذکور ہے۔ اس نعمت کا نام اسلام ہے، اور اس نعمت کا دوسرا نام بطور لقب کے نعمت ہے، چنانچہ فرماتے ہیں۔ الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینًا۔ اس میں اوّل تو تصریح ہے نعمت ہونے کی پھر نام لے کر بتلا دیا کہ وہ نعمت کیا ہے' وہ اسلام ہے۔ کسی استنباط اور استدلال کی بھی حاجت نہیں رہی، بلکہ حق تعالےٰ نے تصریح کر دی اس کے نعمت ہونے پر۔ یعنی بعض جگہ تو ایسا ہوتا ہے کہ کسی چیز کا نعمت ہونا استدلال سے ثابت کیا جاتا ہے۔ یہاں اس کی ضرورت نہیں کیونکہ نص میں خود مصرح ہے کہ وہ نعمت ہے۔ اور یہ بھی بتلا دیا کہ وہ نعمت کیا ہے' اسلام ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اسلام کا نعمت ہونا ظاہر فرمایا ہے اور اس نعمت اسلام پر احسان و امتنان کو ظاہر فرمایا ہے۔

دین کی ناقدری

جب اس نعمت کی تعیین ہوگئی تو اب اس دعویٰ کو سمجھئے جو میں نے ابھی کہا تھا کہ اس کی طرف کسی کا التفات ہی نہیں الا ماشاء اللہ۔ لوگ اس کو نعمت ہی نہیں سمجھتے۔ اب میں اس کو ثابت کرتا ہوں۔ ہر شخص سمجھ لے اور ذرا اپنے قلب کو ٹٹول کر دیکھ لے کہ اس کو اور نعمتوں کی برابر کون نعمت سمجھتا ہے۔ دیکھئے کھانا کھا کر شکر کرتے ہیں۔ خدایا تیرا شکر ہے، تو نے ہم کو کھانا کھلایا۔ پانی پی کر شکر کرتے ہیں الٰہی تیرا شکر ہے۔ کہیں سفر سے آتے ہیں تو سفر کی مشقت و کلفت کو یاد کر کے اور گھر کے عیش و راحت کو دیکھ کر کہتے ہیں الٰہی تیرا شکر ہے۔ کوئی مقدمہ دائر ہو، اور اس میں جرمانہ یا سزا یا قید کا اندیشہ ہو پھر اس سے رہائی مل جائے، بری ہو جاویں، تو کہتے ہیں الٰہی تیرا شکر ہے۔ مگر کسی نے کبھی یہ بھی کہا کہ الٰہی تیرا شکر ہے کہ ہم مسلمان ہیں، ہم نعمت اسلام سے نوازے گئے ہیں۔ اگر ہم اس کو نعمت سمجھتے تو جیسے اور نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہیں اس کا بھی شکر ادا کرنا چاہیئے تھا، بلکہ سب سے زیادہ کرنا چاہیئے تھا، کیونکہ دین و دنیا کی ساری بہبودی اسی کی بدولت ہے۔ مگر یہاں ایک مرتبہ بھی زبان پر نہیں آتا کہ الٰہی تیرا شکر ہے۔ اور مستقلاً تو کیا شکر کرتے، دوسری نعمتوں کے ساتھ منضم کر کے بھی اس پر شکر نہیں کرتے۔ حالانکہ شارع علیہ السلام نے اس کا اس قدر اہتمام کیا ہے کہ اگر تم سے مستقلاً اس کا شکر ادا نہ ہو سکے تو دوسری نعمتوں ہی کے ساتھ ملا کر لیا کرو۔ چنانچہ کھانے کے ساتھ حکم ہے کہ کھانے پر شکر کرتے وقت نعمت اسلام کا بھی شکر ادا کرو۔ کھانے کے بعد جو دعا آئی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔ الحمد للہ الذی اطعمنا وسقانا وجعلنا من المسلمین۔ یعنی تمام حمد اس ذات کے لئے ہے،

جس نے ہم کو کھانے کو دیا، پینے کو دیا، اور ہمیں مسلمان بنایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دین تعلیم دی ہے کہ کھانے پینے کے ساتھ اس کو بھی پڑھا دو وجعلنا من المسلمین۔ مگر نہایت افسوس کی بات ہے کہ ہم اس نعمت کے ساتھ اس قدر بے اعتنائی اور لاپرائی کرتے ہیں کہ اس وقت بھی نعمتِ اسلام پر شکر نہیں کرتے۔ بس بجائے اس دعا کے اتنا کہہ دیتے ہیں اللہ تیرا شکر ہے۔ ایک صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین تھے ان کے قلوب میں دین کی کس قدر وقعت تھی۔ وہ ہم جیسے نہ تھے، اور ان کے قلوب میں قدر ہونے کی دو وجہ تھیں، ایک تو یہ کہ ان کا ادراک سلیم تھا وہ حضرات سلیم الفہم تھے بھلے بُرے کو تمیز کر سکتے تھے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کے قبل کی حالت اور بعد اسلام لانے کے جو حالت ہوئی دونوں کا موازنہ کیا تھا۔ تو اپنی حالتِ ماضیہ اور موجودہ کے اندر اُنھوں نے بہت بڑا فرق محسوس کیا کہ پہلی حالت ظلمت تھی دوسری حالت نُور تھی۔ پہلے تاریکی میں تھے اب نُور سے منور ہو گئے۔ وہ ظلمت کفر ہے اور یہ نُور ایمان ہے چنانچہ قرآن شریف میں کئی جگہ اللہ تعالیٰ نے کفر کو ظلمت سے اور ایمان کو نُور سے تعبیر فرمایا ہے۔ یخرجھم من الظلمٰت الی النور۔ اور واقعی حقیقت میں بھی ایسا ہی ہے۔ مگر اس کا ادراک اُنہیں کو ہوتا ہے، جنھوں نے مختلف حالتوں کو دیکھا ہے۔ ہمیں اس کی قدر نہیں ہمارے قلوب میں اس کی وقعت نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہم کو تو دین مفت مل گیا ہے ہم کو اُس کے حاصل کرنے میں نہ کوئی مشقت کرنا پڑی ہے نہ کوئی ایذا پہنچی ہے۔ آباؤ اجداد سے میراث پہنچ گئی۔ پھر جیسے باپ دادا کی میراث کی کچھ قدر نہیں ہوتی کیونکہ مفت ہاتھ آجاتی ہے ایسے ہی اس کی بھی قدر نہیں۔ مشہور ہے کہ ایک شخص ادھوڑی کا جوتہ دوشالہ سے صاف کر رہا تھا۔ کسی نے کہا کہ یہ کیا حماقت ہے اتنا قیمتی دوشالہ جس کے آگے ادھوڑی

کے جوتے کی کیا حقیقت ہے۔ اس سے جوتا جھاڑتے ہوا کہنے لگا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوشالہ تو میرے باپ کی کمائی کا ہے جو وراثۃً مجھ کو ملا ہے، اور جوتا میری کمائی کا ہے۔ صاحبو! وہی حالت ہماری ہے کہ ہم دوشالہ سے جوتی کو جھاڑ رہے ہیں۔ دوشالہ دین ہے اور ادھوڑی کا جوتا دنیا ہے۔ ہم دین کو دنیا کے لئے برباد کر رہے ہیں۔ دین کی کچھ وقعت ہمارے دل کے اندر نہیں ہے۔ بس جیسے یہ شخص دوشالہ سے جوتا جھاڑ رہا تھا ایسے ہم بھی دین سے دنیا جھاڑ رہے ہیں یعنی دین کے ذریعہ سے دنیا حاصل کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم دین کو کوئی چیز نہیں سمجھتے ہیں۔ پھر اس حالت کے اعتبار سے ہم میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ بعض تو ایسے ہیں کہ اپنے کو دنیا دار سمجھتے ہیں۔ وہ تو دین کو دنیا پر فدا کرتے ہیں دین رہے یا نہ رہے اس کی پرواہ نہیں۔ دنیا ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ یہ لوگ تو دین کی کھلم کھلا مخالفت کرتے ہیں، اور اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہ لوگ بے نفس ہیں کہ بدنامی سے نہیں ڈرتے، بُرا بھلا سننے سے نہیں گھبراتے بلکہ اُس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی ان کو بزرگ ہی نہیں سمجھتا متقیوں میں شمار ہی نہیں ہوتے کوئی بات خلاف شرع کرنے سے ان کی بدنامی ہی نہ ہوگی۔ کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ تو عیاش بدمعاش ہیں ہی۔ اور ایک وہ ہیں کہ ظاہر میں متقی اور دیندار ملانے جاتے ہیں؛ یہ وہ ہیں جو بظاہر دنیا کو دین پر فدا کرتے ہیں۔ ظاہراً تو مقتدائے دین ہیں، بڑے علماء و صلحاء سمجھے جاتے ہیں۔ مگر یہ مرض ان میں بھی ہے کہ جہاں دین و دنیا جمع ہوتے ہیں، وہاں دنیا کو دین پر ترجیح دیتے ہیں۔ مگر کس خوبصورتی سے کہ ایک برجستہ تاویل کر کے اُس دنیا کو بھی برنگِ دین ظاہر کرتے ہیں۔ نعوذ باللہ، گویا وہی حالت ہے یخادعون اللہ والذین آمنوا وما یخدعون الا انفسہم وما یشعرون۔ جب گناہ کریں گے، تو غلط تاویل کر کے اور اگر غلط فتویٰ کسی اثر سے دیں گے تو اس کی بھی توجیہ کریں گے، حالانکہ اُس تاویل اور فتویٰ کا غلط ہونا اور اس کا بطلان اُن کو بھی معلوم ہے۔ مگر پھر واہیات خرافات تاویلیں اس لئے

کرتے ہیں تاکہ وہ تاویلیں وقت پر آڑ ہو سکیں اور کوئی بد دینی نہ کھلے، ان کے تقوے میں دھبہ نہ لگے۔ غرض یہ بھی دین کو دنیا کے تابع بناتے ہیں۔ بہر حال دونوں حالت میں دین کی بےقدری ہوئی خواہ دین کی کھلم کھلا مخالفت کی جائے یا دنیا کو برنگ دین بنایا جائے۔ بہر صورت وہی مثال ہوئی کہ دوشالہ سے ادھوڑی کے جوتہ کو جھاڑ لیا۔

ترقی مطلوب

تعجب ہے کہ مسلمان دنیوی نعمتوں کو دین پر ترجیح دیتے ہیں اور صرف بےقدری ہی نہیں اس سے بڑھ کر غضب یہ ہے کہ اس سے اعراض اور تنگی ظاہر کرتے ہیں۔ کبھی کھلم کھلا اور کبھی کسی پردہ میں اس سے نفرت ظاہر کرتے ہیں۔ چنانچہ لکھنؤ میں ایک کمیٹی ہوئی جس میں اس پر بحث تھی کہ مسلمانوں کے تنزل کا سبب کیا ہے؟۔ میں اس وقت لکھنؤ میں تھا، ایک شخص میرے پاس آیا کرتے تھے وہ اس مجمع میں موجود تھے انھوں نے مجھ سے کہا کہ اس کمیٹی کا آخری فیصلہ یہ ہوا کہ خود اسلام ہی سبب ہے تنزل کا، جب تک اسلام باقی ہے اُس وقت تک ہم ترقی کر نہیں سکتے، یہی مانع ترقی ہے۔ خدا جانے یہ لوگ ترقی کس کو سمجھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک ترقی کا ذریعہ وہ ہے، جس سے مال و جاہ بڑھے۔ اگر مال و جاہ ہے تو ترقی حاصل ہے ورنہ نہیں حالانکہ حقیقت کو دیکھنا چاہیے کہ درحقیقت ترقی کس کا نام ہے۔ آیا ہر ترقی کو ترقی کہتے ہیں یا اس میں نافع و ضار کا بھی فرق ہے۔ کیونکہ بالاتفاق بعض ترقی نافع ہوتی ہے اور بعض ضرر پہنچاتی ہے۔ تو کون سی ترقی مطلوب ہے۔ صرف ترقی نافع یا کہ نافع و ضار میں کچھ فرق نہیں غالباً ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ترقی نافع ہی مطلوب ہے، اور جو ترقی مضر ہو اُس کو کوئی ترقی نہیں کہہ سکتا۔ تو اب دیکھنا چاہیے کہ آیا مال و جاہ دین کے برابر نافع ہے یا نہیں مطلق مال و جاہ کے نافع ہونے سے مجھ کو انکار نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ دین کے

برابر بھی ان کا نفع ہے یا نہیں۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی کو اشرفیاں ملی تھیں تو اُس نے اُن کو ہتھیلی میں بھر لیا۔ آگے چل کر خوبصورت کوڑیاں ملیں تو اس نے اشرفیوں کو پھینک کر کوڑیوں سے ہتھیلی بھر لی۔ تو گو ایک درجہ میں کوڑیاں بھی نافع ہیں مگر کیا اس درجہ نافع ہیں کہ اشرفیوں کو ضائع کرنے کے بعد اُن کو بھرا جائے۔ اسی طرح مال وجاہ ضرور نافع ہیں مگر اس درجہ نافع نہیں کہ اسلام ضائع ہونے کے بعد بھی ان کا نفع معتدبہ ہو۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ مال اور جاہ کا نفع تو دنیا ہی میں ہے، اور دین کا نفع دنیا اور آخرت دونوں میں ہے۔ آخرت میں تو دین کا نافع ہونا مسلّم ہے، باقی دنیا میں بھی یہ مال وجاہ سے زیادہ نافع ہے۔ ان شاء اللہ میں اس کو ثابت کروں گا۔ لیکن اس سے قطع نظر بھی ظاہر ہے کہ عالم دنیا عالمِ آخرت کے مقابلہ میں کوئی چیز نہیں۔ لہٰذا نفع اُخروی کے مقابلہ میں نفع دنیوی بھی کوئی چیز نہیں۔ دونوں عالموں کی مثال ایک حدیث میں مذکور ہے حدیث یہ ہے کہ اگر ایک انگلی سمندر میں ڈال دی جاوے تو اس میں کچھ پانی سمندر کا لگ جائے گا۔ سو جو نسبت اس انگلی میں لگ جانے والے پانی کو سمندر کے پانی کے ساتھ ہے، یہی نسبت دنیا کو آخرت کے ساتھ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس پانی کو سمندر کے پانی سے کیا نسبت ہے؟ اب آخرت میں اگر ترکِ دین کی وجہ سے نفع نہ ہو بلکہ ضرر ہونے لگے تو وہ مال کیا نفع دے سکتا ہے۔ پس جب مال دین کے مقابلہ میں نافع نہیں، تو اس سے معلوم ہوا کہ ہر ترقی مطلوب نہیں بلکہ بعض ترقی مضر بھی ہوتی ہے اور ترقی مضر کو ترقی نہیں کہہ سکتے۔ اگر ہر ترقی اور ہر زیادتی مطلوب ہو تو کسی کے اگر زخم ہو یا کوئی پھوڑا دنبل نکل آئے اس کو بھی ترقی سمجھنا چاہیے، کیونکہ پھوڑے کی جگہ میں ورم تو ضرور ہوتا ہے۔ سو یہ بھی ترقی ہی ہوئی۔ بس چاہیے کہ پھوڑے اور دنبل کو ترقی سمجھ کر علاج نہ کرے۔ ڈاکٹر کو آپریشن نہ کرنے دے کہ واہ اتنا بڑا تو پھوڑا ہے میرے بدن میں کس قدر ترقی ہوئی ہے۔ آپریشن سے تنزل ہو جائے گا، بدن گھٹ جائے گا، کیوں صاحب!

درم کو تو کوئی بھی ترقی نہیں سمجھتا حالانکہ اس میں بھی زیادت ہے اور درم کی کثرت کو ہر شخص ترقی سمجھتا ہے۔ گو اس میں ضرر بھی ہو وجہ فرق کیا ہے؟ یہ درہم و دینار تو آخر کار ورم ہی ہو جاوے گا کہ جیسے اس ورم کی وجہ سے ضرر اور تکلیف پہنچتی ہے۔ اس درہم کی بدولت بھی آخرت میں قسم قسم کی مصیبتیں اٹھانا پڑیں گی۔ معلوم ہوا کہ ہر ترقی مطلوب نہیں بلکہ صرف وہ ترقی مطلوب ہے جو دین کو مضر نہ ہو اور وہ ترقی مطلوب ہے جو اپنے سے زیادہ نافع چیز کے لئے مضر نہ ہو، ورنہ وہ مطلوب تو کیا ہوتی مضر ہوگی۔

مذاق کا بگاڑ

اور لکھنؤ کی کمیٹی میں جو یہ پاس ہوا تھا کہ اسلام سبب تنزل کا ہے' اس کا منشا ترقی کی حقیقت سے ناواقف ہونا تھا۔ کیا ان جاہلوں نے بھی ڈاکہ زنی اور چوری کو بھی ترقی سمجھا ہے؟ اگر یہ نہیں تو پھر ذرا وہ عقلاً ثابت کر دیں کہ چوری اور ڈاکہ میں اور سود اور رشوت اور قمار بازی میں کیا فرق ہے۔ اور اس کی کیا وجہ ہے کہ آپ نے حکومت پر کبھی اعتراض نہ کیا کہ تم نے چوری اور ڈاکہ کو ممنوع قرار دے کر ترقی کو روک دیا، اور اسلام پر بلا دلیل یہ اعتراض کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اسلام نے بھی انہیں کاموں سے روکا ہے، جو چوری اور ڈاکہ کی مثل ہیں۔ مگر تماشہ ہے کہ پھر بھی بعض لوگ احکام شریعت کو مانع ترقی اسلام سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ایک تعلیم یافتہ نے ایک جلسہ میں بیان کیا تھا کہ اسلام کو ترقی نہ ہونے کا سبب نماز ہے۔ اگر اسلام میں نماز نہ ہوتی تو اس دین کی بڑی ترقی ہوتی۔ کیونکہ جب کوئی مسلمان ہونا چاہتا ہے، تو جب پہلے ہی اس کو بتلا دیا جاوے گا کہ پانچ وقت کی نماز تیری گردن پر رکھی جائے گی۔ وہ گھبرا اٹھے گا کہ یہ مجھ سے کیونکر ادا ہوں گی۔ بس اس سے وہ متوحش ہو کر اسلام لانے سے اعراض کرتا ہے۔ اگر سب مولوی لوگ جمع ہو کر اسلام

سے نماز کو نکال دیں تو بہت ہی اچھا ہوتا کہ اسلام کو ترقی ہو۔ استغفر اللہ گویا شریعت مولویوں کی بنائی ہوئی ہے۔ غرض اس طرح خود مسلمانوں کا مذاق بگڑ گیا ہے سعدی فرماتے ہیں ؎

ہر کس از دست غیر نالہ کند ٭ سعدی از دست خویشتن فریاد

محافظتِ دین

غیروں کا ضرر پہنچانا تو الگ رہا ہم تو خود ہی اسلام کو ضرر پہنچا رہے ہیں۔ خود مسلمان ہی اسلام کی جڑ کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی درخت کسی باغ میں لگا ہوا ہو اور باغ کا مالی اُس کی خدمت نہیں کرتا، پانی نہیں دیتا، کبھی اُس کی خبر گیری نہیں کرتا کہ دفعتہً کسی بھینسے نے آ کر دھکا دے کر درخت کو گرا دیا، تو یہاں بھینسے کی شکایت نہیں کی جائے گی کہ اُس نے ٹکر مار کر گرا دیا بلکہ خطا اس مالی کی ہے۔ حقیقت میں درخت کو مالی نے گرایا ہے، بھینسے نے نہیں گرایا ہے۔ اُس نے پانی نہ دے کر اس کی جڑ کمزور کر دی، ورنہ اس کی جڑ تو اتنی پکی تھی۔ کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابت وفرعھا فی السماء وہ تو اتنا بڑا مضبوط درخت تھا کہ

؎ ہر کہ با فولاد بازو پنجہ کرد ٭ ساعد سیمین خود را رنجہ کرد

مگر مالی نے پانی نہ دے کر اس کی جڑ کو ایسا کمزور کر دیا کہ ذرا سے ہوا کے جھونکے سے گر پڑا یا کسی کا ہاتھ لگا اور گر گیا۔ جب اس کی یہ حالت ہے کہ ذرا سے اشارہ سے گر پڑتا ہے پھر بھینسے کی ٹکر تو بڑی چیز ہے۔ صاحبو! یہی حال ہم نے اپنے اسلام کا کر رکھا ہے۔ یاد رکھو جب کبھی اسلام کو ضرر پہنچا ہے اہل اسلام ہی کے ہاتھ سے پہنچا ہے۔ ورنہ یہ دین ایسا ہے کہ اس کو کوئی قوت کمزور نہیں کر سکتی۔

اگر اہل اسلام اس دین کو ضرر نہ پہنچاتے تو کبھی اس دین کو ضرر نہ پہنچتا۔ کیونکہ خدا اس کا محافظ ہے۔ مگر محافظت کے یہ معنی نہیں کہ تم اس کو ضائع کرو۔ تب بھی محفوظ رہے گا بلکہ انا لہ لحافظون کے معنی یہ ہیں کہ اگر تم اس کا دھیان رکھو، اس پر عمل کرو اور محافظت کرو تو اللہ تعالیٰ اس کو قائم رکھیں گے، ضائع نہ ہونے دیں گے۔ اگر کوئی کہے کہ جب ہماری محافظت کی بھی ضرورت ہے تو اللہ میاں کی محافظت کیا چیز ہوئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ عقیدہ ثابت ہے کہ آپ کا کوئی فعل بھی بغیر ان کی تائید کے نہیں ہو سکتا۔ جب یہ مقدمہ ذہن نشین ہو گیا تو اب سمجھئے کہ آپکا یہ فعل خاص یعنی محافظت دین بھی ان کی تائید کی محتاج ہے۔ قرآن کی محافظت تمہاری محافظت کی محتاج نہیں بلکہ تمہاری محافظت خود ان کی محافظت کی محتاج ہے۔ مگر عادۃ اللہ یہی ہے کہ انکی محتاج الیہ محافظت کا ظہور تمہاری محتاج محافظت کے بعد ہوتا ہے۔ اگرچہ تاثیر اس کی پہلے ہوتی ہے پس انا لہ لحافظون کے معنی یہ ہیں کہ تم اس کام کو کرو یعنی محافظت کرو جس میں تم انکی تائید کے محتاج ہو۔ حق تعالیٰ اپنی عنایت سے تمہاری محافظت کو بار آور کر دیں گے جس سے ان کی محافظت کا ظہور ہو جائے گا جیسے حق تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کی ہے۔ اس کے بھی یہ معنی نہیں اب کسی کو حفظ کی ضرورت نہیں رہی بلکہ انکی محافظت کے یہ معنی ہیں کہ ہم کو حفظ کرنے کا حکم فرمایا، سامان مہیا فرما دیا جس سے ہم اس کے لئے کوشش کرتے ہیں وہ ہماری سعی کو پورا فرما دیتے ہیں۔ اگر انکی طرف سے مدد نہ ہو تو قرآن کبھی بھی یاد نہ ہو۔ چنانچہ بہت سے لڑکے حفظ کرنا چاہتے ہیں مگر نہیں ہوتا۔ ایسے ہی بہت سے بڑے آدمی جو ان پوری عمر کے بہت چاہتے ہیں کہ حفظ کریں مگر نہیں ہوتا کسی کو فرصت نہیں ملتی۔ کسی کے پاس مال جمع نہیں ہوتا۔ اور اس کے مقابل بعض کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ اب اگر کوئی آدمی حافظ ہو جاوے تو یہ کہیں گے کہ اس نے کوشش کی تھی حق تعالیٰ نے اس کو کامیاب کر دیا۔ خوب سمجھ لو۔ اور اس کے نظائر دیکھئے۔ مثلاً کھیتی کرنا ہے تو کیا اس میں بندہ کو کچھ کرنا نہیں پڑتا۔ کہ نہ زمین کو

کھودتا ہو نہ دانہ ڈالتا ہو نہ حفاظت کرتا ہو۔ نہیں بلکہ بندہ کو بھی بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ ہل چلانا، زمین کھودنا، پانی سینچنا، پہرہ دینا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اگر کہو پھر اللہ میاں کو کیا کرنا پڑا۔ جواب یہ ہے کہ ہم نے مانا تم نے سب کچھ کیا۔ زمین کو تیار کیا۔ پانی سینچا، دانا بھی ڈالا، مگر کیا اس دانہ سے بال نکالنا تمہاری قدرت میں تھا؟ ہرگز نہیں۔ اسی لئے فرماتے ہیں۔ افرأیتم ما تحرثون أ أنتم تزرعونه ام نحن الزارعون، لو نشاء لجعلناه حطاما فظلتم تفکھون۔ کہ تم جو کھیتی کرتے ہو کیا تم اس کو زمین سے نکالتے ہو یا ہم؟۔ زمین سے نکالنا تمہارا کام نہیں ہے وہ خدا کا کام ہے۔ تو جیسے کھیتی کرنے میں نہ سب کام خدا کے حوالے کر دیتے ہو، اور نہ کوشش چھوڑتے ہو۔ بلکہ اس میں سعی تمہاری ہوتی ہے۔ باقی کامیاب ہونا نہ ہونا خدا کے اختیار میں ہے۔ اسی طرح دین کی محافظت کی بھی یہی صورت ہے کہ ہم کو حکم کیا محافظت کا۔ پس ہم اس کی حفاظت کریں، کوشش کریں۔ پھر اللہ تعالٰے اس کو پورا فرمائیں گے۔ کیونکہ وعدہ کیا ہے۔ انا له لحافظون۔ یعنی اللہ تعالٰے اس محافظت کی تکمیل کریں گے۔

مُسلم کی داخلی قوت

آپ سمجھئے دین کی محافظت دو طرح سے ہے۔ ایک بیرونی حملوں کو روکنا، اور دوسرے خود اندرونی آثار اور بناؤں کو مستحکم کرنا۔ لوگوں نے محافظت کے صرف یہ معنی سمجھے ہیں کہ اوروں سے لڑنے لگے۔ یعنی بیرونی حملوں کو روکنا شروع کر دیا، اور اس کو کافی سمجھ لیا۔ حضرت! بیرونی حملہ کو روکنے سے زیادہ اہتمام اندرونی آثار کا کرنا چاہیئے، کیونکہ محافظت کے لئے دونوں جزو کی ضرورت ہے۔ ایک بیرونی حملے سے بچانا، دوسرے اندرونی حالت کو مکمل کرنا۔ اگر اندرونی حالت بالکل خراب

ہو تو محافظت ہو ہی نہیں سکتی۔ دیکھو اگر کوئی بادشاہ ہو اور وہ ساری فوج کو موقوف کر دے، لڑائی کے سازو سامان کو برباد کر دے، سارے خزانہ کو لٹا دے، آگ لگا دے۔ اب اگر کوئی غنیم آجاوے اور بادشاہ لڑائی کے لئے آمادہ ہو جائے کیا وہ ظفریاب ہو سکتا ہے؟ بلکہ وہ حالت ہو گی

ع لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

جب فوج نہیں خزانہ نہیں سامانِ حرب نہیں تو کیا خاک اپنے ملک کی محافظت کرے گا؟ تو ایسی حالت میں محافظت کے کیا معنی ہوں گے۔ بس یہ معنی ہوں گے کہ نویت ان احافظ ملکی۔ کہ میں محافظتِ ملکی کی نیت باندھتا ہوں۔ سو محافظت تو اس سے ہو چکی۔ اب بتلائیے کہ یہ بادشاہ اپنے ملک کی حفاظت کیوں نہ کر سکا؟ صرف اسی وجہ سے کہ اس نے اندرونی قوت کو بالکل تباہ اور مضمحل کر دیا تھا۔ اس حالت میں وہ بیرونی حملہ کو کیسے روک سکتا ہے؟ یہی حالت ہماری ہے کہ ہم محافظت اسلام کے لئے محض بیرونی حملوں کو دفع کرنا چاہتے ہیں، اور اپنی حالت کی تکمیل نہیں کرتے۔ افسوس ہے کہ اس وقت فتنۂ ارتداد سے مسلمانوں کی گو ایک آنکھ تو کھلی یعنی بیرونی حملوں کا کچھ انسداد کیا ہے، مگر ایک اب بھی بند رہ گئی یعنی اندرونی حالت درست کرنا، وہی کلنے کے کانے ہی رہے۔ پوری طرح ہوش اب بھی نہیں آیا۔ حضرات مکرر کہتا ہوں کہ اندرونی محافظت کی زیادہ ضرورت ہے اپنا اسلام کو راسخ کرنا، شریعت کا متبع ہونا یہ اندرونی محافظت ہے۔

صاحبو! کامل مسلمان بن جاؤ۔ احکام شریعت کی پورے طور سے پابندی کرو۔ یہی نہیں کہ غیروں سے لڑنے لگو، بلکہ میں کہتا ہوں کہ خواہ لڑو مت مگر اپنی حالت کو درست کر لو۔ صاحبو! ہر شئے کا ایک اثر ہوا کرتا ہے۔ اسلام کامل کا بھی ایک اثر ہے۔ واللہ جو کام خارجی قوت سے نہیں ہوتا، وہ داخلی قوت سے ہو جاتا ہے۔

اگر داخلی قوت پکی ہو جاوے تو خارجی قوت کی زیادہ ضرورت ہی نہ ہے پہلے زمانہ میں لوگ ہمارے بزرگوں کو دیکھ کر، ان کے اعمال، ان کی طرز معاشرت کو دیکھ کر اسلام میں داخل ہوتے تھے۔ کوئی زور یا زبردستی سے مسلمان نہیں ہوتے تھے مگر اب ہمارے اعمال خراب اخلاق خراب، معاشرت گندی، معاملات خراب۔ اگر کوئی مسلمان ہونا چاہے تو ہماری کیا چیز دیکھ کر ہو؟ —

قوتِ اسلام

اور اس مقام پر ایک تنبیہ کی ضرورت ہے۔ وہ یہ کہ اکثر مقررین کی زبان پر یہ جملہ آتا ہے کہ اسلام ضعیف ہو گیا۔ شاید کوئی میرے کلام کو بھی اسی پر محمول کر لے سو خوب سمجھ لو کہ اسلام کے دو درجے ہیں۔ ایک اسلام کی ذات اور حقیقت اور ایک اہل اسلام کی صفت اور حالت۔ سو میں یہ نہیں کہتا کہ اسلام اپنی حقیقت کے درجہ میں مختل ہو گیا۔ ہر گز نہیں، وہ تو اب بھی اپنی اسی آب و تاب پر ہے۔ اس کی تو یہ حالت ہے ؎

ہنوز آں ابر رحمت درفشاں ست — خم و خمخانہ با مہر و نشان ست

بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ ہمارا اسلام ضعیف ہو گیا ہے یعنی ہماری اسلامی حالت مختل ہو گئی۔ باقی یہ جو آجکل لیکچراروں کی زبان پر ہے کہ اسلام ضعیف ہو گیا، جس کا مفہوم قرآن سے یہ ہے کہ وہ اپنی ذات میں ضعیف ہو گیا۔ سو یہ بالکل غلط ہے وہ ہر گز ضعیف نہیں ہے، وہ اپنی ذات میں کامل مکمل ہے اور کبھی اس میں ضعف نہیں آ سکتا۔ اسلام اس وقت ضعیف ہو سکتا ہے کہ نعوذ باللہ خدا ضعیف ہو جاوے خداوند کریم کے ہوتے ہوئے اسلام کبھی ضعیف نہیں ہو سکتا۔ یہ غلط محاورہ زبان پر چڑھا ہوا ہے کہ آج کل اسلام ضعیف ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ ضعف اسلام کے

کیا معنی ہے۔ اگر مراد یہ ہے کہ اسلام جو قانونِ الٰہی ہے وہ ضعیف ہو گیا۔ تو یہ بالکل غلط ہے۔ اور اگر یہ معنی ہیں کہ وہ اسلام جو ہماری ایک خاص صفت ہے وہ ضعیف ہو گیا ہم جو ایک صفت کے ساتھ متصف تھے اس میں کمی آ گئی تو مسلّم ہے مگر پھر سیدھی بات یوں کیوں نہ کہو کہ آج کل ہم کمزور ہیں، اسلام میں ایسا لفظ کیوں کہو جس سے غلط معنی کا شبہ پڑتا ہے' یوں کیوں کہتے ہو کہ اسلام ضعیف ہو گیا۔ اس میں تو دھبہ آتا ہے اسلام پر۔ ناظرین شبہ میں پڑتے ہیں' وہ اس کا مطلب یہ سمجھیں گے کہ بس مذہب اسلام ہی ضعیف ہو گیا ہے' ایسے موہم الفاظ کو چھوڑنا چاہیئے۔ الغرض ہم لوگوں نے ضعف کو اسلام کی طرف منسوب کر رکھا ہے۔ حیرت کی بات ہے کس قدر کبر ہے کیا ٹھکانہ ہے کبر کا کہ اپنی کوتاہی کو بھی اسلام پر ڈالا۔ وہی حال ہے کہ ے

حملہ برخود میکنی اے سادہ مرد ۔۔۔ ہمچو آں شیرے کہ برخود حملہ کرد

ہماری وہی مثال ہے جیسے ایک حبشی کو راستہ میں ایک آئینہ پڑا ہوا ملا۔ آپ نے اس میں اپنی حسین صورت کو ملاحظہ فرمایا۔ اُن کی صورت جیسی ہوتی ہے سب کو معلوم ہے۔ آئینہ میں جب اپنی بُری صورت دکھائی دی تو جھنجھلا کر آئینہ کو پتھر پر دے مارا اور کہا ایسی بھدی صورت کا تھا جبھی تو کوئی راستہ میں پھینک گیا۔ تو جیسے اس حبشی نے اپنی بدصورتی کو آئینہ کی طرف منسوب کیا ایسے ہی ہم بھی اپنے ضعف اور اپنی کمزوری کو اسلام پر ڈالتے ہیں۔ اسی طرح کسی احمق بڈھے کی حکایت ہے کہ اُس کا لڑکا روٹی کھا رہا تھا، اتفاق سے ایک ٹکڑا لوٹے میں گر گیا، اُس نے جو جھانک کر دیکھا تو اپنی صُورت نظر آئی۔ وہ اُسے کسی دوسرے بچے کی شکل سمجھا وہ بچہ تھا یہ نہ سمجھا کہ یہ میرا ہی ظل و عکس ہے۔ رو کر کہنے لگا کہ ابا اس بچے نے میرا ٹکڑا چھین لیا۔ اب وہ بڈھے صاحب اٹھے کہ تو ہٹ میں آتا ہوں' تو کمزور ہے،

تو اس سے چھین نہیں سکتا۔ میں چھین لوں گا۔ آپ نے جو جھانک کر دیکھا تو حضورؐ کو اپنی شکل نظر آئی کہنے لگا لعنت ہے اتنی لمبی ڈاڑھی لگا کر بچے کا ٹکڑا چھینتے ہوئے کچھ شرم بھی آئی؟ تف ہے تیری اس صورت پر۔ سب کچھ کہہ لیا اور احمق کو یہ خبر نہیں کہ اپنے ہی کو کہہ رہا ہوں اور جو کچھ تو کہہ رہا ہے وہ تیرے ہی اوپر برس رہا ہے۔ نیز ہماری بعینہٖ وہی مثال ہے۔ جیسے میرے ایک عزیز مجھ سے بیان کرتے تھے کہ ایک عورت اپنے بچہ کو پاخانہ پھرا کر کپڑے سے پونچھ کر چاند دیکھنے کھڑی ہوئی وہ دن چاندرات کا تھا۔ وہ بھی ناک پر انگلی رکھ کر دیکھنے لگی تو پاخانہ کی بو آئی کیونکہ جلدی میں کچھ پاخانہ انگلی میں لگ گیا تھا۔ تو کہتی کیا ہے کہ اوئی اب کے چاند سڑا ہوا کیوں نکلا۔ تو اس اُلو کی پٹھی کو یہ خبر نہیں تھی کہ چاند تو سڑا ہوا نہیں ہے تُو ہی خود سڑی ہوئی ہے۔ مگر اس نے اپنے متعلق تو ایسا احتمال نہ کیا چاند پر خاک ڈالنے چلی۔ اسی طرح ہم چاند پر خاک ڈالنا چاہتے ہیں کہ اپنے ضعف کو اسلام پر لگاتے ہیں۔

کیدِ نفس

صاحبو! اسلام ضعیف نہیں ہوا بلکہ ہم خود ضعیف ہو گئے ہیں مگر اپنے ضعف کو جو ہم اپنی طرف منسوب نہیں کرتے بلکہ اسلام کی طرف منسوب کرتے ہیں اس میں نفس کا ایک کید خفی ہے، وہ یہ کہ اگر ضعف کو اپنی طرف منسوب کریں تو اس ضعف کا تدارک کرنا پڑتا ہے، اور اس کا تدارک یہ تھا کہ ہم اسلام میں پکے ہوتے، اور اس میں خود کو بہت سے کام کرنا پڑتے ہیں۔ اب ضعف اسلام کی طرف منسوب کر دیا تاکہ کچھ کرنا نہ پڑے کہ بس جو کچھ ضعف ہے اسلام میں ہی ہے۔ ہم پر ضعف کا کوئی اثر نہیں، کوئی شکایت یا کوتاہی ہم میں ہے ہی نہیں؛

تاکہ اس کا تدارک کرنا پڑے۔ اسی لئے خدمتِ اسلام کو ایسے لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں جن کے عقائد تک صحیح نہیں اور اعمال کا تو کیا ذکر بھلا ایسے لوگ اسلام کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟ اور ان کی خدمت سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ جب خود تمہارے ہی عقائد درست نہیں پھر دوسروں کو صحیح عقائد کی طرف کیوں بلاتے ہو؟ اور اگر اپنے غلط عقائد کی طرف بلاتے ہو تو ایسے غلط تو اس کے بھی ہیں۔ پھر وہ تمہارا کہنا کیوں مانے؟ اسی طرح بعض مبلغین کے اعمال کی یہ حالت ہے کہ نہ نماز ہے نہ روزہ نہ حلال حرام کی پرواہ ہے نہ معاملات اچھے ہیں نہ معاشرت ٹھیک ہے' انکی حالت کو دیکھ کر کوئی ان کو مسلمان بھی نہیں کہہ سکتا۔ پہلے تو دنیادار مسلمانوں کی یہ حالت تھی کہ نماز پڑھتے، روزہ رکھتے، زکوٰۃ دیتے، حج ادا کرتے، حلال حرام کی جانچ کرتے تھے، احکام شرعیہ کے ذرہ برابر خلاف نہ کرتے تھے۔ اب یہ حالت ہو گئی، بقول اکبر ؎

نہ نماز ہے نہ روزہ نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے ۔۔۔ تو خوشی پھر اس کی کیا ہے کوئی جنٹ کوئی جج ہے

اوّل اوّل جب کالج کھولے گئے تو لوگوں نے کہا تھا کہ اب اسلام کو بڑی ترقی ہو گی، کیونکہ مسلمانوں کو حکومت کے عہدے ملیں گے اور جج کلکٹر ڈپٹی وغیرہ نماز پڑھنے آویں گے۔ مسجد کے دروازے پر گاڑی کھڑی ہو گی۔ لوگ پوچھیں گے کہ یہ گاڑی کس کی ہے؟ ملازم کہے گا ڈپٹی صاحب کی ہے۔ کہیں بگی کھڑی ہے کس کی ہے؟ جنٹ صاحب کی ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ نماز کے لئے مسجد میں تو کیا آتے، امتحان پاس کر کے خود نماز کے پاس بھی نہیں پھٹکتے (لطیفہ جتنے پاس ہوتے گئے اتنے ہی دُور ہوتے گئے) ہاں ڈگری ملنے اور امتحان میں پاس ہونے سے پہلے بعضے بعضے نماز پڑھتے رہتے ہیں، اور جہاں مقصود حاصل ہوا پھر کہاں کی نماز کدھر کا روزہ؟ گویا اب خدا کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ جیسے بعض طالب علم امتحان کے

زمانہ میں یا علیم یا علیم بہت پڑھا کرتے ہیں اور جب امتحان گزر گیا پھر اُس کی خبر ہی نہیں گویا اب خدا کی ضرورت نہیں رہی۔ ہمارے یہاں ایک نوجوان شخص خوشحال گھرانے کا تھا بہت نیک بخت نمازی تہجد گزار روزے بھی رکھتا تھا، عشرہ اخیرہ میں اعتکاف بھی کرتا تھا، خدا تعالےٰ سے دعائیں بھی گڑگڑا کر مانگتا تھا۔ اس کا ایک تایا تھا بڑا جاہل وہ کہنے لگا ارے ہاتھ پھیلا پھیلا کر کیا مانگتا ہے؟ تجھے کس بات کی کمی ہے۔ کھانے کو موجود ہے پہننے کو موجود ہے تجھے کس چیز کا گھاٹا ہے۔ غضب ہے بعض لوگ کتنے بدعقیدہ ہیں، الٰہی توبہ۔ اور اس سے بڑھ کر یہ غضب ہے کہ بعضے پیر پرست کہتے ہیں کہ جو کچھ مانگنا ہو بڑے پیر سے مانگو۔ اور اللہ کی نسبت کہتے ہیں کہ میاں ان سے کیا مانگنا، اُن کا تو یہ کام ہے اس سے لیا اس کو دیا اُس سے لیا دوسرے کو دیا۔ خدا کی پناہ خدا کی پناہ۔ اللہ تعالےٰ کی عظمت اور وقعت قلب میں بالکل ہی نہیں، جو منہ میں آیا بک دیا۔ نہ اس کی پرواہ ہے کہ اس بات سے ہمارا ایمان جاتا ہے۔ نہ اس کا خیال ہے کہ یہ الفاظ کفر کے ہیں۔ حالانکہ خدا تعالیٰ کی عظمت سب سے زیادہ ہونا چاہیے تھی۔

صرف ہمت

مگر میں اب دیکھتا ہوں کہ سب سے زیادہ تو کیا ہوتی برابر بھی نہیں۔ بلکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تو کچھ عظمت دلوں میں ہے بھی۔ مگر حق جل شانہٗ کی عظمت تو بالکل دلوں سے جاتی رہی۔ جبھی تو ہماری وہ حالت ہو گئی کہ ہمارے اسلام کو دیکھ کر لوگوں کو اسلام لانے سے عار آتی ہے۔ جیسے ایک مجوسی کا قصہ مولانا رومیؒ نے لکھا ہے کہ کسی نے اُس سے کہا تھا کہ مسلمان ہو جاؤ، اُس نے کہا کیسا مسلمان ہوں، تم جیسا یا بایزید جیسا۔ اگر یہ مراد ہے کہ تم جیسا مسلمان ہو جاؤں

تو تم سے تو میں ہی اچھا ہوں اور بایزید جیسا میں ہو نہیں سکتا۔ مگر اس کا یہ کہنا کہ ایسے مسلمانوں سے تو ہم ہی اچھے۔ بالکل غلط ہے کیونکہ باغی سے غیر باغی ہر حالت میں اچھا ہے۔ کفر بغاوت ہے اور اسلام اطاعت ہے۔ غیر باغی خواہ چور ہو یا زانی ہو باغی سے بدرجہا افضل ہے خواہ وہ کیسا ہی مہذب اور عقل کا پتلا ہو۔ تمہیں کیا معلوم ہے کہ بغاوت اور اطاعت میں کیا فرق ہے۔ بادشاہ سے پوچھو کہ اس کی نظر میں کون اچھا ہے۔ باغی یا مطیع ہے اور کس کی وقعت اس کے قلب میں ہے اور کس سے نفرت ہے۔ حضرت بغاوت وہ چیز ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے سارے کمالات گرد ہو جاتے ہیں، اور اطاعت وہ چیز ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے سارے جرائم خفیف ہو جاتے ہیں۔ مگر خفیف کے معنی بالکل ہیچ اور معمولی اور ہلکا نہ سمجھے بلکہ یہ خفیف بمقابلہ بغاوت کے ہے۔ ورنہ یہ بھی فی نفسہ ثقیل و شدید ہے۔ دیکھو اگر کوئی چوری کرے تو بادشاہ اسے سزا دے گا۔ مثلاً سات برس جیل میں مشقتیں اٹھانی پڑیں گی مگر اس مدت کے بعد پھر رہائی ملے گی، اور کسی وقت بادشاہ کو خوش کر کے کسی عہدہ پر بھی پہنچ سکتا ہے۔ اور باغی اگر ہاتھ آوے گا تو یا تو قتل کیا جاوے گا۔ یا کم از کم دائم الحبس سے ادھر تو رہے ہی گا نہیں کبھی اس کی رہائی نہ ہو گی۔ اسی طرح کوئی مسلمان گنہگار ہو تو وہ خاص مدت تک دوزخ میں رہ کر پھر جنت میں چلا جاوے گا مگر کفار کو کبھی رہائی نہ ہو گی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دوزخ ان کا ٹھکانہ ہے ...

فی نار جہنم خالدین فیہا ابدا۔ تو اس لئے اس مجوسی کا یہ کہنا کہ اس سے تو ہم ہی اچھے ہیں یقیناً غلط تھا۔ مگر میرا مقصود اس حکایت سے یہ ہے کہ تمہاری حالت ایسی کیوں ہے جس پر ایک کافر نے یہ کہہ دیا کہ تم سے تو ہم ہی اچھے ہیں۔ صاحب ہماری حالت دیکھ کر اس گبر کو مسلمان ہونے سے عار آئی۔ اس کا یہ کہنا کہ بایزید جیسا مسلمان ہوا نہیں جاتا۔ یہ کہنا بھی اس کا غلط تھا۔ کیونکہ اگر

بایزید جیسا ہونا محال ہے پھر وہ کیسے ہوئے وہ کوئی نبی تو نہ تھے ان کے پاس وحی تو آتی نہ تھی۔ بس انہوں نے ذرا توجہ کی اور نفس کی مخالفت کی مجاہدے کئے بایزید ہو گئے۔ تم بھی اگر توجہ کرو گے ذرا ہمت سے کام لو گے بایزید ہو سکتے ہو، ورنہ با حذف ہو کر یزید ہو جاؤ گے۔ جو ترکیب بایزید نے کی تھی تم بھی کرو بایزید ہو جاؤ گے۔ وہ ترکیب کیا ہے، اس کا نام ہے ہمت۔ ہمت سے کام لو اوامر کو بجا لاؤ، منہیات سے برطرف رہو۔

بزرگی کے معنٰی

اگر کوئی کہے ہمیں تمام رات جاگنے کی ہمت تو ہے نہیں۔ یہ تو مشکل کام ہے۔ سو اس کا شرطِ لازم ہونا ہی غلط بات ہے۔ رات بھر جاگنے کو کون کہتا ہے۔ خربوزے اور تربوز چھوڑنے کو کس نے کہا، اناج غلہ چھوڑ دینے کو بزرگی کس نے کہا۔ اس کو بزرگی نہیں کہتے۔ بزرگی کے معنی ہیں خدا کے اوامر کا امتثال کرنا، اور منہیات کو چھوڑنا۔ کھانا پینا چھوڑنے کو کون کہتا ہے خوب کھاؤ پیو۔ بایزید کو نوافل پڑھنے کی ہمت تھی، ان کے قویٰ قوی تھے وہ زیادہ مجاہدے کر سکتے تھے اس لئے کئے۔ اور ہم کو صرف فرائض واجبات وسنن ادا کرنے کی ہمت ہے کیونکہ ہمارے قویٰ کمزور ہیں۔ تو ہمارے لئے یہی کافی ہے۔ اگر کوئی کہے کہ صاحب ہم کو تو سب فرائض کی بھی قدرت نہیں چار وقت کی تو قدرت ہے۔ فجر، ظہر، عصر، مغرب باقی عشاء کی طاقت نہیں ہے نیند سے مغلوب ہو جاتے ہیں تو وہ غلط کہتا ہے کیونکہ اللہ تعالٰے تو فرماتے ہیں کہ تم کو قدرت ہے اور تم خدا کی بات کو غلط کرنا چاہتے ہو۔ رہا یہ کہ حق تعالٰے نے کہاں فرمایا ہے۔ سنئے ارشاد فرماتے ہیں۔ لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا کہ اللہ تعالٰے نے وسعت وطاقت سے زیادہ کسی کو کسی

حکم کا مکلف نہیں فرمایا۔ معلوم ہوا کہ جملہ اوامرِ شرعیہ داخلِ قدرتِ بشریہ ہیں اور انہی میں سے عشاء کی نماز بھی ہے۔ تو قرآن سے معلوم ہوا کہ یہ سب داخلِ قدرت ہے اور یہ شخص کہتا ہے کہ مجھے قدرت نہیں چھوٹا ہے۔ یا کسی نے کہا تھا کہ صُبح کو تو آنکھ نہیں کھلتی اور آنکھ کھلنا اختیار میں نہیں اوّل تو ہم اس عذر کو مانتے نہیں کیونکہ تجربہ ہے اگر اس شخص کو جو کہ یہ کہتا ہے کہ صبح کو آنکھ نہیں کھلتی۔ ریل پر جانا ہو تو کیسا جلدی سے چار بجے اٹھ کر اسٹیشن پر پہنچتا ہے۔ اگر سویرے اٹھنا اختیار اور قدرت میں نہیں تو آج کیسے اُٹھ بیٹھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بات دل کو لگی ہوئی تھی۔ اس لئے آنکھ کھل گئی۔ اور نماز دل کو لگی ہوئی نہیں اس لئے آنکھ نہیں کھلتی۔ ورنہ ممکن نہیں کہ صبح ہو اور آنکھ نہ کھلے۔ مگر خیر ہم نے آپ کے اس عذر کو بھی مانا، مگر کیا یہ بھی قدرت سے خارج ہے کہ سورج نکلنے کے بعد ہی فوراً پڑھ لو قضا ہی سہی۔ تو پھر صبح کی نماز وسعت سے کہاں خارج ہوئی۔

بہرحال اپنی وسعت کے موافق کرتے رہو جو تم سے بن پڑے کئے جاؤ۔ یہ کون کہتا ہے کہ وسعت سے زائد کرو۔

شیوخِ محققین کی وصیت

بلکہ شیوخ محققین کی اس بارہ میں وصیت ہے کہ طالب کو اس کی ہمت سے زیادہ بتلانا ہی نہ چاہیئے۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

خستگاں را چو طلب باشد و ہمت نبود
گر تو بیداد کنی شرطِ مروت نبود

—— اور مولانا رحؒ فرماتے ہیں ؎

چار پا را قدر طاقت بار نہ ❊ بر ضعیفاں قدر ہمت کار نہ

اور فرماتے ہیں ؎

طفل را گر نان دہی بر جائے شیر ٭ طفل مسکیں را ازاں نان مردہ گیر

غرض اس طریق میں ہر شخص کو اس کی طاقت کے موافق کام دیا جاتا ہے۔ تو اب اگر یہ طریق اختیار رکھو گے تو بایزید سے بھی افضل ہو سکتے ہو۔ باوجود تم محنت کرنے کے۔ تو اس گبر کا یہ کہنا کہ بایزید جیسا ہونا محال ہے یہ بھی ٹھیک نہیں۔ یہ تو قصہ تھا، باقی مقصود میرا اس قصہ سے یہ ہے کہ ہماری حالت ایسی ہوگئی کہ اس کو دیکھ کر دوسروں کو اسلام لانے سے عار آتی ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ بعضے مسلمان قوم کی مجموعی حالت کو دیکھ کر اسلام کو بے وقعت سمجھنے لگے۔

ہمارے وطن کا ایک قصہ ہے کہ ایک انگریز میرے پاس مسلمان ہونے کو آیا وہ کسی عہدہ پر تھا۔ آپ کو مسلمان ہونے کا جوش اٹھا۔ نوکری چھوڑ کر مسلمان ہونے کو آئے۔ آجکل لوگوں میں یہ بھی ایک دستور ہو گیا ہے کہ ذرا سی بات پر نوکری چھوڑ دیتے ہیں۔ خدا جانے نوکری ان کو کیا کہتی ہے۔ کیا نوکری اللہ اللہ کرنے کو منع کرتی ہے۔ خیر یہ تو ایک کم سمجھ کا واقعہ تھا۔ ایک سمجھ دار کا قصہ بیان کرتا ہوں۔ ایک مولوی صاحب کانپور کے ایک مدرسہ میں تھے، پڑھتے بھی تھے اور ایک رئیس زادہ کے جو اس مدرسہ میں پڑھتا تھا۔ اتالیق تنخواہ دار بھی تھے۔ انہوں نے ایک دفعہ ایک خواب دیکھا کہ حشر برپا ہے حساب کتاب ہو رہا ہے، اس خواب میں اپنی ایک بری حالت معلوم ہوئی۔ وہ خواب سے بہت پریشان ہوئے اور مجھ سے کہنے لگے کہ اگر آپ کہیں تو نوکری چھوڑ دوں۔ خدا جانے اس کو خواب کی برائی سے کیا تعلق تھا، نہ معلوم نوکری چھوڑنے میں کیا رکھا ہے۔ اس سے کیا مل جاتا ہے۔ لوگ نوکری چھوڑنے کو اور متعلقین سے بے پرواہ ہو جانے کو بڑی بزرگی سمجھتے ہیں۔ جب میں نے منع کیا تو رک گئے میں ایک مرتبہ میرٹھ اپنی اہل خانہ کا علاج کرانے کے واسطے گیا۔ وہاں پر

ایک عورت مجھ سے مرید ہونے کو آئی۔ تو اس کو دوسری عورتوں نے کہا کہ تو ان سے مرید مت ہو بلکہ ہمارے پیر سے مرید ہونا وہ بڑے بزرگ ہیں، پچاس برس سے بیوی سے بات تک نہیں کی اور یہ تو علاج کے لئے بیوی کو ساتھ ساتھ لئے پھرتے ہیں۔ وہ عورت فہیم تھی کہنے لگی اس کی یہ دلیل تھی کہ اس سے تو مرید ہونا جائز نہیں کیونکہ پچاس برس تک بیوی سے نہ بولنا اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ وہ پچاس برس سے گناہ میں مبتلا ہے کیونکہ بیوی کے حقوق ادا کرنا واجب ہے، تو جو اتنا بڑا گنہگار ہو اس سے مرید ہونا کہاں جائز ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک اناج نہ کھانا بڑی بزرگی ہے۔ چنانچہ بعض دوکاندار پیر ایسے دیکھے گئے ہیں جن کی یہ کرامت مشہور ہے کہ وہ اناج نہیں کھاتے۔ افسوس ان لوگوں نے حلال کو چھوڑ کر حرام کو اختیار کیا ہے۔ کیونکہ انھوں نے اناج کھانا (جو کہ حلال تھا) اس لئے چھوڑا تاکہ شہرت حاصل ہو (جس کی طلب حرام ہے) کہ لوگ یوں کہیں کہ یہ بڑے بزرگ ہیں کچھ کھاتے ہی نہیں۔

جوش و ہوش

غرض آج کل جہاں بزرگی کا جوش اٹھا یا بی بی کو چھوڑا یا نوکری چھوڑ دی۔ میاں اطاعت وہ چیز ہے کہ سلطنت کے ساتھ بھی ہو سکتی ہے۔ اور اگر کسی نے سلطنت کو چھوڑا ہے تو وہ غلبۂ حال اور جوش میں چھوڑا ہے۔ اور جوش کی حالت حجت نہیں ہوتی بلکہ ہوش کی حالت حجت ہوتی ہے۔ پھر جوش میں بھی ان کو ہی ترک علائق کی اجازت تھی تم کو اجازت نہیں، تمہارے لئے ملازمت چھوڑنا جائز نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ قوی القلب تھے سلطنت کو چھوڑ کر پچھتائے نہیں۔ تم ان کی کیا ریس کرتے ہو کہ آج نوکری چھوڑو کل کو پچھتانے لگو کہ ہائے اب کیسے گزر ہوگی۔ ہم نے یہ کیا بے وقوفی کی۔ حضرت ابراہیم بن ادہمؒ جب سلطنت چھوڑ کر نکلے تو یہ حالت تھی سے

لنگے زیر و لنگے بالا ÷ نے غم دزد و نے غم کالا

مگر اس قدر مستغنی تھے کہ حال سلطنت میں بھی اتنے مستغنی نہ تھے۔ جب سلطنت چھوڑ کر گئے تو ایک کنویں میں وضو کرنے کے لئے ڈول ڈالا اس کو جو کھینچا تو بڑا وزنی معلوم ہوا۔ جب نکالا تو دیکھا دراہم سے بھرا ہوا ہے۔ اس کو الٹ دیا اور پھر ڈال تو سونا بھرا ہوا آیا۔ اس کو بھی الٹ کر پھر کھینچا تو جواہر سے لبریز تھا۔ رونے لگے اور جناب باری میں عرض کیا کہ آپ میرا امتحان لیتے ہیں۔ امتحان کے لائق تو نہیں لیکن میرے قلب میں اگر ان کی قدر ہوتی تو سلطنت ہی کیوں چھوڑتا۔ میرا امتحان نہ لیجئے۔ اپنی رحمت کے صدقہ مجھے پانی دے دیجئے مجھے وضو کرنا ہے۔ نماز کا وقت تنگ ہوا جاتا ہے۔ دیکھو ان کا دل کتنا قوی تھا۔ اور اب تو یہ حال ہے کہ اگر نوکری بھی چھوڑی تو اس لالچ میں چھوڑتے ہیں کہ اس سے زیادہ ملے اور لوگ بزرگ سمجھ کر ہدیئے تحفے زیادہ دیں۔ چنانچہ ایک بیرسٹر کا قصہ ہے کہ اس نے ان تحریکات میں نوکری چھوڑی اور ایک انجمن کا صدر ہو گیا۔ بس ہزاروں روپے اس بہانہ سے کمالئے اور ساتھ کے ساتھ نیک نام بھی ہو گئے کہ ایسے خادم اسلام ہیں کہ بیرسٹری چھوڑ کر انجمن کی خدمت کے لئے تیار ہو گئے۔ سبحان اللہ دین کا بہت ہی خیال ہے۔ یہ حقیقت تھی ان کے اسباب معاش چھوڑنے کی۔ مگر حقیقت شناس اس حالت میں بھی پرکھ لیتے ہیں۔ پرکھنے پر سرسید کی ایک بات یاد آئی۔ گو ہم ان کے مخالف ہیں مگر انصاف یہ ہے کہ جیسے ان کے عیوب کو ہم ظاہر کرتے ہیں ویسے ہی اگر ان میں کوئی خوبی ہو تو اس کو بھی ظاہر کر دینا چاہیئے ؎

عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو
نفی حکمت مکن از بہر دل عامی چند

(قرآن شریف کا بھی یہی طرز ہے فرماتے ہیں یسئلونک عن الخمر والمیسر قل فیھما اثم کبیر ومنافع للناس ۔ اور فرماتے ہیں ومن اھل الکتاب من ان تامنہ بقنطار یؤدہ الیک ومنھم من ان تامنہ

بدینار لا یؤدہ الیک الا ما دمت علیہ قائماً ۱۲ ط) غرض سرسید امورِ دنیا میں بڑے عاقل اور مسلمانوں کے محب اور بہت خیر خواہ تھے۔ گو وہ محبت بوجہ دین کی کمی کے ناداں دوست کی سی محبت ہو گئی تھی۔ بس ان میں قلت دین کا عیب ضرور تھا۔ لیکن بہت سی خوبیاں بھی تھیں مگر اس عیب نے سب خوبیوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ غرض ان سے کسی نے کہا کہ فلاں مقام پر ایک بزرگ ہیں ان سے آپ ملئے وہ بڑے متوکل شخص ہیں۔ اس نے کہا ہاں میں بھی ان کو جانتا ہوں یہ بھی ایک دنیا کمانے کی ترکیب ہے کہ لوگ ہم کو متوکل سمجھ کر زیادہ ہدایا تحائف پیش کریں گے۔ خیر ان کا حال تو معلوم نہیں کہ وہ کس لئے بیٹھے تھے۔ لیکن بہت سے لوگ واقعی اس کو ترکیب طلب دنیا ہی کی سمجھتے ہیں۔ بہتوں نے اس کو حصول دنیا کا ایک ذریعہ بنا رکھا ہے تو ایسے لوگوں کو ضرورت ہی کیا نوکری چھوڑنے کی۔ کیونکہ چھوڑ کر بھی دنیادار ہی رہے۔ اس سے تو نہ چھوڑنا ہی اچھا ہے کہ جھوٹے دعوے سے تو بچیں۔ الغرض سلف کے قلوب قوی تھے۔ وہ چھوڑ کر گھبراتے نہ تھے۔ ان کے لئے ملازمت چھوڑ دینا بجا تھا۔ اور ہم ضعیف ہیں ہمارے قلوب بھی ضعیف ہیں۔ آج ہم اگر ملازمت سے استعفار دیں تو کل کو پچھتانے لگیں۔ اس لئے ہمارے لئے ملازمت چھوڑ دینا بے جا ہے۔ ہم کو چاہئے کہ جب اس کا جوش اٹھے، اس وقت ہوش سے کام لیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ کسی مقتدار کی رائے پر عمل کریں جو وہ کہے اسی کو اختیار کریں۔ اپنی رائے کو اس میں اصلاً دخل نہ دیں کیونکہ مریض کی بدبختی ہے علاج میں اپنی رائے پر عمل کرنا۔ اور خوش قسمت ہے وہ مریض جو اپنے کو طبیب کے حوالے کر دے اور اس کے کہنے کے موافق عمل کرے۔ غرض وہ عہدہ دار انگریز نوکری چھوڑ کر آیا تھا اس کے چند شبہات تھے وہ کہتا تھا کہ اگر وہ شبہے رفع ہو جاویں تو میں مسلمان ہو جاؤں گا۔ جب وہ تھانہ بھون آیا تو اتفاق سے میں اس زمانے میں مکان پر نہ تھا۔ اس انگریز کی

قصبہ میں ایک جنٹلمین صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ انھوں نے اس انگریز سے سوال کیا کہ تم مسلمان ہوکر کیا کروگے جہاں پہلے سے دس بدمعاش ہیں۔ وہاں تم بھی ایک اور بڑھ جاؤگے۔ اب گیارہ ہوجاویں گے۔ استغفر اللہ استغفر اللہ گویا ان کے نزدیک اسلام نام بدمعاشی کا ہے۔ افسوس کس قدر شنیع کلمہ ہے۔ پھر لوگ کہتے ہیں کہ مولوی مسلمانوں کو کافر بناتے ہیں۔ ارے ظالمو! مولویوں کی کیا خطا ہے۔ جب تم خود ہی کافر بنتے ہو۔ اب اگر کوئی مولوی ایسی بیہودہ باتوں پر تم کو کافر کہہ دے تو اس بے چارے کی کیا خطا ہے وہ کیا کرے مولویوں کا کافر بنانا بالکل ایسا ہے۔ جیسے ایک رئیس نے اپنے مہمان کو مخنث بنایا تھا یعنی مخنث وہ خود بنا تھا۔ رئیس نے اسی کے لوازم ظاہر کر دیئے۔ قصہ یہ ہے کہ ایک رئیس کے پاس ایک جاہل شخص گیا۔ وہاں کچھ اور مہذب بھی تھے، جنہوں نے کچھ دیر تک باتیں کیں۔ جاتے وقت ایک نے کہا کہ میں جناب سے اب مرخص ہوتا ہوں۔ اس اناڑی نے بھی اس لفظ کو سنا، آپ نے اس کو یاد کر لیا کہ جاتے وقت یوں کہا کرتے ہیں۔ اب آپ کے رخصت کا وقت آیا تو فرماتے ہیں کہ صاحب اب میں مخنث ہوتا ہوں۔ اس نے کہا اپنی چیز ہے آپ کو اختیار ہے، چاہے رکھئے چاہے الگ کر دیجئے۔ بتلایئے اس صورت میں اگر وہ اناڑی یہ کہنے لگے کہ واہ صاحب تم نے تو مجھے ہیجڑا ہی بنا دیا، تو اس رئیس کی کیا خطا ہے تم تو خود اپنی زبان سے مخنث بن گئے اس نے کہاں بنایا۔

اسی طرح مولوی صاحب کسی کو کافر نہیں بناتے۔ لوگ خود کافر بنتے ہیں، مولوی لوگ بتا دیتے ہیں، بلکہ وہ تو مسلمان بناتے ہیں۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ بس حکم کر دیتے ہیں انت مسلم کہ تم مسلمان ہو۔ بلکہ مسلمان بنانے سے مراد یہ ہے کہ اسلام کا امر کرتے ہیں بس بنانے کے یہ معنی ہیں۔ سو اس معنی کر وہ کسی کو کافر نہیں بناتے یعنی کسی کو کفر کا امر نہیں کرتے۔ البتہ اگر کوئی کافر ہوگیا ہو تو اس پر حکم لگا دیتے ہیں کہ

کے عزت انت کہ تم کافر ہو گئے فتب الی اللہ وجد د اسلامک
خدا سے توبہ کرو اور اسلام و نکاح کی تجدید کرو۔ غرض وہ کافر ہونے کو ظاہر کر دیتے
ہیں، اور اس کے متعلق احکام کا امر کرتے ہیں کہ اس وقت تم کو ایسا کرنا چاہیے۔
حاصل یہ کہ وہ کافر بناتے نہیں دونوں سے ہ بلکہ بتاتے ہیں (تا سے)۔
ایک نقطہ کا فرق ہے۔

رُوحانی قوت

میں تنبیہ سے پہلے اس کو بیان کر رہا تھا کہ اسلام کی حفاظت ایک اندرونی ہے ایک بیرونی۔ اور زیادہ اہم اول ہے۔ اگر ہم اس کا اہتمام کرلیں۔ تو اغیار خود پست ہو جائیں اور بدون اس کے محض دوسری قسم میں کوشش کرنا ایسا ہے جیسے اپنے پاس ہتھیار نہیں خزانہ نہیں پھر دشمن کا مقابلہ۔ میں تلوار بندوق توپ کمان کو ہتھیار نہیں کہتا۔ بلکہ ہتھیار سے مراد یہ ہے کہ ہمارے پاس اعمال نہیں ہیں۔ ہمارے اعمال اخلاق معاشرت بالکل گندے ہیں اگر ہمارے یہ ہتھیار تیز ہوں تو دوسرا کبھی حملہ نہ کر سکے۔ اس کو لڑنے کی ہمت ہی نہ ہوگی۔ خدا کی قسم کہ ہمارا اسلام کامل ہوتا۔ اعمال ٹھیک ہوتے تو کسی کو کبھی ہمت بھی نہ ہوتی کسی مسلمان کی طرف نظر اٹھانے کی، کبھی اس کا وسوسہ بھی ان کے دل میں نہ آتا۔ بس اس لئے میں کہتا ہوں کہ اس کی تم کو زیادہ ضرورت نہیں کہ کسی سے لڑو بھڑو۔ اس کی طرف التفات ہی نہ کرو۔ ہاں تم ایسے بن جاؤ کہ ان کو تمہارے مقابلہ کی ہمت ہی نہ رہے۔ اگر تم اپنے اعمال ٹھیک کرلوگے شریعت کے پورے متبع ہو جاؤ گے، معاشرت، معاملات، اخلاق کو درست کرلوگے، تو وہ کسی مسلمان کو تو کیا مرتد بناتے ادھر رُخ کرنے کی بھی ہمت نہ ہوگی۔ غرض اول اندرونی محافظت کرو اس کی زیادہ ضرورت ہے۔ صاحبو! ہم کو اس روحانی محافظت کی ضرورت ہے خارجی تدابیر کی زیادہ ضرورت نہیں۔ یاد رکھو کہ یہ روحانی طاقت بہت بڑی ہتھیار ہے۔

چنانچہ کانپور میں میرے ایک دوست تھے۔ ان کے پڑوس میں ایک عیسائی رہتا تھا۔ وہ ان کو عیسائی بننے کی ترغیب دیتا تھا، مگر ان پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ وہ ہیڈ کانسٹیبل تھے طرح طرح سے ان کو سمجھاتا۔ نصرانیت کے فوائد بتلاتا کہ اگر عیسائی ہو گئے تو تمہاری بڑی وقعت ہو گی، وقار ہو گا، مگر یہاں وہی ہنوز روز اول تھا۔ آخر اس نے ایک دن باتوں باتوں میں پوچھا کہ تم کسی بزرگ سے مرید ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں کسی سے مرید تو ہوں نہیں۔ البتہ حضرت مولانا گنگوہی سے حُسنِ عقیدت رکھتا ہوں، اُن سے مجھے محبت ہے وہ کہتے تھے کہ جس روز سے اس کو معلوم ہوا کہ میں مولانا گنگوہی کا معتقد ہوں اُس روز سے اس کو مایوسی ہو گئی۔ پھر اس نے کبھی مجھ کو عیسائیت کی ترغیب نہیں دی۔ بس وہ حالت ہو گئی الیوم یئس الذین ــــــ کفروا من دینکم الآیۃ دیکھئے حالانکہ پولیس کے مشاغل کے سبب ان کا اسلام خود کامل نہ تھا، مگر ایک کامل الاسلام سے ان کو تعلق تھا۔ صرف اس تعلق کی وجہ سے مخالف ان سے مایوس ہو گیا اور سمجھ گیا کہ ان کو عیسائی بنانا مشکل ہے۔ جب صرف ایک کامل الاسلام کے ساتھ تعلق کا یہ اثر ہے۔ پھر اگر کوئی خود کامل الاسلام بن جاوے، نماز روزہ ادا کرے، زکوٰۃ دے، حلال حرام کا خیال رکھے، ہر کام دین کے موافق کرے کوئی بات خلاف شرع اس سے صادر نہ ہو تو دوسرا شخص دیکھتے ہی سمجھ لے گا کہ یہ کامل الاسلام ہے، پورا مذہبی شخص ہے۔ اُس کے دندان آز اُس کی طرف کبھی تیز نہ ہوں گے بلکہ کند ہو جاویں گے۔ پکے مسلمان پر کبھی کسی کافر کو بہکانے کی ہمت نہ ہو گی۔ اس کو کبھی نہیں چھیڑے گا بلکہ کوسوں الگ رہے گا۔

اصل علاج

ہم کو خود اپنی حالت کی فکر نہیں۔ سراپا امراض میں مبتلا ہیں۔ لیکن اس کا علاج نہیں کرتے۔ اب اگر علاج کی فکر ہوئی تو کیا کیا دوسرے سے لڑائی بھڑائی شروع کر دی۔ غرض جو اصل علاج

تھا (یعنی اپنے اعمال کی اصلاح)۔ اس کو تو پس پشت ڈال دیا اور جو حقیقت میں علاج نہیں اس کے درپے ہو گئے۔ ہماری وہ حالت ہو گئی جس کو مولانا ایک کنیز کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

ہر چہ کردند از علاج و از دوا　　رنج افزوں گشت و حاجت ناروا

پھر آگے اس کی وجہ بتلاتے ہیں ؎

بے خبر بودند از حال دروں　　استعیذ اللہ مما یفترون

اور اسی کو طبیب الٰہی نے کہا تھا ؎

گفت ہر دارو کہ ایشاں کردہ اند　　آں عمارت نیست ویراں کردہ اند

تو جیسے وہاں جتنی دوائیں کی گئیں وہ سب ناکافی تھیں۔ اسی طرح ہم بھی صدہا علاج کرتے ہیں مگر ایک بھی کارآمد نہیں کیونکہ جو اصلی علاج ہے اس کی خبر ہی نہیں۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ اصل علاج سے غافل ہیں اور جو علاج نہیں ہے اس میں مشغول ہیں۔ اس وقت اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہماری عادت یہ ہو گئی ہے کہ ہم کو اپنے گھر کی بات تو ناپسند ہے اور غیروں کے گھر کی بات پسند ہے بس جو غیروں کو کرتے دیکھا وہی خود کرنے لگتے ہیں۔ اوّل کو کچھ کریں گے ہی نہیں اور جو کریں گے بھی تو غیروں کو دیکھ کر۔ جو وہ کریں یہ بھی وہی کریں گے سو یہ تو ان کا پورا اتباع ہو گیا۔ مثلاً تبلیغ اسلام ہی کا کام ہے اوّل تو کسی کو اس کا خیال ہی نہ تھا، ہوش ہی نہ تھا مدہوش پڑے تھے۔ اب جو دوسری قوم کی سعی دیکھی تو ہوش ہوا، اور اشاعت اسلام کی سعی کرنے لگے۔ مگر اس چال سے چلے جو دوسری قوم نے چلی تھی۔

اہل کفر کو کفر سے مناسبت

صاحبو! اس طرح سے ہر بات میں دوسری قوم کا اتباع۔ اس کے تو معنی یہ ہوئے کہ ہمارے مذہب میں ہمارے اسلام میں کام کرنے کا کوئی طریق ہی

نہیں۔ نعوذ باللہ کس قدر غلط خیال ہے؟ پھر نتیجہ یہ ہے کہ جو کچھ ہم دوسروں سے لیتے ہیں ہم کو اس میں کامیابی نہیں ہوتی اور ان کو ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تدابیر ان کے لئے ہی مناسب ہیں۔ ہمارے لئے بالکل مناسب نہیں کیونکہ وہ مذہب باطل ہے، اس کی تعلیم بھی باطل ہے، وہ اہل باطل ہیں اُن کی تدابیر بھی باطل ہیں۔ باطل کو باطل ہی سے مناسبت ہے اس لئے ان کا کام بن جاتا ہے۔ اور ہمارا مذہب حق ہے۔ ہم اہل حق ہیں ہم کو تدبیر باطل کافی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ان میں ہمیں ناکامی ہوتی ہے۔ پس اہل حق کو تدابیر بھی حق ہی کرنا چاہئیں۔ حق کو باطل سے مناسبت کیسے ہو۔ حق کو حق ہی سے مناسبت ہوتی ہے۔ اور باطل کو باطل سے۔ یاد رکھو تدابیر اہل کفر سراسر دنیا ہیں۔ مسلمانوں کو وہ تدبیریں راس نہیں آسکتیں۔ اور کفار کا دنیا سے تناسب نقل سے ثابت ہے۔ چنانچہ قرآن شریف میں ہے۔ قال ومن کفر فامتعہ قلیلا ثم اضطرہ الی عذاب النار۔

یہ ابراہیم علیہ السلام کے قصہ میں ہے، اس سے اوپر یہ ارشاد ہے واذ ابتلی ابراھیم ربہ بکلمات فاتمھن قال انی جاعلک للناس اماما کہ حق تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو چند احکام میں آزمایا، اور جب اس میں پورے اتر گئے تو خطاب فرمایا کہ میں تم کو لوگوں کا امام اور مقتدا بناؤں گا۔ قال ومن ذریتی ابراہیم علیہ السلام نے کہا اور میری اولاد میں سے بھی بعض کو امام اور پیشوا بنائیے۔ قال لا ینال عھدی الظلمین ارشاد ہوا کہ امامت ظالم کافر کو نہیں مل سکتی یعنی ذریت میں سے۔ پھر مناسبت مقام سے درمیان میں خانہ کعبہ کا ذکر فرمایا ہے واذ جعلنا البیت مثابۃ للناس وامنا۔ کہ ہم نے خانہ کعبہ کو مقام امن اور لوگوں کا مرجع فی العبادت بنا دیا۔ واتخذوا من مقام ابراھیم مصلی الآیۃ اس کے آگے ہے واذ قال ابراھیم

رب اجعل ھذا البلد امنا کہ یا اللہ اس مقام کو امن والا شہر کر دے،
وارزق اھلہ من الثمرات اور اس کے رہنے والوں کو پھل بھی دے۔
من امن منھم باللہ والیوم الاخر جو اللہ پر اور قیامت پر ایمان
لاوے۔ آپ نے ثمرات دنیوی کو دینی امامت پر قیاس کیا وہاں حکم ہوا تھا لاینال
عھدی الظلمین کہ کافر ظالم کو امامت اور نبوت نہیں مل سکتی۔ آپ نے
اس پر قیاس کیا کہ شاید نعمت دنیوی بھی کافر کو نہ ملے اس لئے دعا میں من امن
منھم باللہ والیوم الاخر کی قید لگادی تاکہ بے ادبی کا احتمال نہ ہو۔
اللہ تعالےٰ نے جواب دیا ومن کفر فامتعہ قلیلا ثم اضطرہ
الی عذاب النار وبئس المصیر۔ عام مفسرین نے تو اس کی اور تفسیر
کی ہے۔ مگر حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی نے تفسیر مظہری میں ایک
عجیب تفسیر کی ہے۔ عام مفسرین نے تو یہ تفسیر کی ہے کہ یہ معمول ہے ارزق
مقدر کا یعنی وارزق من کفر کہ میں کافر کو بھی رزق دوں گا۔ آگے اس کی
تفصیل ہے فامتعہ قلیلا ثم اضطرہ الی عذاب النار
اس تفسیر کے موافق گویا من کفر پر جملہ ختم ہوگیا۔ فامتعہ قلیلا الخ الگ جملہ ہے۔
اور قاضی ثناء اللہ صاحب نے کہا ہے کہ من مبتدا ہے اور فامتعہ خبر ہے
یا یوں کہو کہ من شرطیہ ہے اور امتعہ اس کی جزا ہے۔ خواہ من کو مبتدا مانو
یا شرطیہ اور امتعہ کو خبر بناؤ یا جزا دونوں جائز ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ جملہ
مستقلہ ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جو کفر کرے گا اس کو دنیا سے متمتع کروں گا۔ اور
قلیلا قید واقعی ہے۔ کما قال تعالےٰ قل متاع الدنیا قلیل۔ اب اس پر
ایک سوال ہوتا ہے کہ اس تقریر کا تو حاصل یہ ہوا کہ جو کفر کرے گا اسی کو متاع
حاصل ہوگی تو کیا کفر سبب تمتیع کا ہے۔؟ قاضی صاحب نے اس کا جواب دیا ہے

کہ دنیا کو مومن سے کم مناسبت ہے اور کافر سے زیادہ مناسبت ہے۔ یہ ایسی بات ہے جیسے ارشاد ہے الخبیثٰت للخبیثین والخبیثون للخبیثٰت کہ خبیث کو خبیث ہی ملا کرتا ہے۔ دنیا خسیس ہے اور کفار بھی خسیس ہیں۔ لہٰذا ان میں باہم تناسب ہے۔ اور مومن شریف ہے اور دنیا خسیس ہے لہٰذا ان میں باہم تناسب نہیں ہے۔ میں نے اسی تفسیر پر دعویٰ کیا تھا کہ کفار کا دنیا سے تناسب نقل سے ثابت ہے۔ اس لئے تدابیر باطلہ کفار کے لئے مفید ہیں۔ بخلاف اہلِ اسلام کے ان کے لئے تو وہی تدابیر نافع ہوں گی جو اسلام کے مناسب ہیں، وہ تدابیر کیا ہیں وہ وہ ہیں جو اللہ میاں نے بیان فرمائی ہیں۔ جن کو میں نے اب بیان کیا ہے کہ اپنی اصلاح کرو، اخلاق کو درست کرو، عقائد و اعمال کو سنوارو۔ اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ دوسروں کو تمہارے بہکانے کی طمع نہ ہوگی، دست درازی کی ہمت نہ ہوگی۔ یہ تو اپنا ذاتی فائدہ ہے اپنے نفس کی حفاظت ہے آگے دوسرا درجہ اشاعتِ اسلام کا ہے اس سے بھی اس میں کامیابی ہوگی۔ کیونکہ اس کا حُسن ایسا ہے کہ دوسروں کے دل بھی کھینچتا ہے۔ اگر تمہارے اندر اسلام کے پورے اوصاف پائے جائیں گے۔ اس کے انوار و برکات تم میں جمع ہو جائیں تو دوسری قومیں خود ہی اس کے اندر آ جائیں گی۔ زیادہ بولنے کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔

اسلام اور تلوار

یہ جو مشہور ہے کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلا ہے، جس سے مراد مخالفین کی یہ ہے کہ خود اس میں کشش نہیں، بالکل غلط ہے۔ اس دعوے کو خود قرآن رد کرتا ہے۔ فرماتے ہیں لا اکراہ فی الدین دین میں کوئی جبر نہیں۔ قرآن تو جبر کی مخالفت کرتا ہے۔ تو کیا بھلا مسلمان قرآن کے خلاف کریں گے اور جبراً مسلمان بنائیں گے ہرگز نہیں۔ خصوصاً صحابہ جو اپنے جان و مال کو اس پر فدا کر چکے حیرت کی بات ہے کہ وہ اس کے خلاف کریں۔ پس

سمجھ لو کہ اسلام ہرگز بزورِ شمشیر نہیں پھیلا بلکہ اس کے کمالِ ذاتی کو دیکھ کر لوگ خود بخود کھنچے چلے آئے ہیں۔ اس کی تحقیق بہت آسان ہے وہ یہ کہ اسلام کے قوانین کو دیکھ لو اس سے اندازہ ہو جاوے گا کہ بزورِ شمشیر پھیلا ہے یا نہیں۔ اسلام میں اشاعتِ اسلام کا قانون یہ ہے کہ جب کسی قوم پر حملہ کرو۔ اوّل ان پر اسلام پیش کرو کہ ایمان لے آؤ اگر وہ ایمان لے آویں تو وہ تمہارے بھائی ہیں تم ان کے بھائی ہو کوئی فرق نہیں سب برابر ہو۔ اور اگر یہ نہیں کرتے اور اسلام نہیں لاتے تو ان سے کہا جائے گا جزیہ دو تاکہ ہم کو اطمینان ہو جاوے کہ تم ہماری اطاعت کرو گے، سرتابی نہ کرو گے۔ اصل مقصود تو اطاعت ہے۔ جزیہ اس کی علامت ہے۔ یعنی جزیہ سے معلوم ہو جائے گا کہ تم ہمارے زیرِ اثر رہو گے، سرکشی اور بدامنی نہ پھیلاؤ گے۔ اگر وہ یہ مان لیں تو اس صورت میں بھی تمہاری اولاد کی طرح ہیں۔ جیسے تم اپنی اولاد کی حفاظت کرتے ہو ایسے ہی ان کی جان و مال کی حفاظت بھی تم پر لازم ہوگی۔ اور اس حالت میں دیکھو ان کے لئے کس قدر آزادی ہے کہ اپنے دینی احکام کو ان پر جاری نہ کرو، بلکہ ان کو ان کے مذہب پر چلنے دو۔ کچھ تعرض مت کرو۔ مثلاً شراب پینا اسلام میں حرام ہے مگر ان کے یہاں جائز ہے تو حکم ہے کہ ان کو شراب پینے سے مت روکو، اس کی بیع و فروخت کرنے دو۔ یا مثلاً نکاح ہے کہ ہمارے یہاں کچھ شرائط ہیں تو ان کو اس پر مجبور نہ کرو کہ ہمارے جیسا نکاح کریں۔ بلکہ جیسا ان کے یہاں رواج ہے ویسا ہی کر دو۔ غرض اگر اسلام نہ لاویں تو اس ہیئت کے ساتھ جزیہ کا حکم ہے اور اگر جزیہ بھی نہ دیں تو اس وقت ان کو کمزور کرنے کے لئے نہ کہ مسلمان بنانے کے لئے شمشیر کا کا حکم ہے کیونکہ اب معلوم ہو گیا کہ بڑی سرکش قوم ہے، کسی بات کو مانتے ہی نہیں لہٰذا تلوار سے ان کی گردنیں پست کر دو۔ اگر اسلام تلوار سے پھیلا ہوتا تو اوّل ہی حکم تلوار کا ہوتا تیسرے درجہ میں نہ ہوتا۔ مگر یہاں تو پہلے اسلام پیش کرتا ہے۔ دوسرے

درجہ میں جزیہ کا حکم سنا دینا۔ تیسرے درجہ میں تلوار کا حکم ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام اکراہِ شمشیر سے نہیں پھیلا اور ایک باریک بات قابلِ غور ہے وہ یہ کہ اگر اسلام تلوار سے پھیلا ہوتا تو گویا لوگوں کو زبردستی سے مسلمان بنایا گیا ہے۔ اور جبر کا اثر بدن پر ہوتا ہے قلب پر نہیں ہوتا۔ اگر لوگ کراہتہً مسلمان ہوئے ہوتے تو ان کی یہ حالت ہونی چاہیئے تھی کہ زبان سے تو اپنے آپ کو مسلمان بتلاتے اور دل سے اسلام سے اُن کو نفرت ہوتی لوگوں کے سامنے نماز روزہ کر لیتے، پیچھے نہ کرتے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کا اثر قلوب پر ہے اور جو نیا مسلمان ہوتا ہے وہ اکثر پرانے مسلمان سے بھی اچھا ہوتا ہے۔ وہ پرانے مسلمانوں سے زیادہ احکام کا پابند اور زیادہ خائف اور زیادہ خاضع بالخصوص جو اس وقت مسلمان ہوتے ہیں ان کی حالت پرانے مسلمانوں سے بہت ہی اچھی نظر آتی ہے۔ بشرطیکہ کچھ علم احکام اسلام کا حاصل کر لیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ اسلام تنزل پر ہے۔ اس کی غلطی میں نے ظاہر کر دی ہے۔ کہ درحقیقت خود ہماری حالت تنزل پر ہے نہ کہ اسلام۔ وہ تو کامل مکمل ہے۔ اُس کو تنزل کبھی نہیں ہو سکتا۔

محبتِ اسلام

مگر جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسلام تنزل پر ہے وہ دیکھ لیں کہ ہم اس حالت میں بھی دیکھتے ہیں کہ ہر سال ہزاروں آدمی مسلمان ہوتے ہیں اور یہ نہیں کہ صرف غرباء ہی اسلام لاتے ہوں (جس سے یہ شبہ ہو کہ یہاں اسے کھانے کمانے کو نہیں ملتا تھا اس لئے مسلمان ہو گیا) بلکہ بہت سے ان میں متمول بھی ہوتے ہیں صاحب جائیداد ہوتے ہیں صاحب حشم خدم بھی ہوتے ہیں۔ بلکہ بہت سے مالدار مسلمان ہو کر مال سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔ پہلے بہت ناز و نعم میں رہتے اور اسلام لانے کے بعد قسم قسم کی تکالیف اٹھاتے ہیں۔ نہ کھانے کو ہے نہ پہننے کو نہ رہنے کو کوئی جگہ ہے در در بھٹکتے پھرتے

ہیں اور پھر ان تکالیف کو زبان پر بھی نہیں لاتے۔ بتلائیے یہاں جبر کس نے کیا۔ کیا جبر کی یہ صورتیں ہوتی ہیں ؟۔ جبر کی تو یہ حالت ہوتی ہے کہ پہلی محبت بھی جاتی رہتی ہے بلکہ بجائے محبت کے عداوت ہو جاتی ہے۔ غرض اس زمانہ میں کسی کا اسلام لانا محاسن اسلامیہ کے کمال کی قوی دلیل ہے۔ کیوں کہ اب کسی پر کون جبر کرتا ہے ؟ کون جہاد کرتا ہے ؟۔ مگر یہ بات بڑے افسوس کی ہے کہ آج کل جو کوئی بے چارہ مسلمان ہوتا ہے ہم لوگ اُس کی خبر گیری نہیں کرتے۔ اس کی کوئی خدمت نہیں کرتے حالانکہ دُنیا میں جتنی متمدن قومیں ہیں وہ سب اپنا مذہب قبول کرنے والے کی خدمت کرتے ہیں، ہر طرح سے اُس کو راحت پہنچاتے ہیں جان سے بھی مال سے بھی۔ اور ایک ہم ہیں کہ ہم اس کے لئے دو روپیہ بھی خرچ نہیں کرتے، بعض میں تو وسعت ہی نہیں لیکن اگر کسی میں وسعت بھی ہے وہ بھی نہیں دیتا۔ اور ہمارے نہ دینے کی دو وجہیں ہیں ایک اچھی ایک بُری۔ بُری وجہ تو یہ ہے کہ ہم میں ہمدردی نہیں ہے۔ اگر ہمدردی ہوتی تو ضرور ایسے شخص کی اعانت کرتے یہ تو بُری وجہ ہے۔ اور اچھی وجہ یہ ہے کہ اگر کوئی اسلام لایا تو اس نے ہم پر کیا احسان کیا، ہمارا کون سا کام کر دیا، جو ہم اس کی خدمت کریں اگر مسلمان ہوئے ہیں تو اپنی خیر منانے کے لئے نہ کہ ہمارے لئے۔ دیکھو جو لوگ کوئی سرکاری امتحان دیتے ہیں ان کو سرکار سے کچھ انعام نہیں ملتا، بلکہ وہ خود ہی ہزاروں مشقتیں اٹھاتے ہیں، کہیں نجی طور پر ماسٹر رکھتے ہیں۔ اس کو الگ روپیہ دینا پڑتا ہے ان کے نخرے برداشت کرنا پڑتے ہیں، راتوں مطالعہ کے لئے جاگنا پڑتا ہے۔ پھر فیس داخل کرتے ہیں تب جا کر امتحان کی منظوری ہوتی ہے۔ پاس ہونا تو الگ رہا۔ اسی طرح اسلام جب نجات آخرت کا طریقہ ہے اس کو ہم نے مفت بتلا دیا تو یہ بھی ہمارا بڑا احسان ہے، اُن کا کیا احسان ہے۔ پس وہ ہمارا احسان مانیں۔ ہمیں نذرانہ دیں۔

یہ کیسی الٹی بات ہے کہ ایک تو ہم احسان کریں پھر اُن کی خدمت بھی ہم پر واجب کی جاوے۔ مگر خیر یہ تو نکتے ہیں جو کسی کے ذہن میں بھی نہیں آتے۔ اصل سبب وہی بے تعلقی بے دردی ہے۔ تمہارے ان نکتوں میں وہ بے چارہ تو برباد ہو گیا۔ اس نے تو گھر بار چھوڑا، بال بچوں نے بھی اس کو اس حال سے نکال دیا کہ کوئی چیز اس کے پاس نہیں کھانے پینے کو کچھ نہیں۔ اتنے پیسے نہیں کہ دوسری جگہ جا کر کسی کے ہاتھ پر مسلمان ہی ہو جاتے۔ ریل کا کرایہ نہیں مگر دل میں ایک تیر لگا ہوا ہے وہ کہاں بیٹھنے دے بیچارہ پیدل ہی چل پڑا، کہیں فاقے گزرے، کہیں پیر میں چھالے پڑ گئے، غرض سیوں مصیبتیں اٹھا کر مسلمان ہونے کو کسی شہر میں آیا۔ اب مسلمانوں کے نخرے دیکھئے کہ وہ خدمت اور خاطر مدارات تو کیا کرتے۔ اب تو بعض لوگ الٹا روکتے ہیں کہ جاؤ میاں ہم مسلمان نہیں کریں گے، یہ وقت **اسلام** لانے کا نہیں ہے۔ اگر ہم تم کو مسلمان کریں گے تو ہندو مسلم اتحاد میں خلل پڑے گا۔ ہمارا اتفاق بگڑ جاوے گا۔ بھائی اتحاد کیوں بگڑتا۔ آخر ہمیشہ سے دونوں قومیں بستی آئی ہیں اور ہر ایک اپنے اپنے مذہب کی خدمت کرتا رہا ہے کبھی لڑائی جھگڑا نہ ہوا۔ بلکہ پرانے لوگوں میں اتحاد زیادہ تھا۔ ہر شخص اپنے پڑوسی کی زیادہ ہمدردی کرتا تھا۔ اس کو راحت پہنچاتا تھا۔ مگر اب دونوں قوموں کی نئی امت میں چھری کٹار چلنے لگے وہ اس کے مارنے کی فکر میں ہے۔ یہ اس کا گلا کاٹنے کو آمادہ ہے۔ پرانے لوگوں میں دعویٰ نہ تھا مگر کام کرتے تھے۔ زبان سے اتحاد و اتفاق نہیں رٹتے تھے۔ مگر دل میں محبت مرانست تھی۔ اور اب زبان سے تو بڑے لمبے چوڑے دعوے کئے جاتے ہیں اور دل میں کچھ نہیں۔ انجمنیں قائم ہوں گی اور قوانین بہت سے ایجاد کریں گے مگر عمل ایک پر نہیں۔ چنانچہ انہیں قوانین و ضوابط میں سے ایک ضابطہ یہ بھی ہے کہ اب کسی ہندو کو مسلمان نہ کرو، اس سے اتحاد بگڑے گا، ہندو بھائی ناراض ہو جائیں گے۔

افسوس ہے کہ ہندوؤں کی ناراضی کا تو خیال ہو۔ مگر اللہ میاں کی ناراضی کی پرواہ نہ ہوئی۔ انہوں نے تو انکار کر دیا مگر اس کو کہاں صبر ہو، اس کے دل میں تو ایک ایسا نشہ لگا ہے کہ اس کو دن رات چین نہیں ہے۔ مارا مارا پھرتا ہے۔ ایک جگہ مطلب حاصل نہ ہوا دوسری جگہ گیا۔ آخر کوئی اللہ کا بندہ ایسا بھی مل گیا جس نے ان مصالح کی پرواہ بھی نہ کی بلکہ ان مصالح کو سل بٹہ سے خوب پیس دیا، اور اس کو مسلمان کیا۔ اب جو مسلمان ہوا تو بے چارے کے پاس کھانے کو نہیں پہننے کو نہیں۔ انہوں نے کہا ہم ایک رقعہ لکھ دیں گے۔ تم مسلمانوں کے پاس لے جانا، وہ تمہاری مدد کریں گے۔ اب وہ بیچارہ کاغذ لے کر در در مارا پھرتا ہے مگر کوئی نہیں پوچھتا۔ فاقے گزرتے ہیں طرح طرح کی تکلیفیں گزرتی ہیں۔ کیوں صاحب اگر اس کے دل میں محبت اسلام نہ ہوتی تو وہ اتنی تکالیف کیوں اٹھاتا کیا کسی کو مصائب اٹھانے میں بھی مزا آتا ہے، ہرگز نہیں۔ معلوم ہوا اس کے دل میں اسلام کی محبت ہے۔ اسلام کے محاسن اس کے دل میں جم گئے ہیں۔ اس لئے سب کلفتیں گوارا ہیں۔ اور وہ ایسا پختہ ہے کہ پرانے مسلمان بھی اس کی حالت دیکھ کر شرماتے ہیں

میں جب کانپور میں تھا ایک روز ایک نوجوان نہایت خوبصورت جس کے چہرے سے آثار خشوع نمایاں تھے۔ میرے پاس آ کر بیٹھا۔ میں نے پوچھا آپ کس لئے آئے ہیں۔ کہنے لگا مسلمان ہونے کو آیا ہوں مجھے مسلمان کر لیجئے۔ میں نے کہا بسم اللہ آئیے، چنانچہ وہ مسلمان ہو گیا۔ مسلمان ہوتے ہی اس کی یہ حالت ہو گئی کہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ خدا کا عاشق ہے۔ وہ انوار و برکات اس کو نصیب ہوئے کہ ہر وقت روتا تھا۔ سوائے رونے کے کوئی کام نہ تھا۔ مگر افلاس کا رونا نہیں، فقر و فاقہ کی وجہ سے نہیں روتا تھا۔ بلکہ اخلاص کا رونا تھا۔ خدا تعالیٰ کے جوشِ محبت میں روتا تھا۔ اس کو پڑھنے کے واسطے ایک سپارہ اور ایک رسالہ راہ نجات

میں نے دیدیا۔ بس اب یہ حال تھا کہ سیپارہ پڑھ رہا ہے اور رو رہا ہے۔ راہ نجات سامنے ہے۔ اور آنسو جاری ہیں اور جو کھانا کپڑا کہیں سے مل جاتا تو وہ اور وں کو دے دیتا اپنے واسطے کوئی ذخیرہ نہیں رکھتا تھا۔ اور اس سے بڑھ کر تعجب یہ کہ ایک دفعہ اس نے آٹھ دن کے روزے پے درپے بدون افطار کے رکھے۔ تین چار روز کے بعد میں نے اس کو بہت لاغر دیکھا۔ کیونکہ وہ بہت ضعیف تھا کبھی اس نے مشقت اٹھائی نہ تھی۔ ہمیشہ ناز و نعم میں رہا تھا اس لئے لاغر ہو گیا۔ میں نے پوچھا کہ تم اتنے لاغر کیوں ہوتے جاتے ہو۔ کہنے لگا کہ میں نے آٹھ دن کا ایک روزہ رکھ لیا ہے۔ میں نے کہا ایسا روزہ ہماری شریعت میں جائز نہیں ہے۔ اگر روزہ رکھنے کو جی چاہے تو ایسا کرو کہ ایک دن کا روزہ رکھو۔ اور اگلے دن مت رکھو۔ پھر اس سے اگلے روز رکھ لیا۔ غرض ایک روز کھانا اور ایک روز روزہ رکھنا یہ سب سے بہتر ہے۔ اس کو صوم داؤدی کہتے ہیں۔ پھر اس کو مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحبؒ گنج مراد آبادی کی زیارت کا شوق ہوا۔ وہاں پیدل گیا۔ سواری نہ کی۔ حالانکہ بہت نازک تھے کبھی چلنے کی اسے عادت ہی نہ تھی مگر مولانا کی ملاقات کو پیدل گیا۔ یہ خیال ہوا کہ سوار ہو کر جانا کہیں ادب کے خلاف نہ ہو۔ بیچارہ کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے مگر اس کو برداشت کیا اور سوار نہ ہوا۔ پھر اس کو شوق حج کا ہوا اور بھوپال چلا گیا۔ یہاں تک تو مجھے اس کا حال معلوم ہے آگے کی خبر نہیں کہ مکہ پہنچا یا نہیں۔ فرمائیے اگر اسلام بزورِ شمشیر پھیلا ہے۔ تو یہاں اس کو کون سی تلوار نے مجبور کیا تھا؟ کس نے اس کو اتنے مصائب کا مکلف کیا تھا؟ اپنے عیش و عشرت کو چھوڑ کر اس نے کیوں اتنی تکالیف کو اختیار کیا ہے۔

نورِ اسلام

اگر کشش اسلام نہیں تو کیا ہے۔ آخر کس چیز کو دیکھ کر اُس نے سارے تنعمات پر خاک ڈالی۔ کس چیز نے اُس کو

بے چین کیا۔ اگر حسن اسلام اس کا سبب نہیں تو اور کیا ہے؟ مگر وہ حسن افعال شنیعہ سے مستور ہو گیا۔ ورنہ اگر ہماری حالت اچھی ہوتی ہم پورے مسلمان ہوتے تو لوگ ہماری طرف خود ہی آتے۔ ہمیں دعوتِ اسلام کی بھی ضرورت نہ ہوتی اور نہ لڑائی جھگڑے کی نوبت آتی۔ میں بعض دفعہ سفر کرتا ہوں اور اپنے دوست احباب بھی ساتھ ہوتے ہیں۔ تو ان سے باتیں کرتا ہوں، جس میں ہر طرح کی باتیں ہوتی ہیں کھانے پینے کی بھی، قصے کہانیاں بھی ہوتے ہیں اور مسائل تصرف کی بھی کبھی تحقیق ہوتی ہے۔ غرض ہر قسم کی باتیں دنیا کی بھی دین کی بھی، صرف علوم و معارف ہی کا تذکرہ نہیں ہوتا۔ مگر کفار پر اس کا اثر دیکھتا ہوں کہ جتنے آدمی آس پاس ہوتے ہیں سب ادھر متوجہ ہو جاتے ہیں، اچھی طرح کان لگا کر سنتے ہیں اور جب اتر جاتا ہوں تو وہی لوگ کہتے ہیں (جن کے ساتھ نہ جان پہچان تھی نہ کبھی ملاقات ہوئی) کہ میاں ان کو کہاں لے چلے ان کی وجہ سے تو یہاں نور برس رہا تھا۔ سارے کمرہ میں اجالا ہو گیا تھا۔ آخر یہاں کون چیز ان کے قلوب کو کھینچتی تھی۔ میں انہیں کچھ پڑھتا نہیں نہ میں نے ان کی طرف کچھ توجہ کی۔ اگر یہ نورِ اسلام نہیں تو اور کیا ہے؟ اسلام کی یہ خوبی ہے کہ وہ از خود کشش کرتا ہے۔ اسلام ایسا دلکش ہے کہ غیر کو بھی اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ اگر ہم اپنی حالت درست کر لیں تو اسلام کی خوبیاں اس طرح ظاہر ہوں کہ جس کا بیان نہیں ہو سکتا پس اپنی اصلاح سے علاوہ اپنی اندرونی حفاظت کے دوسروں کے جذب کا بھی نفع ہو گا۔ صاحبو! اگر اندرونی محافظت ہو گئی تو پھر بیرونی حملوں کی فکر نہ رہے گی۔ اس لئے مبلغ کو چاہئے کہ دو باتیں اپنے اندر پیدا کر لے بس کافی ہے۔ ایک یہ کہ طمع نہ کرے حرص اور طمع بہت بری چیز ہے، دوسری یہ کہ اپنی حالت اچھی کر لے، اپنے کو شرع کے مطابق بنالے۔ ہر کام کو خدا کے خوف سے کرے اور یہ دیکھے کہ یہ شریعت کے موافق ہے

یا نہیں۔ اس سے خداوند کریم ناراض تو نہ ہوں گے۔ دوسروں کو جذب کرنے پر ایک قصہ یاد آگیا۔ ایک مرتبہ میں سہارنپور جا رہا تھا۔ اس گاڑی میں کچھ ہندو آریہ انگریزی خوان بھی تھے، میں اپنے احباب سے معمولی باتیں کر رہا تھا۔ میرے رفقاء نے بیان کیا کہ یہ ہندو آپس میں کہہ رہے تھے۔ معلوم نہیں کہ دیکھو ان کی باتوں کی طرف دل کھینچا ہے تو دوسرا کہتا ہے کہ میاں سچے ہونے کی یہی نشانی ہے، یہ لوگ سچے ہیں، اس لئے ادھر دل کھنچتا چلا جاتا ہے۔ اب فرمائیے کہ نہ میں نے ان سے باتیں کیں نہ میں ان کے ساتھ کوئی خاص اخلاق سے پیش آیا تھا تاکہ یہ خیال ہوتا کہ اخلاق سے مسخر ہو گئے ہوں گے۔ پھر اُن کو کس چیز نے مسخر کیا اگر اس کا سبب حسنِ اسلام نہیں تو اور کیا ہے۔ صاحبو! یہ وہی اسلام کی کشش ہے وہی اسلام کا نور ہے۔ اسلام کی تو وہ شان ہے ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ مینگرم ٭ کرشمہ دامن میکشد کہ جا اینجا است

اسلام اوّل سے آخر تک نور ہی نور ہے۔ اُس کی جس ادا کو دیکھو دلکش ہے جس حکم کو دیکھو دلربا ہے۔

اِسلام کی ادنیٰ جھلک

اسی قصہ کا بقیہ یہ ہے کہ میں اس مرتبہ سہارنپور جا رہا تھا، اُس وقت مجھے لکھنؤ جانا تھا۔ جب میں تھانہ بھون کے اسٹیشن پر ریل میں سوار ہوا تو ایک مولوی صاحب نو وارد اسی گاڑی سے اُترے، وہ اس وقت دہلی سے مجھ سے ملنے کے لئے آئے تھے مجھ کو اطلاع کی میں نے کہا اب تو میں سفر میں جا رہا ہوں۔ اگر تمہارا جی چاہے تو سہارنپور تک چلو، وہاں تک باتیں ہوتی رہیں گی۔ ٹکٹ لے لو۔ وقت کم رہ گیا تھا ٹکٹ نہیں مل سکا۔ انہوں نے گارڈ سے کہہ دیا اور سوار ہو گئے، جب نانوتہ کا اسٹیشن آیا، یہ تھانہ بھون سے آگے ہے، میں نے اُن سے کہا کہ اب گارڈ کے پاس جاؤ، اور

اُسے پیسے دے کر رسید لے لو اور آگے کا ٹکٹ لے لو جب وہ گارڈ کے پاس گئے تو اس نے یہ کہہ کر تھانہ بھون تک کا ہم نے معاف کر دیا اور نانوتہ سے سہارنپور تک کا ٹکٹ دلوا دیا جب میرے پاس آئے اور یہ قصہ بیان کیا میں نے کہا یہ تو نا جائز ہے۔ گارڈ گاڑی کا مالک نہیں وہ خود مولوی تھے، مگر اس وقت ان کو خیال نہ ہوا۔ اور افسوس تو یہ ہے کہ آج کل بعضے بعضے اہل علم عمداً بلا کرایہ ریل میں سفر کرنے کو جائز سمجھتے ہیں مجھے تو اس کو نقل کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے کہ ایسے کھلم کھلا ناجائز فتوے دینے لگے۔ غرض میں نے کہا گارڈ کے معاف کرنے سے معاف نہیں ہوا کیونکہ گارڈ مالک نہیں ہے بلکہ ریلوے کمپنی کا نوکر ہے اس کو معاف کرنے کا حق نہیں ہے، تمہارے ذمہ اتنے پیسے قرض ہیں جو شرعاً واجب الادا ہیں۔ مگر اب یہ تو امید نہیں کہ گارڈ سے رسید مل سکے۔ تم یہ کرو کہ بعد میں ایک ٹکٹ اتنے داموں کا خرید لو اور اس کو تلف کر دو۔ اس طرح محکمہ میں کرایہ پہنچ جائے گا۔ اس وقت ایک انگریزی خواں ہندو آریہ اس گاڑی میں تھا جو بڑا لیکچرار تھا وہ اول سے آخر تک اس واقعہ کو دیکھ رہا تھا میری تقریر سن کر بے ساختہ جوش میں آ کر کہنے لگا کہ جناب میں اپنی اخلاقی کمزوری بیان کرتا ہوں کہ جب ان سے گارڈ نے کہا کہ نانوتہ تک کا کرایہ ہم نے معاف کیا، اس وقت میں بہت خوش ہوا کہ ایک غریب آدمی کا کام بن گیا۔ مگر اب معلوم ہوا کہ میں بے ایمانی پر خوش ہوا تھا، دغا بازی پر مجھے مسرت ہوئی تھی۔ واقعی بات وہی ہے جو آپ نے فرمائی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ تو ایک چھوٹی سی بات تھی، یہ تو اسلام کی ادنیٰ جھلک ہے۔ اگر اہل انصاف ہمارے پاس چند روز رہیں تو ان کو اسلام کی بڑی بڑی خوبیاں معلوم ہوں گی۔

دیکھئے ایک چھوٹی سی بات ہے کہ میرے پاس بہت سے خطوط لیسے آتے ہیں کہ ان کی ٹکٹوں پر مہر نہیں ہوتی۔ بالکل سالم ہوتے ہیں، کوئی دھبہ ان پر نہیں ہوتا

ان سے دوبارہ کام لینا بہت آسان تھا۔ کسی کو پتہ بھی نہ لگتا۔ مگر چونکہ شریعت میں یہ جائز نہیں اس لئے میں اکثر خط پڑھنے سے پہلے ان ٹکٹوں کو چاک کر دیتا ہوں پھر خط پڑھتا ہوں کیونکہ یہ درحقیقت رسید ہے ان پیسوں کی جن کو دے کر ہم نے محکمہ ڈاک سے اپنا کام لینا چاہا ہے۔ حقیقت میں یہ اُجرت ہے یعنی پیشگی ادا کردہ محصول کی رسید ہے، جیسے ریل کا ٹکٹ۔ تو اب دوبارہ اس سے نفع اٹھانا جائز نہیں، کیونکہ جتنے کام کی یہ رسید تھی اتنا کام تو آپ نے ڈاک سے لے لیا ہے اب اگر دوسرا کام لینا ہو تو دوسرا ٹکٹ خریدنا پڑے گا اس سے نفع لینا حرام ہوگا۔ تو ایسا بہت ہوتا ہے کہ بعض خطوط کے ٹکٹ مہر سے بالکل سالم ہوتے ہیں اور خطوط میرے پاس اکثر ایسے وقت آتے ہیں کہ سوائے خدا کے کسی کو علم نہیں ہوتا اور اگر کوئی میرے پاس دوستوں میں سے ہو بھی تب بھی کیا میری ڈاک کو کوئی جھانکتا ہے کہ دیکھوں کون سا ٹکٹ سالم ہے اور کونسا نہیں۔

پس میں اگر ان ٹکٹوں سے کام لینا چاہتا تو اچھی طرح لے سکتا تھا، مگر میں الحمد للہ ان کو اول ہی پھاڑ دیتا ہوں۔ تو یہاں ہم کو کس چیز نے مجبور کیا۔ صرف اسلام نے مجبور کیا۔ ورنہ ہم کو کوئی قوت روکنے والی نہ تھی۔ اس وقت نہ کوئی پولیس تھی نہ کوئی پہرہ تھا۔ غرض اسلام کا ہر پہلو نہایت مکمل ہے جس نے اسلام کو مکمل کیا اور اس کو کامل طور پر سمجھا ہے۔ ممکن نہیں کہ اس کے احکام میں گڑبڑ کرے ممکن نہیں کہ ایسا شخص ریل میں پندرہ سیر کی جگہ سولہ سیر لے جائے اور بلا کرایہ سفر کرنا تو الگ رہا۔ اور جب تک کسی کے دل میں اسلام نے گھر نہ کیا ہو اسلام سے پوری محبت نہ ہوئی ہو اس وقت تک یہ حال ہوتا ہے کہ پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر تو بڑے لمبے چوڑے لکچر دیتے ہیں اور عمل ایک پر نہیں۔ تقریر خوب رونق دار ہے اور عمل میں اندھیرا۔

مسلمان اور حقوق انسانی

حضرت اسلام ایسی چیز ہے کہ مسلمان انسانی حقوق تو کیا ضائع کرتا وہ تو حیوانات

پر بھی رحم کرتا ہے۔ ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ انہوں نے سفر میں ایک دکاندار سے شکر خریدی اور کپڑے میں باندھ لی۔ گھر جا کر کھولا تو اس میں ایک چیونٹی نظر آئی یہ دیکھ کر آپ کو بے حد قلق ہوا کہ نہ معلوم بیچاری اپنے کس کس عزیز سے الگ ہوتی ہوگی، اس کا دل ان کی جدائی سے تڑپتا ہوگا۔ آخر اسی طرح کپڑا باندھ کر پھر سفر کر کے جہاں سے شکر لائے تھے وہیں لا کر اسی دکان پہ کپڑا کھولا اور چیونٹی کو اس کے مستقر پہ پہنچایا۔ تو دیکھئے اتنی ہمدردی۔ یہ اثر ہے تعلیم اسلام کا کہ انسان تو انسان حیوان پر بھی اسلام ہمدردی کرتا ہے۔ اتنا ترحم ہے اسلام میں کہ حیوانات کے بھی حقوق مقرر کئے ہیں۔ ان پر بھی ظلم وستم کو جائز نہیں رکھا۔ اس کے متعلق بھی بہت سے احکام ہیں۔ چنانچہ اس میں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ میں نے بھی ایک رسالہ لکھا ہے اس کا نام ہے ارشاد الہائم فی حقوق البہائم۔ اس میں بتلایا ہے کہ حیوانات کے حقوق کیا ہیں اور کیا برتاؤ ان سے کرنا چاہئے، اور ہر حکم حدیث سے ثابت کیا ہے اپنی طرف سے نہیں لکھا۔ تو جس اسلام نے جانور پر بھی رحم کیا ہے کیا وہ انسان پر رحم نہ کریگا ضرور کریگا۔ اب اگر کسی حکم میں کسی کو جبر و تشدد کا شبہ ہو تو چونکہ وہ ایسے اسلام کے حکم سے ہوا ہے جس میں اتنا رحم ہے تو وہ واقع میں جبر و تشدد نہیں ہے ضرور اس میں کوئی عظیم مصلحت ہوگی۔ مگر حقیقت میں جس کی وجہ سے وہ جبر عین رحمت و مصلحت ہے اس وقت وہ مصلحت اسی کو مقتضی ہے اس کو ہر شخص اپنے معاملات میں غور کر کے سمجھ سکتا ہے کہ بعض دفعہ ہم ضرورت کی وجہ سے اولاد تک کے ساتھ سختی کرتے ہیں اور مجبوراً کرنا پڑتی ہے بدون اس کے کام نہیں چلتا۔ یعنی دوسرے کی اصلاح بدون اس کے نہیں ہوتی۔

چنانچہ میں جب کسی پر ظاہراً تشدد کرتا ہوں مجبور ہو کر کرنا پڑتا ہے، مگر ساتھ ہی دل پگھلا جاتا ہے، جگر ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا ہے۔ مگر کیا کروں ضرورت شرعی ہوتی ہے۔ اس لئے تشدد کرنا پڑتا ہے اور اس کا حکم شرعی ہونا دلائل سے ثابت

ہوتا ہے نصوص اس کے لئے موجود ہیں۔ تو واقع میں یہ سختی رحم کے خلاف نہیں ہے کیونکہ ہر چیز کا موقع ہے، رحم کی جگہ رحم کرنا پڑتا ہے اور سختی کی جگہ سختی۔ بلکہ سختی کی جگہ رحم کرنا خود بے رحمی ہے، جیسے کسی کے دنبل ہو جس میں نشتر کی ضرورت ہے۔ مگر ڈاکٹر رحم کی وجہ سے نشتر نہیں دیتا بلکہ مرہم پٹی کئے جاتا ہے۔ تو کیا اس کو رحم کہا جائے گا، ہر گز نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ مطلق تشدد بے رحمی نہیں ہے۔ اگر مطلق تشدد بے رحمی ہو تو نعوذ باللہ نعوذ باللہ کیا اللہ میاں کو بے رحم کوئی کہہ سکے گا، کیونکہ وہ تو کروڑوں کو مارتے ہیں۔ ہلاک کرتے ہیں، بیمار کر دیتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ بعض جگہ تشدد بھی رحم کے خلاف نہیں۔ اگر اس کو نہیں مانتے تو یا تو خدا تعالیٰ کو رحیم نہ کہو گے یا ان کو محیی و ممیت نہ کہو گے۔ مارنا مطلقاً خلاف رحم ہے تو اللہ میاں تو روزانہ بلکہ ہر وقت مارتے رہتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ تشدد مطلقاً رحم کے خلاف نہیں، بلکہ وہ تشدد بوجہ حکمتوں کے درحقیقت رحم ہی ہے۔ اگر وہ حکمتیں تفصیلاً سمجھ میں نہ آویں تو اتنا مجملاً سمجھ لو کہ وہ حکیم اور رحیم ہیں۔ اس لئے ان کا تشدد حکمت اور رحم کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ پس اب کفار کا مسلمانوں کو بوجہ جہاد اور ذبح حیوانات کے بے رحم کہنا غلط ہو گیا۔ اگر ہمارے قلوب میں رحم نہ ہوتا تو جانور اور چیونٹی پر اتنا کیوں رحم کرتے جس کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ آخر یہ رحم نہیں تو اور کیا ہے کہ ایک چیونٹی کی پریشانی دیکھ کر بے چین ہو جاویں۔ غرض اسلام کی یہ تعلیم ہے کہ ہر چیز سے ہمدردی کرو۔ دنیا بھر میں کوئی خوبی ایسی نہیں ہے جو اسلام میں نہ پائی جاتی ہو۔ اگر ہمارا اسلام کامل ہو اور یہ سب خوبیاں ہمارے اندر مشاہد ہوں پھر ہم خود ہی اوروں کو کوشش کر کے بلانے اور دعوت دینے کی بھی چنداں ضرورت نہ رہے۔ مگر اب تو ہماری یہ حالت ہے کہ تقریر تو لمبی چوڑی کرنے کو تیار ہیں اور کام خاک بھی نہیں کرتے۔ حالانکہ اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ خوب کہا ہے کسی نے ؎

کار کن کار بگذار از گفتار ❊ کاندریں راہ کار باید کار

کام کرنا چاہیئے۔ دعوے اور لاف زنی چھوڑنا چاہیئے۔ مگراب کام کچھ نہیں۔ فقط نام ہی نام ہوتا ہے۔

تبلیغ اور سوال

چنانچہ جابجا انجمنیں بھی ہیں۔ جن میں ایک صدر ہے۔ ایک سیکرٹری ہے۔ کوئی ناظم ہے اور کوئی کیا خاک بلا ہے۔ سوان لوگوں سے کام کچھ نہیں ہوتا۔ البتہ سب سے پہلے چندہ مانگنے کو تیار ہیں۔ حالانکہ اس طرح چندہ مانگنے سے ہم کو روکا گیا ہے۔ خود حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو حکم ہے ام تسئلھم خرجا فخراج ربک خیر الآیۃ اور دوسرے حضرات انبیاء علیہم السلام کا ارشاد ہے لا اسئلکم علیہ اجرا کہ ہمیں تبلیغ کے معاوضہ میں مال نہیں چاہیئے۔ ہم تم سے روپے پیسے نہیں مانگتے ہیں اور جہاں مال لینے کا حکم ہے مثلاً ارشاد ہے خذ من اموالھم صدقۃ تطھرھم وتزکیھم بھا وصل علیھم ان صلوتک سکن لھم یعنی ان کے مال سے صدقہ لیجئے انہیں کے تزکیہ اور تطہیر کے لئے یعنی اس میں آپ کا کوئی نفع نہیں ہے تو اگر کسی کو خذ من اموالھم الآیۃ سے شبہ چندہ کا ہو۔ تو اس کا شان نزول دیکھ لیجئے۔ اسی سے معلوم ہو جائے گا کہ غزوۂ تبوک میں بعضوں سے کوتاہی ہوگئی تھی۔ جب ان کی توبہ قبول ہوئی تو انھوں نے کچھ مال حاضر کرکے اُس کے قبول کی درخواست کی۔ اس پر یہ ارشاد ہوا سو اس سے چندہ مانگنے کا کیا تعلق کہاں اخذ اور کہاں سوال اس کے معنی تو یہ ہیں کہ اگر وہ خود لادیں تو لے لو انکار نہ کرو۔ اور سوال یہ ہے کہ مانگ مانگ کر لوگوں سے روپیہ جمع کیا جاوے سو دونوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ اگر کوئی بطیب خاطر کوئی چیز لادے تو لے لو تو خذ من اموالھم سے چندہ مانگنا کیسے نکلا اللہ میاں نے تو خذ فرمایا ہے اسئل تو نہیں فرمایا۔ اور چندہ تو سوال ہے نہ کہ اخذ اگر اسئل فرماتے تو تمہارا مدعا

حاصل ہو جاتا۔ مگر سوال کے متعلق تو یہ آیا ہے ان تؤمنوا و تتقوا یؤتکم اجورکم ولا یسئلکم اموالکم اگر تم ایمان لاؤ اور خدا سے ڈرو تو اپنے پاس سے اجر دیں گے اور تم سے تمہارا مال نہیں مانگیں گے بے فکر رہو۔ آگے فرماتے ہیں۔ ان یسئلکموھا فیحفکم تبخلوا ویخرج اضغانکم کیونکہ اگر تم سے اصرار کے ساتھ مانگا جاتے تو تم بخل کرنے لگو۔ واقعی یہ خدا ہی کا کلام ہے۔ کیونکہ وہ تو تمہارے رگ پٹھے سے واقف ہیں۔ میں تو کہتا ہوں اگر یہ رسول کا بھی کلام محض رائے سے ہوتا، تو اس میں اتنی گہری باتیں نہ ہوتیں۔ فرماتے ہیں ہم تم سے کیا مانگتے ان یسئلکموھا فیحفکم دیکھئے یہاں سوال میں فیحفکم بڑھایا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سوال میں عادۃً احفار ہوتا ہے چنانچہ مانگنا اسی کو کہتے ہیں جس میں دوسرے کو لپٹ جائے، اور شریعت میں یہ حرام ہے۔ تو فرماتے ہیں کہ اگر ہم مانگنے لگیں تو تم بخل کرنے لگو گے۔ اور تمہاری دلی کدورت ظاہر ہو جائے گی۔ ضغینہ کے اصل معنی کینہ کے ہیں یہاں مراد کدورت ہے یعنی انفاق میں جو دل پر تنگی ہوتی ہے وہ ظاہر ہو جائے گی۔ اس لئے ہم تم سے سوال نہیں کرتے۔ اگر سوال کریں تو یہ خرابیاں ہوں گی۔ یہ حاصل ہے آیت کا۔ ہاں انفاق فی سبیل اللہ کی فضیلت بیان کر دینا اور بات ہے۔ یہ سوال میں داخل نہیں، اس لئے ہم اس کو نصوص میں جا بجا بتلا چکے ہیں اگر کسی کو ثواب لینا ہو لے لے، اسی کو فرماتے ہیں ھا انتم ھؤلاء تدعون لتنفقوا فی سبیل اللہ ہم بے شک تمہیں اس طرف بلاتے ہیں کہ خرچ کرو اللہ کے راستہ میں اس میں تمہارا ہی نفع ہے۔ مگر مانگتے کب ہیں ہم تو تم سے ایک کوڑی بھی نہیں مانگتے۔ البتہ خرچ کا راستہ بتلاتے دیتے ہیں۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک تو کسی سے کہا کہ دس روپے لاؤ یہ تو سوال ہے۔ اور ایک یہ کہ کسی کو رائے دی کہ میاں دس روپے کے فلاں چیز لے لو گے تو نفع ہوگا یہ

مشورہ ہے اپنے لئے کچھ نہیں مانگتے، بلکہ خود اس کے نفع کی ایک صورت بتلا دی۔ ان دونوں باتوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ تو فرماتے ہیں کہ نصوص میں اس کی ترغیب تو ہے کہ خرچ کرو اگر خرچ کرو گے تو اس کا ثواب یہ ہے کمثل حبۃ انبتت سبع سنابل فی کل سنبلۃ مائۃ حبۃ واللہ یضٰعف لمن یشاء ایک دو اور سات سو لو بلکہ اس سے بھی زیادہ سے

خود کہ یابد ایں چنیں بازار را ٭ کہ بیک گل میخری گلزار را،

اور فرماتے ہیں سے

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد ٭ انچہ در وہمت نیاید آں دہد

تو یہ ایک تجارت سکھلائی تھی کہ اگر اس پر عمل کرو گے بڑے منافع حاصل ہوں گے مگر تم کنجوس ہو تجارت میں بھی کنجوسی کرتے ہو۔ اس کا خمیازہ تم ہی بھگتو گے، ہمارا کیا نقصان ہم نے تو تمہارے نفع کی ایک بات بتلائی تھی نہیں مانتے مت مانو ایسی تیسی میں جاؤ۔ اسی کو ارشاد فرماتے ہیں فمنکم من یبخل ومن یبخل فانما یبخل عن نفسہ یعنی اس بخل سے خدا کا کچھ ضرر نہیں تمہارا ہی ضرر ہے واللہ الغنی وانتم الفقراء، خدا غنی ہے اس کو کسی کی پرواہ نہیں، ہاں تم محتاج ہو۔ تمہاری حاجت ہی کو دیکھ کر یہ رائے دی گئی تھی کہ اللہ کے راستہ میں دو گے تو مالا مال ہو جاؤ گے۔ نہیں مانتے تو تمہارا ہی نقصان ہے ہمارا کیا بگڑا۔ اس آیت کی یہ تقریر ایک عالم صاحب نے سن کر بہت خوشی ظاہر کی اور دعائیں دیں اور کہا آج اس کا مطلب سمجھا ہوں۔ پہلے تو بڑے تردد میں تھا کہ اس آیت میں یہ کیسا تعارض ہے کہ اول آیت میں تو سوال کی نفی معلوم ہوتی ہے اور آخر میں خود سوال ہے۔ اب معلوم ہوا کوئی تعارض نہیں کیونکہ دوسری آیت میں سوال نہیں ہے بلکہ ترغیب ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ کی اور پہلی آیت میں نفی ہے۔ سوال کی اس تقریر سے سب اشکالات حل ہو گئے

مگر ایک شبہ رہ گیا تھا وہ یہ کہ اگر ہم خرچ نہ کریں تو دین کا سب کام چوپٹ ہو جاوے یہ مدارس کیسے قائم رہیں اور مسجدوں کی خدمت کون کرے۔ اگر ہم خرچ نہ کریں تو رفتہ رفتہ دنیا سے دین رخصت ہو جاوے تو اس اعتبار سے ہم محتاج الیہ ٹھہرے۔ اس ناز کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ ہاں بے شک بظاہر تمہاری ہی مدد سے یہ کام چلتے ہیں اگر روپیہ نہ ہو تو مثلاً مدرسے قائم نہ رہیں۔ روپیہ کی اور دینے والے کی تو واقعی ضرورت ہے۔ مگر خاص تمہاری ذات شریف کی خدا کو حاجت نہیں۔ اگر تم اس کام کو چھوڑ دو گے تو اللہ تعالٰی دوسری قوم کو بدل دیں گے کہ بجائے تمہارے وہ اس دینی خدمت کو کرے گی۔ اسی مضمون کو فرماتے ہیں وان تتولوا یستبدل قوما غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم۔ مطلب یہ ہے کہ واقعی دین کا کام خرچ کرنے سے چلتا ہے، مگر وہ خرچ کرنا تم پر موقوف نہیں۔ سبحان اللہ کیا بلاغت ہے یستبدل میں اشارہ ہے اس طرف کہ یہ خرچ کرنا تمہارا ایک عہدہ ہے تم مالک نہیں ہو۔

خزانچی کو بادشاہ کے حکم سے روپیہ دینا اس کا عہدہ ہے وہ خزانے کا مالک نہیں بلکہ مالک بادشاہ ہی ہے۔ اگر خزانچی بادشاہ کے کہنے پر روپیہ نہ دیوے تو مالک اس عہدہ دار کو بدلنے پر قادر ہے۔ اس طرح سے کہ فوراً کان پکڑ کر نکال دیا جاوے گا اور اس کے قائم مقام دوسرے کو خزانچی بنا دیں گے۔ اسی طرح اگر تم خرچ نہیں کرتے تو اللہ تعالٰی دوسری امت پیدا کر دیں گے کہ وہ فی سبیل اللہ خرچ کرے گی اور دینی خدمات کو انجام دے گی یہ بھی شبہ رفع ہو گیا۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ لوگ سب سے پہلے چندہ مانگتے ہیں اور کام کچھ نہیں کرتے۔ اس طرح چندہ کو بھی بے اثر کر دیا کہ ہر بات میں لاؤ چندہ۔ پھر اس کے مصرف کی کچھ پرواہ نہیں کہ حلال طریقے سے خرچ ہوتا ہے یا حرام طریقے سے اور

سمجھاں صرف کرنا جائز ہے کہاں حرام اسکی ذرہ پرواہ ہی نہیں۔ نیز لینے میں یہ نہیں دیکھتے کہ کسی یتیم کا تو حق نہیں آگیا، کسی نابالغ کا مال تو نہیں آگیا۔ بس جس طرح آگیا لے لیا۔ وہ دردہ ہے اس میں جو بھی گو دوڑے ناپاک نہیں ہوتا۔ پھر چندہ کرنے میں نہ آبرو کا خیال ہوتا ہے نہ عزت کی نگہداشت خواہ کتنی ہی ذلت ہو مگر چندہ ضرور ملے۔

۔۔۔ تھانہ بھون کے اسٹیشن پر ایک مسجد بنی ہے جب اس کا کام شروع ہوا، تو ہمارے پاس کل آٹھ روپے تھے۔ وہاں ایک دہلوی صاحب تھے پرانی رو کے انہوں نے پوچھا کہ مسجد کے لئے کتنے روپے جمع ہوئے۔ لوگوں نے کہا کہ آٹھ روپے، کہنے لگے آٹھ روپے اور مسجد کا کام شروع کرا دیا۔ انہوں نے بڑا تعجب کیا اور یہ کہا کہ جب تک دو ہزار روپے جمع نہ ہوں تعمیر کو ہاتھ نہ لگانا۔ آٹھ روپے سے بھی بھلا مسجد تیار ہوا کرتی ہے مجھے یہ قصہ معلوم ہوا تو میں نے کہا کہ آپ نے اللہ میاں کو اپنے اوپر قیاس کیا ہے خدا کے پاس تو سارے خزانے ہیں ان کے یہاں روپیہ کی کیا کمی ہے وللہ خزائن السمٰوات والارض۔ میں نے ناظم تعمیر سے کہا کہ تم بنیاد کھدواؤ اور کسی کا کہنا مت مانو۔ تم اللہ کا نام لے کر کھدواؤ۔ اللہ میاں ہی اس کو غیبی سامان سے بھر دیں گے۔ ان مولوی صاحب نے کہا کہ میاں لڑکے ہو کچھ سمجھتے نہیں میں نے کہا کہ جب لڑکوں سے کام چل جائے تو بڈھوں کو بلانے کی ضرورت نہیں، اور واقعی ان کے اعتبار سے تو ہم لڑکے ہی تھے۔ جیسے ایک بڈھے سفید ریش والے سے میں نے پوچھا تھا آپ کون ہیں۔ کہا میں فلاں صاحب کا لڑکا ہوں تو اگرچہ یہ خود بھی بڈھے تھے مگر اپنے باپ کے اعتبار سے تو لڑکے ہی تھے۔ ایسے ہی ہم بھی ان کے اعتبار سے لڑکے ہی تھے جب وہ آٹھ روپے خرچ ہو گئے اور روپیہ نہ رہا تو میں نے ناظم سے کہہ دیا تھا کہ کسی سے چندہ مت مانگنا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ حال ہو گیا کہ میں بازار کو کسی کام کو جا رہا ہوں لوگ پکارتے ہیں کہ میاں فلاں صاحب ذرا ادھر آیئے میں کہتا بھائی مجھے کام کو جانا ہے۔

وہ کہتے اجی ذرا ٹھہرو تو پھر وہ خود آتے اور کوئی دو روپیہ اور کوئی چار روپے دے جاتا۔ غرض لوگ بلا بلا کر روپیہ دیتے تھے۔ اس زمانہ میں بیگم بھوپال کے صاحبزادہ بیمار تھے اور اس قدر پریشان تھیں کہ ڈاک تک نہ دیکھتی تھیں۔ اس حالت میں میں نے ناظم سے کہہ دیا کہ تم ان کے پاس لکھ دو کہ یہاں ایک مسجد بن رہی ہے ایک کارِ خیر ہے۔ اگر آپ اس میں حصہ لینا چاہیں تو لے سکتی ہیں۔ میں آپ سے چندہ نہیں مانگتا۔ صرف اس لئے اطلاع کر دی کہ شاید علم ہونے پر پھر آپ کو خیال ہو کہ مجھے کیوں نہ اطلاع کی گئی۔ اس کارِ خیر میں مجھے کیوں نہ شریک کیا گیا۔ انہوں نے فوراً جواب دیا کہ تعمیر مسجد میں کتنے روپے خرچ ہوں گے۔ تخمینہ کر کے اطلاع کیجیے۔ ہمارے دوستوں نے کہا کہ کچھ زیادہ لکھ دیجئے کیونکہ اگر کہیں خرچ زیادہ ہو گیا تو زیادہ روپے کی ضرورت ہو گی اور تعمیر کا کام ایسا ہی ہے کہ کبھی بڑھ جاتا ہے۔ میں نے کہا نہیں جی اللہ میاں کے یہاں کچھ کمی نہیں ہے اگر بعد میں ضرورت ہو گی تو وہ پھر دوسرا انتظام کر دیں گے۔ غرض ان کو صحیح تخمینہ کی بلا کم و بیش اطلاع کی گئی، روپیہ آ گیا۔ اتفاق سے کام بڑھ گیا اور روپے کی اور ضرورت پڑی۔ میں نے ناظم سے کہا کہ ایک خط اور لکھ دو بیگم صاحبہ کو۔ اور اس کا یہ مضمون ہو کہ جو روپیہ آپ نے بھیجا تھا وہ تو سب لگ گیا۔ اور اتفاق سے کام بڑھ گیا ہے۔ آپ کو یہ اطلاع اس لئے نہیں کی جاتی ہے کہ آپ خواہ مخواہ اس کی تکمیل ہی کریں۔ بلکہ اس لئے کی جاتی ہے کہ بعد میں آپ کو ناگواری نہ ہو کہ مجھے کیوں نہیں اطلاع کی۔ آپ سے چندہ کی درخواست نہیں کی جاتی۔ آپ اگر آزادی سے دینا چاہیں دے دیں۔ چنانچہ خط پہنچتے ہی فوراً روپیہ آ گیا۔ اس واقعہ سے لوگ حیرت میں پڑ گئے کہ ایسے استغنا کے ساتھ لکھا گیا تھا اور پھر بہت جلد کامیابی ہو گئی۔ میں نے کہا کہ میاں یہ سنت انبیاء کی برکت ہے وہ بھی کسی سے چندہ نہیں مانگتے تھے۔ ہم نے اس پر ہی عمل کیا ہے۔ اس کی برکت سے خدا نے کام پورا کر دیا

سو الحمد للہ ہم کسی سے چندہ نہیں مانگتے۔ اور خود تو کیا مانگتے ہیں تو اگر کوئی از خود بھی دے اس سے یہ کہتے ہوئے بھی عار آتی ہے کہ ہم آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں، جیسا عام طور پر لوگ چندہ دینے والے کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ میں لطیفہ کے طور پر کہا کرتا ہوں کہ جو شخص شکریہ ادا کرتا ہے تو بزبان حال اقرار کرتا ہے کہ ہم تمہارا روپیہ کھا جائیں گے ورنہ شکریہ کاہے کا ہے۔ انہوں نے تم پر کیا احسان کیا جو تم ان کا شکریہ ادا کرتے ہو۔ دینے والوں نے اپنی منفعت اور اپنی بھلائی کے واسطے دیا تم ہیں تو نہیں دیا بلکہ برعکس وہ ہمارا شکریہ ادا کریں تو زیبا ہے۔ کیونکہ ہم نے ان کے روپے کی حفاظت کی اور موقع پر خرچ کیا اور ایک پیسہ نہیں لیا۔ سو ہم شکریہ کے مستحق ہیں۔ غور کر لیا جاوے کہ انہوں نے ہم پر زیادہ احسان کیا یا ہم نے۔ حقیقت میں ہم ہی نے احسان کیا کہ امانت کا بار اٹھایا، احتیاط سے صرف کیا۔ اس لئے ہم شکریہ کیوں ادا کریں۔ مگر ان شکریہ والوں نے شکریہ میں ایک لطیفہ بنا رکھا ہے۔ یعنی وہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ ہم آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں یعنی چھوٹی سی شکر جو گویا شکر کی بی بی ہے شکر ادا نہیں کرتے نہ معلوم یہ شکریہ کون سا لغت ہے نہ عربی نہ فارسی۔ یہ اصل میں یا تحقیر ہے۔ ہمارے استاذ مولانا عبد العلی صاحب جو کہ اس وقت دہلی مدرسہ عبدالرب میں پڑھاتے ہیں فرماتے تھے کہ الف لام اس وقت پانچ قسم کا ہے گو طالب علموں کو چار ہی قسمیں معلوم ہیں۔ یعنی جنسی، استغراقی، عہد ذہنی، عہد خارجی مگر ایک پانچواں اور بھی ہے وہ الف لام تحقیریت کا ہے۔ ان کے یہاں ہر بات پر الف لام آتا ہے الفلاں الفلاں۔ تو جیسے وہ الف لام تحقیریت کا ہے غالباً ایسے ہی یہ یا بھی تحقیریت ہی کی سی ہے یا کہ یہ مونث ہے شکر کا۔

مونث کے ذکر پر یاد آیا ایک گنوار دہلی گیا تھا۔ دکان پر نان رکھے ہوئے تھے۔ اس نے پوچھا کہ اس کا کیا نام ہے۔ دکاندار نے کہا نان۔ کہنے لگا یہ نان

کے پیسے کو ملتا ہے کہا دو پیسے کو۔ اسی جگہ چھوٹے چھوٹے نان بھی رکھے تھے، کہنے لگا اور یہ نانیاں کتنے کو ملتی ہیں۔ اس نے نان کی تانیث نانیاں بنائی۔ تو گویا یہ بی بی ہے بڑے نان کی۔ اسی طرح یہ لوگ شکر کو شکریہ کہتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہم چندہ لینے کو منع نہیں کرتے۔ چندہ کی ترغیب دینا بُرا نہیں ہے۔ ہم تو مانگنے کو منع کرتے ہیں اور اس کو ذلت سمجھتے ہیں، شاید کوئی کہے کہ پھر بات ہی کیا ہوئی کہ چندہ کو منع نہیں کرتے ہیں اور مانگنے کو منع کرتے ہیں۔ دونوں میں فرق ہی کیا ہے۔ جواب یہ ہے کہ دونوں میں بہت فرق ہے۔ چنانچہ اس فرق کو ابھی ایک آیت سے ظاہر کر چکا ہوں کہ سوال کا اور حکم ہے ترغیب کا اور حکم ہے۔ دونوں میں نہایت لطیف فرق ہے۔ سوال میں تو اللہ تعالےٰ نے فیحفکم بڑھایا ہے جس سے معلوم ہوا کہ اس میں عادۃً جبر ہوتا ہے دینے والوں پر۔ کیونکہ سوال میں لگا لپٹا ہوتا ہے اور ترغیب میں جبر نہیں ہوتا۔ دوسرے سوال میں ذلت ہوتی ہے اور ترغیب میں استغنا۔ سائل معطی کی نظر میں حقیر اور خوار ہوتا ہے اور ترغیب دینے والا ذیجاہ اور ممتاز رہتا ہے۔ اس کو وقعت اور عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے کیونکہ وہ مستغنی ہوتا ہے۔ بس ایک دفعہ کہہ دیا کہ یہاں فلاں کام ہوگا۔ مسجد بنے گی، مدرسہ قائم کیا جاوے گا۔ کسی کو سعادت لینا ہو ہزار دفعہ ہاتھ جوڑ کر روپیہ لاوے، لے لیا جاوے گا، اور اگر اس کار خیر میں حصہ نہیں لیتے مت لو۔ تمہارا ہی نفع نقصان ہے ہمارا کچھ نہیں۔

مَیں ایک مرتبہ ریاست رامپور گیا تھا۔ وہاں ایک مدرسہ کا جلسہ تھا۔ ایک مولوی صاحب نے مجھ سے پہلے تقریر کی۔ دوران تقریر میں چندہ کی تحریک کے لئے یہ کہا کہ اس وقت اسلام کی مثال اور اس کی حالت اس بیوہ عورت کی طرح ہو گئی ہے جس کا کوئی خبر گیر نہیں۔ خاوند مر گیا ہے اب نہ کھانے کو ہے نہ پہننے کو، نہ رہنے سہنے کو۔ چاروں

طرف دیکھ رہی ہے کہ میرا بھی کوئی خبر گیراں ہے۔ تو ایسے وقت میں اس کی مالی خدمت کرنا بے حد ضروری ہے مجھے یہ مثال بہت بُری معلوم ہوتی۔ ان کے بعد جب میں کھڑا ہوا تو میں نے اس کا رد کیا کہ اسلام بادشاہ ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں ہے بلکہ سب اسی کے محتاج ہیں۔ ؎

منت منہ کہ خدمت سلطان ہمیکنی ٭ منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

اس میں نہ مسکنت ہے نہ ذلت ہے وہ بادشاہ ہے اس کا تو یہ حال ہے ؎

ہنوز آں ابر رحمت درفشاں ست ٭ خم و خمخانہ بامہر و نشان ست

اس میں کچھ نقص نہیں۔ دین جیسا تھا ویسا ہی ہے۔ ہاں یہ کہو کہ ہم مسلمان اسلام کو چھوڑ کر بیوہ عورت کی طرح ہو گئے کہ ہمارا کوئی پرسان حال نہیں۔ اسلام پر جمتے تو خدا تعالے ہمارا ناصر و حامی ہوتا۔ اب کوئی بھی نہیں۔ پھر میں نے تحریک چندہ کے لئے یہ کہا اگر تمہاری بے پرواہی سے اسلام دنیا سے گم ہو جاوے تو فقط مولویوں ہی سے پوچھ نہ ہو گی بلکہ عوام سے بھی مواخذہ ہو گا کیونکہ جس کا جو کام ہے اس سے اسی کی پرسش ہو گی۔ مولوی سے تو اس کی پوچھ ہو گی کہ تم نے تعلیمی خدمت نہیں کی اور عوام سے یہ کہا جاوے گا کہ تم نے ان کی مالی خدمت کیوں نہ کی کیونکہ ننگے بھوکے رہ کر کوئی پڑھا نہیں سکتا۔ تو تنہا ہمیں پر مصیبت نہ آوے گی بلکہ سب پر مصیبت ہو گی۔ جیسے مولویوں کی گرفت ہو گی عوام کی بھی گرفت ہو گی۔ اب خواہ مالی خدمت کرو یا نہ کرو۔ یہ سن کر پٹھانوں کو جوش اٹھا کہا ہاں جی اسلام بیوہ کیوں ہوتا وہ تو بادشاہ ہے اور چھنا چھن روپیہ برسنا شروع ہوا۔ پھر ان مولوی صاحب کو بھی اپنی غلطی معلوم ہو گئی۔ میں کہتا ہوں بخدا اگر ساری دنیا کافر ہو جاوے جب بھی اسلام میں کچھ فرق نہیں آسکتا۔ بلکہ جیسا ہے ویسا ہی رہے گا۔ اور کیوں فرق ہو، آخر اسلام کس کا نام ہے احکام خداوندی کا۔ خدا حاکم ہے اور اسلام اس کا قانون ہے۔ تو

جب تک حاکم میں قوت ہے اس وقت تک اس کے قانون و احکام میں ضعف نہیں آسکتا۔ اسی طرح جب تک خدا موجود ہے اس وقت تک اسلام ضعیف نہیں ہو سکتا۔ اور ظاہر ہے کہ خدا ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ لہٰذا اسلام بھی ہمیشہ قوی رہے گا۔ اس میں ذرا برابر ضعف نہیں آسکتا۔ اسلام کو رانڈ بیوہ کہنا نہایت بے ادبی ہے۔ مسلمان کو اس سے بڑی عار آنا چاہیے۔

بھلے بُرے میں تمیز

اسی طرح پچھلے دنوں اس مضمون کے لیکچر ہوا کرتے تھے کہ اسلام بغیر دوسری اقوام کی امداد کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ افسوس ان لوگوں کو یہ لفظ منہ سے نکالتے ہوئے شرم و غیرت نہ آئی۔ ڈوب مرے انھوں نے ہی قوم کو برباد کیا ہے ساری خرابی انہیں کی بدولت ہو رہی ہے۔ بھلا ہم اور دوسروں کے محتاج ہوں۔ افسوس اب تک ان لوگوں نے یہی نہیں سمجھا کہ ہم کیا ہیں۔ اگر یہ سمجھتے تو کبھی ایسا لفظ زبان پر نہ لاتے۔ مگر سمجھتے کیسے؟ کیونکہ اس کے سمجھنے کے لئے تو بصیرت کی ضرورت ہے۔ اس کے فہم کے لئے نور چاہیے جب وہ نور نہیں پھر کیسے سمجھیں بھلے برے کی تمیز کریں۔ ہماری وہ مثال ہے کہ ایک معشوق حسین ہمارے پاس موجود ہے۔ ہم اس کو نہیں دیکھتے کیونکہ وہ اندھیرے میں کھڑا ہے اور ہمارے پاس روشنی نہیں نور نہیں اس لئے وہ ہم کو نظر نہیں آتا۔ اگر نور ہوتا تو اس کو دیکھ کر یہ کہتے ہیں ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

مگر وہ نور نہیں لہٰذا دوسرے زشت منظر کو تک رہے ہیں۔ اسی طرح اپنے کو نہ دیکھ کر اپنے کو دوسری قوم کا محتاج سمجھ لیا۔ صاحبو! اسلام کو ظاہری قوت کی ضرورت نہیں۔ اسلام روپیہ پیسہ کا محتاج نہیں۔ اسلام کی اشاعت و ترقی کے لئے صرف دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک تو ہر شخص اپنے اعمال کو ٹھیک کرے۔ دوسرا

متبع شریعت بن جائے اور اعمال میں اتفاق بھی آ گیا اور دوسرے یہ کہ غیر قوموں کے کانوں میں اس کی خوبیاں ڈالتا رہے، لڑائی جھگڑا نہ کرے، نرمی سے ان کو سمجھاتا رہے جس کو حق تعالیٰ نے فرمایا ہے ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن۔ افسوس اس وقت ہماری حالت بالکل خراب ہو گئی، ہمارا بالکل کایا پلٹ ہو گیا، ہمارا کوئی کام اعتدال سے نہیں ہوتا۔ بس وہی حال ہے ؎

چوں گرسنہ میشوی سگ میشوی ؛ چونکہ خوردی تند و بدرگ میشوی

یعنی یہ حالت ہے کہ اگر بھوکے ہیں تو اور قسم کی بلا میں مبتلا ہیں اور پیٹ بھرے ہیں تو اور قسم کی بلا میں مبتلا ہیں۔ اور یہ حالت ہے ؎

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی ؛ تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

یا تو ہم غفلت میں پڑے سو رہے تھے یا اٹھے تو کبھی دوسروں کے ساتھ لڑائی جھگڑا کرنے لگے۔ اور کبھی ان کی خوشامد کرنے لگے۔ ہماری وہی مثال ہے کہ اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی ہے۔ پہلے تو یہ تھا کہ ہندوؤں کے خلاف کچھ نہ بولو اتحاد میں خلل پڑے گا۔ اتحاد ہی کو قبلہ و کعبہ بنا رکھا تھا چاہے اسلام ٹوٹے مگر اتحاد نہ ٹوٹے۔ افسوس ان کو تو اتحاد کا خیال تھا، ہر وقت اتحاد کی دُھن تھی اور اُن کو اس کی ذرا بھی پرواہ نہ تھی۔ بلکہ اس اتفاق ہی کی حالت میں وہ ان کی جڑ کاٹ رہے تھے مگر ان کو خبر بھی نہیں ہوئی اور یا اب خبر ہوئی تو لڑنا بھڑنا شروع کر دیا۔ بھائی لڑنے کے بھی کچھ شرائط و حدود ہیں جب وہ نہیں پھر کیا لڑائی۔ طریقہ کے بغیر لڑنا بجز فساد کے کچھ نہیں۔ بس ہمیں تو یہ طریقہ بتلایا گیا ہے اور وہی ہم کو اختیار کرنا چاہیئے یعنی ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن۔ ان ربک ھو اعلم

بمن ضل عن سبیلہ وھو اعلم بالمھتدین - وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم بہ ولئن صبرتم لھو خیر للصٰبرین واصبر وما صبرک الا باللہ ولا تحزن علیھم ولا تک فی ضیق مما یمکرون - ان اللہ مع الذین اتقوا والذین ھم محسنون۔

آداب تبلیغ

اس میں پورے آداب تبلیغ کے مذکور ہیں حق تعالےٰ نے اس میں شرائط و آداب تبلیغ کو مفصل طور پہ بیان فرما دیا ہے۔ چنانچہ اوّل تو امر ہے ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ۔ سبحان اللہ کیا فصاحت ہے ایک ہی آیت میں سب فرقوں کی اصلاح فرماتے ہیں۔ چنانچہ بعض تو وہ لوگ ہیں کہ دعوت کو ضروری نہیں سمجھتے ہیں اور بعض وہ ہیں کہ ضروری تو سمجھتے ہیں مگر جنگ و جدال کرنے لگتے ہیں۔ اس میں اللہ تعالےٰ نے دونوں کی اصلاح فرمائی ہے کہ دعوت تو کرنا چاہیئے وہ تو ضروری ہے اس میں فرقہ اوّل کی اصلاح ہو گئی۔ آگے فرماتے ہیں کہ دعوت تو ہو مگر ایک خاص طریقہ سے۔ آگے وہ طریقہ بتلاتے ہیں کہ طریقہ دعوت کا یہ ہے کہ حکمت اور موعظت حسنہ کے ساتھ لوگوں کو بلاؤ۔ نرمی سے سمجھاتے رہو۔ یہاں حق اللہ تعالےٰ نے دو باتوں کا امر فرمایا ہے۔ ایک حکمت دوسرے موعظت حسنہ۔

اوّل یہ سمجھو کہ ان دونوں میں فرق کیا ہے۔ سو حکمت تو کہتے ہیں علم کو، اور موعظت حسنہ کہتے ہیں ترغیب ترہیب ترقیق قلب کو یعنی ان کو علمی مضامین سے بلاؤ۔ مضامین علمیہ ان کے کانوں میں ڈالتے جاؤ اور اُن مضامین کو ترغیب و ترہیب سے مؤثر بناؤ۔ اسی کو فرماتے ہیں کہ حکمت و موعظت حسنہ کے ساتھ بلاؤ اور یہ حکمت مقابل ہے مناظرہ و جدال کا گو وہ بھی علمی مباحث سے ہوتا ہے مگر وہ حکمت نہیں بلکہ حکمت اثبات مدعا کا نام ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ ایک تو ہوتا ہے اثبات مدعا اور ایک جواب ہوتا ہے نقیض مدعا کا۔ یعنی ایک تو ہے اپنے دعویٰ کو ثابت کرنا، دوسرے معترض کے اعتراض کا جواب دینا، اس کے خدشات کو دفع کرنا، تو حکمت تو اثبات مدعا ہے اور جواب دینا نقیض مدعا کا یہ جدال ہے۔ تو اصل مفید چیز تو دعوت کرنا ہے حکمت کے ساتھ، لیکن اس میں اگر کبھی جدال واقع ہو جائے، تو اُس کے بھی خاص طریقے ہیں۔ سو آگے ان طریقوں سے خصم کے اعتراض دفع کرنے کی تاکید ہے۔ غرض دعوت الی الاسلام کے لئے حکمت تو لازم ہے۔ بلا حکمت کے دعوت ہوتی ہی نہیں۔ باقی جدال لازم نہیں یہ ضروری نہیں کہ جہاں دعوت ہو وہاں جدال بھی ہو۔ تو مطلب یہ ہے کہ دعوت میں مضامین علمی بیان کرو۔ فوائد علمیہ سناتے جاؤ۔ اپنے دعوے کو دلائل علمیہ وعقلیہ سے ثابت کرو اُس کی خوبی اس کے محاسن بیان کرو لیکن اگر اس میں کوئی دوسرا اعتراض کرے کوئی نقض وارد کرے، تو اس وقت ضرورت ہوگی مباحثہ کی۔ تو اس وقت مباحثہ کرو مگر احسن طریقہ سے اسی کو فرماتے ہیں وجادلھم بالتی ھی احسن یعنی اس طرح جواب دو کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو، لعن وطعن نہ ہو، خشونت نہ ہو۔ کسی پر طعن نہ کرو، کسی کو ملامت نہ کرو، کسی کی ہجو نہ ہو۔ ایسے مباحثۂ حسنہ سے مخاطب کو رنج و ملال نہ ہوگا بلکہ وہ اثر پذیر ہوگا یعنی مضامین کے بیان میں کبھی خشونت ہو جاتی ہے، کبھی غصہ اور تیزی کے لہجہ سے بیان کیا جاتا ہے، اس کی ممانعت فرماتے ہیں کہ ایسے طرق اختیار نہ کرو جس سے مخاطب بھڑک اٹھے، اس کے بدن میں آگ لگ جائے۔ سو ایک تقریر تو مقام کی یہ ہوئی۔

دوسری تقریر یہ ہے کہ موعظت بھی ایک مستقل طریق ہے۔ تو اس وقت حاصل مقام کا یہ ہوگا کہ اگر مخاطب میں علمی قابلیت دیکھو اس کے اندر سمجھ کا مادہ ہو تو وہاں حکمت کے ساتھ بلاؤ، اس کو مضامین علمیہ سناؤ اور اگر استعداد علمی نہ ہو

تو موعظت سے کام لو۔ کیونکہ وعظ کے لئے چنداں ذہین فہیم ہونے کی ضرورت نہیں۔ وعظ کا اکثر مضمون عام فہم ہوتا ہے، کیونکہ موعظۃ حسنہ اس کو کہتے ہیں جس سے قلب میں نرمی پیدا ہو، رقت طاری ہو۔ تو معنی یہ ہوئے کہ جنت کی ترغیب دو۔ دوزخ سے ترہیب کرو، نعمائے جنت و آسائش و راحت بہشت کو بیان کرو، اس سے رغبت پیدا ہو گی۔ اور دوزخ کے درکات اور تکالیف و عذاب سے ڈراتے رہو اور اس کے بعد بھی اگر کوئی شبہ کرے تو اس کے لئے حکم ہے جادلھم بالتی ھی احسن کہ ان سے مجادلہ کرو احسن طریقہ سے جس کی تفسیر اوپر گذر چکی۔

آگے ان ربک ھو اعلم الخ بڑھا کر مجموعہ میں ایک باریک بات بتلادی وہ یہ کہ اللہ تعالٰے نے جو یہ طرز تعلیم فرمایا ہے کہ ان کو حکمت اور موعظت حسنہ کے ساتھ بلاؤ یعنی نرمی سے سمجھاؤ۔ کوئی خشونت نہ ہو، درشتی نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ طرز وہی اختیار کر سکتا ہے جس کے اندر شفقت ہو۔ اگر وہ شفیق نہیں تو اس کو منت سماجت کی کیا پڑی ؟ دیکھو جب استاذ شفیق ہوتا ہے تو چاہتا ہے کہ کسی طرح یہ پڑھ لے۔ طرح طرح سے اس کو سمجھاتا ہے، کبھی پیسے دیتا ہے، کبھی مٹھائی کھلاتا ہے، پیار کرتا ہے، چمکارتا ہے کہ میاں تمہارا ہی فائدہ ہے۔ سبق پڑھو دیکھو اگر پڑھو گے تو درجات ملیں گے۔ تو اس طریق کی تعلیم فرمانا گویا شفقت کا حکم فرمانا ہے مگر اس حکم شفقت میں ایک اشکال بھی تھا وہ یہ کہ شفقت کی وجہ سے جس طرح ابتدائے تعلیم میں نرمی اختیار کرتا ہے ایسے ہی انتہا میں ناکامی سے رنج بھی زیادہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر کسی بچہ کے ساتھ محنت اور جان کاہی کی جاوے اور پھر بھی ناکامی ہو تو بڑا رنج ہوتا ہے کہ ہائے ہماری ساری محنت برباد گئی، خاک ہی میں مل گئی۔ پھر رنجیدہ ہو کر کام سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ اس لئے اس اشکال کے عملی علاج کے لئے آگے ان ربک ھو اعلم میں اس شفقت کو اعتدال پر لانے کا طریقہ بتلاتے ہیں۔

اور وہ طریقہ ایک مراقبہ ہے واقعی اخلاق کی میزان سوائے خدا کے کسی نے نہیں بتائی ان کی تعلیم میں افراط تفریط نہیں ہے بالکل اعتدال ہی اعتدال ہے۔ کیونکہ افراط بھی مضر ہے اور تفریط بھی۔ چنانچہ اگر حد سے زیادہ شفقت ہو تو یہ بھی مضر۔ کیونکہ اس سے آخر کو بد دل ہو جاوے گا اور کام بھی چھوڑ بیٹھے گا۔ اور اگر تفریط ہے یہ بھی مضر، کیونکہ شفقت کی تعلیم کا اور اثر ہوتا ہے اور بے شفقت کا اور اثر۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر اس کی ایک میزان بتا دی تاکہ کسی جانب میں کمی بیشی نہ ہو۔ دونوں پہلو برابر رہیں۔ چنانچہ اوّل فرماتے ہیں ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ اس میں تو شفقت کے ساتھ تعلیم کا امر ہے کیونکہ اگر ابتدا میں شفقت نہ ہو تو ایسی تعلیم کم نفع دے گی اور اس کے بعد افراط فی الشفقت کی ممانعت ہے، اس کے لئے یہ مراقبہ بتلاتے ہیں کہ ان ربک ھو اعلم بمن ضل عن سبیلہ وھو اعلم بالمھتدین گویا اس کے معنی یہ ہیں کہ لاتحزن علیھم ان لم یؤمنوا یعنی آپ کا فرض منصبی تو دعوت کرنا ہے وہ آپ نے کر دی اب اگر وہ ایمان نہیں لاتے آپ کی دعوت کو قبول نہیں کرتے تو آپ غمگین نہ ہوں، کیونکہ ایمان لانا یا نہ لانا یہ تو خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ آپ کے اختیار میں نہیں، پھر آپ غمگین کیوں ہیں ہے

اس مضمون کے استحضار سے غلو فی الشفقت نہ ہوگا جو کہ مضر ہے اور اس کے مضر ہونے کا ایک راز ہے وہ یہ کہ شفقت سے حزن ہوگا، اور حزن کا خاصہ یہ ہے کہ اس سے قلب ضعیف ہو جاتا ہے اور بد دل ہو کر آدمی کام چھوڑ دیتا ہے کہ اتنا تو سر مارا اور پھر بھی ناکامی ہوئی چھوڑو اور اس قصہ ہی کو الگ کرو، اس سے کیا فائدہ ہے تو شدت شفقت کی وجہ سے یہ بات ہوگی اور اس سے سلسلہ تبلیغ کا بند ہو جائے گا، اس لئے غلو کا بھی علاج کر دیا۔ خلاصہ یہ کہ مسلم کی تبلیغ کا کام شفقت

سے ہوتا ہے۔ مگر شفقت سے تبلیغ کی صرف تکمیل ہوتی ہے یہ خود مقصود نہیں، بلکہ اصل مقصود تبلیغ ہے۔ اگر شفقت سے تبلیغ ہی جاتی رہے تو شفقت کی ایسی تیسی ایسی شفقت سے کیا فائدہ ؟ کیا اس کو لے کر چاٹیں گے۔ اس کے بعد اس میں ایک اور شبہ رہا وہ یہ کہ ساری دنیا تو مہذب نہیں جو اس طریق کو مان لیں دنیا میں سب قسم کے لوگ ہیں اگر مبلغ سے کوئی لڑنے لگے مارپٹائی ہونے لگے تو کیا کریں ؟ اس کے لئے فرماتے ہیں وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم بہ۔ سبحان اللہ دیکھئے اس میں کیسی بلاغت ہے کہ حضورؐ کو مخاطب نہیں بنایا۔ جس میں بتلا دیا کہ آپؐ کو تو تبلیغ میں اس کی نوبت ہی نہ آئے گی کہ آپ سے تبلیغ میں کوئی لڑے جھگڑے یا آپ اس کا بدلہ لیں۔ آپ کے ساتھ حق تعالٰے کی اعانت خاصہ ہے۔ ہاں اگر تابعین اور ان کے خدام ان کے غلاموں کو یہ بات پیش آجاوے تو ممکن ہے اس لئے تمہیں مخاطب بنا کر کہتے ہیں کہ جتنی تکلیف کسی سے تمہیں ہوئی ہو اتنی ہی اس کو دیجیو، زیادتی نہ کرنا ولئن صبرتم لھو خیر للصابرین۔ سبحان اللہ واقعی یہ خدا کا کلام ہے اگر مخلوق کا کلام ہوتا تو وہ صبر کو مقدم کرتا اور معاقبہ کو مؤخر کرتا۔ مگر خدا تعالٰے نے صبر کو مقدم نہ کیا اس میں بندہ کی حاجت کی رعایت ہے کیونکہ بشریت کا خاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی غصہ میں بھڑک رہا ہو اس وقت اس کی موافقت کرنے سے غصہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور مخالفت کی جاتی تو وہ اور زیادہ گرم ہو جاتا ہے بالکل آگ ہو جاتا ہے مثلاً کسی کو آپ نے لڑتے دیکھا اور اس سے کہا کہ تو بھی اس کے چار دھول لگا دے یہ کہتے ہی وہ ٹھنڈا ہو جاتے گا اور اگر تم نے یوں کہا کہ کیا نامعقول حرکت ہے کیوں لڑ رہے ہو صبر و تحمل سے رہنا چاہئے۔ تو وہ ایک تو اُس پر دانت پیس رہا تھا اب آپ کی طرف بھی گھورنے لگے گا۔ کہ سبحان اللہ کچھ سمجھے نہ سمجھاتے یوں ہی صبر و تحمل کی ہانکنے لگے تو اللہ میاں نے مخاطب کی رعایت کی کہ اگر کوئی تم سے لڑے بھڑے تو تم بھی اس کے

چار جوتے لگا دو۔ اب یہ سن کر جب ذرا جی ٹھنڈا ہو گیا تو آگے فرماتے ہیں کہ اگر صبر کرو تو وہ بہت ہی اچھا ہے۔ پھر آگے حضورؐ کو خاص طور پر صبر کا خطاب ہے واصبر وما صبرک الا باللّٰہ کہ آپ تو بالضرور صبر کریں یہ اور صبر ہے جس کا حضورؐ سے خطاب ہو رہا ہے اور اس سے پہلے ولئن صبرتم لھو خیر للصابرین میں اور صبر مراد تھا یعنی آپ کو جو رنج ہوتا تھا ان کے برا بھلا کہنے سے۔ واصبر میں تو اس پر صبر کرنا مراد ہے۔ ولئن صبرتم میں لڑائی بھڑائی نہ کرنا اور بدلہ نہ لینا مراد ہے اور اس واصبر کے بڑھانے میں ایک دوسرا نکتہ بھی ہے وہ یہ کہ مسلمانو سمجھو صبر جس کے لئے تم کو مشورہ دیا گیا ہے ولئن صبرتم میں یہ وہ چیز ہے کہ حضورؐ کو بھی باوجودیکہ آپؐ اعلیٰ درجے کے اخلاق پر ہیں اس کا حکم ہوا کہ صبر کیجئے۔ پھر تم کس شمار میں ہو؟ تو اس سے مخاطبین کو صبر سہل ہو جائے گا۔ اس سے آگے ایک اور مرض کا علاج فرماتے ہیں۔ وہ مرض یہ ہے کہ صبر سے دعویٰ پیدا نہ ہو جائے کہ صابر ہیں، کہ ہم نے ایسے موقع پر صبر کیا ہم بڑے کامل ہیں۔ اس کا اس طرح ازالہ فرماتے ہیں کہ حضورؐ کو خطاب فرماتے ہیں وما صبرک الا باللّٰہ جس میں آپؐ کے خادموں کو سنانا ہے کہ میاں کیا دعویٰ کر سکتے ہو تم بے چارے کیا چیز ہو۔ خود رسول کا صبر بھی جب واقع ہو گا وہ بھی خدا ہی کی توفیق سے ہو گا پھر تمہارا ان کے سامنے دعوی کرنے کا کیا منہ ہے؟ تم ہو کیا چیز ان کے کمال کے سامنے تمہارا کمال معدوم ہے، ان کے صبر کے مقابلہ میں تمہارا صبر کچھ حقیقت نہیں رکھتا جب ان کا صبر بھی بغیر توفیق مولیٰ نہیں ہو سکتا۔ پھر تم کیا دعویٰ کر سکتے ہو؟

آگے فرماتے ہیں ولا تک فی ضیق مما یمکرون کہ اگر ناکامی ہو تو دل میں تنگی نہ ہونا چاہیئے۔ آگے اس تنگی کو رفع کرنے کے لئے مراقبہ بتلاتے ہیں، اگر یہ مراقبہ پیش نظر رہے تو کبھی تنگی نہ ہو گی۔ پس فرماتے ہیں ان اللّٰہ مع الذین

اتقوا والذین ھم محسنون یعنی یہ سوچو کہ مقصود تبلیغ سے کیا ہے۔ کیا دوسروں کو خاص مسلمان بنانا مقصود ہے اگر کسی کو یہ مقصود ہوگا تو اگر ایک بھی کافر رہے گا تو رنج ہوگا۔ پس اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں کہ تبلیغ سے خاص یہ مقصود نہیں کہ آپ کی حسب دلخواہ مراد پوری ہو جایا کرے کہ سب کے سب ولی اور ابدال بن جاویں بلکہ مقصود تبلیغ سے خدا تعالیٰ کا قرب اور معیت حاصل کرنا ہے اگر وہ تم کو حاصل ہو جاوے تو خواہ ساری عمر میں ایک بھی مسلمان نہ ہو ایک جگہ بھی کامیابی نہ ہو کچھ حرج نہیں اور اگر یہ نہیں تو ساری دنیا کی اصلاح سے تمہارا کیا نفع ہوا اس کو فرماتے ہیں ان اللہ مع الذین اتقوا والذین ھم محسنون یعنی اللہ تعالےٰ تو متقین اور محسنین کے ساتھ ہے۔ اگر تقوےٰ اور احسان حاصل ہے چنانچہ تبلیغ کی بجا آوری سے یہ حاصل ہو گیا تو معیت خدا نصیب ہو گئی، اور یہی کافی ہے اب اور کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ اب خواہ کوئی بگڑے یا سنورے تم کو اس کی پرواہ نہیں ہونا چاہیئے۔ فمن شاء فلیومن ومن شاء فلیکفر یہ احکام ہیں اسلام کے اور یہ آداب ہیں تبلیغ کے۔ صاحبو! افسوس ہے کہ عرصہ سے ہم اتنی بڑی چیزوں کو چھوڑ بیٹھے ہیں کہ نہ اپنے اسلام کی تکمیل کی فکر ہے نہ دوسروں تک تبلیغ اسلام کی فکر ہے۔ لوگ چونکہ اس سے غافل ہیں اس لئے اس وقت اس کے متعلق بیان کیا گیا کیونکہ حلوا نہ تنہا بایست خورد۔ پس اب اپنی بھی تکمیل کرو اور تبلیغ بھی کرو اور اس طرح کرو جیسے قرآن میں ہے تو مسلموں اور کافروں کو نرمی سے سمجھاؤ، کسی سے لڑو بھڑو مت، مناظرہ مروجہ مت کرو کہ یہ آداب تبلیغ کے خلاف ہے اور اس سے نفع بھی نہیں ہوتا، تجربہ ہو چکا ہے۔ حتیٰ کہ اس کا غیر قوموں نے بھی تجربہ کر لیا ہے وہ بھی اب مناظروں سے کنارہ کش ہونے لگے بس اسلامی مضامین کان میں ڈالے جاؤ۔ بار بار اسلام کی خوبیاں سناتے رہو یہی طرز

قرآن کا ہے۔ چنانچہ جا بجا فرماتے ہیں صرفنا الآیات صرفنا فی ھذا القرآن وامثالھما۔ یعنی بار بار مضامین کو دُہراتے ہیں۔ اگر ہم لوگ اس طرز کو اختیار کریں یعنی وقتاً فوقتاً احکام پہنچاتے رہیں تو انشاء اللہ بہت نفع ہو اور اگر نفع نہ بھی ہو ہمارا کیا بگڑا۔ ہم نے تو اپنا فرض اتار دیا، جو کام ہمارے ذمہ تھا وہ ادا کر دیا۔ اب نفع ہو یا نہ ہو، وہ جانیں اور ان کا کام۔

تبلیغ میں دو نیتیں

ہیں اس سے کیا بحث۔ قرآن مجید میں حکایت ہے واذ قالت امۃ منھم لم تعظون قوما اللہ مھلکم او معذبھم عذابا شدیدا کہ اصحاب السبت میں سے ایک جماعت نے دوسری جماعت سے کہا کہ تم ایسی جماعت کو کیوں نصیحت کرتے ہو جن کو خدا تعالیٰ ہلاک کرنے والے ہیں یا جن پر عذاب شدید نازل فرمانے والے ہیں ایسے لوگوں کو خطاب کرنے سے کیا فائدہ ہے قالوا معذرۃ الی ربکم ولعلھم یتقون۔ انھوں نے کہا کہ صاحب ہم اس لئے نصیحت کرتے ہیں تاکہ تمہارے لئے ایک عذر ہو خدا کے نزدیک کہ یا اللہ ہم نے تو کہا تھا انھوں نے مانا نہیں، جو ہمارا کام تھا وہ ہم نے ادا کر دیا تھا ایک تو یہ بات ہے اور دوسرا فائدہ یہ ہے کہ لعلھم یتقون کہ ممکن ہے یہ لوگ ڈریں، شاید ان میں سے کسی کو ہدایت ہو جاوے۔ کیونکہ نرمی کے ساتھ سمجھانے سے امید تو ہے اُن کے ایمان کی مایوسی کی کوئی وجہ نہیں یہ حکایت ہے بس یہی دو نیتیں آپ بھی تبلیغ میں رکھئے ایک معذرت عند اللہ اور دوسری ان کے ایمان لانے کی توقع۔ جن میں سے پہلا مقصود تو قطعی الحصول ہے ان شاء اللہ تعالیٰ اور دوسرا محتمل و متوقع ہے۔ بس تم ان کو اسلامی محاسن سناتے رہو، ان شاء اللہ بہت کچھ اصلاح کی امید ہے اور اس سے بہت اصلاح ہوئی ہے۔

قانونِ اسلام کی رعایت

چنانچہ اس کا ایک واقعہ یاد آ گیا، جس سے ان محاسن کا اندازہ ہوتا ہے

وہ یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے یہاں فارس کا ایک شہزادہ گرفتار ہو کر آیا تھا آپؓ نے اس پر اسلام پیش کیا اس نے قبول نہ کیا، پھر آپؓ نے فرمایا تو مطیع ہو کر رہنا ہوگا اس نے اس سے بھی انکار کیا۔ آپؓ نے فرمایا تو پھر اب قتل کے لئے تیار ہو جاؤ۔ چنانچہ آپؓ نے قتل کا حکم دیا۔ اس نے کہا اب تو میں مارا ہی جاتا ہوں میری ایک تمنا ہے اسے تو پورا کر دو فرمایا کہو۔ کہا پانی پینا چاہتا ہوں۔ آپؓ نے کہا بہت اچھا۔ پانی لایا گیا وہ پیالہ منہ کے پاس لے گیا اور پھر اس کو ہٹا لیا۔ آپ نے فرمایا پیتا کیوں نہیں؟ کہا مجھے اطمینان نہیں کہ مجھے پانی پینے کی بھی مہلت ملے گی، شاید درمیان ہی میں قتل کر دیا جاؤں۔ حضرت عمرؓ کو عمر بھر میں کسی نے دھوکہ نہیں دیا سوائے اس شخص کے۔ آپ نے فرمایا کہ تو پانی پی لے ڈر مت۔ کہا مجھے اطمینان نہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ جب تک تو یہ پانی نہ پی چکے گا اس وقت تک تجھے قتل نہ کیا جاوے گا۔ جب مجھے اطمینان ہوگا۔ آپؓ نے یہی بات کہہ دی۔ اس نے یہ شرارت کی کہ جھٹ سے پانی گرا دیا اور کہا اب مجھے قتل کرو کیسے کرتے ہو؟ اس کو یہ اطمینان ہو گیا کہ آپؓ یہ تو فرما ہی چکے ہیں کہ جب تک پانی نہ پی چکے گا اس وقت تک تجھے قتل نہ کیا جاوے گا اور اب پانی کا پینا محال ہو گیا ہے۔ تو اب تحقق شرط متعذر ہو گیا تو مشروط بھی متعذر ہو گیا۔ اب مجھے کیسے قتل کریں گے؟ آپؓ نے فرمایا کہ جا تجھے آزاد کیا گیا۔ آزاد ہوتے ہی اس نے کہا اشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ واشھد ان محمداً عبدہ ورسولہ اور مسلمان ہو گیا۔ جب اس سے پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ اگر میں اس وقت جبکہ آپ نے مجھ پر اسلام پیش کیا تھا مسلمان ہو جاتا تو

لوگ سمجھتے کہ تلوار کے خوف سے مسلمان ہوا ہے اس لئے پہلے میں نے آپ کو بے دست و پا کر دیا کہ میرے اوپر کسی طرح آپ کا زور نہیں چل سکتا۔ اب بخوشی مسلمان ہوتا ہوں۔ دیکھا آپ نے اسلام کی تعلیم کو کہ اُس کو اس تعلیم وفائے عہد پر اتنا بھروسہ تھا کہ ان دینے کے بعد امیر المومنین ہرگز بد عہدی نہ کریں گے وعدہ کر کے خلاف وعدہ کبھی نہ کریں گے جبھی تو اس نے یہ تدبیر کی۔ اس کو پورا اعتماد تھا کہ مسلمان عہد کر کے ہرگز اُس کے خلاف نہیں کرتے۔ کیا ٹھکانا ہے اسلامی قانون کا کہ اس میں رعایت کی کچھ حد ہی نہیں۔ حدیث میں ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا کہ اگر ایک کافر نے قتال میں میرا ہاتھ قطع کر دیا ہو۔ پھر جب میں نے اس پر قابو پایا اور مارنے کے لئے تلوار اٹھائی تو اُس نے لا الہ الا اللہ کہہ دیا، اب اس حالت میں اس کو قتل کردں یا نہیں۔ فرمایا ہرگز نہیں۔ اب اُس کو مارنا جائز نہیں اُس وقت اگر اس کو مارو گے تو تم اُس جیسے ہو جاؤ گے اور وہ تم جیسا یعنی اسلام لانے سے پہلے وہ کافر تھا کندۂ جہنم تھا اور تم مسلمان جنتی تھے۔ اب اگر اس کو قتل کرو گے تو تم دوزخی ہو جاؤ گے اور وہ جنتی کیونکہ وہ ایمان لے آیا۔ اب اُس کا دم حرام ہو گیا ہے وہ بہشتی ہو گیا ہے۔ دیکھا آپ نے کہ اسلام کا ایسا قانون ہے کہ جب تم لشکر کفار پر چڑھائی کرو اور اُن پر قابو پا جاؤ اور وہ لا الہ الا اللہ کہہ دیں خواہ محض جان بچانے کے لئے ہی کہیں اور تم کو قرائن سے معلوم بھی ہو جائے کہ محض دھوکہ سے لا الہ الا اللہ کہہ رہے ہیں جب بھی حکم ہے کہ ان کو چھوڑ دو قتل مت کرو ورنہ گنہگار ہو گے۔ کوئی بھی مذہب میں بھی اتنی رعایت دکھا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دشمن دیرینہ سالہا سال کا دشمن صرف ایک لفظ سے معاً دوست نہیں ہو سکتا خصوصاً جب کہ قرائن سے یہ بھی معلوم ہو کہ یہ کلمہ محض دھوکہ دینے کو کہا گیا ہے مگر اسلام کو اپنے کلمہ کی قوت پر

یہ تو بھروسہ ہے جو اُس کی زبان سے نکلتے ہی دشمن کو چھوڑ دینے اور دوست بنانے کا کافی ہے۔ اس میں عملاً یہ بتلا دیا گیا کہ اسلام کو ظاہری تدابیر کی ضرورت نہیں۔ اس کی قوت خود بہت کامل ہے کسی کے دھوکہ کی اس کو پرواہ نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اپنے ذاتی انوار و برکات کی وجہ سے پھیلا ہے۔ اس کی ادائیں ہی ایسی دلکش ہیں کہ قلوب کو کھینچ لیتی ہیں۔ اُس کے محاسن کو دیکھ کر لوگ خود بخود مسلمان ہوتے ہے۔ کسی نے زور زبردستی نہیں کی۔ پس ثابت ہو گیا کہ اسلام بزور شمشیر نہیں پھیلا بلکہ اپنے حسن و خوبی سے پھیلا ہے اور وہ اب بھی علیٰ حالہٖ باقی ہے۔

ہنوز آں ابر رحمت دُر فشاں است ⁂ خم و خمخانہ با مُہر و نشاں است

بھلا جس مذہب نے اتنی بڑی سپر دشمن کے ہاتھ میں دے رکھی ہو کہ زبان سے ایک کلمہ کہنے پر فوراً چھوڑ دیئے جاؤ گے کیا وہ مذہب بجبر پھیل سکتا ہے؟ جبر کی یہاں گنجائش ہی کہاں ہے۔ ہر کافر تقیہ کر کے کلمہ پڑھ کر قتل سے بچ سکتا ہے اور پھر قدرت کے وقت اپنے مذہب سابق پر عود کر سکتا ہے۔ آخر اس کی کیا وجہ کہ جن لوگوں نے بقول معترضین کے جبراً اسلام کو قبول کیا تھا وہ ساری عمر اس پر کیسے پابند کیوں ہو گئے۔ موقع پا کر آزاد ہو کر پھر اپنے پہلے مذہب پر کیوں نہ چلے گئے؟ کچھ نہیں یہ محض خیال ہی خیال ہے۔ درحقیقت اسلام کا حسن ہی ایسا ہے کہ اس کی جھلک دیکھنے کے بعد نہ ماننا دشوار ہے۔ میں نے جو اس آریہ لیکچرار کا قصہ بیان کیا ہے کہ اس نے اپنے اخلاق کی کمزوری اور اسلام کی خوبی کو خود ہی تسلیم کیا۔ یہ اس کی زبان سے کس نے کہلوایا؟ اسلام ہی کی تعلیم نے۔ اسی واسطے میں کہتا ہوں کہ کفار کے سامنے اسلام کی خوبیاں بیان کرو۔ جنگ و جدال و بحث و مباحثہ کی ضرورت نہیں کیا اس کے محاسن کم ہیں جو اُن کو چھوڑ کر جنگ و جدال میں مشغول ہوں۔ اس کے محاسن ہی کے بیان کرنے سے فرصت نہیں مل سکتی پھر لڑائی جھگڑے کی

فرصت کب مل سکتی ہے۔ مگر ہماری خود آنکھیں نہیں ہیں۔ اس لئے وہ محاسن خود ہم کو نظر نہیں آتے' دوسروں کے سامنے کیا پیش کرتے۔

اب ہماری ایسی مثال ہو گئی جیسے ایک نہایت حسین جمیل عورت ہے جس کی نظیر دنیا میں نہیں۔ مگر اس کا شوہر اندھا ہے، وہ بے چاری حسرت سے رو رہی ہے کہ ہائے مجھ میں تو یہ حُسن و جمال اور اس کا کوئی قدر دان نہیں۔ وہ یہ بھی کہتی ہے کہ غیر تو کیا سمجھیں اور کیا قدر دانی کریں گے غیر کے لئے تو نظر بھی حلال نہیں، وہ تو دیکھ بھی نہیں سکتے خود شوہر جس کے لئے دیکھنا حلال تھا وہی اندھا ہے اور اندھا بھی ایسا کہ حس کو بالکل حس ہی نہیں، کیونکہ بعضے اندھے بھی کسی طریقہ سے حسن کا پتہ لگا لیتے ہیں۔ مثلاً جس کی آواز اچھی ہو تو سمجھتے ہیں کہ یہ بڑا حسین ہے خواہ وہ بالکل ہی بدصورت ہو، چیچک رو ہو۔ مشہور ہے کہ ایک اندھے نے کہا یہ شہر بڑا اچھا ہے۔ کسی نے پوچھا کہ تجھے کیسے معلوم ہوا، اچھے بُرے کو تو کیا جانے۔ کہا اس کی سڑک ہموار ہے، عمارات چکنی چکنی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ شہر بھی اچھا ہے۔ اسی طرح اندھے سمجھتے ہیں کہ جس کی آواز اچھی ہو وہ خود بھی اچھا ہے مگر ہم ایسے اندھے ہیں کہ ہم کو اسلام کی خوبیاں کسی طرح بھی نظر نہیں آتیں ورنہ اس کا حسن تو ایسا تھا ؎

داماں نگہ تنگ گل حسن تو بسیار ✼ گل چین بہار تو ز داماں گلہ دار

گلستان میں ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص کے ایک لڑکی تھی بہت بدصورت اور داماد اندھا تھا۔ اتفاق سے ایک آنکھ بنانے والا وارد ہو گیا لوگوں نے کہا کہ اپنے داماد کا علاج کیوں نہیں کر لیتے۔ کہنے لگا اگر وہ اچھا ہو گیا تو میری لڑکی کو ضرور طلاق دے دے گا۔ تو اگر ہمارا اسلام بدشکل ہوتا تو دیکھنے والوں کی آنکھیں بننے سے ڈر لگنا بھی تعجب نہ تھا۔ مگر اسلام تو ایسا حسین ہے جس کے برابر

دنیا میں کوئی حسین نہیں مگر اُس کا قدر دان کوئی نہیں اس کے حُسن کی کسی کو خبر بھی نہیں اور غیر تو کیا جانتے خود مسلمان بھی نہیں جانتے۔

مفاسدِ چندہ

بس اب تو یہ رہ گیا ہے کہ کوئی صاحب لیکچر دینے کو کھڑے ہو گئے صدقات کے کچھ فضائل یاد کر لیے اور لمبی چوڑی تقریر کر کے غریبوں سے روپیہ وصول کر لیا۔ کوئی ان سے پوچھے کہ تم نے کیا دیا آخر تم کو بھی کچھ دینا چاہیئے یا اوروں سے ہی لوٹ کھسوٹ لینا سیکھ لیا ہے اور خود ایک پیسہ بھی داخل کرنا نہیں جانتے۔ عارف شیرازی ایسے ہی لوگوں کے بارے میں فرماتے ہیں، جو اوروں سے تو کہنے کو موجود ہوں اور خود کنارہ کش ؎

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر میکنند ؛ چوں بخلوت میروند آں کار دیگر میکنند
مشکلے دارم ز دانشمند مجلس باز پرس ؛ توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر میکنند

دوسرے کو تو کہتے ہیں ایک پیسہ دو گے تو سات سو پیسے ملیں گے۔ کیوں مولانا اور کیوں لیڈرو کیا اس انفاق میں کچھ تخصیص بھی ہے غرباء کی کہ خیر خیرات غرباء ہی کے ذمہ ہے آپ کی جیب سے کبھی ایک پیسہ کیوں نہیں نکلتا ہے ہاں ایک اعتبار سے البتہ تخصیص ہے یعنی مال کے حلال ہونے کے اعتبار سے کہ حلال مال غرباء ہی کا ہے اور ان کا مال ایسا نہیں ہے۔ ایک مولوی صاحب وعظ میں صدقہ کی فضیلت بیان کر رہے تھے کہ اس کی یوں فضیلت آئی ہے اور یوں ثواب آیا ہے۔ وعظ کہہ کر جب گھر آئے تو دیکھا کہ عورت سر سے پیر تک ننگی بیٹھی ہے انہوں نے سب زیورات صدقہ کر دیئے۔ آپ نے پوچھا آج ننگی کیسی ہو زیورات کہاں گئے۔ کہا جی میں نے سب کو صدقہ کر دیا۔ تم وعظ میں کہہ بھی رہے تھے کہ صدقہ کی یہ فضیلت ہے یہ ثواب ہے۔ کہنے لگے بے وقوف وعظ ہم نے لینے کے واسطے کہا تھا یا دینے کے لئے ۔۔۔۔ ہاں جی مولانا کا یہی احسان ہے کہ راستہ بتلا کر ہمارا مال لے لیا ورنہ ہمارا مال کون

لیتا اور ثواب کیسے ہوتا لاحول ولا قوۃ لوگوں میں کچھ حس ہی نہیں رہی خدا کے لئے تبلیغ میں تو کبھی چندہ کا نام ہی نہ لو۔ لوگ اس سے بہت گھبرا گئے ہیں۔ ان کے خیالات خراب ہو گئے ہیں کیونکہ بہت لوگ انجمنوں اور مساجد کے نام سے چندہ لے کر کھا گئے اس سے لوگ بدظن ہو گئے ہیں۔ ہر جگہ چندہ ہر جگہ چندہ لیکچر ختم ہونے نہیں پاتا کہ چندہ لاؤ۔ اکبر مرحوم نے خوب کہا ہے ؎ درپس ہر لیکچر آخر چندہ ایست۔ انہوں نے ترمیم کی ہے مولانا کے اس شعر میں ؎ درپس ہر گریہ آخر خندہ ایست۔ انہوں نے اس کو اس طرح بنایا ؎ درپس ہر لیکچر آخر چندہ ایست۔ اور دوسرا مصرعہ اصل شعر کا یہ تھا ؎ مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست۔ اس کو میں نے یوں بنایا ؎ مرد اخرہیں مبارک بندہ ایست ۔ انہوں نے مجھ سے خود کہا کہ ہم نے علماء کے تو لیے وعظ بہت سنے جن میں چندہ نہیں مانگا گیا مگر لیکچر ایک بھی ایسا نہیں سنا کہ جس کے بعد چندا نہ ہوا ہو۔ دوسرے ایک فرق اور بھی ہے کہ مولوی تو بے چارے چندہ میں چار پیسے بھی لے لیتے ہیں اور وہ چار سو پر بھی خوش نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ اگر مولوی لے کر کھالیں تو ان کے گلے سے نکال بھی سکتے ہیں اور یہاں تو لینا کیا معنیٰ وہ تمہارے ہاتھ کو بھی چبالیں۔

بس ان مفاسد کے ہوتے ہوئے اس چندہ کی مد کو حذف کرو اور اگر کام کرنا ہو تو میرے نزدیک بجائے عام چندہ جمع کرنے کے اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ایک ایک شخص ہی ایک ایک مبلغ کی تنخواہ مقرر کر دے اور اپنے متعلق انتظام رکھے اور جن کو زیادہ وسعت نہ ہو وہ دو دو چار چار دس دس پانچ پانچ ہم خیال اور ہم مشرب مل کر ایک مبلغ کا خرچ برداشت کر لیں اور کسی عالم کو مبلغ مقرر کر لیں اپنے ہی متعلق حساب کتاب رکھیں پھر نہ خیانت کا ڈر ہے نہ غبن کا خوف البتہ مبلغ کسی عالم کی رائے سے

منتخب کریں۔ اس میں خود رائی نہ کریں۔ کسی عالم سے پوچھ لیں کہ ہمارے پاس سرمایہ موجود ہے۔ آپ بتلا دیجئے کون مبلغ اس کام کے لائق ہے۔ آپ تجویز کر دیجئے۔ ہم خود اس کا خرچ دیں گے۔ یہ صورت بہت اچھی ہے جس پر رؤسا ربلا واسطہ کسی انجمن وغیرہ کے خود بھی عمل کر سکتے ہیں۔ پھر کسی انجمن یا کسی مولوی لیڈر کو گالیاں بھی نہ دے سکیں گے مگر سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ جن سے یہ کام لیا جاوے وہ اس کے اہل ہوں ایسوں کو خدمت دین کی سپرد نہ کرو جن سے اصلاح کی توقع نہیں۔ دوسرے کو جو ہدایت کرے گا پہلے وہ خود بھی تو متبع شریعت ہونا چاہئے۔ الہٰی توبہ الہٰی توبہ کل ہی دہلی میں مغرب کے وقت کسی انجمن کی طرف سے ایک صاحب فخر المساجد میں آئے۔ انھوں نے کچھ کہنا چاہا۔ صاحبو! ذرا ٹھہر جانا مجھے دو ایک بات سنانی ہے۔ رگ کچھ جلانے لگے، بعض نماز پڑھ رہے تھے آپ تقریر کے لئے آگے بڑھے بھلے مانس نے یہ بھی خیال نہ کیا کہ اس سے نمازیوں کا دل بٹے گا۔ بعض آدمیوں نے روک دیا کہ یہاں سب مسافر ہیں کچھ ملنے ملانے کا نہیں نماز پڑھنے دو۔ خیر وہ ذرا رکے پھر جوش اٹھا اور مصلے کے پاس کھڑے ہو گئے پھر روکا گیا۔ غرض دو تین دفعہ ایسے ہی کیا۔ آخر میں ناخوش ہو کر طعن سے کہتے ہیں۔ افسوس میں تو اب تک سمجھتا تھا کہ مغرب کی نماز کی تین رکعتیں ہیں۔ اب معلوم ہوا کہ بارہ رکعت ہیں۔ مطلب یہ کہ اتنی لانبی پڑھی جا رہی ہے کہ مجھ کو تقریر کا وقت ہی نہیں ملتا۔ غرض اس نے بہت ہی چاہا۔ تقریر کرنے کو مگر ایک نہ چلی اور خیر سے آپ کا لباس بھی شریعت کے موافق نہیں تھا۔ کوٹ پتلون پہنے ہوئے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اس کی تحریک کے لئے آئے تھے کہ ہندوؤں سے کوئی چیز نہ خریدی جائے اور علماء کو حکم تھا کہ اس کی تبلیغ کریں۔ سبحان اللہ آپ علماء کے سردار ہیں۔ آپ ہی علماء کو لائسنس دینے کے لئے رہ گئے ہیں گویا آپ اعلم العلماء ہیں۔ افسوس آج کل زعماء اسلام ایسے

لوگ رہ گئے جن کو نہ شریعت کی خبر نہ حلال و حرام کی پرواہ نہ لباس شرع کے موافق، نہ وضع مسلمانوں کی سی ایسی حالت میں کیا کامیابی ہو۔ بس وہی حالت ہے ؎

گر بہ میر و سگ وزیر و موش را دیوان کنند ÷ ایں چنیں ارکان دولت ملک را ویران کنند

نماز تک نہیں پڑھتے اور عمائد اسلام بنے ہوتے ہیں۔ صاحبو! اسلام کی خدمت خدمت کے قاعدہ سے کرو اور اس وقت تبلیغ اسلام کی سخت حاجت ہے اُس کیلئے اُٹھ کھڑے ہو اس کے آداب میں نے بتلا دیئے ہیں۔ اب پھر مکرر عرض کرتا ہوں کہ مبلغین کی خرچ میں مدد کرو مگر اپنے انتخاب سے کسی کو مبلغ مت بناؤ۔ نہ اپنی رائے سے کام تجویز کرو۔ علماء سے پوچھو کہ ہمیں کیا کام کرنا چاہیئے اور اُس کا کیا طریق ہے تو علماء سے یہ کام لو باقی روپیہ جمع کرنے کی مولویوں سے درخواست مت کرو کہ وہ بھیک مانگ کر تمہیں لا کر دیں۔

اب تو میں علماء کو رائے دیتا ہوں کہ ترغیب چندہ بھی نہ کریں۔ چندہ ہی کی بدولت علماء عوام کی نظروں میں ذلیل و خوار ہوتے جاتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ اس وقت ترغیب اسلام کی سخت ضرورت ہے۔ اس لئے لازم ہے کہ اس میں سب حصہ لیں اور اسلام کی خوبیاں بیان کر کر کے لوگوں کو اسلام سے مانوس کریں۔ باقی لڑائی جھگڑے سے اکثر وحشت بڑھتی ہے۔ اس کو ترک کریں۔

ترجمہ و تفسیر آیت

اب میں ترجمہ پر بیان کو ختم کرتا ہوں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: الیوم یئس الذین کفروا من دینکم فلا تخشوھم واخشون کہ آج کے دن کفار تمہارے دین سے مایوس ہو گئے یعنی اس بات سے کہ اس کو مٹائیں یا اس پر غالب آجائیں۔ یہاں بدل اشتمال محذوف ہے ای الیوم یئس الذین کفروا من دینکم ان یغلبوہ یا ان یمحقوہ کے اور وہ کیوں مایوس ہوئے؟

لکثرۃ شیوعہ ولنصرتہ تعالیٰ یعنی بحمد اللہ اس وقت اسلام اس قدر پھیل بھی گیا ہے کہ عادت الٰہیہ میں اب مٹ نہیں سکتا اور نیز اللہ تعالیٰ نے وعدہ بھی فرمالیا ہے کہ یہ قیامت تک قائم رہے گا۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ آپ نے چند دعائیں کی تھیں کہ میری اُمت ہلاک نہ ہو یہ دعا قبول ہو گئی۔ دوسری یہ دعا کی تھی کہ اس پر قحط مہلک نہ ہو یہ بھی دعا قبول ہوئی۔ تو اس میں وعدہ ہو گیا قیامت تک بقاءِ دین کا۔ تیسرے یہ کہ میری اُمت میں نا اتفاقی نہ ہو یہ قبول نہ ہوئی تو فرماتے ہیں کہ آج کے دن کفار مایوس ہو گئے تمہارے دین سے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حدیث میں ہے کہ وہ دن حجۃ الوداع کا تھا یعنی نویں تاریخ ذی الحجہ کو عرفہ کے میدان میں جمعہ کے رُوز نازل ہوئی وقت بھی عصر کا تھا۔ تو گویا جب یہ آیت نازل ہوئی وہ وقت تقریباً سال کا بھی آخر تھا ہفتہ کا بھی آخر تھا، دن کا بھی آخر تھا حضورؐ کی عمر شریف کا بھی آخر تھا، کیونکہ حجۃ الوداع کے بعد محرم، صفر اور ربیع الاوّل کی چند تاریخوں تک آپ زندہ رہے۔

کسی یہودی نے حضرت عمرؓ سے کہا تھا کہ اگر یہ آیت ہم پر نازل ہوتی تو ہم اس دن کو عید مناتے۔ پہلے یہ مرض یہودیوں میں تھا۔ اب مسلمانوں میں بھی یہ مرض ہو گیا ہے کہ ہر بات کی یادگاریں عید کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے معلوم ہے کہ یہ آیت کہاں نازل ہوئی اور کس جگہ نازل ہوئی یعنی عرفات میں حجۃ الوداع میں جمعہ کے روز نازل ہوئی ہے۔ مطلب یہ تھا کہ جہاں یہ آیت نازل ہوئی ہے وہ مقام ہمیشہ سے من جانب اللہ جائے عید ہے اور جس وقت نازل ہوئی ہے وہ زمانہ بھی من جانب اللہ عید کا ہے۔ ہمیں اور عید کی ضرورت نہیں۔ بس یہی عید کافی ہے یہ تو حقیقت تھی جو حضرت عمرؓ نے ظاہر فرما دی۔ مگر اب مسلمانوں میں ایک یہ رسم پیدا ہو گئی ہے کہ وہ یہود کی طرح ہر بات کی عید اور ہر چیز کی ایک یادگار بنانا چاہتے

ہیں۔ یاد رکھو یہ ابتداع فی الدین ہے۔ جن ایام کو شریعت نے عید بنا دیا ہے ان کے علاوہ کسی دن کو عید بنانا حرام و بدعت ہے۔ اور پہلے تو صرف یادگار کا یہی طریقہ تھا کہ اس دن کو عید بنا لیتے تھے حتیٰ کہ کسی کے مرنے کے دن کو بھی عرس کا دن بناتے تھے۔ اور اب اس کے علاوہ ایک اور نئی ایجاد ہوئی ہے کہ یادگار کے لئے ہڑتال کر دیتے ہیں۔ نہ معلوم یہ ہڑتال کیسا نام ہے، ہڑتال سے تو بال صاف کئے جاتے ہیں ہڑتال تو ان کی اور سر منڈتا ہے غریبوں اور مزدوروں کا کہ وہ بیچارے اس دن کھائیں کہاں سے کمائیں کیسے۔ کیونکہ اس دن بازار اور تمام کاروبار بند ہو جاتا ہے جس سے غریبوں اور مزدوروں کو بیحد تکلیف ہوتی ہے مگر ان کو اس کی ذرا پرواہ نہیں۔

یہ رسم بھی بعض کفار ہی سے لی ہے۔ نہ معلوم مسلمانوں میں اتباع طریقہ کفار کا اتنا شوق کیوں پیدا ہو گیا۔ اپنے بزرگوں کی حالت نہیں دیکھتے کہ وہ کیا کر گئے ہیں؟ اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی اس وقت سال کا آخر تھا، ہفتہ کا آخر تھا، دن کا بھی آخر تھا، حضورؐ کی عمر کا بھی آخر تھا۔ ان سب چیزوں کا آخر تھا۔ اس کے متعلق ایک بات طالب علموں کے کام کی ہے وہ بھی عرض کرتا ہوں کہ اس آخر سے آخر حقیقی مراد نہیں بلکہ قریب آخر کے مراد ہے۔ چنانچہ سال بھی قریب آخر کے تھا، حضورؐ کی عمر بھی قریب آخر کے تھی، دن بھی قریب آخر کے تھا اور جیسے یہ چیزیں قریب آخر کے تھیں۔ اسی طرح اس آیت کو بھی جو آخر آیات کہا جاتا ہے وہ بھی قریب آخر کے ہے آخر حقیقی نہیں۔ چنانچہ اس کے بعد فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّإِثْمٍ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ نازل ہوئی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ پس جو شخص شدت کی بھوک میں بے تاب ہو جائے بشرطیکہ کسی گناہ کی طرف اس کا میلان نہ ہو تو یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے رحم کرنے والے ہیں۔ تو ان سب میں آخر حقیقی مراد نہیں ہے بلکہ قریب آخر مراد ہے۔

اور مجھے اس سے ایک فائدہ نکالنا مقصود ہے وہ یہ کہ یہاں پر ایک اشکال ہے وہ یہ کہ جب دین کامل اور تام ہو چکا تو پھر یہ حکم اضطرار اور مخمصہ کا اس کے بعد کیسا اور اس کا یہ جواب نہیں دیا جا سکتا ہے کہ احکام کے بارے میں جو آیتیں نازل ہوئی ہیں ان میں یہ آخر ہے اس کے بعد کوئی اور حکم نازل نہیں ہوا۔ کیونکہ فمن اضطر فی مخمصۃ الآیۃ تو احکام ہی میں سے ہے اور یہ الیوم اکملت لکم دینکم الآیۃ کے بعد میں نازل ہوا ہے۔ تو پھر آخر کہاں ہوا پس جواب صحیح وہی ہے جو میں نے کہا کہ آخر سے مراد قریب آخر ہے اس پر کوئی خدشہ نہیں وارد ہوتا۔ مشکل یہ ہے کہ لوگ قرآن کو اصطلاحات منطقیہ پر اتارتے ہیں محاورہ کو نہیں دیکھتے۔ محاورہ میں قریب آخر کو بھی آخر کہا جاتا ہے۔ مثلاً کوئی کسی دوست سے ملنے جاتا ہے تو کہتا ہے اب تمہارے ساتھ میری یہ آخری ملاقات ہے اور اس کے بعد دو گھنٹہ تک بیٹھا رہتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ الیوم سے مراد خاص آج ہی کا دن نہیں جس پر یہ شبہ ہو کہ جب آج اکمال دین ہو گیا تو اس کے بعد کوئی حکم نازل نہ ہونا چاہیے اور آیات احکام میں یہ آخری آیت اور آخر احکام ہونا چاہیے۔ سو یہ شبہ اس لئے وارد نہیں ہوتا کہ الیوم سے مراد خاص آج ہی کا دن نہیں بلکہ الیوم سے مراد زمانہ حاضرہ مع متصل ماقبل و مابعد کے ہے اور محاورہ میں اس مجموعہ کو زمانہ حاضرہ ہی کہا جاتا ہے پس کسی حکم کا اس کے بعد نازل ہونا مگر نزول متصلاً باتصال حقیقی جیسا فمن اضطر متصل ہے یا باتصال عرفی جیسا اگر کسی دوسرے حکم کا نزول اس کے بعد ہو جاوے یہ اکمال بزمانہ حاضرہ کے منافی نہیں۔ الغرض حق تعالیٰ فرماتے ہیں الیوم یئس الذین کفروا کہ آج سے کافر مایوس ہو گئے تمہارے دین سے کہ اس کو مٹا دیں یا اس پر غالب آویں جب یہ بات ہے فلا تخشوھم

واخشون تو تم ان سے ڈرو مت تمہارا کچھ کر نہیں سکتے۔ اگر اسلام سے تم کو محبت ہے تو اس میں پختہ رہو، کسی سے مت ڈرو

افسوس اب بہت لوگوں کو دعویٰ ہے محبت اسلام کا اور کفار سے ڈر کر ان سے دوستی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر یہ ساتھ نہ ہوں تو ہمارا دین قائم نہیں رہ سکتا اس لئے ان سے مدد لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کا رد فرماتا ہے کہ اب وہ تمہارے دین سے مایوس ہو گئے۔ پھر تم کیوں ڈرتے ہو۔ افسوس کفار تو سمجھ گئے کہ ہم اس دین کو دنیا سے نہیں مٹا سکتے۔ چنانچہ ان کا یاس اس سمجھنے کی دلیل ہے اور مسلمان نہیں سمجھتے۔ پس ارشاد ہے فلاتخشوھم واخشون تو تم ان سے مت ڈرو۔ مجھ سے ڈرو یعنی ان کی خوشامد میں شریعت کے خلاف نہ کرو، دین کو تباہ مت کرو۔ کوئی اس دین کو مٹا ہی نہیں سکتا۔ اسلام تو وہ چیز ہے کہ ؎

چراغے را کہ ایزد بر فروزد ⁂ ہر آنکس تف زند ریشش بسوزد

کیا یہ اسلام کا معجزہ نہیں کہ فتنۂ تاتار میں چنگیز خان نے اپنے نزدیک اسلام کو فنا کر دیا تھا کیونکہ خلافت کی جڑ اکھاڑ دی تھی۔ مگر یہ اس کی حماقت تھی کہ خلافت کے مٹانے کو اسلام کا مٹانا سمجھا۔ آخر خلافت کیا ہے وہ تو اسلام کی ایک شاخ ہے۔ خدانخواستہ خلافت کے مٹ جانے سے اسلام نہیں مٹ سکتا۔ بلکہ کبھی شجر کی ایک شاخ کٹنے سے ایک اور شاخ نکل آتی ہے جو پہلی شاخ سے اچھی ہوتی ہے۔ خلافت تو فرع ہے اسلام کی۔ اس کے جانے سے کہیں اسلام مٹ سکتا ہے۔ غرض چنگیز خاں نے خلافت کی جڑ کاٹ ڈالی تھی مگر خدا نے یہ کیا کہ جنہوں نے اسلام کو مٹانا چاہا تھا، انہیں سے اسلام کی خدمت کرائی۔ چنانچہ وہی اب اسلام کو مخالفین کے حملوں سے بچا رہے ہیں۔ یعنی ترک جو چنگیز خاں کی اولاد اور خاندان اور قوم سے ہیں۔ میں نے بعض مورخین سے سنا ہے کہ اس وقت روئے زمین پر کوئی ترک نہیں جو مسلمان نہ ہو۔

اور انہوں نے اتنی بڑی خدمتِ اسلام کی ہے جس سے لوگوں کو ان کے متعلق گمان ہو گیا خلافت کا کہ وہ خلیفہ ہیں اسی لئے کہتے ہیں ؎

چراغے راکہ ایزد برفروزد ٭ ہر آنکس تف زند ریشش بسوزد

جس چراغ کو خدا روشن کرے وہ گُل نہ ہو گا۔ اس کی بیخ کُنی کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ اور یاد رکھو جس دن یہ ڈوبے گا اُس دن سب ڈوب جائیں گے۔ اسلام وہ مذہب نہیں جو دنیا سے تنہا رخصت ہو بلکہ اس کا مٹنا تمام مذاہب اور تمام عالم کا مٹنا ہے اس کی تو وہ شان ہے کہ

ع ہم تو ڈوبیں گے مگر تم کو بھی لے ڈوبیں گے

صاحبو! جس روز اسلام نہ رہے گا اس دن عالم فنا ہو جائے گا۔ اور راز اس کا یہ ہے کہ اگر کسی شہر میں سب باغی نہ ہوں بلکہ مطیع بھی ہوں تو بادشاہ ایک طرف سے اس شہر کو نہیں اڑایا کرتا بلکہ پہلے مطیعین کو وہاں سے الگ کرتا ہے پھر شہر کو اڑاتا ہے تو جب تک شہر میں مطیعین موجود ہیں اس وقت تک اطمینان رہتا ہے کہ یہ شہر ابھی نہیں اڑایا جائے گا اور جس دن مطیعین کو وہاں سے الگ کر لیا جائے پھر بستی کی خیر نہیں کیونکہ اب اس میں سارے باغی ہی باغی ہیں۔ کوئی ایسا نہیں جس کی رعایت سے شہر کو باقی رکھا جائے۔ چنانچہ قرآن میں لوط علیہ السلام کے قصہ میں بھی اسی اصل کا ذکر ہے لما جاءت رسلنا ابراھیم بالبشریٰ قالوا انا مھلکوا اھل ھذہ القریۃ ان اھلھا کانوا ظلمین۔ ابراہیم علیہ السلام سے فرشتوں نے کہا کہ ہم اس بستی کے باشندوں کو ہلاک کرنے والے ہیں۔ کیونکہ وہاں کے باشندے بڑے ظالم و شریر ہیں قال ان فیھا لوطا ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ اُن میں لوط علیہ السلام بھی تو موجود ہیں۔ اس حالت میں بستی کو کیسے ہلاک کرو گے قالوا نحن اعلم بمن فیھا فرشتوں نے کہا کہ جو وہاں رہتے ہیں ہم کو سب معلوم ہیں

لننجینہ واہلہ الا امرأتہ کانت من الغابرین ہم اُن کو اور اُن کے خاص متعلقین
متبعین کو بچالیں گے۔ مگر اُن کی عورت کو کیونکہ وہ بھی نافرمانوں میں تھی۔ دوسری جگہ
اس تنجیہ کی صورت فرماتے ہیں فاخرجنا من کان فیہا من المؤمنین فما وجدنا
فیہا غیر بیت من المسلمین کہ ہم نے جتنے ایماندار تھے سب کو وہاں سے نکال لیا
علیحدہ کر دیا اور مسلمانوں کا بجز ایک گھر کے اور کوئی گھر نہ پایا جب ان کو الگ کر دیا اب
قہر خدا نازل ہوا۔ غرض یہ خدا کی رحمت ہے کہ اگر کسی بستی میں ایک مطیع بھی موجود ہو، تو
وہاں قہر عام نازل نہیں فرماتے یہ ان کی عنایت ہے رحمت ہے۔ جب یہ سمجھ گئے تو اگر
دنیا میں ایک اللہ اللہ کہنے والا بھی موجود ہو گا تو حق تعالیٰ عالم کو فنا نہ کریں گے عالم
باقی رہے گا۔ اور اگر ایک بھی مسلمان نہ رہے تو پھر اُسی دم عالم کو فنا کر دیں گے جب بقائے عالم
اور بقائے اہل عالم اسلام پر موقوف ہے تو تمام دنیا کو اس کی خوشامد کرنا چاہیئے نہ کہ مسلمان
کسی کی خوشامد کریں اس لئے فرماتے ہیں فلا تخشوہم واخشون یعنی کفار کی خوشامد کر کے
اور اُن سے دوستی بڑھا کر اسلام کو مت کھو بیٹھو۔ ہماری خوشامد کرو ہم سے ڈرو وہ ہیں کیا
چیز۔ آگے اس کے بعد فرماتے ہیں الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی الآیۃ
اب ہم نے دین کو کامل کر دیا۔ دین ایسا کامل ہو گیا کہ اس کو دیکھ کر کسی کی ہمت نہ ہو گی اس کے
مٹانے کی واتممت علیکم نعمتی یعنی تم پر اپنی نعمت پوری کر دی۔ دو اعتبار سے ایک
قوت سے دوسرے قواعد و احکام سے۔ قوت کے اعتبار سے تو اتنا مضبوط کر دیا کہ الیوم
یئس الذین کفروا اب کفار مایوس ہو گئے ان کے اندر اتنی قوت نہیں جو اس کا مقابلہ
کر سکیں۔ سو اب اس کو مٹانے کی ان کو ہمت نہ ہو گی اور قواعد کے اعتبار سے الیوم
اکملت لکم دینکم الآیۃ یعنی قواعد و احکام کے اعتبار سے اتنا کامل کر دیا کہ قیامت تک
کے جتنے احکام ہیں سب اس سے نکل سکتے ہیں کوئی حادثہ ایسا پیش نہ آوے گا جس کا حکم
اس میں نہ ملے اگر کوئی کہے پھر اور دلائل کی کیا ضرورت ہے حدیث و اجماع امت قیاس

تو یہ بات نہیں۔ حدیث تو خود دین کا جزو ہے اور دینکم میں داخل ہے دینکم کا مقابل نہیں باقی قیاس مظہر ہے مثبت نہیں وہ احکام قیاسیہ بھی قرآن وحدیث ہی سے ثابت ہیں۔ رہا اجماع امت سو وہ اجماع کسی آیت یا حدیث ہی کے مضمون پر ہوتا ہے تو یہ سب حقیقت میں ایک ہی چیز ہوئے یعنی دین۔ صرف نام الگ الگ ہیں ایک لحاظ سے اس کا نام قرآن ہے اور ایک اعتبار سے حدیث ایک اعتبار سے اجماع امت، ایک اعتبار سے قیاس ہے

عبارا تنا شتی وحسنک واحد ⁛ وکل الی ذاک الجمال یشیر

ے بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش ⁛ من از رفتار پایت می شناسم

یہ سب ایک ہی چیز ہے کسی وقت کسی رنگ میں ہے، کسی وقت کسی لباس میں اسی کی نسبت فرماتے ہیں الیوم اکملت لکم دینکم الآیۃ یعنی تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا اور اپنی نعمت پوری کر دی ظاہراً بھی اور باطناً بھی کسی قسم کا نقص کوئی کمی اس میں نہیں رہی ورضیت لکم الاسلام دینا اور پسند کیا میں نے تمہارے لئے دین اسلام کو یہی دین خدا کے نزدیک مرضی اور پسندیدہ ہے یہاں پر ایک شبہ ہوتا ہے وہ یہ کہ رضیت کا عطف ظاہر ہے کہ اکملت و اتممت پر ہے اور معطوف علیہ مقید ہے الیوم کے ساتھ یعنی اکمال اور اتمام دین اب ہوا تو رضیت معطوف میں بھی وہ قید ہوگی۔ سو معطوف علیہ میں تو کچھ اشکال نہیں کیونکہ وہ واقعی ابھی متحقق ہوا لیکن رضیت میں کیا کہا جاوے گا۔ کیا یہ رضا بالاسلام بھی آج ہی ہوئی کیونکہ عطف کا مطلب تو یہی نکلتا ہے کہ جیسے اکمال و اتمام اب ہوا ایسے ہی یہ رضا بالاسلام بھی ابھی ہوئی، حالانکہ اسلام کو ان کے لئے پسند کرنا پہلے سے ہے یہ اشکال ہے اس کا جواب بعض نے تو یہ دیا ہے کہ اکملت پر عطف نہیں بلکہ الیوم پر ہے اب کوئی اشکال نہیں مگر یہ ضعیف توجیہ ہے کیونکہ اس میں متبادر کا ترک لازم آتا ہے محققین کہتے ہیں کہ اس تکلیف کی ضرورت نہیں کیونکہ

الیوم پر عطف ہے۔ بلکہ اہل تفسیر یہ ہے کہ یہاں ایک قید ہے یعنی رضیت لکم الاسلام دینا تابیدا مطلب یہ تو ہمیشہ سے ہے ہم نے اسی کو پسند کیا ہے یہ دنیا سے کبھی زائل نہ ہوگا کوئی اس کا مٹانے والا نہیں کوئی اس کا ناسخ نہیں جیسے اور دین پہلے بعد دیگرے منسوخ ہوتے گئے یہ ایسا نہ ہوگا ہمیشہ رہے گا سو یہ خبر بقاء الی یوم القیامۃ کی تصریحاً آج ہی ارشاد فرمائی گئی اگرچہ ختم نبوت کی خبر سے لزوماً یہ بھی معلوم ہو گیا تھا یہاں شاید کسی کو وہم ہو کہ عیسیٰ علیہ السلام تو آخر زمانہ میں آویں گے اور وہ نئے خاص احکام جاری کریں گے۔ مثلاً جزیہ کا قانون اٹھا دیں گے جو حکم اسلامی ہے یا خنزیر کی نسل کو مٹا دینے کا حکم فرماویں گے اور یہ سب ظاہراً نسخ ہے۔ جواب یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اس حیثیت سے نہ آویں گے کہ ان کو اس وقت نئی نبوت یا شریعۃ اسلامیہ کے خلاف کوئی شریعت عطا ہوگی۔ لا نبی بعدی کے یہی معنی ہیں کہ حضورؐ کے بعد کوئی جدید نبوت نہیں یعنی بعد حضورؐ کی وفات کے کسی کو جدید نبوت یا شریعۃ اسلامیہ کے خلاف کوئی شریعت عطا نہ ہوگی۔ یہ مطلب نہیں کہ کوئی پہلے کی نبوت عطا کیا ہوا نبی بھی شریعۃ اسلامیہ کا متبع ہو کر بھی دنیا میں نہ آوے گا عیسیٰ علیہ السلام تو پہلے سے نبی تھے اور شریعۃ اسلامیہ ہی کے تابع ہو کر تشریف لائیں گے اُن کا حضورؐ کے بعد آنا اور متبع ہو کر آنا لا نبی بعدی کے خلاف نہیں۔ سو وہ آکر حضورؐ ہی کی شریعت کے موافق عمل کریں گے تو لا نبی کے یہ معنی نہیں کہ کوئی پرانا نبی بھی حضورؐ کے دین کی خدمت کے لئے نہ آوے گا۔

غرض عیسیٰ علیہ السلام نازل بھی ہوں گے اور اس وقت نبی بھی ہوں گے، مگر اعطائے نبوت ان کے لئے پہلے ہو چکی ہے اور آپ نیابت کے طور پر آویں گے نہ کہ مستقل بن کر اور حاکم ہو کر بلکہ حضورؐ کے محکوم ہو کر آویں گے۔

اس میں تو حضورؐ کی اور فضیلت بڑھ گئی کہ نبی بھی حضورؐ کے خادم ہو گئے۔ حدیث میں ہے لو کان موسیٰ حیا لما وسعہ الا اتباعی کہ اگر موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے

تو وہ سوائے میرے اتباع کے اور کچھ نہ کرتے۔ آپؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ سلب نبوت کر ان کی نبوت چھین جاتی بلکہ یہ فرماتے ہیں کہ متبع ہو کر رہتے۔ غرض رضیت کے یہ معنی ہوئے کہ ہم نے ہمیشہ کے لئے اسی دین کو پسند کیا ہے پس حدیث میں جو ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نازل ہو کر جزیہ کو موقوف کر دیں گے اور اس وقت دو ہی باتیں رہ جاویں گی یا اسلام لاؤ یا قتال کرو تو وہ نسخ نہیں ہے بلکہ اس وقت کے لئے شریعت محمدیہ کا یہی قانون ہوگا جس کو عیسیٰ علیہ السلام جاری فرماویں گے۔ اور بڑے مزہ کا لطیفہ ہے کہ عیسائی لوگ منکر جہاد کے اور پر اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام نے اس مد کو کیوں رکھا۔ میں کہتا ہوں کہ اپنے پیغمبر سے ہی پوچھیو وہ عنقریب آنے والے ہیں فانتظروا انا منتظرون۔ حضورؐ نے تو پھر بھی تمہاری رعایت کی ہے کہ جزیہ دے کر بچا سکتے ہو۔ عیسیٰ علیہ السلام نے تو اس کی بھی پرواہ نہ کی۔ ان کے عہد میں دو ہی باتیں ہوں گی یا اسلام یا سیف غرض عیسیٰ علیہ السلام حکم اسلامی قدیم کو منسوخ نہ فرماویں گے کہ پہلے جزیہ کا حکم تھا اور آپ اس کو اٹھا دیں گے تاکہ ان کو ناسخ کہا جاوے۔

پھر رضیت لکم الاسلام دینا تابیدا پر شبہ کیا جاوے کہ تابید تو جب ہوتی کہ اسلام کا ہر حکم قیامت تک رہتا۔ سو جواب ظاہر ہے کہ اس حکم کو عیسیٰ علیہ السلام نے منسوخ نہیں کیا بلکہ حضورؐ ہی نے منسوخ کیا ہے۔ پس اس حدیث میں کہ یضع الجزیۃ خبر بمعنی انشاء ہے۔ یعنی حضورؐ ہی خود یہ حد مقرر کر گئے ہیں کہ اے عیسیٰ جب تم آؤ اس وقت کفار کے ساتھ یہ معاملہ برتنا۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ طبیب نے کسی مریض کو مسہل دیا اور اس سے کہہ دیا کہ مسہل لینے کے بعد یہ ٹھنڈائی پیئے گا تو اب مریض جو ٹھنڈائی پیتا ہے یہ اس کی ایجاد نہیں بلکہ طبیب ہی کا کہنا پورا کرتا ہے طبیب ہی نے بتلا دیا تھا کہ تین روز کے بعد تبرید تجویز ہو گی۔ اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کو حکم ہے کہ اس وقت آپ جزیہ کو موقوف کر دیں۔ عیسیٰ علیہ السلام اپنی طرف سے ایجاد نہیں کریں گے۔ بلکہ آپ ہی کے

فرمان کو بجالاویں گے غرض ان الدین عند اللہ الاسلام (خدا کے نزدیک دین پسندیدہ اسلام ہی ہے) اور رضیت لکم الاسلام دیناً کے معنی یہ ہیں کہ ہمیشہ یہی دین رہے گا۔ آگے ایک نکتہ ہے اہل علم کے لئے وہ یہ کہ فمن اضطر فی مخمصۃ الآیۃ یہ حکم یہاں بظاہر بے جوڑ معلوم ہوتا ہے۔ ماقبل کے ساتھ اس آیت کا ربط نہیں معلوم ہوتا کہ یا تو ابھی تکمیل اسلام کی بشارت دی جا رہی ہے یا اب فمن اضطر فی مخمصۃ کا حکم نازل فرما دیا اور پھر اس مضمون کو فآ کے ساتھ لائے جو ترتیب کے لئے آتا ہے تو بعض نے تو اس اشکال سے گھبرا کر یہ کہہ دیا کہ فآ۔ ترتیب ذکری کے لئے ہے ترتیب حکمی کے لئے نہیں۔ لہذا حکم کا مرتب ہونا اور مسلسل ہونا ضروری نہیں۔ مگر الحمد للہ میری سمجھ میں آگیا ہے کہ یہاں پر فآ ترتیب حکمی ہی کے لئے ہے اور پھر بھی اشکال نہیں چنانچہ عنقریب مذکور ہوگا۔ باقی جن لوگوں نے فآ کو ترتیب ذکری کے لئے قرار دیا ہے، اُن پر ایک اشکال پھر بھی باقی رہتا ہے وہ یہ کہ اس مضمون کو ماقبل سے کیا جوڑ ہوا اس بے ربطی کا کیا جواب ہے۔ انہوں نے اس کا بھی ایک جواب دیا ہے وہ یہ کہ الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا یہ بیچ میں آگیا ہے فمن اضطر فی مخمصۃ کا ربط اُس کے ماقبل سے ہے کہ اول میں حلال وحرام چیزوں کا ذکر تھا حرمت علیکم المیتۃ والدم ولحم الخنزیر وما اھل لغیر اللہ بہ والمنخنقۃ والموقوذۃ و المتردیۃ والنطیحۃ وما اکل السبع الا ما ذکیتم وما ذبح علی النصب وان تستقسموا بالازلام ذلکم فسق یہ احکام حق تعالیٰ نے پہلے ذکر فرمائے ہیں۔ ان احکام کے ساتھ فمن اضطر فی مخمصۃ الخ مرتبط ہے کہ یہ چیزیں جو ہم نے بیان کی ہیں ہیں تو حرام مگر مضطر کے لئے جائز ہیں، اور الیوم اکملت لکم بیچ میں جملہ معترضہ ہے اور جملہ معترضہ کو بھی اول سے کچھ مناسبت

ہوتی ہے وہ مناسبت یہ ہے کہ دیکھو اسلام میں کیسے کیسے قواعد ہیں اور چونکہ خدا تعالیٰ کو اسلام کا اکمال مقصود ہے۔ اس لئے دیکھو اللہ میاں نے سارے ضروری احکام بتلا دیئے تاکہ کسی طرح کمی نہ رہ جائے۔ یہ تو مشہور جواب ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ اگر فاء ترتیب حکمی ہی کے لئے ہو پھر بھی کچھ اشکال نہیں اور جو اشکال کیا گیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ فمن اضطر فی مخمصۃ غیر متجانف لاثم کا ترتیب الیوم اکملت لکم دینکم الخ پر ہو سکتا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ہم نے تمہارے دین کو مکمل کیا اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کیا اور تمہارے لئے اس دین کو ہمیشہ کے لئے پسند کیا۔ آگے ارشاد ہے فمن اضطر فی مخمصۃ الخ یعنی ہم اتنے کامل النعمۃ ہیں اور تم سے اتنے خوش ہیں اور ہماری اس قدر تم پر رحمت ہے۔ بعض حالات میں تمہاری راحت و سہولت و مصلحت کے لئے حرام کو بھی حلال کر دیتے ہیں۔ اس پر فاء کا ترتب نہایت لطیف اور چسپاں ہو گیا۔ اور اس میں ایک اور لطیفہ بھی ہو گیا وہ یہ کہ اس میں اشارہ ہے سبقت رحمتی علی غضبی کی طرف۔ چنانچہ آیت کو ختم بھی رحمت پر کیا ہے یعنی غفور رحیم پر، گویا اشارہ ہے اس طرف کہ اے بندو! ہمارے احکام کو تنگ مت سمجھو، احکام میں کوئی تنگی نہیں ہے جہاں تنگی کا وہم ہے جیسے تحریم محرمات وہاں بھی رحم کی رعایت ہوتی ہے۔ بخدا میں دعوے سے کہتا ہوں کہ دین میں کوئی تنگی اور حرج نہیں ہے۔ میرا ایک وعظ ہے نفی الحرج وہ چھپ گیا ہے اس میں ثابت کر دیا گیا ہے کہ دین میں تنگی بالکل نہیں ہے کسی قسم کی رکاوٹ اس میں نہیں ہے۔ اس کو دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ واقعی دین میں کوئی تنگی نہیں ہے۔ اب ایک اشکال وارد ہوتا ہے اس کا جواب دے کر بیان کو ختم کرتا ہوں وہ یہ کہ میں نے تو کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے رحمت پر اپنے کلام کو ختم فرمایا ہے۔ چنانچہ تکمیل دین کے مضمون کو اس پر ختم کیا ہے کہ ہماری اتنی رحمت ہے کہ کبھی حرام کو

بھی حلال کر دیتے ہیں اور غفور رحیم میں رحمت کی تصریح فرما دی مگر یہ ثابت ہے کہ سب سے آخر آیت قرآن کی یہ ہے واتقوا یوماً ترجعون فیہ الی اللّٰہ ثم توفی کل نفس ما کسبت وھم لا یظلمون یعنی ڈرو تم اس دن سے جس روز تم اللہ تعالیٰ کے پیشی میں لائے جاؤ گے پھر ہر شخص کو اپنے کئے ہوئے کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور اُن پر کسی قسم کا ظلم نہ ہوگا اور اس میں ظاہر ہے کہ وعید کا مضمون ہے سو اس سے تو ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کو وعید پر ختم کیا ہے۔

اور یہاں کلام کو وعید پر ختم کرنے کی ایک وجہ بھی علماء نے لکھی ہے کہ جو کلام آخر میں ہوتا ہے وہی نقش دل رہتا ہے اور اس کا اثر قلوب پر زیادہ رہتا ہے تو اس نقل میں اور میرے قول میں تعارض ہو گیا کیونکہ میں نے تو لکھا تھا کہ مضمون رحمت پر کلام ختم ہوا ہے اور اس نقل سے معلوم ہوا وعید پر ختم ہوا ہے۔ سو رفع اس تعارض کا یہ ہے کہ کلام تو رحمت ہی پر ختم ہوا ہے مگر اس مصلحت سے کہ اس رحمت پر نظر کر کے کوئی بالکل لاپروائی نہ کرنے لگے ذرا سی دھمکی بھی دے دی۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے احکام میں تو بالکل تنگی نہیں، بہت آسان احکام ہیں لیکن اگر سہل سہل احکام پر بھی عمل نہ کرو گے تو تمہاری کم بختی آوے گی کہ اتنی تو تم پر رحمت کی بالکل ہلکے ہلکے احکام نازل کئے پھر اگر اس میں بھی کاہلی برتو گے تو بس جان تباہی میں آجائے گی تو یہ آیت ہماری تقریر کے مخالف نہ ہوئی بلکہ اس سے رحمت کی اور تائید ہو گئی اس کی ایسی مثال ہے کہ بچہ کو سبق آسان بتلا دیا اور اس کی یاد کی بھی آسان صورت بتلا دی پھر اگر اس میں بھی وہ شوخی اور سستی کرے تو اس کے کان کھینچ لئے، تاکہ اس ڈر کے مارے سبق جلدی یاد کر لے اور پھر دس روپیہ انعام کے لے لے۔ اس صورت میں سبق تو اس کا بالکل آسان تھا مگر وہ لاپروائی سے یاد نہیں کرتا اس لئے تنبیہاً اس کے کان کھینچ لئے تاکہ اس کو یاد کرے تو یہ گوشمالی بھی رحمت ہی کا اثر ہے۔

بہرحال تعارض نہ رہا۔ اب میں ختم کرتا ہوں۔

حاصل آیت

خلاصہ اس آیت کا یہ ہوا کہ اللہ تعالےٰ نے اس آیت میں نعمت اسلام کا کامل اور تام ہونا ذکر فرمایا ہے تاکہ اس نعمت پر متنبہ ہوکر اس کا شکر بجالاویں اور شکریہ ہے کہ اس کے فضائل و برکات خود بھی حاصل کریں اور دوسروں کو بھی اس سے بہرہ ور کریں۔ دوسروں کے سامنے بھی اس کے فضائل و برکات بیان کریں تبلیغ کریں جس کی خصوصاً اس وقت سخت ضرورت ہے۔ خلاصہ یہ کہ اپنی بھی اصلاح کریں اور دوسروں کی بھی اصلاح کریں، ان کو ترغیب دیں ادھر متوجہ کریں، قرآن میں جہاں نماز روزہ زکوٰۃ کا حکم ہے وہاں امر بالمعروف کا بھی حکم ہے اس لئے امر بالمعروف بھی کریں مگر خوبصورتی کے ساتھ، کسی سے لڑے بھڑے نہیں اور جیسے نماز باوجود فرض ہونے کے کبھی کبھی کسی عذر کے ساقط ہوجاتی ہے جیسے حائض سے نماز ساقط ہوجاتی ہے اسی طرح یہاں بھی اعذار و قیود ہیں۔ اسی لئے میں نے کہا ہے کہ جو کچھ کرو علماء سے پوچھ کر کرو۔ وہ ہر ایک کے مناسب کام بتادیں گے۔ کسی کے تصنیف کا کام سپرد کردیں گے۔ کسی کو زبانی تبلیغ و اشاعت کے لئے تجویز کریں گے۔ کسی کو مالی امداد کا مشورہ دیں گے۔ کسی کو دعاء کا حکم کریں گے کہ تم دعاء ہی کرتے رہو، اور دعاء کا کام تو سب ہی کرسکتے ہیں اور کام کرنے والے بھی اس میں شریک رہیں۔ اب دعاء کیجئے کہ خداوند کریم فہم سلیم عطا فرماویں اور ہم کو ظاہری و باطنی اصلاح کی توفیق بخشیں۔ آمین

الاتمام لنعمۃ الاسلام ؎۲

کے بارے میں

نعمتِ اسلام مکمّل دین ہے

یہ وعظ حاجی کرم الٰہی صاحب کے مکان پر نظامت نارنول ریاست پٹیالہ میں ۲۲ شوال سنہ ۱۳۴۱ھ بروز جمعہ صبح کے وقت ساڑھے تین گھنٹے تک بیٹھ کر ارشاد فرمایا —— مرد سامعین کی تعداد ڈیڑھ ہزار تھی، مستورات اس کے علاوہ تھیں۔

مولوی اطہر علی صاحب سلہٹی نے اسے قلمبند فرمایا۔

جو شخص اپنے سر پر ایسے مالک کو مانے گا جو ہر طرح سے کامل ہے۔ اس کا ثمرہ خاص یہ ہوگا کہ اس کے دل میں خُدا تعالیٰ کی ہیبت و عظمت ہوگی۔ کیونکہ بادشاہ جتنا کامل ہوگا اتنی ہی محبت وہیبت زیادہ ہوگی ہے۔

پھر حق تعالیٰ ایسے جمیل ہیں کہ کوئی ان کے جمال کے قریب قریب بھی نہیں

(از حضرت حکیمُ الاُمّت)

خطبہ : اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم ۰ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۰ الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا۔

تمہید

یہ ایک لمبی آیت کا ٹکڑا ہے، اس کے متعلق ریواڑی میں کچھ بیان ہو گیا تھا آج پھر اسی کا اعادہ اس وجہ سے کیا گیا کہ اس کے متعلق کچھ تفصیل کی حاجت تھی، وہاں اس کے بیان کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اس لیے اب اس کی کچھ تفصیل کی جائے گی۔ ہر چند کہ وہ تفصیل بھی پوری مفصل نہیں مگر اس اجمال کے مقابلہ میں ضرور تفصیل ہے

پسندیدہ نعمت

اس اجمال کا حاصل یہ تھا کہ حق تعالیٰ نے اس آیت میں ایک بڑی نعمت کا ذکر فرمایا ہے اور وہ نعمت اسلام ہے۔ حق تعالیٰ نے ہم کو اس کے کامل ہونے کی بشارت دیدی ہے، اور اس کو پسند کرنے کی خبر دی ہے۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ بہت ہی بڑی نعمت ہے اس سے خدا تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے اور بڑی نعمت مسلمانوں کیلئے حق تعالیٰ کی رضا ہی ہے تو حق تعالیٰ نے اسلام کو ہمارے لیئے پسند بھی کیا اور اس کو کامل بھی کر دیا۔ یعنی وہ نعمت اپنی ذات میں بھی کامل ہے اور صفات میں بھی کہ اس کو پسند بھی فرمایا ہے تو اس سے بڑھ کر اور کیا نعمت ہوگی؟ دیکھیئے اگر کوئی چیز فی نفسہ مکمل ہو اور بادشاہ کو پسند نہ ہو

تو وہ کچھ بھی کمال نہیں سمجھا جاتا۔ کیوں کہ جب بادشاہ ہی اُس سے راضی نہیں ہے تو پھر اس کمال سے کیا فائدہ ؟ اور اگر وہ فی نفسہ کامل بھی نہ ہو مگر بادشاہ کو پسند ہے تو کافی ہے اور اگر وہ چیز فی نفسہ بھی کامل ہو اور بادشاہ کو بھی پسند ہو' تو پھر کیا کہنا ، یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے، نورٌ علیٰ نور ہے۔ تو اسلام ایسی نعمت ہے کہ حق تعالیٰ نے اس کو پسند بھی کیا ہے اور کامل بھی کیا ہے تو اس کا اثر یہ ہوگا کہ جس شخص کے پاس یہ دولت ہوگی اس سے وہ راضی بھی ہوگا تو یہ بہت بڑی نعمت ہوئی کہ اپنی ذات میں بھی کامل ہے اس کے ساتھ اس سے خوشنودیِ حق بھی حاصل ہے۔ خوب سمجھ لو۔

اقسامِ نعمت

اب ایک دوسری طرح سمجھو کہ نعمت دو قسم کی ہوتی ہے اور اس کو میں اس لئے بیان کرتا ہوں تاکہ معلوم ہوجائے کہ وہ کتنی بڑی نعمت ہے اور یہ اندازہ ہوجائے کہ اسلام کتنی عظیم الشان نعمت ہے اور ہم اس کا کیا حق ادا کرتے ہیں اور ہم کو کیا کرنا چاہیئے تھا غرض نعمتیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک دنیا کی نعمتیں جیسے کھانا، پینا، مال وجاہ و اولاد، مکان، زمین جائیداد وغیرہ۔ یعنی وہ نعمتیں کہ دنیا میں ان کا نفع حاصل ہوتا ہے اور ان کی راحت محدود ہے اور ایک آخرت کی نعمتیں یعنی وہ نعمتیں کہ ان کے منافع آخرت میں حاصل ہوتے ہیں اور ان کا نفع کبھی زائل نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ نعمتیں باقی اور دائمی ہیں جیسے جنت کا ملنا، حور وغلمان کا ملنا، جنت میں باغ کا ملنا اور طرح طرح کی راحت اور لذت ملنا، کسی قسم کا غم نہ ہونا۔ دنیا میں خواہ کتنی ہی بڑی خوشی ہو اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ رنج ضرور ہوتا ہے۔ راحت کے ساتھ کلفت ملی ہوتی ہے، مگر آخرت میں کوئی غم کسی قسم کا رنج پاس نہ پھٹکے گا اور دنیا کی نعمتیں تو دو چار روز کے بعد زائل ہو ہی جاتی ہیں کوئی نہ کوئی نقصان اس میں ضرور آہی جاتا ہے مگر نعمائے اخروی ابداً لآباد کیلئے ہیں یعنی ختم نہ ہوں گی، غرض نعمت کی دو قسمیں ہیں ایک دنیوی ایک اُخروی دنیا کی نعمت تو کبھی ختم ہوجائے گی اور کوئی نعمت کلفت

سے خالی بھی نہیں ہے، کچھ نہ کچھ کلفت سب کے اندر ہے۔ دیکھئے کھانا ایک نعمت ہے اسمیں کتنی محنت ہے پھر یہ محنتیں بھی دو قسم کی ہیں ایک وہ جو قبل کھانے کے ہیں جیسے اول زمین کھودی جائے پھر اُس کو ہموار کیا جائے دھوپ کے محتاج ہیں، بارش کی ضرورت ہے اگر بارش نہ ہوا تو کنویں سے سینچائی کیجائے، پھر ہل چلانا، اس کے واسطے بیل کی ضرورت ہے، پھر بیلوں کے رہنے کو ایک مکان چاہیے، اس مکان کی درستی کا بھی خیال رکھنا، پھر اُن کے چرانے کیلئے ایک آدمی ساتھ رہے، خواہ دھوپ ہو یا بارش ہو سب چرانے والے کے سر پر کبھی بیل نہیں ہوتا تو خریدنا پڑتا ہے اسمیں کبھی روپیہ پاس نہیں ہوتا قرض لینا پڑتا ہے پھر کبھی بیل مر بھی جاتا ہے تو صدمہ اور زیادہ ہوتا ہے۔ ایک تو بیل کا صدمہ پھر قرض کا بار زمین درست کر کے تخم ڈالا کبھی دانہ نہیں اُگا، پھر دوبارہ ڈالنا پڑتا ہے۔ اور اگر دانہ جم آیا تو اس کی حفاظت کیواسطے ایک آدمی چاہیے، اور جو آدمی نہ ہوا تو خود زمیندار کو اپنا مکان چھوڑ کر جنگل میں رہنا پڑتا ہے۔ پھر اس مصیبت کے بعد کبھی کھیت قابل کٹنے کے ہوئے تو دفعۃً اولا گر کر ساری کھیتی خراب ہو گئی تو بے حد صدمہ ہوتا ہے۔ یہ کلفتیں تو کھیتی سے پہلی کی ہیں پھر کھانے کے ساتھ کی کلفتیں یہ ہیں کہ کبھی مرچ زیادہ ہو گئی تو تکلیف ہو رہی ہے کبھی نمک زیادہ ہو گیا تو کھایا نہ گیا۔ کبھی کچا رہ گیا تو لطف نہیں آتا، کبھی جل گیا تو بے لطفی رہی کبھی گرم گرم لقمہ منہ میں ڈالا تو منہ جل گیا۔ کبھی گلے میں اٹک گیا پھر تو جان پر نوبت آجاتی ہے اور پھر کھانے کے بعد یہ کلفتیں ہیں کبھی ایک دو لقمہ زیادہ کھالیا تو گرانی ہو گئی کبھی قبض ہو جاتا ہے کبھی دستانے لگتے ہیں ہیضہ ہو جاتا ہے کبھی تے ہو جاتی ہے کبھی اور کوئی مرض ہو جاتا ہے۔ اب حکیم کو بلاؤ ڈاکٹر کو بلاؤ اب کہیں نسخہ پیا جا رہا ہے کہیں چورن کھایا جا رہا ہے۔ دیکھئے اتنی کلفتیں بھگتنے کے بعد تب کہیں دو لقمے ملتے ہیں اسی طرح ہر نعمت کے ساتھ کچھ نہ کچھ کلفتیں ضرور ہیں بخلاف نعمت اخروی کے جب وہ ملیگی پھر کبھی ختم نہ ہوگی۔ بلکہ ہمیشہ رہیگی، پھر اسمیں کوئی رنج نہیں، کوئی کلفت ومشقت نہیں ابتداء سے انتہا تک خوشی ہی خوشی ہے ابتداء دخول جنت سے تو یہ برتاؤ ہوگا۔ وسیق الذین اتقوا ربہم الی الجنۃ زمرا حتی اذا جاؤھا وفتحت ابوابھا جب

جنت کے پاس پہونچیں گے، اور دروازہ کھولدیا جاویگا۔ یہ گویا ابتداء ہوگی اس نعمت کے عطا ہونے کی۔ گویا ابتداءِ عطائے نعمت کی یہ ہوئی کہ فرشتہ کے ذریعے سے حکم ہوگا کہ داخل ہو جاؤ جنت کے اندر۔ اور داخلہ اس طرح ہو گا کہ ان کے جاتے ہی دروازہ کھولدیا جائے گا اس وقت ایک خاص فرحت ہوگی۔ پھر دوسری فرحت یہ ہوگی۔ وقال لهم خزنتها سلام علیکم طبتم فادخلوها خالدین۔ فرشتے دعا دیں گے سلامتی کی، کہ سلامتی ہو تم پر، خوشحال رہو جنت میں داخل ہو جاؤ فادخلوها خالدین پھر ساتھ ہی خلود کی بشارت بھی دیں گے . . . . . . یہ سامان تو ابتدا کا ہے پھر بہشت کے اندر جائیں گے تو اس وقت خوش ہو کر کہیں گے وقالوا الحمد للہ الذی صدقنا وعدہ واورثنا الارض نتبوأ من الجنة حیث نشاء فنعم اجر العاملین۔ یعنی وہاں کے حالات دیکھ کر خوش ہو کر کہیں گے کہ سب تعریف اس ذات کو ہے جس نے وعدہ کو سچا کیا اور ہم کو ارض جنت کا مالک بنا دیا کہ جہاں چاہیں اس میں چل پھر سکتے ہیں۔ پوری آزادی ہے کسی طرح کی رکاوٹ نہیں۔ ہر طرح سے آرام ہے، جو چاہو گے، وہی ہو گا۔ مثلاً کسی کو مکان میں بیٹھے بیٹھے یہ خیال ہوا کہ اس پر چھت نہ ہو خیال کرتے ہی معاً ایسا ہی ہو جاوے گا۔ نگاہ اٹھا کر دیکھا ، تو چھت ندارد کھلا ہوا مکان ہے۔ یا کوئی پرندہ کہیں بیٹھا ہوا ہے کسی کا خیال ہوا کہ اس کے کباب کھاؤں، بس فوراً کباب بن کر قاب کے اندر حاضر۔ ایک منٹ کی بھی دیر نہیں اور پھر دیکھا تو وہی جانور وہاں بیٹھا ہوا ہے یا کسی نے کوئی پھل بہت خوشنما کھانے کیلئے توڑا اس کے اندر سے ایک حور عجیب غریب حسین و خوبصورت نکل آئی کہ السلام علیکم پھل رہا الگ اور مفت میں ایک حور ہاتھ آگئی غرض وہاں کی عجیب و غریب حالت ہے اور دنیا کی نعمتیں دو چار دن کے بعد نہ رہیں گی۔ کبھی نہ کبھی ختم ہو ہی جائیں گی اور وہاں کی نعمت ہمیشہ باقی ہے کبھی اس کو زوال اور فنا نہیں۔

دینی نعمت میں کمال

پھر یہ کہ یہاں کی لذت کی یہ حالت ہے کہ اگر آپ ہمیشہ کھایا جائے تو اخیر میں طبیعت اکتا جاتی ہے یا کبھی کوئی مرض

پیدا ہو جاتا ہے' دست آنے لگتے ہیں قبض ہو جاتا ہے۔ وغیرہ ذالک اور اگر یہ بھی نہ ہو تو انقطاع تو ضرور ہو جاتا ہے ہمیشہ میسر نہیں آتی اور وہاں اگر کوئی میوہ پسند ہو اور کھانے کو جی چاہے اور ہمیشہ کھائیں تو کھاتے رہو کچھ ڈر نہیں نہ پیشاب ہے، نہ پاخانہ ہے، نہ مرض کا خوف ہے' صرف پسینہ آیا اور ڈکار لی اور سب کھانا ہضم ہو گیا اور کوئی بکھیڑا ہی نہیں اور پسینہ بھی مشک کی طرح خوشبودار' اور ڈکار بھی اس قدر خوشبودار کہ کبھی سونگھی بھی نہ ہو گی عفونت اور بدبو کا وہاں بالکل نام نہیں۔ بہر حال وہاں ایسی ایسی نعمتیں ہیں کہ نعمائے دنیوی کو ان سے کچھ نسبت ہی نہیں تو اس سے معلوم ہوا کہ دینی نعمت بہت زیادہ کامل ہے، دنیوی نعمت سے

نعمت اسلام

جب یہ سمجھ گئے تو اب سمجھو کہ آخرت کی نعمت بغیر اسلام کے کبھی نصیب نہ ہو گی۔ تو اب بتلاؤ جب ان کی جڑ اسلام ہے اور وہ نعمتیں ایسی ہیں کہ دنیا کی نعمتیں ان کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں اور اسلام سے وہ نعمتیں ملتی ہیں تو اسلام کتنی بڑی دولت ہوئی۔ پھر کیا یہ زیرکی اور عقلمندی ہے کہ ایسی چیز کو چھوڑ کر نعمت فانی کے طالب ہیں اور ہم تمہاری خاطر سے کچھ عذر بھی مان لیتے اگر اسلام سے دنیا کی نعمتیں نہ ملتیں۔ مگر اس میں تو دنیوی نعمتیں بھی ملتی ہیں یعنی اگر کوئی اسلام قبول کرے تو دنیا میں بھی کوئی نعمت اس کی برابر کسی کو نہیں مل سکتی اس کو میں عنقریب ثابت کر دوں گا بہر حال اسلام کے اندر جب دنیوی نعمتیں بھی موجود اور اخروی کی تو وہ جڑ ہی ہے تو اس کی برابر کونسی نعمت کامل ہو گی؟ تو حق تعالیٰ نے اسلام کا نعمت ہونا اس آیت میں بیان فرمایا ہے۔

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی اور یہ بھی بتلایا ہے کہ وہ نعمت کاملہ ہے اور نعمت تامہ ہے پھر اس کا دین ہونا بھی ظاہر فرمایا ہے ان چند اوصاف میں کوئی تو اس کا علم ہے اور کوئی لقب ہے غرض یہ ایسا مضمون ہے کہ اس میں کوئی خفا نہیں پس فرماتے ہیں کہ اسلام دین کامل ہے نعمت کاملہ ہے اسلام دین پسندیدہ ہے جب

ایسی نعمت ہے تو اس کا حق بھی ایسا ہی ہوگا یعنی ہر نعمت کا ایک حق ہوتا ہے تو نعمت اسلام کا بھی ایک حق ضرور ہوگا اور ہر نعمت کا حق یہ ہوتا ہے کہ اس سے نفع حاصل کرو تو اس کا بھی یہی حق ہوگا کہ اس سے نفع حاصل کرو یعنی اسکو کامل کرو اس سے اپنی حالت کو درست کرو تو اس کے آثار و برکات تمکو حاصل ہوں گے اس کے فیوض سے آپ بہرہ یاب ہوں گے یہ تو ایک موٹی بات تھی۔ دوسری ایک باریک بات اسمیں ہے۔

امر بالمعروف جسکا بیان اس وقت مقصود ہے وہ یہ کہ ابھی معلوم ہوا کہ نعمت کا حق یہ ہے کہ اس کو کامل طور پر حاصل کیا جائے تو اسلام کا بھی ہم پر یہ حق ہوا کہ ہم اسے کامل طور پر حاصل کریں اب سمجھیئے کہ اسلام کیوں کہ کامل ہوتا ہے تو شریعت نے بتلا دیا ہے کہ جیسے اسلام بغیر صوم وصلوٰۃ کے کامل نہیں ہوتا ایسے ہی اور ایک چیز ہے کہ اس کے بدون بھی اسلام کامل نہیں ہوتا اس کا بیان یہ ہے کہ ہم نے جو احکام کو دیکھا تو جہاں اقیموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ کا حکم ہے یعنی نماز ادا کرو، زکوٰۃ دو۔ اور کتب علیکم الصیام یعنی تم پر روزہ فرض ہے اور اتموا الحج والعمرۃ للہ یعنی حج کا بھی حکم ہے۔ یہ سارے احکام تو ہم پر فرض ہیں ہی نماز روزہ حج زکوٰۃ سب ہی کے ادا کرنے کا حکم ہے اور اتل ما اوحی الیک من الکتاب میں تلاوت قرآن کا بھی حکم پایا۔ ان احکام کے ساتھ ہی ایک حکم یہ بھی فرمایا ہے وامر بالمعروف وانہ عن المنکر یعنی دوسروں کو بھی بھلائی کا حکم کرو اور برائی سے روکو اور یہ حکم احکام مذکورہ کے متقابل نہیں بلکہ جہاں نماز کا حکم ہے وہاں ہی امر بالمعروف کا بھی حکم ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ یٰبنی اقم الصلوٰۃ وامر بالمعروف وانہ عن المنکر اور ارشاد ہے والمؤمنون والمؤمنات بعضھم اولیاء بعض یامرون بالمعروف وینھون عن المنکر ویقیمون الصلوٰۃ ویؤتون الزکوٰۃ ویطیعون اللہ ورسولہ اُولٰئک سیرحمھم اللہ ان اللہ عزیز حکیم اور جہاں جنت کا وعدہ ہے وہاں نماز کے ساتھ امر بالمعروف کا وصف بھی مذکور ہے۔ چنانچہ آیت بالا میں ان اوصاف کے

بعد ہی ارشاد ہے۔ والمؤمنین والمؤمنات جنات جہاں ان کے اور فضائل بیان کئے گئے ہیں اس کے ساتھ یہ بھی مذکور ہے کہ وہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرتے ہیں سو حکم تو یہ ہے کہ جیسے اور احکام فرض ہیں ایسے ہی امر بالمعروف بھی فرض ہے مگر حالت ہماری یہ ہے کہ اس کا بالکل خیال ہی نہیں اول تو ہم لوگوں کو خود دین ہی کی طرف توجہ نہیں اور جو دیندار ہیں بھی، ان کی حالت یہ ہے کہ صرف اپنی کمیلی کی تو خیر مناتے ہیں مگر دوسروں کی خبر نہیں کسی کو نہ نیک کام کی ترغیب دیتے ہیں اور نہ برائی سے روکتے ہیں۔ گویا یہ حکم قرآن میں ہے ہی نہیں اور غیروں کو تو کیا کرتے خود اپنے گھر والوں سے بھی پوچھ گچھ نہیں کرتے؟ حالانکہ جیسے اپنے اوپر عمل کرنا فرض ہے ایسے ہی اپنے اہل و عیال کو عمل کیلئے کہنا بھی فرض ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں قوا انفسکم واھلیکم نارا اور خاص حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہے وامر اھلک بالصلوٰۃ یعنی خود بھی نماز ادا کیجئے اور اپنے گھر والوں کو بھی حکم کیجئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والے کیا نماز نہیں پڑھتے تھے؟ ان جیسا تو نمازی بننا مشکل ہے لیکن اس کے ساتھ ہی جو آپ کو حکم ہوا ہے کہ اہل بیت کو نماز کا حکم کیجئے تو اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص کرتا بھی رہے اسے بھی کہتے رہو۔ دیکھو جب بچہ قرآن ختم کرتا ہے تو جو شفیق استاد ہوتا ہے وہ اس سے کہتا رہتا ہے کہ بھائی اس کو بھول مت جانا بلکہ دو ایک منزل ہمیشہ پڑھتے رہنا شفیق استاد یہ نہیں کرتا کہ میں نے تو اب ختم کرا دیا آگے وہ جانے اس کا کام جانے یا تم نے اپنے کسی عزیز کو حساب سکھلایا ہو تو اسے کہتے رہتے ہو کہ دیکھو روزانہ ایک دو سوال نکال لیا کرو۔ نہیں تو بھول جاؤ گے اور پھر اس پر بس نہیں کرتے بلکہ روز یا دوسرے تیسرے دن اس سے پوچھتے رہتے ہو کہ سوال نکالا تھا یا نہیں اگر کسی دن اس نے سستی کی تو ڈانٹتے ہو اسی طرح اپنی اولاد اور اپنے بچے کو بیماری میں آپ نے سکھلا دیا کہ تم کو فلاں چیز مضر ہے۔ دماغ خراب کرتی ہے اس سے پٹھے خراب ہو جاتے ہیں رطوبت پیدا کرتی ہے کھائی مت کھانا وہ یہ نقصانات کریگی اور وہ سمجھ

بھی گیا کہ یہ شئے مضر ہے مگر پھر بھی تم دوسرے تیسرے دن کہتے رہتے ہو دیکھو کبھی کھٹائی نہ کھانا اب وہ کہتا ہے کہ میں نے تو سمجھ لیا ہے سن لیا ہے پھر روزانہ کہنے کی ضرورت کیا؟ تو اس سے کہتے ہو کہ بھائی محبت کا تقاضا ہوتا ہے اس لیے کہتا ہوں یہ نہ ہو کہ کبھی غلطی سے کھا جاؤ۔ اور نقصان کرے تو۔ اسی طرح حق سبحانہ وتعالیٰ نے حضورؐ کو فرمایا کہ اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم کیجئے باوجودیکہ حضرات ازواج مطہرات اس کی نہایت پابند تھیں اور ایسی کامل ولیات تھیں کہ اُن کے فضائل قرآن میں جا بجا موجود ہیں ایک مقام پر تو یہ تصریح ہے کہ۔

یانساء النبی لستن کاحد من النساء کہ تم اور عورتوں جیسی نہیں ہو۔ کیا اسی طرح بے نمازیوں کے فضائل میں ایسا خطاب ہو سکتا ہے ہرگز نہیں مگر پھر بھی حکم ہوتا ہے۔ وامر اھلک بالصلوٰۃ اپنے گھر والوں سے نماز کیلئے کہتے رہو کہنا مت چھوڑو واقعی کہنے کی بڑی برکت ہے دیکھا جاتا ہے کہ بڑے بڑے متقی نیک لوگ بھی چند روز کے بعد عمل میں کچیا جاتے ہیں کہنے سننے سے پھر تنبہ ہو جاتا ہے اور اسی لیئے تو صحبت نیک کی تاکید آئی ہے وجہ یہ ہے کہ اس سے عمل میں پختگی ہوتی ہے صحبت کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ چنانچہ بے نمازی آدمی چند روز نمازیوں میں رہنے سے نمازی ہو جاتا ہے اور نمازی بے نمازیوں کی صحبت سے چند دنوں میں بے نمازی ہو جاتا ہے پس کوئی اپنے کمال پر ناز نہ کرے میں بڑا نمازی ہوں یہ سب نمازیوں کے پاس رہنے کی برکت ہے پس یا تو اپنے سے بڑوں میں رہو اور اگر بڑے میسر نہ ہوں تو چھوٹوں میں ہی رہو بشرطیکہ وہ نیک اور صالح ہوں۔ بڑے کے پاس رہنے سے تو اس کی صحبت کا اثر اپنے اندر ہو گا اس کے حالات کو دیکھ کر ذوق شوق پیدا ہو گا اور کوئی لغزش ہو جائے تو وہ روک ٹوک کریگا اور چھوٹوں کی صحبت سے ان کے اعمال صالحہ کو دیکھ کر شرم آئے گی کہ ہائے اتنے چھوٹے چھوٹے بچے تو کیا کچھ کرتے ہیں کسقدر خوف خدا ان میں ہے کس پابندی سے احکام کو ادا کرتے ہیں اور ہم نہیں کرتے بڑی شرم کی بات ہے غرض جسطرح بڑے سے نفع ہوتا ہے ایسے

ہی کبھی چھوٹے سے بھی نفع ہوتا ہے۔ یہی راز ہے صحبت کا کہ اس سے عمل میں پختگی ہوتی ہے غرض حضور کو حکم ہے وامر اھلک بالصلوٰۃ کہ اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم کیجئے جب حضور کو یہ حکم ہے تو اوروں کے گھر والوں کا کیا حال ہو گا؟ انہیں تو تاکید کرنا بہت ہی ضروری ہو گا مگر ہمارا یہ حال ہے کہ جب کوئی گھر میں جاتا ہے تو اول سوال یہ ہوتا ہے کہ روٹی پکی یا نہیں؟ کرتہ سلگیا یا باقی ہے؟ ہانڈی پک گئی یا نہیں؟ یہ ساری باتیں تو پوچھی جاتی ہیں مگر نماز کا کہیں ذکر ہی نہیں کہ تم نے نماز بھی پڑھی یا نہیں؟ جب گھر والوں کے ساتھ ہمارا یہ حال ہے تو غیروں کیساتھ کیسا ہو گا؟ خیال فرمائیے کہ اگر تمہارے کسی دوست کا روپیہ رات میں گر پڑے تو تم پر حق یہ ہے کہ اسے اٹھا کر دیدو اور اس سے کہو کہ اچھی طرح باندھ کر رکھو اور ایسا ہی کرتے بھی ہیں یہ نہیں کرتے کہ روپیہ کو راستہ ہی میں پڑا رہنے دیں کہ ہمیں کہنے کی کیا ضرورت ہے یہ کوئی بچہ ہے خود خیال کیوں نہیں کرتا نہیں نہیں بلکہ روپیہ کو ضرور اٹھا کر دیتے ہیں کیوں کہ سمجھتے ہیں کہ یہ دوست ہے اس سے بیچارے کو نفع ہو گا لاؤ اٹھا کر دیدو اور سمجھا دو یہ اس کے کام آویگا اسی طرح مسلمان کو چاہیے کہ جب اپنے بھائی مسلمان کو دیکھے کہ نماز نہیں پڑھتا ہے اور اس کی نماز چھوٹ گئی ہے۔ تو یہ سمجھے کہ گویا اس کا روپیہ کھو یا گیا بلکہ روپیہ اور اشرفی کی بھی اس کے سامنے کیا حقیقت؟ تو اسکو بھی ضرور سمجھا دو مگر یہاں یہ کہتے ہو کہ ہمیں کیا غرض پڑی؟ کیوں صاحبو کیا نماز روپیہ سے بھی کم ہے؟

طرزِ نصیحت

ہاں تم ایک عذر کرو گے کہ وہاں تو بتلانے سے دوسرا احسان مانے گا اور یہاں برا مانتا ہے۔ حضرت یہ کوئی عذر نہیں تم کہنے کے طریقے سے کہو ہرگز کوئی برا نہ مانے گا اس طرح کیوں کہتے ہو جس سے دوسرا بھڑک اٹھے تم تو کہتے ہو طعن و تشنیع سے۔ اس سے بے نمازی تو کیا جو نمازی ہے وہ بھی برا مانے گا مگر یہ مرض ایسا عام ہو گیا ہے کہ جو بے نمازی کبھی نماز کیواسطے آتا ہے اس پر ضرور طعن کرتے ہیں۔ قصبہ چرتھاول میں ایک مسجد میں ایک مولوی صاحب مہمان تھے نماز کیوقت ایک بے نمازی بھی مسجد میں آگیا تو اس بیچارے کو لوگ شرمندہ کرنے لگے او ہو آج کیسے آگئے کیا راستہ بھول گئے

مولوی صاحب بڑے دانشمند تھے انہوں نے فرمایا تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ نماز نہیں پڑھتے ممکن ہے گھر میں پڑھ لیتے ہوں لوگ کہنے لگے اجی یہ تو بتاتا کہ پھر مسجد میں کیوں نہیں آتا کوئی لنجا لنگڑا تو نہیں اندھا تو نہیں کوئی عذر نہیں فرمایا کہ بھائی کوئی عذر ہوگا جو تمہیں معلوم نہیں انکی صورت سے تو نور معلوم ہوتا ہے یہ بے نمازی تو نہیں ہے وہ شخص کہتا تھا کہ میں دنیا بھر کے وعظ سے بھی نماز نہ پڑھتا مگر ان کی تھوڑی سی طرفداری سے پکا نمازی بن گیا تو صاحبو! کہنے کا اثر کیوں نہ ہوا اور دوسرا بُرا کیوں مانے تم اس طریقے سے کہہ کر تو دیکھو اب تو طعن سے کہتے ہیں۔ یوں تو اگر اٹھا کر روپیہ بھی طعن سے دو تو دوسرا ضرور بُرا مانیگا۔ مثلاً اتنے زور سے اس کے اوپر مارو کہ آنکھ ہی پھوڑ دو تو ضرور برا مانے گا غرض بُرے طریقے سے کہا جاوے گا تو دوسرا ضرور برا مانے گا خواہ روپیہ کا معاملہ ہو یا نماز کا معاملہ اور اچھے طریقے سے ممنون ہوگا۔ ایک دفعہ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب نے مجلس وعظ میں ایک شخص کو دیکھا کہ اس کا پاجامہ ٹخنوں سے نیچا ہے اپنے وعظ میں تو کچھ نہ فرمایا جب وعظ ختم ہوا۔ اور وہ مصافحہ کیلئے آیا فرمایا کہ آپ ذرا ٹھہر جائیں مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے وہ ڈرا کہ اب مجھے لتاڑیں گے جب سب لوگ چلے گئے تو آپ نے اس کو بلایا۔ اب ظاہر میں تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اس سے یوں فرماتے کہ پاجامہ ٹخنوں سے لٹکانا حرام ہے مگر وہ تو حکیم تھے دیکھا یہاں یہ طرز نافع نہ ہوگا۔ فرمایا کہ بھائی میرے اندر ایک عیب ہے چونکہ اپنے عیوب خود کو معلوم نہیں ہوا کرتے لہٰذا تم کو دکھلاتا ہوں ذرا دیکھنا وہ عیب میرے اندر ہے یا نہیں وہ یہ کہ میرا پاجامہ ٹخنوں سے نیچا ہو جاتا ہے میں تمہارے سامنے کھڑا ہوتا ہوں دیکھنا ٹخنوں سے نیچے تو نہیں ہوتا کیونکہ اکثر میرا پاجامہ نیچے لٹک جاتا ہے اور حدیث میں ہے جو شخص مسبل ازار ہے یعنی پاجامہ ٹخنوں سے نیچے پہنتا ہے وہ دوزخ میں جاوے گا اور جتنی بھی وعیدیں اس بارہ میں آئیں تھیں سب اس بہانہ سے اس کے کان میں ڈالدیں اور کہا میں کھڑا ہوتا ہوں ذرا دیکھنا وہ پیروں میں گر پڑا اور کہا حضرت آپ میں یہ عیب کیوں ہوتا یہ عیب تو مجھ میں ہے۔ میں توبہ کرتا ہوں آئندہ نہیں

کروں گا۔ تو کہنے کا ایک یہ بھی طریقہ ہوتا ہے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک بار میرٹھ تشریف لائے ان کے پاس ایک خانصاحب آیا کرتے تھے وہ داڑھی چڑھاتے تھے اور ٹخنوں سے نیچے پاجامہ پہنتے تھے لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت یہ شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور اس کا یہ حال ہے اس کو نصیحت کر دیجئے اب مولانا کا طرزِ نصیحت دیکھئے میں کہتا ہوں جس کو نصیحت کرنا ہو اس کا طریقہ بزرگوں سے سیکھ لے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ نصیحت نہ کرے بلکہ طریقہ سیکھے نصیحت سب کرو مگر بزرگوں سے سیکھ کر۔ صاحبو! ہر چیز حاصل کرنے سے حاصل ہوتی ہے کوئی چیز یوں ہی نہیں آیا کرتی اور حاصل کرنے کی صورت یہ ہے کہ اُن کے پاس رہو ان سے پوچھتے رہو وہ بتلادیں گے۔ یاد رکھو نصیحت میں سختی نہ کرو لطافت اور نرمی سے کہو اور اگر ممکن ہو دوسروں پر رکھ کر سنا دو۔ مولانا رومیؒ کا شعر ہے۔

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں — گفتہ آید در حدیث دیگراں

دوسروں پر رکھ کر سب کچھ کہہ بھی لو اور کسی کا دل بھی نہ دکھے۔ اب مولانا کی نصیحت دیکھئے فرماتے ہیں کہ بھائی میں تو کہہ دیتا مگر خانصاحب بڑے پکے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ یہ اپنی وضع کے بہت پابند ہیں۔ جب تک اس فعل کی برائی سمجھ میں نہ آوے گی اس وقت تک چھوڑیں گے نہیں اور جب سمجھ لیں گے تو آپ ہی چھوڑ دیں گے۔ کسی کے کہنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ اُن سے جو یہ واقعہ کہا گیا تو وہ پگھل ہی تو گئے اسی وقت توبہ کی اور کہا کہاں میں اور کہاں مولانا مگر پھر بھی۔ مولانا نے میری کتنی بڑی رعایت کی۔ اسی طرح کانپور میں ایک شخص داڑھی منڈاتے تھے اور مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔ ایک بار ایک شخص سے کہا کہ مجھ کو حاضری کا بہت شوق ہے مگر میں داڑھی منڈا ہوں۔ اس لئے سامنے آتے ہوئے شرم آتی ہے۔ میں نے جواب دیا شرم کی کوئی بات نہیں تمہارے اندر ظاہری عیب ہے میرے اندر باطنی عیوب ہیں اس کے بعد وہ مجھ سے ملنے آئے۔ تو پہلی دفعہ تو منڈی ہوئی داڑھی نظر آتی تھی مگر جب دوسری دفعہ آئے تو داڑھی پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے اور جب تیسری یا چوتھی دفعہ آئے تو داڑھی تمام تھی۔

اقسامِ نصیحت

بعض اوقات کچھ نہ کہنے کا بھی اثر ہوتا ہے چنانچہ میں ایک دفعہ ریل میں سفر کر رہا تھا اسمیں ایک ڈپٹی کلکٹر بھی سوار تھے جب نماز کا وقت آیا ہم نے ریل میں نماز پڑھی اور وہ ویسے ہی بیٹھے رہے۔ میرے ایک دوست کہ وہ بھی ڈپٹی کلکٹر تھے اس سفر میں رفیق تھے انہوں نے مجھ سے کہا کہ ان کو تم سے محبت معلوم ہوتی ہے تم ان سے کہو تو نماز پڑھ لیں گے میں نے کہا کہ مجھے کہنے کی کیا ضرورت ہے، یہ کوئی بچے ہیں کہ میں کہوں گا تو سمجھیں گے ورنہ نہیں سمجھیں گے۔ بالآخر ہم نے ان سے کچھ نہیں کہا اور نماز پڑھ لی اور حقیقت میں سب کچھ کہا مگر اس طریقہ سے کہا کہ دوسروں کو علم بھی نہ ہوا اور اثر ہو گیا۔ اب ان کا یہ گمان تھا کہ جب یہ نماز پڑھ کر بیٹھیں گے تو بولیں گے بھی نہیں۔ مگر میں پھر ویسے ہی بشاشت سے باتیں کرنے لگا اس سے ان پر یہ اثر ہوا کہ وہ پکے نمازی ہو گئے پھر وہ ہمارے ضلع میں پولیس کے سپرنٹنڈنٹ ہو گئے تھے اور وطن میں مجھ سے ملے تھے مجھ سے یہ بھی کہا میرا جی چاہتا ہے کہ تمہارے پیچھے نماز پڑھوں اس وقت نماز ایک دوسرے امام پڑھاتے تھے میں نے اُن سے اجازت لے لی کیونکہ وہ تو دراصل میرے ہی نائب تھے تو کہنے کا بھی طریقہ ہوتا ہے کہنا کبھی صریح ہوتا ہے کبھی تدبیر سے موقع محل کا خیال کرنا چاہیے مگر فکر کہنے کی ہو۔ اگر اسی دُھن میں لگے رہو تو یہ طریقے بھی معلوم کرنیکا شوق ہو گا مگر یہاں تو یہ فکر ہی نہیں بلکہ اپنی خیر منائی جاتی ہے اور نصیحت کریں گے بھی تو برے طریقہ سے جیسے دوسرے کے سر پر کلہاڑی مار دی جائے اس کی بھی پرواہ نہیں کہ کس طرح کہنے سے فائدہ ہو گا؟ کیوں کہ نصیحت کے بھی اقسام ہیں کبھی نصیحت قالی ہوتی ہے کبھی حالی۔ مولانا فرماتے ہیں۔ ؎

گرچہ تفسیر زباں روشن گر ست ٭ لیک عشق بے زباں روشن تر ست

جہاں جو طریقہ مناسب ہو اسی کو اختیار کرنا چاہیئے اور ہر موقع پر مختلف طریقوں سے نصیحت کرنا چاہئے اگر ایک طریقہ مفید ثابت نہ ہو تو دوسرے طور سے کرے پیچھا نہ چھوڑے

دیکھو جب اپنے لڑکے کو نصیحت کرتے ہیں تو کبھی مارتے ہیں کبھی پیار کرتے ہیں کبھی پیسے دیتے ہیں مٹھائی کھلاتے ہیں کبھی لڑکے کے سامنے اگر دوسرا یہ کہتا ہے کہ یہ لڑکا خراب ہے یا بدشوق ہے تو تم کہتے ہو کہ نہیں ایسا نہیں وہ تو مدرسہ میں جاتا ہے اگر شوقین نہ ہوتا تو مدرسہ میں کیوں جاتا فضول تم اس کے سر ہوتے ہو اس سے تعریف مقصود نہیں ہوتی بلکہ ترغیب مقصود ہوتی ہے کبھی کہہ دیتے ہو کہ بھائی تمہاری چھٹی ہے اور اس سے مقصود تعطیل نہیں ہوتی بلکہ مقصود پڑھوانا ہے کہ آج تمہاری چھٹی ہے جلدی سے چار دفعہ سبق اور کہہ لو وہ چھٹی کا نام سن کر خوشی خوشی کہہ لیتا ہے غرض سب کو ایک لکڑی سے مت ہانکو مواقع اور مراتب کا لحاظ رکھو۔ ایسا نہ کرو جیسے ہمارے یہاں عقلمندوں کا ایک قصبہ ہے ضلع سہارنپور میں وہاں ایک شخص اپنے باپ سے کہا کرتا تھا کہ میں تو آپ کو بجائے باپ ہی کے سمجھتا ہوں خواہ آپ مجھے کچھ ہی سمجھیں۔ دیکھئے نامعقول باپ سے کہتا ہے کہ میں آپکو بجائے باپ کے سمجھتا ہوں۔ اسی طرح ضلع مظفر نگر میں ایک قصبہ ہے وہاں کا ایک قصہ ہے کہ ایک شخص ایک معاملہ میں اپنے باپ سے کہتا ہے کہ آپ اپنے اخلاق درست کیجئے ذرا اس نامعقول کا کلام تو دیکھئے قرآن میں تو حکم ہے کہ والدین کا ادب کرو اُن کی تعظیم کرو حتیٰ کہ اگر وہ کافر بھی ہوں تب بھی اُن کے ساتھ شائستگی برتو دیکھئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو نصیحت کی کیونکہ وہ کافر تھے مگر کس خوبی سے فرماتے ہیں۔ یا ابت لم تعبد ما لا یسمع و لا یبصر و لا یغنی عنک شیئا۔ اے میرے باپ! اے ابا جان! اولاً یا ابت سے بڑا یہ لفظ ہی ایسا ہے کہ جس سے باپ پگھل جاتا ہے۔ کیونکہ باپ کو اپنی طرف نسبت کرنے سے اُس پر خاص اثر ہوتا ہے جیسے بیٹے کو کہو اے میرے بیٹے تو اس کا خاص اثر ہوتا ہے اسی طرح یہ کہنا کہ اے میرے ابا اس کا بہت زیادہ اثر ہوتا ہے اس کا وہ اثر ہے جو تلوار کا بھی نہیں تو اولاً تو یہ لفظ ہی غضب کا موثر ہے پھر فرماتے ہیں کہ آپ ایسی چیز کی عبادت کیوں کرتے ہیں جو نہ دیکھے نہ سنے نہ کچھ فائدہ ہی پہنچا سکے اس کی عبادت کیوں کرتے ہیں دیکھئے کس خوبی سے تبلیغ

کی یہ نہیں کہ لٹھ سا مار دیں بلکہ اوّل تو اس میں اُن کے طریقہ کی مذمت بیان کی پھر فرماتے ہیں۔ یا ابت انی قد جاءنی من العلم مالم یاتک فاتبعنی اھدک صراطا سویا۔ یہاں بھی مکرر وہی لفظ ہے یا ابت۔ شاید کسی کو وہم ہو کہ ایک دفعہ یا ابت کہہ چکے ہیں پھر بار بار یا ابت یا ابت دھرانے کی کیا ضرورت؟ جواب یہ ہے کہ وہاں کوئی لکچر تو دینا تھا نہیں وہاں تو دل سوزی کی ضرورت تھی اس لیئے بار بار وہی لفظ استعمال کرنا چاہیے جس سے دل پگھل جائے تو فرماتے ہیں یا ابت انی قد جاءنی من العلم مالم یاتک فاتبعنی۔ اے میرے باپ اے ابا جان اب مجھے خدا نے ایسا علم دیا ہے جو آپ کو نہیں آپ میرا اتباع کیا کیجئے اھدک صراطا سویا میں آپ کو سیدھا رستہ بتلاؤنگا جسمیں کوئی کجی اور زیغ نہیں ہے جب سارے دلائل بطلان کے بیان کر چکے تو اب بطور تفریع کے فرماتے ہیں۔ یا ابت لا تعبد الشیطان ان الشیطان کان للرحمٰن عصیا۔ پیارے ابا۔ شیطان کی پرستش نہ کیجئے بظاہر تو وہ بت کو پوجتے تھے شیطان کی عبادت نہیں کرتے تھے مگر واقع میں وہ شیطان ہی تھا کیوں کہ عبادت اصنام کا امر وہی کرتا ہے اس لیئے بجائے صنم کے شیطان فرمایا جسمیں اس پر تنبیہ تھی کہ عبادت اصنام درحقیقت عبادت شیطان ہے اور شیطان کو آپ بھی برا جانتے ہیں پھر جس کو آپ خود بھی برا جانتے ہیں ایسے کی عبادت کیوں کرتے ہیں؟ اس کو چھوڑ دیجئے یا ابت انی اخاف ان یمسک عذاب من الرحمٰن فتکون للشیطان ولیا۔ غرض یہاں انہوں نے چار دفعہ یا ابت یا ابت کہا۔ اور یہ بھی جب ہے کہ آذر باپ ہو کیونکہ اس میں دو قول ہیں بعض نے کہا کہ آذر باپ تھا اور بعض نے کہا چچا تھا باقی راجح قول یہی ہے کہ باپ تھا اور یہ قول مرجوح ہے کہ چچا تھا اور باپ مجازاً کہدیا اگر باپ ہو تو دیکھئے کس قدر ادب سے پیش آئے اور اگر چچا ہو تب تو اور زیادہ ادب ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے چچا کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جو کوئی اپنے باپ کے ساتھ بھی نہیں کرتا بلکہ بجائے ادب کے اب تو یہ ہے کہ اگر باپ سے کوئی بات خلاف مرضی کے ہو جائے تو اُس کو بھی حقیر اور ذلیل کرتے ہیں۔ بہر حال نصیحت اگر

ادب و شفقت کیا جاتا ہو تو اس کا خاص اثر ہوتا ہے۔ کالجی کا ذکر ہے کہ جامع مسجد میں ایک مسافر عطر فروش جمعہ کی نماز پڑھنے گیا اتفاق سے ایک داروغہ صاحب بھی جماعت میں شریک تھے جماعت کے بعد لوگ حسب معمول سنتیں پڑھنے لگے داروغہ صاحب بھی ولائتی طریقے سے سنتیں پڑھنے لگے جسمیں ارکان کی تعدیل نہ تھی جب انہوں نے سلام پھیرا اس گندھی نے سامنے آکر سلام کیا اور کہا داروغہ جی کچھ عرض کرنا ہے حضور آپ کی نماز ٹھیک نہیں ہوئی اسے پھر پڑھیئے وہ بڑے خفا ہوئے کیوں کہ وہ تو دروغ بات کو پسند کرتے ہیں داروغہ ہی جو ٹھہرے وہ سچی بات کیوں سنتے مارے غصہ کے آگ بن گئے کہ نالائق بیہودہ تیری یہ جرأت کہ مجھے نصیحت کرتا ہے اس نے کہا نہیں میں نصیحت نہیں کرتا میں اس قابل کہاں مگر میرا دل دکھتا ہے مجھے آپ کے وقت کا بڑا قلق ہے کہ آپ نے اتنی محنت کی اور یوں ہی رائیگاں جا رہی ہے اس سے اور خفا ہوئے کہ خبردار چپ رہ مگر اس نے پیچھا نہ چھوڑا حتیٰ کہ داروغہ نے اس کو مارا بھی مگر اس نے کہا اور مار لیجئے جی بھر کر پیٹ لیجئے مگر جب تک نماز اچھی طرح نہ پڑھو گے مسجد سے نکلنے نہ دوں گا میں نے تمہاری مار پٹائی سب معاف کی کیوں کہ تم حقیقت سمجھتے نہیں اس لئے معذور ہو اب داروغہ عاجز آ گیا اس نے ہر چند ڈانٹا دھمکایا مارا پیٹا مگر کسی طرح چھٹکارا نہیں ملتا اس شور و غل میں چاروں طرف سے لوگ جمع ہو گئے لوگوں نے داروغہ ہی کو ملامت کی کہ اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے؟ ایک مسلمان خیر خواہی کرتا ہے اور تم سختی کرتے ہو نماز دہرانے میں تو تمہارا ہی نفع ہے اب وہ نماز پڑھنے کو کھڑے ہوئے سوچا اگر ویسی ہی پڑھوں گا تو پھر پکڑا جاؤں گا لہذا تعدیل کے ساتھ پڑھنی چاہیے اب تو ایسی نماز پڑھی کہ شاید ان کی سات پشت تک بھی کسی نے ایسی نماز نہ پڑھی ہوگی گویا جنید بغدادیؒ نماز پڑھ رہے ہیں پھر اس گندھی نے معافی چاہی کہ میں نے آپکو تکلیف دی داروغہ نے کہا کہ آپ مجھے معاف کر دیجئے اور بزبان حال کہا ؎

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی ❁ مرا با جان جاں ہمراز کردی

ابتو داروغہ جی راست جی ہو گئے تو دیکھئے یہ بھی طریقہ ہے نصیحت کا اسمیں ثواب تو انشاء اللہ

ملا ہی اس کے ساتھ دنیوی نفع یہ ہوا کہ لوگ اس گندی کے معتقد ہو گئے اُسے بزرگ سمجھنے لگے پہلے تو وہ گندہ تھا اب طیب ہو گیا ساری بستی میں اس قصہ کی شہرت ہو گئی اب یہ جدھر جاتا ہے لوگ کہتے ہیں حضرت ذرا یہاں بیٹھ جائیے کوئی دکان پر بٹھاتا ہے .... کوئی گھر لیجاتا ہے کہ برکت ہو گی کوئی پان کھلاتا ہے کوئی شربت پلاتا ہے کوئی جلیبی پیش کرتا ہے اس نے کہا بھائی میں کوئی بزرگ نہیں ہوں میں تو معمولی عطر فروش آدمی ہوں اس سے لوگ اور معتقد ہو گئے کہا اچھا اور کچھ نہیں تو عطر مول دیدیجئے اب لوگ ضرورت سے نہیں بلکہ تبرکاً عطر خریدتے ہیں داموں میں بھی کچھ تکرار نہیں کرتے کہ اگر زیادہ بھی چلے جائیں گے تو برکت ہو گی غرض اس کا عطر خوب بکا اور دین کی ایک بات سے دنیا کا بھی فائدہ ہو گیا میں نے تو کہا تھا کہ دین کی درستی سے دنیا کا بھی نفع ہوتا ہے اس میں کا ایک شعبہ یہ بھی ہے مگر اس میں دنیا کی نیت نہ کرنا چاہیے بلکہ خلوص ہونا چاہیئے برکت خلوص ہی سے ہوتی ہے۔

خلوصِ نیت

مگر آجکل خلوص نیت ہی نہیں رہا بلکہ جو کام بھی دین کا کرتے ہیں۔ اس میں دنیا کی پخ لگی ہوتی ہے اپنے گھر میں وعظ کہلواتے ہیں شہرت کیلئے تاکہ لوگ کہیں کہ فلاں کے یہاں وعظ ہوا تھا اور کسی نیک کام میں چندہ دیا تاکہ شہرت ہو کہ فلاں نے پچاس روپے دیئے ہیں کوئی سیکرٹری بننا چاہتا ہے کوئی صدر ہونا چاہتا ہے پھر اس کیلئے کسی کو ساتھ بھی لیجاویں گے کہ تم میری صدارت کی تحریک کرنا اور فلانے تم تائید کرنا اور تائید کرنیوالے بکثرت ایسے جاہل کودن ہوتے ہیں کہ ان کو وہاں سبق پڑھایا جاتا ہے کہ میں یوں کہوں گا تم یہ کہنا خانہ ساز سازشیں ہوتی ہیں کہ میں یہ تقریر کروں گا تم اس طرح تائید کرنا اور وہ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ حقیقت کو سمجھتے بھی نہیں غلط سلط جو زبان پر آتا ہے کہہ جاتے ہیں۔ غلط پر ایک قصہ یاد آیا۔ کانپور میں ایک جلسہ میں کوئی صاحب ایک مہاجن کو اپنی تائید کیلئے لیگئے اوّل تو اسے گھر پڑھا کر لیگئے تھے کہ میں تقریر کرونگا تو تم یہ کہنا کہ میں بھی تائید کرتا ہوں وہ بیچارہ محض ہندی پڑھا ہوا تھا اس نے عمر بھر کبھی تائید کا لفظ سنا نہ تھا کیونکہ عربی

کا لفظ ہے اس کے منہ سے نکلتا نہ تھا ٹاؤن ہال میں جلسہ تھا سب تو تقریریں سن رہے تھے۔
اُدھر اُدھر دیکھ رہے تھے مگر یہ بیچارہ اس لفظ کو یاد کر رہا تھا پریشان تھا کہ کب وہ شخص ختم
کرے تا کہ جلدی سے میں یہ لفظ کہہ کر اس مصیبت سے رہائی پاؤں دل سے بوجھ اترے
جب انہوں نے تقریر کی تو اس نے کھڑے ہو کر کہا صاحبو میں بھی اس کی تردید کرتا ہوں
وہ پڑھانیوالے آنکھیں دکھلاتے ہیں گھورتے ہیں اس نے تو سارا کیا کرایا ناس کر دیا اگر وہ
تو اچھا تھا کیونکہ یہ تو بجائے تائید کے تردید کرنے لگا آنکھوں کے گھورنے سے وہ کچھ سمجھا کہ
شاید غلطی کی تو جلدی سے اس نے کہا نہیں صاحبو ہم تاریدکرتے ہیں یہ کوئی لفظ ہی نہ
مہمل بے معنی تھے انہوں نے پھر اشارہ سے دھمکایا تو وہ کہتا ہے کہ میں تاکید کرتا ہوں
اس نے بہت کوشش کی مگر وہ لفظ منہ سے نہ نکلا پھر ایسے شخص سے تائید کرانا مقصود
نہیں تو کیا ہے مگر بات کیا ہے وہی شہرت اور نمود اس لئے اس کے آثار بھی ایسے
ہیں کہ ثمرہ کچھ نہیں محض کاغذ پری۔ میں ایک دفعہ ڈیگ علاقہ بھرت پور میں گیا تھا و
شخص مجھ سے ملے وہ کسی انجمن کے سکریٹری تھے مجھ سے کہنے لگے کہ یہاں کے مسلمان
کی تائید نہیں کرتے ہیں میں نے کہا اس انجمن کے مقاصد کیا ہیں؟ کہا۔ تعلیم علم دین ا
تکفین و تجہیز موتی۔ یتامیٰ کی امداد۔ مساجد کی مرمت۔ میں نے کہا بعضے کام تو کسی د
تنہا بھی کر سکتے ہیں مثلاً علم دین سکھانا ہے تو علم دین کے دو درجے ہیں ایک اعلیٰ ا
اگر آپ اعلیٰ درجہ کا نہیں کر سکتے ادنیٰ درجہ کا تو کر سکتے ہیں مثلاً یسپارہ اور رسالہ ابد کو
اور راہ نجات یہ تو آپ پڑھا سکتے ہیں کہا ہاں۔ پھر میں نے پوچھا کہ تم بھی اتنا کرتے
جواب دیا نہیں میں نے کہا پھر فضول مسلمانوں کی شکایت کرتے ہو تم سے تو خود انجمن کی
ہوتی نہیں دوسروں کو بدنام کرتے ہو خدا کی قسم تم کام کرنے لگو تو لوگ خود ہی کھنچ
لگے آج کل یہ بھی ایک مصیبت ہے کہ غیر کا عیب تو نظر آتا ہے اور اپنی بغل میں
در گنده ذخیره بھرا ہو مگر کچھ خبر نہیں۔ ہے

ہر یکے ناصح برائے دیگراں ⁂ ناصح خود یافتم کم در جہاں

ہر شخص غیر کا شاکی ہے پھر میں نے کہا اگر مردہ مر جائے اور تم کفن میں مدد نہ کر سکو قبر تک تو جا سکتے ہو معلوم ہوا کہ سیکریٹری صاحب دفن کرنے بھی کبھی نہیں گئے اور سچ کہتا ہوں کہ اگر وہ ایسے کام کرتے تو جو لوگ ان کاموں میں اعانت نہیں کرتے سب کرنے لگتے۔ مسجد کی مرمت نہ ہو سکے تو دیا چٹائی ہی دیدو۔ باقی یہ خوب رہی کہ تم حکومت کرو اور سب تمہارے غلام بنے رہیں حالانکہ سید القوم خادمھم یہ بزرگوں کا قول ہے اس پر میں دو بزرگوں کا واقعہ بیان کرتا ہوں کہ ایک دو بزرگوں کو سفر درپیش ہوا تو آپس میں کہنے لگے کہ شریعت کا حکم ہے سفر میں ایک سردار ہونا چاہیئے تاکہ انتظامات درست ہوں اس کے موافق ایک حاکم بنا ایک محکوم جو سردار تھے انہوں نے منزل پر پہونچتے ہی خود خیمہ گاڑا پانی لائے روٹی پکائی محکوم نے کہا اجی پھر میں کاہے کے واسطے ساتھ ہوا تھا کہنے لگے کہ دیکھو تم نے مجھے سردار بنالیا ہے تو میرا کہنا مانو لہٰذا ساکت بیٹھے رہو وہ کہنے لگے کہ اس سے تو میں ہی سردار ہو جاتا تو اچھا تھا کہنے لگے آئندہ کو تم ہو جانا صاحبو! ہمارے بزرگوں کی تو یہ عادت تھی کہ بڑے بن کر سب کے خادم ہو جاتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب بیت المقدس عیسائیوں کے بلائے ہوئے تشریف لیگئے ہیں تو آپ کا اور خادم کا ایک ہی اونٹ تھا باری باری دونوں اسی پر سوار ہوتے تھے سارا راستہ یونہی طے کیا اور جب بیت المقدس پاس آگیا تو آخری باری خادم کی تھی آپ نے اس کو سوار ہونیکا حکم دیا اور خود نکیل کھینچنی شروع کی اس نے عرض کیا کہ آپ امیر المؤمنین ہیں اب سوار ہو جائیے اب آپ عیسائیوں کے سامنے جارہے ہیں مگر نہ مانا اور اسی حالت میں عیسائیوں کے پاس جانے پر آمادہ ہو گئے۔ دیکھئے یہ حالت تھی ہمارے سلف کی کہ امیر المؤمنین نکیل پکڑے ہوئے ہیں اور خادم سوار حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر میں تھے اونٹ تھے کم اور سوار زیادہ۔ تو دو دو تین آدمی کو ایک ایک اونٹ ملا اسی طرح حضورؐ کے ساتھ بھی دو شخص شریک ہوئے جب آپ کی چلنے کی باری آئی تو آپ اتر پڑے ساتھیوں نے

عرض کیا حضور ہم اپنا حصہ سواری کا آپ کو دیتے ہیں آپ نے فرمایا تم مجھ سے زیادہ قوی نہیں اور میں تم سے زیادہ ثواب سے مستغنی نہیں میں بھی ثواب کا محتاج ہوں سبحان اللہ یہ برتاؤ تھا حضور کا اپنے خدام کیساتھ کسی بات میں ترفع نہ تھا نہ نشست وبرخاست میں کسی قسم کا امتیاز تھا۔ جب حضور کے دربار میں کوئی آتا تو ہر شخص تمیز نہیں کرسکتا تھا کہ ان میں آقا کون ہیں اور خدام کون۔ ایک دفعہ آپ صحابہؓ کے مجمع میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص آیا اور کہا من محمد فیکم کہ تم میں محمدؐ کون ہیں؟ یہاں یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ آپ کو اس نے کیوں نہ پہچانا آپ کے چہرہ مبارک پر تو انوار وبرکات خداوندی نمایاں تھے۔ جواب یہ ہے کہ اول تو انوار دیکھنے کیلئے نظر چاہیئے انوار کو ہر شخص نہیں پہچان سکتا ہر مومن بھی تمیز نہیں کرسکتا پھر غیر مومن کیا پہچانتے۔ دوسرے انوار سے اتنا ہی تو معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ صاحب انوار مقدس ہیں باقی آقا اور سلطان ہونا کیونکر معلوم ہو سکتا ہے کیونکہ صاحب انوار کیلئے سلطان ہونا ضرور نہیں اور یہ شخص حضور کو سلطان ہی سمجھ کر آیا تھا ہنوز اُس کو کمال نبوت کی خبر نہ تھی اسی طرح ظاہری حسن اور آب وتاب بھی آپ میں اسقدر تھی کہ کسی بڑے حسین وجمیل میں نہ تھی مگر اس سے بھی سلطان ہونا کیسے معلوم ہو لوازم سلطنت تو تاج وتخت وغیرہ ہیں جس سے آپ منزہ ہیں اس لیئے ہر کس وناکس آپ کو نہیں پہچان سکتا تھا غرض آپ کی عادت شریف یہ تھی کہ سب سے ملے جلے رہتے تھے کوئی امتیاز کوئی شان نہیں تھی اگر تم یہ کہو کہ حضور کی کیا بات وہ تو نبی تھے ہم ویسے کیوں کر ہو جائیں۔ میں کہتا ہوں کہ ارے جب باوجود اس عظمت کے نبی کی یہ عادت تھی تو ہم کو تو بہت زیادہ تواضع اختیار کرنا چاہیئے اور اگر یہ سمجھ میں نہیں آتا تو میں ابھی ایک غیر نبی مگر عظیم الشان کا واقعہ سناتا ہوں۔ خورجہ کے ایک آدمی مجھ سے نقل کرتے تھے اب انکا انتقال ہو گیا۔ وہ کابل گئے تھے مجھ سے بیان کرتے تھے کہ عبدالرحمٰن خاں امیر کابل کا یہ حکم تھا کہ جب وہ دربار سے اٹھ جائیں تو پھر مجلس میں کوئی ان کی تعظیم نہ کرے دربار کے بعد مصاحبین کے ساتھ ہنستے بولتے تھے اور مصاحبین میں سے کوئی ان کی طرف پشت کیئے ہوئے ہے کوئی پاؤں پھیلائے ہوئے ہے کچھ برا نہیں مانتے تھے تو واقعی مسلمان کی حالت ایسی ہی ہونی چاہیئے یہ کیا کہ دیکھو فلاں

داروغہ ہیں فلاں جج ہیں دیکھو کوئی گستاخی نہ ہو جائے ورنہ سزا ہو جائے گی کچھ نہیں واللہ ہم کو نام ونمود نے خراب کر رکھا ہے اسی لئے ہمارے اندر خلوص نہیں ہے ہمارے ہر کام میں اغراض فاسدہ بھری ہوئی ہیں ہمارے پہلے بزرگ تو دنیا کے کام بھی دین کی وجہ سے کرتے تھے اور اب دین کے کام بھی دنیا سے خالی نہیں ہر کام میں شہرت ونمود وجاہ کا خیال ہے جب ہم میں خلوص نہیں تو برکت بھی نہ ہوگی البتہ اول اول ایک دفعہ خوب آب وتاب اور عزت وشہرت ہو جاتی ہے پھر یہ حالت ہوتی ہے کہ یا تو کوئی اس کا نام ہی نہیں لیتا یا لیتا ہے تو وکال اول میں دتیلہ ہے اور دآخر میں اور درمیان میں نام۔

اخلاص اور شہرت

صاحبو! اخلاص حاصل کرو اس سے بلاقصد شہرت بھی ہوگی اور عزت بھی مولانا فرماتے ہیں ؎

کعبہ را ہر دم تجلی مے فزود ∴ ایں ز اخلاصات ابراہیم بود

ورنہ نام کا کعبہ تو اور لوگوں نے بھی بنایا تھا جو ظاہری زیب وزینت میں اس سے کہیں زیادہ تھا مگر کہیں ان کا نام ونشان بھی نہیں رہا چنانچہ ایک کعبہ تو حضورؐ سے پہلے یمن میں بنا تھا جس کے بانیوں نے اس سچے کعبہ کو اس جھوٹے کعبہ کی بے رونقی کا سبب دیکھ کر ہدم بیت اللہ کا ارادہ کیا تھا جس پر عذاب غیبی سے سب تباہ ہوئے اور ایک اور کعبہ حضورؐ کے زمانہ میں بنا تھا۔ حضورؐ نے اس کو منہدم کرا دیا اگر کہو کہ منہدم نہ ہوتا تو شاید شہرت ہوتی اب شہرت ہو کیسے جب منہدم کرا دیا۔ تو میاں اس کعبہ پر بھی بہت سی آفتیں نازل ہوئی ہیں مگر وہی آب وتاب ہے اور اس مصنوعی کو کوئی جانتا بھی نہیں اور مثال لو ایک تو حضورؐ نے دعویٰ کیا نبوت کا اور ایک مسیلمہ کذاب نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا تھا مگر دونوں کا فرق دیکھ لیجئے مولانا فرماتے ہیں ؎

بو مسیلم را لقب کذاب ماند ∴ مر محمد را اولو الالباب ماند

اس کا کذاب لقب ہوا اور حضورؐ کو اولوا الالباب کا خطاب ملا اور مولانا فرماتے ہیں ؎

احمد و بوجہل در بت خانہ رفت ∴ زیں شدن تا آں شدن فرقیست زفت

بتخانہ میں تو دونوں گئے تھے مگر فرق کیا ہوا ابوجہل نے تو بتوں کو سجدہ کیا اور حضور کے جانے سے آپ کے پیروں میں بت گر پڑے۔ ور فرماتے ہیں ؎

گر بصورت آدمی انسان بُدے ⁂ احمد و بوجہل ہم یکساں بُدے
اینکہ مے بینی خلاف آدم اند ⁂ نیستند آدم غلاف آدم اند

اور ایک جگہ فرماتے ہیں۔

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر ⁂ گرچہ باشد در نوشتن شیر و شیر

اس شعر سے پہلے مثنوی دفتر اول میں مولانا نے ایک حکایت لکھی ہے کہ کسی عطار کے یہاں ایک طوطی تھی خوش آواز خوش رنگ وہ دکان پر نگہبانی کیلئے رہا کرتی تھی اور سوداگروں سے باتیں کیا کرتی آدمیوں کی بولی بولتی وہ بقال مالک طوطی ایک روز گھر گیا ہوا تھا اور طوطی دکان کی نگہبانی کر رہی تھی دفعۃً کوئی بلی چوہا پکڑنے دوڑی طوطی اپنی جگہ سے جان کے خوف سے جست کر کے ایک طرف چلی وہاں روغن گل کی بوتل رکھی تھی اس کے بازو یا پاؤں لگنے سے گر گئی۔ مالک جب گھر سے آیا دیکھا کہ تمام دکان اور فرش چکنا ہو رہا ہو معلوم ہوا کہ یہ اسی کی حرکت ہے اس کو مارنا شروع کیا اتنا مارا کہ اس کے سر کے بال اُڑ گئے گنجی کردی۔ اب وہ خفا ہو گئی ہر چند یہ اُس سے باتیں کرنا ہے بولتی ہی نہیں یہ میوہ اور پھل دیتا ہے دعا تعویذ کراتا ہے فقرا کو خیر خیرات کرتا ہے مگر وہ بولتی ہی نہیں یہ بڑا پریشان ہوا اور اس پر بڑی حسرت سوار ہوئی۔ اپنی داڑھی کے بال نوچتا تھا کہ ہائے دکان کی رونق جاتی رہی اس وقت میرا ہاتھ کیوں نہ ٹوٹ گیا جب میں نے اس کو مارا تھا۔ غرض حسرت واویلا کر کے مایوس ہو کر بیٹھ گیا۔ ہر قسم کی تدبیریں کیں طرح طرح پھل پھول نقش و نگار اس کے سامنے پیش کرتا تھا کہ کسی طرح بول اٹھے مگر سب بیکار۔ اسی مایوسی میں تین روز کے بعد ایک گنجا اس کے سامنے سے گزرا جس کے سر پر مطلق بال نہ تھے جیسے تانبے کا طشت ہو اس کو دیکھتے ہی طوطی بول پڑی اور کہا ؎

از چہ اے کل با کلاں آمیختی ⁂ تو مگر از شیشہ روغن ریختی

کرا اے گنجے تو کس وجہ سے گنجوں میں شامل ہوا معلوم ہوتا ہے شاید تو نے بھی کسی کا روغن گرایا ہوگا۔

؎ ازقیاسش خندہ آمد خلق را ٭ کہ چو خود پنداشت صاحب دلق را

اس سے لوگ بہت ہنسے کہ اس نے گنجے کو بھی اپنا جیسا سمجھا تو وہاں مولانا فرماتے ہیں ؎

کار پاکاں راقیاس ازخود مگیر ٭ گرچہ باشد در نوشتن شیر وشیر

اسی طرح کہاں مخلص کا عمل ؟ کہاں غیر مخلص کا ؟ لوگ بزرگوں کی ریس کرتے ہیں کہ ان کی تو شہرت وعزت ہوتی ہے اور ہماری نہ شہرت ہے نہ کسی کے دل میں وقعت ہے نہ عزت ہے ارے ہو کیسے ان میں خلوص ہے اور یہ تم سے مراحل دور ہے خدا کی قسم اگر خلوص سے کام ہو تو شہرت خود بخود ہو جائے صائب کہتا ہے۔ ؎

اگر شہرت ہوس داری اسیر دام عزلت شو ٭ کہ در پرواز دارد گوشہ گیری نام عنقا را

غرض جو مٹنا چاہتا ہے وہ روشن ہو جاتا ہے اور جو شہرت چاہتا ہے اُسے ذلت گھیر لیتی ہے اور بزرگوں نے جو کام بھی کیا خلوص سے کیا اس لیئے ان کے ہاتھوں کام بھی پورا ہوا اور شہرت اور نیکنامی بھی ہوئی مگر ان کو کبھی شہرت کا قصد تو کیا وسوسہ بھی نہیں ہوتا تھا اور ہم تو ابتداء سے شہرت ہی چاہتے ہیں اس لئے وہ بھی نصیب نہیں ہوتی۔ ارے کیا شہرت کے طالب بنے ہو ایسی تیسی میں جائے شہرت مقصود اصلی تو خدا کو راضی کرنا ہے بس جو کام کرو رضائے حق کو پیش نظر رکھو۔

کارِ پاکاں

غرض ہم میں بڑی کوتاہی یہ ہے کہ ہمارے اندر خلوص نہیں ہے حالانکہ ہمارے بزرگوں نے جو کچھ کامیابی حاصل کی خلوص ہی کے بدولت حاصل کی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اس خلوص ہی کی برکت سے کتنی بڑی بڑی فتوحات حاصل کی ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب خلیفہ ہوئے اس وقت حضرت خالد بن ولیدؓ دمشق کا محاصرہ کئے ہوئے تھے حالانکہ یہ بڑے قوی اور شجاع تھے اور حضرت ابو عبیدہ ؓ ضعیف ونحیف تھے گو تھے بڑی شجاعت اور مردانگی والے مگر اس وقت تک جرنیل نہیں تھے بلکہ حضرت خالدؓ کے ماتحت تھے۔ حضرت عمرؓ کی نظر دیکھئے کہ تخت امارت پر بیٹھتے ہی حضرت ابو عبیدہ ؓ

حالت یہی ہے کہ اگر ان کو کچھ ملتا ہے تعریف کرتے ہیں نہیں ملتا تو ہجو کرنے لگتے ہیں چنانچہ ایک شاعر نے ایک شخص کی ہجو کی تھی اُس نے کچھ انعام اکرام دیدیا تو پھر تعریف بھی کر دی کسی نے کہا میاں ہجو بھی کرتے ہو اور تعریف بھی یہ تو اجتماع ضدین ہے کہا میاں دونوں حال میں سچا ہوں کیونکہ آدمی میں بھلائی برائی دونوں ہوتی ہیں ہم خوش ہوتے ہیں بھلائیاں بیان کر دیتے ہیں ناخوش ہوتے ہیں برائیاں بیان کر دیتے ہیں تو ممکن ہے کہ حضرت خالدؓ نے اس نیت سے دیا ہو کہ اس سے دفع شر ہوگا اور دفع شر کیلئے دنیا جائز ہے لہٰذا ہم جیسوں کو تو اُن پر اعتراض کا حق نہیں لیکن امیر المومنین کو حق ہے وہ ان کو جائز سے گذر کر اولیٰ اور احوط کے درجہ پر دیکھنا چاہتے تھے جیسے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی شان میں فرمایا ہے وعصیٰ آدم ربہ فغویٰ اور ہم لوگوں کو زبان کھولنے کی مجال نہیں غرض حضرت عمرؓ نے ان کو معزول کر دیا۔ جس میں اس واقعہ کو بھی دخل تھا سو اس حالت میں اگر یہ خلوص سے کام نہ کرتے ہوتے تو اس وقت ضرور کام چھوڑ دیتے مگر وہ تو خالق عمرؓ کیلئے کام کر رہے تھے خواہ عمرؓ راضی ہوں یا ناراض اس کی ان کو پرواہ نہیں تھی یہ رنگ تھا ہمارے بزرگوں کا اور ہماری یہ حالت ہے کہ اول ہی دن سے بڑا ہونے کا خیال ہو جاتا ہے اور یہ بڑا ہونا ایسی بری بلا ہے کہ اگر کوئی بلا طلب وخواہش بھی بڑا ہو جائے تب بھی آفت ہے مولانا فرماتے ہیں۔ ؎

تن قفس شکلست اما خار جاں ⁂ از فریب داخلاں و خارجاں

اینش گوید نے منم انباز تو ⁂ آنش گوید نے منم ہمراز تو

او چو بیند خلق را سرمست خویش ⁂ از تکبر میرود از دست خویش، الخ

یہ مصائب ہیں شہرت اور بڑا ہونے کے اس لیئے تفریعاً وصیت فرماتے ہیں ؎

خویش را رنجور ساز و زار زار ⁂ تا ترا بیروں کنند از اشتہار

اشتہار خلق بند محکم ست ⁂ بند ایں از بند آہن کے کم ست

یہ تو دین کی خرابی ہے اور دنیا میں یہ حالت ہوتی ہے۔ ؎

کو جرنیل بنایا اور حضرت خالدؓ کو معزول فرما دیا لوگوں نے کہا حضرت یہ کیا کیا؟ وہ تو بڑے دلیر اور بہادر تھے اور یہ کمزور دبلے پتلے ہیں فرمایا اسی وجہ سے معزول کرتا ہوں کہ خالدؓ پر سب کی نظر ہو گئی ہے اور ابو عبیدہؓ کی امارت میں سب کی زبان پر یہی ہوگا کہ خدا ہی خیر کرے خدا ہی مدد فرمادیں اور جو فتح حاصل ہوگی وہ خدا ہی کی طرف سے بے ساختہ سمجھی جائیگی حضرت یہ تھے سمجھنے والے دین کے چنانچہ آپ نے فرمان لکھا حضرت ابو عبیدہؓ کے پاس کہ میں آج سے آپ کو عسکر اسلام کا جرنیل بناتا ہوں اور خالدؓ کو اطلاع کر دو یعنی خود ان کو خط لکھا بھی نہیں کہ تمہارے بجائے ابو عبیدہؓ کو جرنیل مقرر کر دیا گیا ہے۔ اب حضرت ابو عبیدہؓ شرمائے کہ میں کیسے ان کو کہوں اب تک تو ان کی ماتحتی میں کام کر رہا تھا اور اب ان کو معزول کروں مگر امیر المومنین کا حکم تھا ماننا ضروری تھا اس لئے وہ خط ایک آدمی کے حوالہ کیا کہ اس کو حضرت خالد بن ولیدؓ کے پاس لے جاؤ اور یہ کہلا بھیجا کہ خدا کی قسم اس میں میرا کوئی دخل یا خواہش نہیں ہے آپ مجھ سے کبیدہ خاطر نہ ہوں وہ خط پاکر خوشی خوشی حاضر خدمت ہوئے اور کہا کہ میں اپنے کو معزول کرتا ہوں اور امیر المومنین کا فرمان سر آنکھوں پر ہے ۔ واللہ میں آپ کی اطاعت کرونگا اور کام پہلے سے زیادہ کرونگا پھر اس کی حقیقت بتلائی ورنہ شاید کوئی اس قول کو شاعری پر محمول کرتا وہ یہ کہ آپ نے فرمایا کہ اب تک کبھی کبھی مجھے یہ خیال ہوتا تھا کہ اگر میں مارا گیا تو لشکر بددل ہو کر پسپا ہو جائے گا کیونکہ عادۃ اللہ یہی جاری ہے کہ افسر کے مارے جانے سے لشکر بیکار ہو جاتا ہے اس لئے بہت دفعہ میں اپنی حفاظت کرتا تھا اور اب آزاد ہوں مجھ کو وہ اندیشہ نہیں رہا اب انشاء اللہ تعالیٰ میری خدمت دیکھئے گا۔ حضرت یہ لوگ تھے خادمان دین اور یہ وہ تھے کہ حضرت عمرؓ نے ایک بار انکو جاہ طلب بھی فرمایا تھا اور وہ واقعہ اس طرح ہوا تھا کہ ایک بار حضرت خالدؓ نے ایک شاعر کو کچھ روپیہ دیدیا تھا۔ اس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ خیال ہوا کہ ان میں حب جاہ ہو گیا ہے حالانکہ ممکن ہے حضرت خالدؓ نے شاعر کو بیت المال کا مصرف سمجھ کر دیا ہو اور یہ سمجھے ہوں کہ یہ شخص محتاج ہے یا یہ خیال ہوا ہو کہ اگر نہ دیں گے تو شاید ہجو کرے کیونکہ شعراء کی

چشمہا و خشمہا و رشکہا ٭ بر سرت ریزد چو آب از مشکہا

سب کا حسد اور احکام کی دار و گیر اور جمہور کے مطالبات ساری دنیا کے اعتراضات اس پر پڑتے ہیں اور اگر شہرت نہ ہو تو کسی کو بھی اس کا خیال نہیں ہوتا اور نہ اس کو کسی کی پروا ہوتی ہے یہ حال ہوتا ہے۔

لنگکے زیر و لنگکے بالا ٭ نے غم دزد و نے غم کالا

ایک دوست مجھ سے کہنے لگے اگر تین باتیں حاصل ہوں ایک تو کھانا دوسرے کپڑا اور تیسرے کوئی مارے پیٹے نہیں۔ تو اس کے بعد چاہے کوئی ہمیں بھنگی ہی سمجھے تو ہمارا حرج کیا ہے حقیقت میں جن لوگوں نے جاہ کو مطلوب بالذات بنایا ہے بڑی غلطی میں ہیں اس سے دنیا کے مقاصد بھی حاصل نہیں ہوتے اور دین تو گیا ہی ہے اور اگر نیت صادق ہو خلوص ہو دنیا کی کوئی غرض نہ ہو تو دین بھی رہے گا اور دنیا کا بھی نفع ہو گا۔ دیکھو اس عطر فروش کی نیت اپنے عطر چلانے کی نہ تھی بلکہ وہ تو اس پر آمادہ تھا کہ عطر اور تیل کما کیا معنی۔ اگر میرا بھی عطر اور تیل نکل جائے تب بھی نصیحت نہ چھوڑوں گا پھر نتیجہ کیا ہوا کہ دین دنیا دونوں کا بھلا ہوا تو حضرت نصیحت کا یہ طریقہ ہوتا ہے اب تو یہ آفت ہے کہ پہلے ہی سے یوں کہنے لگتے ہیں کہ تجھ کو شرم نہیں آتی بے ایمان بدمعاش کیا یہ طریقہ ہے نصیحت کرنے کا آخر وہ بھی تو آدمی ہے اس کو بھی اشتعال غضب ہوتا ہے وہ بے ایمان کر کلمات کفر بکنے لگتا ہے میرے ایک دوست بیان کرتے تھے کہ کسی موقع پر ایک محصل چندہ نے ایک شخص سے چندہ مانگا اس نے عذر کر دیا اب وہ فرماتے ہیں کہ اسلامی کاموں میں مسلمانوں کی مدد کرنا مسلمان کا کام ہے کیا تم مسلمان نہیں ہو اس نے کہا ہاں میں مسلمان نہیں۔ محصل نے کہا کہ لکھ دو کہ تم مسلمان نہیں کہا لاؤ کاغذ اس نے لکھ بھی دیا اب کرے کوئی اس کا کیا کرے اس کے بعد ایک شخص نے کہا میاں تم نے کیا بکا اور کیا لکھ دیا کیا تم اسلام سے خارج ہو گئے۔ کہنے لگا نعوذ باللہ میں کیوں اسلام سے خارج ہوتا میں تو پکا مسلمان ہوں کہا پھر تم نے یہ فعل کیوں کیا کہنے لگا ان کمبختوں نے تنگی کی مجھ پر جبر کیا میں نے انکار کیا پھر انہوں نے میرے انکار کو اسلام کے خلاف سمجھا اور مجھ سے لکھوانا چاہا کہ لکھ میں مسلمان نہیں میں نے لکھ دیا اور مطلب یہ تھا جیسا تم جسکو اسلام کہہ رہے ہو جو چندہ نہ دینے سے جاتا رہے میں

مسلمان نہیں اور مسروں کے نکلوانے اور کہلوانے سے کیا ہوتا ہے حق تعالیٰ تو یرید اللہ بکم الیسر فرمائیں اور یہ کرتے ہیں تنگی۔ تو صاحبو! یہ طریقہ نہیں نصیحت کا دیکھئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں قبیلہ بنی ثقیف کا ایک وفد آیا تھا اور کہا کہ ہم دو شرطوں سے اسلام لاتے ہیں ایک تو یہ کہ زکوٰۃ نہیں دیں گے دوسرے یہ کہ جہاد نہیں کریں گے یعنی نہ مال خرچ کریں گے نہ جان حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں شرطوں کو منظور فرمالیا۔ عرض کیا گیا کہ یارسول اللہ یہ شرطیں کیسے تسلیم کرلیں باوجودیکہ زکوٰۃ وجہاد دونوں فرض ہیں۔ فرمایا کہ تم ان کو مسلمان تو ہونے دو جب اسلام ان کے دل میں گھر کرلیگا اس وقت سب کچھ خود ہی کریں گے کہنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ تم کسی کو شراب پلاؤ اور وہ کہے اس شرط سے پیتا ہوں کہ شراب پی کر جھولونگا نہیں تو آپ کو اس شرط کے ماننے سے انکار کی کیا ضرورت ہے وہ تو خود ہی شراب ہی جھولا دیگی۔ تمہارے جھلانے کی ضرورت نہیں اسی طرح اسلام خود ہی زکوٰۃ بھی دلوا دے گا اور جہاد بھی کرا دیگا۔ بغیر اس کے چین نہیں ہوگا اور ایک روایت میں ہے کہ کوئی شخص حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں بشرطیکہ نماز سے چھٹی مل جاوے آپ نے انکار فرمایا کیونکہ اسمیں کوئی خرچ نہیں جس سے تنگی ہو اور اس وقت ایسے کم ہمت نہ تھے کہ ہاتھ پاؤں نہ چلائیں۔ لیکن اب ایسے بھی کم ہمت ہیں اس لیے اب اگر کوئی یہ شرط لگادے کہ ہم مسلمان اس شرط پر ہو سکتے ہیں کہ ہم کو نماز سے معافی دی جاوے تو ہم اس کی بھی اجازت دیں گے۔ چنانچہ مولانا مظفر حسین صاحب ایک بار گڑھی جو ایک مقام ہے تشریف لیگئے تھے وہاں ایک بڑا رئیس فیل نشین تھا جو نماز نہیں پڑھتا تھا۔ مولانا نے اس سے دریافت فرمایا کہ خانصاحب نماز کیوں نہیں پڑھتے کہا مولانا مجھ کو داڑھی چڑھانے کا شوق ہے اور وضو کرنے سے وہ بار بار خراب ہوجاتی ہے پھر دن میں پانچ دفعہ اتارنا چڑھانا مصیبت ہے مولانا نے فرمایا کہ تم بے وضو پڑھ لیا کرو۔ انہوں نے کہا کہ اس طرح تو ضرور پڑھ لوں گا فرمایا ہاں مگر ایک شرط ہے وہ یہ کہ جماعت سے پڑھنا اور مسجد میں پڑھنا

کہا بہت اچھا شاید دو ایک وقت خانصاحب نے بے وضو ہی پڑھی پھر خیال ہوا کہ میاں خواہ مخواہ اتنی محنت بھی کی اور پھر نماز بے وضو پڑھی۔ غرض تیسرے ہی وقت سے وضو کرنے لگے اور وضو کر کے پھر داڑھی چڑھاتے مگر دو ایک روز کے بعد کہا کہ میاں میں یہ آنار چڑھاؤ اور دھیڑ بن کب تک کرونگا اب داڑھی چڑھانا بھی چھوڑ دیا تو مولانا نے جو بے وضو کی اجازت دی تھی تو مولانا نے یہ سمجھا تھا کہ جب جماعت سے نماز پڑھے گا تو ان میں کوئی اللہ والا بھی ہوگا اس کے قلب کا نور اس پر پڑے گا اور یہ صحیح طور سے نمازی ہو جائیگا دوسرے خانصاحب کو بھی غیرت ہوگی مولانا نے یہ راز سمجھ کر اجازت دی تھی۔ یہ نہ سمجھنا کہ بے وضو تو نماز ہوتی نہیں پھر مولانا نے کیسے اجازت دی بات یہ ہے کہ مولانا نے جواز کا فتویٰ نہیں دیا تاکہ ان پر اعتراض ہو بلکہ اس کے نمازی بنانیکا طریقہ یہی سمجھا اور یوں خیال فرمایا ہوگا کہ جہاں اس نے اور نمازیں ترک کی ہیں چار وقت اور بے نمازی رہے گا مگر طریقہ یہی ہے اس کو راہ پر لگانیکا کیوں کہ مولانا نے دیکھا کہ یہ عہد و پیمان کا بڑا پکا ہے غیرت مند ہے جب کام شروع کرے گا چھوڑے گا نہیں اس وقت کے دنیا دار تو اتنے پکے ہوتے تھے کہ اب دینداروں میں بھی وہ پکا پن نہیں ہے اسی کو عراقی کہتے ہیں ؎

بہ قمار خانہ رفتم ہمہ پاک باز دیدم ۰۰ چو بصومعہ رسیدم ہمہ یافتم ریائی

یہ قمار خانہ میں پاک باز کیسے مطلب یہ ہے کہ بعض صفات میں وہ پاک باز تھے۔ یعنی عہد و پیمان کے پکے تھے۔ گو دین کے پکے نہ تھے کیوں کہ اگر سب جواری بد عہدی کریں تو بازی کسی کی بھی نہ ہو تو نری لڑائی ہی لڑائی ہوا کرے تو پہلے لوگ قول کے پکے تھے اگر کبھی نمازی ہو جاتے تو اس میں بھی پکے ہو جاتے تھے۔ اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی سید الطائفہ حضرت جنیدؒ ایک جگہ تشریف لے گئے تو رات میں دیکھا کہ سولی پر ایک چور لٹک رہا ہے جس کا ہاتھ بھی کٹا ہوا پاؤں بھی کٹا ہوا اور عبرت کیلئے سولی پر ٹانگ رکھا ہے حضرت جنیدؒ نے جا کر اس کے پاؤں چوم لئے خدام سب حیران کہ شیخ کیا کرتے ہیں چور کی قدم بوسی کرتے ہیں

عرض کیا حضرت یہ کیا کرتے ہیں یہ تو بڑا چور تھا ایک دفعہ اس کا ہاتھ کٹا پھر پاؤں بالآخر ہولی پر چڑھایا گیا فرمایا میں نے اس کی دیانت داری پر قدمبوسی نہیں کی بلکہ اس کی پختگی پر قدمبوسی کرتا ہوں کہ اس نے کتنی سزائیں پائیں مگر اپنے کام میں لگا رہا اخیر تک وہی حالت رہی ؎

دست از طلب ندارم تا کام من برآید ؞ یا تن رسد بجاناں یا جان ز تن برآید

اس سے لوگوں پر ایک حالت طاری ہوگئی اور سب اپنے اپنے کام میں پکے ہو گئے۔ اسی بنا پر حاجی صاحب فرماتے ہیں کہ اخلاق اپنی اپنی جگہ میں سب اچھے ہیں صرف مصرف کے اعتبار سے ان میں بھلائی برائی آجاتی ہے۔ اسی طرح خانصاحب کی پختگی کا وصف دیکھ کر ان کو اس تدبیر سے مولانا راہ پر لگا گئے تھے یہ سب کچھ نرمی کی بدولت ہوا اگر سختی کرتے تو ہرگز یہ اثر نہ ہوتا اسی لئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ اگر نصیحت موعظت حسنہ سے ہوگی اس سے کسی کو ناگواری نہ ہوگی اور فرضاً اگر نصیحت سے دوسرا خفا بھی ہو گیا تب بھی لڑو مت اس وقت چپ رہو دوسرے وقت سمجھاؤ کہ بھائی تم تو برا مان گئے غور تو کرو یہ کیسی اچھی بات ہے اس کو قبول کر لو۔ اگر ایک دفعہ سے کام نہیں چلتا تو مکرر سہ مکرر سمجھاؤ غرض سر ہو جاؤ اور صرف اسی پر اکتفا نہ کرو بلکہ خلوت میں ذات باری سے دعا بھی کرو کہ خطاب کا اثر اس کے قلب میں پیدا کر دے یا اللہ! ہم نے کام شروع کیا ہے تو اس کو پورا فرما اگر پیچھے رہو اور ان کے سر ہو جاؤ انشاء اللہ کام ضرور بن جاوے گا۔

مبالغہ فی النصیحت

انبیاء علیہ السلام کے حالات دیکھئے وہ کیا کرتے تھے فرماتے ہیں افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مؤمنین ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اکراہ تلوار سے نہیں کیا تھا بلکہ نصیحت سے اکراہ فرماتے تھے یعنی ان کا سمجھانا نہیں چھوڑتے تھے اس میں مبالغہ فرماتے تھے اس مبالغہ فی النصیحت کو حق تعالیٰ نے برا نہیں بتایا بلکہ مبالغہ کے بعد جو ناصح کی طبیعت پر رنج کا اثر ہوتا ہے اس سے آپ کو بچانا

مقصود ہے کیونکہ فطری بات ہے کہ نصیحت کی ناکامی بلکہ ہر چیز کی ناکامی کا قلب پر ایک اثر ضرور ہوتا ہے اور جب رنج ہوتا ہے تو بعض اوقات اس کام ہی سے رہ جاتا ہے چنانچہ اسی لیے ولا تحزن علیہم ولا تک فی ضیق مما یمکرون فرمایا اتنی شفقت نہ کرو جس کے عدم ترتب ثمرہ پر رنج ہو جائے مقصود کو دیکھنا چاہیے سو یہ مقصود اصلی نہیں کہ بس مخاطب ہمارے کہنے سے مسلمان ہی ہو جائے گو ایک درجہ میں یہ بھی مقصود ہے مگر خود اس کی بھی حقیقی غایت پر خیال کرنا چاہیے وہ کیا ہے وہ رضائے حق ہے اور وہ ناکامی میں بھی حاصل ہے اس لیے ایسی ناکامی پر بھی راضی رہے اس کو بھی کامیابی ہی سمجھے۔ مولانا اسی کو فرماتے ہیں ؎

گر مرادت را مذاق شکر ست ∴ بے مرادی نے مراد دلبر ست

اور فرماتے ہیں ؎

بس زبون وسوسہ باشی دلا ∴ گر طرب را باز دانی از بلا

ثمرہ پر عدم نظر

ایک بزرگ نے ایک دینی مقصود میں کوشش کی تھی مگر اس میں کامیاب نہ ہوئے اس پر کسی نے طعن کیا کہ میاں اس کوشش سے کیا ملا انہوں نے خوب جواب دیا سودا کے شعر سے ؎

سودا قمار عشق میں شیریں سے کوہ کن ∴ بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا

کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز ∴ اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

مگر یہ جب ہے کہ مقصود اور عمل شریعت کے خلاف نہ ہو ورنہ خسر الدنیا والآخرہ ہو جاویگا غرض عاشق کو ثمرہ پر نظر نہیں ہوتی عاشق کی تو یہ حالت ہوتی ہے کہ ؎

ناخوش تو خوش بود بر جان من ∴ دل فدائے یار دل رنجان من

اور یہ مذہب ہوتا ہے ؎

زندہ کنی عطائے تو ∴ ور بکشی فدائے تو،

جان شد مبتلائے تو ∴ ہر چہ کنی رضائے تو،

عاشق کو اس سے کیا بحث کہ کام ہوا یا نہیں اس کی نظر تو یہاں تک بلند ہوتی ہے کہ اگر محبوب کو صرف خبر ہی ہو جائے کہ فلاں اس کا چاہنے والا ہے وہ اس پر بھی اکتفا کرتا ہے یعنی اس کو رضا کا بھی خیال نہیں ہوتا اسی کو کہتے ہیں ؎

ہمینسم بس کہ داند ماہرویم ∴ کہ من نیز از خریداران اویم

واند کہتے ہیں اور جو مغلوب الحال ہوتے ہیں وہ اس سے بھی آگے کہتے ہیں ؎

ہمینسم بس اگر کاسد قماشم ∴ کہ من نیز از خریدارانش باشم

غرض نتیجہ پر نظر مت کرو جو کرنے کا کام ہے وہ کرو۔

عملی نمونہ ان ہی کرنے کے کاموں میں سے ایک تبلیغ اور ترغیب بھی ہے مگر اس سے پہلے اپنی اصلاح کرو تاکہ تم کو دیکھ دیکھ کر لوگ مسلمان ہونے لگیں پہلے مسلمان عملی نمونہ ہوتے تھے۔ تاریخ سے بکثرت پتہ چلتا ہے کہ ہمارے اسلاف کے زمانہ میں کفار جاسوس کے طور پر لشکر اسلام میں آئے اور مسلمان ہو گئے پھر کفار کے لشکر میں جا کر اسلام پھیلایا ایک واقعہ ایسے ہی اثر کا ذکر کرتا ہوں۔ ایک دفعہ حضرت علیؓ کی زرہ چوری ہو گئی تھی آپ نے اس کو ایک یہودی کے پاس دیکھا اس وقت آپ خلیفہ تھے کہا یہ زرہ میری ہے۔ یہودی نے کہا میری ہے دیکھئے خلیفہ کے مقابلہ میں ایک رعیت کا آدمی کس بیباکی سے کہتا ہے کہ یہ چیز میری ہے۔ یہ اسلام ہی کے قوانین سے تو اس کی جرأت تھی کیونکہ جانتا تھا کہ بادشاہ کے صرف کہنے سے یہ زرہ ان کی نہ ہو جائے گی دیکھئے اسلام کی کتنی خوبی ہے کہ غیر قوموں کو بھی اس سے نفع ہوتا تھا اب تو یہ حال ہے کہ خود مسلمان بھی اس سے نفع نہیں لیتے ہیں غرض آپ نے قاضی کے پاس جا کر دعوی کیا اس وقت قاضی تھے شریح تابعی وہ آپ کے ماتحت تھے اب دیکھئے ادھر آپ بادشاہ اور شیخ کامل صاحب فضائل اور حضرت علیؓ کے خصائص و فضائل دیکھ کر کہیں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ آپ جھوٹ بول سکتے ہیں ہرگز نہیں مگر باینہمہ حضرت شریح یہودی کے مقابلہ میں حضرت علیؓ سے پوچھتے ہیں کہ آپ کے پاس کوئی گواہ ہے صاحبو! اب

تو حضرت علیؓ کیا اگر ہم بھی ہوتے اور ہمارا کوئی شاگرد یا مرید قاضی ہوا اور وہ ہم سے گواہ طلب کرے تو کہتے کیوں جی کیا ہم جھوٹ بولتے ہیں مگر وہاں تو یہ بات نہ تھی وہ تو قوانین اسلام کے پابند تھے چنانچہ حضرت علیؓ نے گواہ پیش کئے ایک قنبرؓ آزاد شدہ آپ کے غلام تھے اور ایک آپ کے بیٹے امام حسنؓ شریحؒ نے کہا غلام آزاد شدہ کی تو شہادت معتبر اور لڑکے کی شہادت باپ کے حق میں قبول نہیں کیجاتی حضرت شریحؒ کا مذہب یہی تھا کہ اولاد کی شہادت باپ کے حق میں مقبول نہیں اسمیں اختلاف ہے کہ اولاد کی شہادت معتبر ہے یا نہیں۔ حضرت علیؓ کا مذہب یہ تھا کہ معتبر ہے اسی لئے ان کو پیش کیا اور شریحؒ کے نزدیک معتبر نہیں اور قاضی فیصلہ کیوقت اپنے مذہب پر عمل کرے گا نہ کہ بادشاہ کے مذہب پر اس لئے شریحؒ نے حکم دیا کہ زرہ یہودی کی ہے

حضرت علیؓ مقدمہ ہار کر عدالت سے ہنستی خوشی نکل آئے کوئی تکدر اور رنج نہ ہوا۔ یہودی نے دیکھا کہ باوجودیکہ یہ بادشاہ ہیں مگر میرے مقابلہ میں ان کا لحاظ نہیں کیا گیا۔ کہا اگر یہ مذہب سچ نہ ہوتا تو اسمیں اتنی حقانیت و برکت نورانیت نہ ہوتی۔ بس کلمہ شہادت پڑھ کر کہا کہ حضور آپ ہی کی زرہ ہے میں مسلمان ہوتا ہوں آپ نے کہا اب میں نے تم کو ہبہ کردی وہ حضرت علیؓ سے بیعت ہو گیا اور جنگ صفین میں شہید ہوا۔ دیکھا آپ نے کہ ایک زرہ کے ادنیٰ معاملہ نے کیا کیا۔ دیکھئے ہمارے بزرگ کیسے تھے کہ ان کی حالت کو دیکھ دیکھ کر لوگ مسلمان ہوتے تھے اور اب ہم کو دیکھ کر کوئی کافر ہو جائے تو تعجب نہیں اس کے مناسب مولانا نے ایک حکایت لکھی ہے کہ کسی مقام پر کافروں کے محلہ میں ایک مؤذن جا کر اذان کہا کرتا تھا جو بڑا ہی بد آواز تھا مگر اس کے دماغ میں یہ خبط سمایا ہوا تھا کہ میں خوش آواز ہوں۔ یہ بھی ایک مرض ہے چنانچہ میں نے بھی مکہ میں دیکھا کہ ہر جمعہ کو نماز جمعہ کے بعد ایک ہندی حاجی سورہ الرحمٰن بہت چلا چلا کر پڑھا کرتا تھا پھر غلط میں نے دل میں کہا ارے ظالم کیوں ہندوستان کو بدنام کرتے مگر وہ سمجھتا ہی نہ تھا اسی طرح وہ مؤذن تھا اسی اثناء میں ایک کافر رئیس نے ایک دن اس بد آواز کے سامنے شہائی وغیرہ پیش کی اس کی برادری نے اسپر ملامت کی کہ ایک مسلمان کا اتنا اکرام اس نے کہا میری ایک لڑکی کو اسلام کیطرف میلان ہو گیا تھا۔ میں بڑا پریشان تھا ہر وقت

خائف رہتا تھا کہ کہیں یہ نکل جائے جب یہ موذن بد آواز آیا تو لڑکی نے پوچھا کہ ابا جان یہ کیا ہے میں نے کہا کہ یہ اسلام کی اذان ہے بس یہ سن کر اسے اسلام سے نفرت ہوگئی تو اس نے اس شکریہ میں اس بد آواز کو مٹھائی دی تھی کہ یہ تو میرا بڑا محسن ہے کہ اس کے آنے سے میری لڑکی کو اسلام سے نفرت ہوگئی یہ تو حکایت ہے مگر ہماری حالت ایسی ہے کیوں کہ آجکل معاملات میں بعض اعتبار سے ہم کافروں سے بھی گرے ہوئے ہیں۔ ہزاروں کافر ایسے نکلیں گے جو وعدہ کے پکے عہد کے پورا کرنیوالے ہیں کسی پرانے انگریز یا ہندو کے پاس امانت رکھو تو دل میں کھٹک نہ ہو گی اور مسلمان کے پاس رکھنے سے کھٹک ہوتی ہے صاحبو! اب تو لوگوں کو کافر پر زیادہ اعتماد ہے خواہ کھا ہی جاوے اور مسلمان پر اعتماد نہیں یہ کیسی ڈوب مرنے کی بات ہے۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ سب سے پہلے اپنی اصلاح کرو مگر یہ نہیں کہ اپنی اصلاح کے انتظار میں دوسرے کو نصیحت نہ کرو بلکہ دوش بدوش دونوں کام کرو اگر ایک ہی طرف لگ جاؤ گے تو ممکن ہے کہ دوسرے مرض کو قوت ہو جاوے اس کو ایک نظیر سے سمجھو مثلاً تعلیم کا بعض جگہ قاعدہ یہ ہے کہ معقولات کے ساتھ منقولات بھی پڑھتے ہیں یہ ٹھیک قاعدہ ہے اور بعض جگہ پہلے کل معقولات پڑھتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پھر منقولات کی نوبت ہی نہیں آتی یا یہ شخص بد دماغ ہو جاتا ہے اور جو مقصود تھا اس سے رہ جاتا ہے مقصود تو ہے منقولات اور معقولات محض اس کا آلہ ہیں کہ اس سے منقولات کے سمجھنے میں ایک گونہ مدد ملتی ہے تو یہ کتنی حماقت ہے کہ معقولات میں ایسے پھنسے کہ منقولات کے سمجھنے کی نوبت ہی نہ آئی اور بعض جگہ پہلے منقولات اور پھر معقولات پڑھتے ہیں اس کی مضرت آجکل یہ ہے کہ فہم کی کمی سے بعض بعض مشکل جگہ ان کی سمجھ ہی میں نہیں آتی۔ لہٰذا تجربہ کار بزرگوں نے یہ ترتیب رکھی ہے کہ دونوں کو دوش بدوش رکھتے ہیں۔

طریق باطن میں ترتیب

اسی طرح طریق باطن میں بھی یہی تفصیل ہے۔ پہلے بزرگوں میں اختلاف تھا کہ تخلیہ مقدم ہونا چاہئے

یا بعد۔ دونوں کے پاس دلائل موجود ہیں مگر آجکل محققین نے اس طرز کو بدل دیا ہے کسی کو مقدم یا مؤخر نہیں کیا بلکہ ساتھ ساتھ دونوں کو رکھا ہے اب اتنی قوت کہاں ہو اتنا زمانہ کہاں ملتا ہے کہ ایک کو الگ دوسرے کو الگ حاصل کیا جائے بس تا توین می رسی من بجدا میرسم کا قصہ ہو جاتا ہے غرض اصلاح نفس و اصلاح غیر دونوں کو ساتھ ساتھ کرتے رہو۔ بعض تو غیر ہی کی اصلاح میں ایسے کھپ جاتے ہیں کہ اپنی مطلق خبر نہیں رہتی۔

مقتدایانِ اسلام

اس وقت کثرت سے ایسے ہی لوگ موجود ہیں اور وجہ اس کی صرف نام و نمود ہے آجکل وہ لوگ جن کا نماز روزہ تک ٹھیک نہیں عقائد خراب ہیں حلال و حرام کی تمیز نہیں مصلح قوم بنے بیٹھے ہیں چنانچہ ایک بہت بڑے لیڈر کا واقعہ ہے کہ وہ کہیں جا بیٹھے نمازیوں میں وہاں پانی وضو کا نہیں ملا تو سب سے سبقت کر کے آپ نے تیمم کیا مٹی لے کر کلائی تک ملی حالانکہ تیمم میں اول منہ پہ ہاتھ ملا جاتا ہے مگر ایجاد بندہ آپ نے سمجھا کہ جب یہ وضو کا خلیفہ ہے تو اس جیسا ہونا چاہیے اول کلائی پر مٹی ملی پھر منہ میں مٹی لے کر کلی کرنا چاہا اس پر سب لوگ ہنسے تب میاں شرمندہ ہوئے جب جانتے نہیں تھے تو شوق ہی کیوں ہوا سبقت کا انہیں لیڈر کا اور قصہ ہے کہ ایک بار موٹر پر سوار تھے کہ نماز کا وقت آگیا آپ نے وہیں موٹر میں بیٹھکر نماز پڑھی کیونکہ موٹر سے اترنا خلافِ شان تھا کیونکر اتریں بہت لوگوں کو خبط ہے کہ وہ ریل میں بیٹھ کر نماز پڑھتے ہیں یاد رکھو استطاعت قیام کی حالت میں بیٹھ کر نماز نہیں ہوتی خیر ریل میں ایک بات یہ بھی ہے کہ وہ چلتی ہے اور چلنے کے بعد ہمارے اختیار سے نہیں ٹھہرتی اور بعض دفعہ حرکت بہت ہوتی ہے اس میں معذور آدمی بیٹھ سکتا ہے۔ موٹر تو کھڑا تھا اور چلتا ہوا بھی کہنے سے فوراً ٹھہر سکتا ہے یہاں قیام سے کونسی چیز مانع تھی مگر وہ تو لیڈر تھے پھر لیڈر کے پاؤں زمین پر کیسے رکھے جا سکتے ہیں وہ تو پرندے تھے جیسے ایک پرندہ ہے کہ وہ زمین پر بیٹھتا ہی نہیں اگر کبھی بیٹھتا بھی ہے تو درخت پر پرندہ پر ایک بات فیشن کی اور یاد آگئی کہ آجکل ایک خبط یہ بھی ہوگیا ہے کہ آدمی کے لقب بھی پرندوں کے نام پہ رکھے جاتے ہیں

طوطی ہند۔ بلبل ہند اور اس کو فخر سمجھتے ہیں بھلا آدمی کا نام اگر جانور پہ رکھ دیا گیا تو اس میں فخر کی کیا بات ہے غرض اتنی تو ناواقفی احکام سے کہ تیمم تک کی بھی خبر نہیں اور پھر رہبر قوم کہلاتے ہیں افسوس ایسے لوگ مقتدا اور ہادی بنتے ہیں ان کی حالت کو دیکھ کر وہی شعر یاد آتا ہے کہ ؎

گربہ میر و سگ وزیر و موش را دیوان کنند ÷ ایں چنیں ارکانِ دولت ملک را ویراں کنند

واقعی یہی حالت ہے جب یہ مصلحان قوم ہیں اور یہ راہنمائے اسلام ہیں تو بس کچھ نہ پوچھو کہ اس کا انجام کیا ہوگا ؎

اذا کان الغراب دلیل قوم ÷ سیھدیھم طریق الھالکینا

اپنی اصلاح کی فکر

غرض آجکل ایسے ایسے لوگ تبلیغ اور اصلاح کو کھڑے ہوئے ہیں جن کی یہ حالت ہے تو بات کیا ہے کہ اس سے شہرت اور نمود ہوتی ہے کہ فلاں صاحب رات دن تبلیغ میں رہتے ہیں اور اپنی اصلاح کی اس لیے فکر نہیں کہ اسمیں تکالیف بہت ہیں اسمیں زبان پر بھی بار پڑتا ہے کیوں کہ جی چاہتا ہے کسی کی غیبت کریں پھر وعید آتی ہے تو چھوڑنا پڑتا ہے کسی حسین عورت کو دیکھ لیا یا کسی امرد حسین پر نظر پڑ گئی جی چاہتا ہے اس سے نظر نہ پھیریں بار بار تقاضا ہوتا ہے کہ اسے دیکھتے ہی رہیں ادھر یہ آیت یاد آتی ہے قل للمؤمنین یغضوا من ابصارھم ویحفظوا فروجھم الآیۃ ادھر نفس کا تقاضا ہے کہ دیکھتا ہے ادھر یہ وعید یاد آتی ہے تو قلب پارہ پارہ ہوتا ہے ہر لحظہ نئی موت آتی ہے وہ حالت ہوتی ہے ؎

کشتگان خنجر تسلیم را ÷ ہر زماں از غیب جانے دیگر است

میں نے یہ پھر پڑھا ہے ورنہ یہ حالت تو سچے عشاق کی ہے جن کی شان ان شہداء کی سی ہے جن کی نسبت حدیث میں آیا ہے کہ شہداء جنت میں اپنے اجر کو دیکھ کر تمنا کریں گے کہ پھر زندہ کیے جائیں پھر مارے جائیں پھر زندہ کیے جائیں۔ یہی حال عشاق و عارفین کا دنیا میں عمر بھر رہتا ہے کہ مرتے ہیں پھر جیتے ہیں پھر مرتے ہیں مگر وہ موت و حیات کونسی

ہیں وہ موت موتِ نفس ہے اور وہ حیات حیاتِ روح ہے ایک بار نفس کو مار روح کو حیات ہوئی پھر کچھ دنوں میں نفس زندہ ہوا تو پھر مجاہدات سے اس کو مارا ساری عمر اسی طرح گزرتی ہے جسمیں پہلے پہلے البتہ چند روز زیادہ مجاہدہ ہوتا ہے پھر تو مشاہدہ کی دولت نصیب ہو جاتی ہے شیخ فرید فرماتے ہیں ؎

چند روزے جہد کن باقی بخند ⁂ جائے گریست ایں جہاں ورروے مخند

اور مولانا فرماتے ہیں ؎

اندریں راہ می تراش و می خراش ⁂ تا دمِ آخر دمے فارغ مباش

مولانا اور شیخ فرید کے کلام میں تعارض کا شبہ نہ کرنا تیاری تو مجاہدہ کیلئے ساری عمر رکھو لیکن وہ ہوتا ہے چند ہی روز ذرا اوّل اوّل کچھ زیادہ ہوتا ہے پھر کم ہوتے ہوتے لطف ہی رہ جاتا ہے۔ حافظ محمد ضامن صاحب شہید رحمہ اللہ نے ایک سالک کو فرمایا تھا کہ میاں کیوں اپنے پیچھے جنجھ روگ لگایا ظرافت سے فرمایا تھا کہ یہ مجاہدات ساری عمر کرنا پڑتے ہیں ہاں اوّل اوّل قلب پر بہت بار ہوتا ہے پھر اتنی مشقت نہیں رہتی۔ مگر بالکل فارغ بھی نہیں ہو سکتے جیسے شائستہ گھوڑا بھی کبھی شوخی کرتا ہے مگر ایڑ کے اشارہ سے ٹھیک ہو جاتا ہے شائستہ تو ہے لیکن کبھی کبھی شرارت بھی کرتا ہے مگر تھوڑی سی حرکت سے ٹھیک ہو جاتا ہے اسی طرح نفس ساری عمر شرارت کرتا ہے مگر اصلاح ہونے کے بعد تھوڑی سے توجہ سے درست ہو جاتا ہے صاحبو! نفس سے کبھی بے فکر نہ ہونا چاہیئے

مولانا فرماتے ہیں ؎

نفس اژدھاست او کے مردہ است ⁂ از غم بے آلتی افسردہ است

یعنی نفس اژدھا کے مثل ہے جو سردی میں ٹھٹھر گیا ہے سامان حرارت نہیں اس لئے مردہ کی مانند ہو گیا ہے سامان ہو تو پھر دیکھو پس ہر چند کہ فرق ضرور ہے ابتدا اور انتہا میں لیکن بالکل مطمئن کسی وقت نہیں ہو سکتے سو یہ معیبتیں ہیں اپنی اصلاح میں اور

دوسرے کی اصلاح کیا مشکل ہے صرف زبان چلانا پڑتی ہے جو بالکل ہی آسان ہے اس لئے لوگوں کو اپنی اصلاح کی فکر نہیں ایسے ہی لوگوں کے بارہ میں عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر میکنند ❊ چوں بخلوت میروند آں کار دیگر میکنند
مشکلے دارم ز دانشمند مجلس باز پرس ❊ توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر میکنند

صاحبو! پہلے اپنی اصلاح کرو گو وہ بڑی کٹھن ہے مگر میں اس کو آسان کئے دیتا ہوں۔ دیکھئے اگر کوئی اندھا دہلی جانا چاہے تو اس کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ وہ لوگوں سے راستہ پوچھتا پھرے اور کوئی اس کو دہلی کا راستہ بتا دے کہ فلاں راستہ پر جانا پھر فلاں مقام آوے گا اس سے داہنی طرف کو جانا مگر کوئی سوانکھا اس کے ساتھ نہیں ہے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ کہیں گڑھے میں گر کر مر جائے گا اور اگر جس سے راستہ پوچھا ہے وہ شفیق ہے تو وہ یہ کرے گا کہ کوئی سوانکھا جارہا ہے اس کے ساتھ اندھے کو کر دے گا اب وہ بے کھٹکے پہنچ جائیگا تو دیکھئے اندھے کو خود تو پہونچنا بہت مشکل تھا مگر چونکہ سوانکھا ساتھ ہے اس لیے اب وصول آسان ہو گیا اسی طرح اصلاح باطنی کی حالت ہے بطور خود اصلاح بہت مشکل ہے مگر کسی واصل کا ہاتھ پکڑ لیا جاوے تو اب آسان ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

قال را بگذار مرد حال شو ❊ پیش مرد کاملے پامال شو، اور فرماتے ہیں
یار باید راہ را تنہا مرو ❊ بے قلاؤز اندریں صحرا مرو
ہر کہ تنہا نادر ایں راہ را برید ❊ ہم بعون ہمت مرداں رسید

اور شیخ فرید فرماتے ہیں۔

بے رفیقے ہر کہ شد در راہ عشق ❊ عمر بگذشت و نشد آگاہ عشق،
گر ہوائے ایں سفر داری دلا ❊ دامن رہبر بگیر و پس در آ،
در ارادت باش صادق اے فرید ❊ تا بیابی گنج عرفاں را کلید

گو فی نفسہ یہ طریق آسان ہے کچھ اسپر موقوف نہیں کہ کسی کا ہاتھ پکڑو اگر اپنے پاس عقل سلیم ہو تو خود ہی طے کر سکتے ہو مگر چونکہ ایسی عقل سلیم قریب قریب مفقود ہے اس لئے اگر تنہا بھی ہمت کرو گے تب بھی چار منزل چل کر تھکو گے یا رجل اللہ خذ بیدی اس وقت

شخص بالکل اندھا معلوم ہو گا بعض لوگوں نے گوشۂ عزلت اختیار کر لیا ہے میں ان پر کوئی طعن نہیں کرتا کیوں کہ وہ تارک الدنیا ہیں مگر میں یہ ضرور کہتا ہوں کہ ساتھ میں تارک الدین بھی ہیں کیونکہ امر بالمعروف بھی تو دین ہی ہے البتہ اگر شیخ کسی مصلحت سے اس سے چند روز کیلئے منع کر دے تو پھر نہ کرنا چاہیئے مگر وہ ترک نہیں کرتا بلکہ ملتوی کراتا ہے جیسے طبیب کسی کو مسہل دیتا ہے تو بھنی ہوئی بوٹیاں کھانے سے منع کرتا ہے تو یہ نہیں کہ ساری عمر کیلئے چھڑا دیتا ہے بلکہ غذا تو یہی ہے مگر اس وقت اس کا معدہ اس قابل نہیں کہ اس کو ہضم کر سکے اسی طرح شیخ دیکھتا ہے کہ اگر یہ اب ہی سے امر بالمعروف کرنے لگا تو اس کے اندر عجب پیدا ہو جائیگا اس لیئے روکتا ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

منصب تعلیم نوعے شہوتیست ٭ ہر خیال شہوتی در رہ بتست

چنانچہ خود میں نے ایک شخص کو جس نے اپنی تقدیس اور دوسرے کی تحقیر کے طور پر ڈانٹا تھا اور یہ سزا مقرر کی تھی کہ نمازیوں کی جوتیاں سیدھی کیا کرو اور لوٹے بھر کر وضو کیلئے دیا کرو کیونکہ جب اس نے نصیحت کی تھی اپنے کو اس شخص سے اچھا سمجھا تھا اور یہ کبر ہے اور اس کا علاج بھی ذلت ہے بس امر بالمعروف کیلئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ عین نصیحت کیوقت بھی یہ نہ سمجھے کہ میں اس شخص سے اچھا ہوں شاید اس پر کوئی کہے کہ صاحب ہم تو نماز پڑھتے ہیں اور دوسرا بے نمازی ہے اس سے تو اپنے کو اچھا ہی سمجھیں گے مسلمان اپنے کو کافر سے تو اچھا ہی جانتا ہے اس کے جواب کے دو درجے ہیں ایک ذوقی دوسرا عقلی۔ ذوقی کو تم کیا سمجھو گے۔ جواب عقلی بتلاتا ہوں وہ یہ کہ العبرۃ للخواتیم تو افضل وہ ہے جس کا خاتمہ اچھا ہو۔ اب کس کو پتہ ہے کہ بے نمازی کا خاتمہ اچھا ہو گا یا ہمارا۔ اس وقت تو ہماری یہ حالت یہ ہے ؎

گہ رشک برد فرشتہ بر پاکی ما ٭ گہ خندہ زند دیو ز ناپاکی ما
ایماں چو سلامت بلب گور بریم ٭ احسنت بریں چستی و چالاکی ما

بس بڑی فضیلت تو یہ ہے کہ آدمی ایمان کے ساتھ مرجاوے جو معلوم نہیں۔ اسی طرح کافر کی حالت معلوم نہیں کہ اس کا خاتمہ اچھا نہ ہوگا ممکن ہے کہ مرتے دم وہ مسلمان ہو جاوے اور اس کا خاتمہ اچھا ہو جاوے۔ پھر یہ دعویٰ کیسے کر سکتے ہو کہ تم اس سے اچھے ہو۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

ہیچ کافر را بخواری منگرید ۔۔ کہ مسلمان بودنش باشد امید

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے قصہ نقل کیا تھا کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے ایک بنیے کو خواب میں دیکھا جو ان کے پڑوس میں رہتا تھا اس کے مرنے کے بعد دیکھا کہ وہ جنت کے باغ میں سیر کر رہا ہے پوچھا لالہ جی تم یہاں کیسے ہو کہا مرتے وقت کلمہ پڑھ لیا تھا اللہ تعالیٰ نے مغفرت فرمادی۔ یہاں لالہ جی تھے وہاں گل لالہ ہو گئے کیا معلوم کس کا خاتمہ کیسا ہو۔ ایک عابد نے عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھا اور ان کے ساتھ ہولیا اور ایک گنہگار فاجر فاسق اپنے دروازہ پر کھڑا رہا۔ عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھ کر بہت جی چاہتا تھا کہ اُن سے ملے مگر اپنی بدکاری پر نظر کرتے ہوئے ہمت نہ ہوتی تھی کہ آپ کے پاس آوے اپنے کو بہت ہی روکا آخر رہا نہ گیا اور ساتھ ہولیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو اخلاق سے پیش آئے اور اس جاہل عابد کمبخت متکبر نے اس کو بہت لتاڑا کہ تو ہمارے ساتھ کیسے ہو گیا اور دعا کی کہ اے اللہ مجھ کو آخرت میں بھی اس کو ساتھ جمع نہ کیجیو اور اس گنہگار نے اپنی مغفرت کی دعا کی فوراً وحی آئی کہ دونوں کی دعا مقبول ہوئی اُس نے تو اللّٰھم اغفرلی کہا تھا اس کو ہم نے جنتی بنادیا اور اس نے یہ دعا کی تھی کہ میرا اس کا آخرت میں ساتھ نہ ہو ہم نے اس کی بھی دعا قبول کی کہ دوزخ میں جائے گا تاکہ اس کا ساتھ نہ ہو اسی لیے ایک عارف فرماتے ہیں ؎

غافل مرو کہ مرکب میدان مرد را ۔۔ در سنگ لاخ بادیہ پے ہا بریدہ اند

نومید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش ۔۔ ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ مومن مومن نہیں ہوسکتا جب تک اپنے کو کافر فرنگ سے بھی بدتر نہ سمجھے۔

غرض اس کا عقلی جواب یہی ہے کہ العبرۃ للخواتیم اور خاتمہ کا حال معلوم نہیں کیا ہو گا۔ ایک شخص نے مجھ سے پوچھا کہ یزید پر لعنت کرنا کیسا ہے میں نے کہا لعنت کی ایسے شخص کو اجازت ہے جس کو یہ یقین ہو کہ میں اس سے اچھا ہو کر مرونگا ورنہ وہ چڑاویگا کہ کیسے کا ہی منہ تھا لعنت کرنے کا۔ خدا قہر سے بچاوے کیا خبراب تو اپنے کو بایزید سمجھتے ہو اور وہاں کہیں با حذف ہو کر یزید ہی نہ رہ جاؤ۔ اس لئے شیوخ جب تک کسی کے اندر عجب و پندار دیکھتے ہیں اس تک امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے منع کر دیتے ہیں پھر جب اہل ہو جاتا ہے اجازت دیتے ہیں سو اصل فرض تو امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہی ہے مگر عوارض کیوجہ سے روک دیتے ہیں جیسے مریض کو گوشت بوٹی سے روکا جاتا ہے ایک اور مثال دیتا ہوں اس سے وہ ذوقی جواب سمجھنے کی کسی قدر قابلیت ہو جائیگی گو تفصیل سے نہ سمجھ سکو۔ مثلاً کسی شہزادہ نے کوئی جرم کیا ہو اور بادشاہ کی طرف سے کسی بھنگی کو حکم ہوا ہو کہ شاہزادہ کے ایک درجن بید لگاؤ اور بادشاہ بھی عادل ہے ظالم نہیں اور یہ بے چارہ بھنگی ہے اور وہ شاہزادہ ہے اب وہ لنگی باندھ کر بید لگاتا ہے کیا کرے شاہی حکم ہے گو بید مارتے ہوئے اس کی روح نکلتی ہو۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ ضارب تو بھنگی ہے اور مضروب شاہزادہ ہے مگر باوجود اس کے کیا یہ بھنگی بید لگانے کے وقت یہ سمجھے گا کہ میں اس سے افضل ہوں ہرگز نہیں اس کا تصور بھی اس کے ذہن میں نہ آوے گا مگر مجبوراً مارنا پڑتا ہے اگر نہ مارے تو مجرم بنتا ہے کیا کرے ہاتھ اٹھتا نہیں روح فنا ہوتی ہے حالت یہ ہے کہ بید تو مارتا ہے اس کی کمر پر مگر اپنے قلب پر بھی آرہ چل رہا ہے ذرا ہاتھ ڈھیلا ہوا اور بادشاہ نے کہا زور سے مار اب بیچارہ شرم کے مارے مرا جا رہا ہے مگر کرے کیا۔ ؎

چوں طمع خواہد زمن سلطانِ دیں ۔۔ خاک بر فرقِ قناعت بعد ازیں

جب یہ مثال سمجھ میں آگئی تو اب سمجھو اگر کسی وقت مصلح کو حکم شرعی یہ ہو کہ

بے نمازی کو دھکا دے اور مارے تو جیسے بھنگی عین ضرب کے وقت اپنی حقیقت کو دیکھ رہا ہے اسی طرح جو عارف ہو گا وہ عین عتاب کے وقت یہ سمجھے گا کہ ممکن ہے اس کا درجہ مجھ سے بڑا ہوا ہو اور میں اس سے کم درجہ ہوں مگر حکم سے مجبور ہوں جب آپ کو یہ درجہ حاصل ہو جائے اس وقت قابلیت ہو گی امر بالمعروف کی اس سے ثابت ہوا کہ شیوخ کا امر بالمعروف سے کسی مرید کو منع کرنا برا نہیں ہے میں یہ کہہ رہا تھا کہ جیسے دوسرے کی اصلاح کے درپے ہوتے ہو اول اپنی اصلاح کی فکر کرنی چاہیے اور تربیت کی فرصت نہ ہو تو یہ دونوں کام دوش بدوش ہوں مگر اس جمع کا طریقہ کسی بزرگ سے پوچھ لو چاہے اس کے مرید مت ہو میں مرید ہونے کو نہیں کہتا بلکہ ان سے مشورہ لینے کو کہتا ہوں کیوں کہ اس کی اونچ نیچ نشیب و فراز کو وہ خوب سمجھ سکتے ہیں جہاں ان کا ذہن پہنچتا ہے وہاں تک تمہاری عقل کی رسائی نہیں ہو گی پس جیسے کسی طبیب سے نسخہ لکھوا لیتے ہو اسی طرح کسی شیخ سے پوچھ کر کام کرو۔ مرید تو نہ ہو مگر اس کے اتباع کو ویسا ہی لازم سمجھو جیسے پیر کے حکم کو لازم سمجھتے ہو۔ غرض اصل ترتیب یہی ہے کہ پہلے اپنی اصلاح کرو پھر دوسرے کی پھر دوسروں کی اصلاح میں بھی پہلے اپنے گھر کی اصلاح کرو پھر نوکر چاکر کی پھر اپنے ہم وطنوں کی پھر ان میں جو کافر ہوں ان کو اسلام کی ترغیب دو ان کو اسلام کے محاسن سے مطلع کرو مگر طعن و تشنیع مت کرو دیکھو اگر تمہیں کسی کو حسین معشوق پہ عاشق بنانا ہے اور دوسرے بدشکل آدمی سے اس کو پھرانا ہے جو اس کے دل میں رچا ہوا ہے اور اس کی محبت اس کے دل میں جاں گزیں ہے تو اول تو وہ تم سے جھگڑے گا اور اپنے معشوق کو اچھا کہے گا اس سے رنجیدہ نہ ہو اور کچھ معارضہ نہ کرو بلکہ اس کو اپنے معشوق کی ادائیں دکھاؤ جب وہ اس کی ادائیں دیکھے گا تو فوراً کہے گا ۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم ۔۔ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا

وہ خود ہی کہے گا کہ ارے میں نے کہاں اپنی عمر برباد کی۔ ایسے دلکش دلربا معشوق کو چھوڑ کر کس چڑیل کے پیچھے میں نے اپنی جان کھپائی۔ صاحبو! اسلام کی خوبیاں صاف صاف ہیں پھر باوجود سادگی کے دلکش ہیں متنبی شاعر کہتا ہے ؎

حسن الحضارۃ مجلوب بتطریۃ ٭ وفی البداوۃ حسن غیر مجلوب

یعنی شہری معشوق کا حسن بناوتی ہوتا ہے اور دیہاتی میں اصلی حسن ہوتا ہے اسی کے متعلق عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

دلفریبان نباتی ہمہ زیور بستند ٭ دلبر ماست کہ با حسن خداداد آمد

تبلیغ میں بے فکری

اور اسلام کا حسن خداداد اور دلکشی بھی ایک بناء ہے تبلیغ سے اہل حق کی ایک درجہ میں بے فکری کی اور یہ ایک راز ہے جی تو چاہتا نہیں کہ اس کو بیان کروں کہیں لوگ اس سے امر بالمعروف میں زیادہ سستی نہ کرنے لگیں مگر جب میں نے سستی کی مذمت بیان کر دی پھر اس راز کو کیوں چھپاؤں جب کہ اس سے اسلام کی خوبی نکلتی ہے وہ راز یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اہل باطل اپنے مذہب کے پھیلانے میں بڑی بڑی تدبیر کرتے ہیں مال سے۔ جان سے۔ جاہ سے ہر طرح اسمیں لگے رہتے ہیں اور اہل حق اکثر ایسے بے فکر ہیں کہ اشاعت اسلام کو اپنا کام بھی نہیں سمجھتے بلکہ اللہ میاں کا کام سمجھتے ہیں کہ حضور آپ کی جائیداد ہے ہمیں تو نفع سے مطلب ہے کہ ہم کو کھانے کو ملجائے تو بس کافی ہے باقی جائیداد کا انتظام خود آپ کریں چنانچہ آپ نے انا لہ لحافظون فرمایا بھی ہے

سو اصل تو اس کی یہ ہے کہ اہل باطل اپنے بطلان کو جانتے ہیں اور اس لئے سمجھتے ہیں کہ امداد غیبی تو ہوگی نہیں ہم بھی اگر کوشش نہ کریں گے تو مذہب ہی مٹ جاوے گا اور اہل حق اسلام کو حق سمجھ کر تائید حق کا یقین رکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ بدون ہماری کوشش کے بھی اس کی ترقی ہوگی سو اس اصل کے اعتقاد میں تو کوئی ملامت نہیں

مگر اس میں غلو کر لیا کہ جتنی کوشش کا حکم ہے اس میں بھی کوتاہی کرتے ہیں اور حیرت کی بات ہے کہ قرآن مجید کے حفظ کرنے کو تو جو کہ ایک فرد ہے حفاظت قرآن کی اسطرح خدا کے حوالے نہ کیا بلکہ تین تین چار برس سر مار کے یاد کرتے ہیں۔ پھر ہمیشہ دور کرتے رہتے ہیں اور اسلام کی حفاظت کو اس طرح خدا کے حوالے کیا کہ ذرا سعی نہیں کرتے۔ اگر قرآن مجید کے متعلق کوئی ان سے سوال کرے کہ میاں قرآن کا بھی تو خدا حافظ ہے پھر تم یاد کیوں کرتے ہو؟ تو وہاں جواب دیتے ہیں کہ یہ بھی تو خدائی محافظت ہے کہ ہم کو حکم دیا ہے کہ ہم یاد کریں اور اس ذریعہ سے اس کو قائم رکھیں۔ سو ایسا ہی اسلام کے متعلق معاملہ ہونا چاہیے کہ یہ بھی خدائی حفاظت ہے کہ ہم کو حکم دے دیا کہ اسلام کی خدمت کریں اور اسلام کو قائم رکھیں غرض یہاں ایسی بھاری غلطی کی کہ حفاظت و اشاعت اسلام سے بالکل بے فکر ہو گئے اور قریب قریب جتنے اہل حق ہیں سب ہی بے فکر ہیں اور گو اس بے فکری کا راز اصل میں یہی ہے کہ اسلام کا حسن ہی ایسا ہے کہ جو کوئی اس کو نظر انصاف سے دیکھے گا وہ اس کی طرف خود ہی مائل ہو جاوے گا کسی کے بلانے کی ضرورت نہیں بقول حافظ شیرازیؒ کے ؎

ز عشق نا تمام ما جمال یار مستغنی ست ۔۔ باب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبارا

سو اس کو تو میں تسلیم کرتا ہوں کہ آب و رنگ خال و خط اسلام میں خود ہی بہت کچھ ہے اور ضرور ہے۔ مگر اتنا تو کرنا تمہارا کام ہے کہ کسی آنکھ بند کرنیوالے کی آنکھ کھول دو۔ اسے ایک دفعہ اس کا چہرہ دکھا دو پھر یہ اپنا کام خود ہی کر لے گا گو جن لوگوں نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا ان پر بھی اس کا قبول کرنا اس لیئے فرض ہو گیا ہے کہ وہ دیکھ سکتے ہیں اور یہ نہ دیکھیں تو ایسوں نے دیکھ لیا ہے جن کا دیکھنا ان پر حجت ہے لیکن اگر ان کو بھی دکھلا دو تو ان کا یہ جہل رفع ہو جاوے گا کہ ہم نے تو دیکھا ہی نہیں اس لیئے ہم مکلف نہیں۔

جیسے کوئی ڈوم تھا اس نے سنا تھا کہ چاند دیکھنے سے روزہ فرض ہو جاتا ہے اس نے رمضان کا مہینہ آتے ہی گھر میں ایک پاخانہ کا برتن رکھ لیا وہاں ہی بیٹھا موتا تھا کہ مبادا

گھر سے نکلے تو کہیں چاند نظر نہ آجاوے پھر روزہ فرض ہو جاوے گا دو چار دن تو عورت نے خدمت کی پھر ہاتھ پکڑ کر کہا نکل یہ کہاں کی پخ لگائی اچھا خاصا تندرست آدمی اور میں اس کا گوہ موت صاف کروں جا نکل اب جنگل جانا تجویز کیا کہ کبھی شہر میں کوئی دل لگی میں منہ اوپر کو اٹھا دے اور چاند نظر پڑ جائے اب جو وہ جنگل میں پاخانہ کر کے تالاب پر آبدست کرنے گیا تو پانی میں چاند نظر آگیا اب چاند سے کہتا ہے گھس جا آنکھوں میں کر دے روجا فرج ہم تو دیکھتے نہیں تو آنکھوں میں گھسا آتا ہے۔ سنگ آمد سخت کا مضمون ہے غرض چاند کو تو اس کی ضرورت نہیں کہ اس کے نور کو کوئی دکھلا دے مگر جو شخص جہل سے آنکھ نیچے کئے ہوئے ہے، جہل رفع کرنے کیلئے ذرا اس کی آنکھ تو اوپر کو کرو۔ بس یہ حاصل ہے امر بالمعروف کی حقیقت کا۔ کہ جو کوئی اسلام کا حسن دیکھنا چاہے یا آنکھیں نیچی ہونیکی وجہ سے نہ دیکھے اس کو دکھلا دینا چاہئے اب میں اسلام کی کچھ خوبیاں بطور نمونہ کے بیان کرتا ہوں لوگوں نے آجکل ایک بڑی غلطی کی ہے اسی غلطی پر تنبیہ کرنے سے اسلام کا حسن نمایاں ہو جاوے گا وہ غلطی یہ کی ہے کہ جیسے آجکل سب چیزوں کا ست نکالا جاتا ہے اسی طرح لوگوں نے اسلام کا بھی ست نکالا ہے حکم تو یہ ہے ادخلوا فی السلم کافۃ کہ اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور لوگوں نے اس کا خلاصہ نکالا تو اب اسلام صرف نماز روزہ حج زکوٰۃ کا نام رہ گیا اور باقی احکام معاملات و عقائد و معاشرت و اخلاق کو کالخارج کر دیا گویا وہ اسلام میں داخل ہی نہیں چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ لوگ نماز تو پڑھ لیتے ہیں مگر عقائد کی فکر نہیں کہ موافق شرع کے ہیں یا نہیں۔ بعضوں کے ایسے عقائد ہیں کہ کفر تک نوبت پہنچتی ہے اس کی کسی کو فکر نہیں اسی طرح معاملات کا حال ہے بلکہ اس کو تو عقائد سے بھی زیادہ دین سے بے تعلق سمجھتے ہیں دلیل اس کی یہ ہے کہ جب کسی رہن بیع وغیرہ کا مسودہ لکھواتے ہیں تو وکیل کو تو دکھلاتے ہیں کہ یہ قانون کے موافق ہے یا مخالف مگر کبھی کسی کو یہ بھی کرتے دیکھا ہے کہ اس نے کسی عالم سے پوچھا ہو کہ یہ مسودہ شرع کے

موافق ہے یا نہیں اگر یہ کہو کہ صاحب اگر کسی عالم کو دکھلائیں تو جیسے وہ بتلادیں گے وہ یقیناً قانون کے موافق نہ ہوگا پھر یہ مسودہ کس کام کا رہے گا تو یہ عذر محض غلط ہے جب تم نے تو کسی عالم کو دکھلایا ہی نہیں تمہیں کیا خبر کہ وہ شریعت اور قانون کو جمع کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر کبھی ایسی مشکل پڑے تو کسی محقق عالم سے پوچھو جب شریعت اور قانون میں مخالفت ہوگی، وہ تفصیل وار حکم بتلادے گا جو اکثر صورتوں میں قانون کے بھی موافق ہوگا بشرطیکہ وہ فعل کھلم کھلا خلاف شریعت نہ ہو۔ یہ نہیں کہ زنا چوری کو بھی شریعت جائز کر دیگی بلکہ مطلب یہ ہے کہ جائز معاملات کی صورت علماء اکثر ایسی بتلادیں گے کہ قانون کے بھی خلاف نہ ہوگی بہرحال پوچھنے ہی سے تو اس کا پتہ لگے گا لیکن معاملات کو تو دین میں داخل سمجھتے ہی نہیں آجکل لوگوں کے زعم میں بیع باطل یا فاسد کرنے سے تو دین نہیں جاتا البتہ نماز روزہ نہ کرنے سے جاتا رہتا ہے۔

اسی طرح یہ سمجھ لیا ہے کہ معاملات و معاشرات کا دین سے کچھ علاقہ ہی نہیں کوئی یہ نہیں سمجھتا کہ بلا ٹکٹ کے ریل کا سفر کرنا گناہ ہے خیر ایسے لوگ تو کچھ کم بھی ہیں مگر بنیڈ سیر کے بجائے بیس سیر لیجانے والے تو بہت ہی کثرت سے ہیں۔ اس کی پرواہ ہی نہیں۔

اجزائے اسلام

غرض لوگوں نے شریعت کا خلاصہ نکالا حالانکہ وہ اور سخت حماقت ہے اسلام کامل مکمل اور بہت مفصل مکمل قانون ہے جس کا خلاصہ ہو ہی نہیں سکتا اب اس کے مفصل مکمل ہونے کو ثابت کرنے کیلئے بتلاتا ہوں کہ اس کے کتنے اجزاء ہیں سو سمجھ لو کہ اس کے یہ اجزاء ہیں ایک عقائد دوسرے دیانات جیسے نماز روزہ حج زکوٰۃ تیسرے معاملات جیسے ہبہ بیع وغیرہ چوتھے معاشرت یعنی آپس میں ایک دوسرے سے کس طرح ملنا جلنا چاہئے کیا برتاؤ رکھنا چاہیئے۔ سب کے حقوق ادا کرنا۔ بیٹے کے خاص حقوق ہیں رعیت کے خاص حقوق ہیں حاکم کے خاص حقوق ہیں پڑوس کے خاص حقوق ہیں۔ پانچویں اخلاق باطنی جیسے صبر، شکر، زہد، توکل، محبت حق، تفویض تسلیم۔

رضا، مراقبہ موت، مراقبہ حساب۔ یہ اعمال باطنی ہیں جن کو اخلاق کہتے ہیں تو شریعت کے پانچ اجزا ہوئے اب ان پانچ چیزوں میں سے ایک ایک کو دیکھو ان کے اندر کیسی کیسی خوبیاں ہیں ایک مشترک خوبی تو یہی ہے کہ اس سے نجات آخرت حاصل ہوتی ہے مگر اس کے علاوہ ہر ایک میں خاص خاص خوبیاں بھی ہیں جن کا دنیوی مصالح پر بھی اثر پڑتا ہے اب ان خوبیوں کو سمجھو۔

فوائدِ توحید

چنانچہ پہلا جزو اسلام کا عقائد ہے اس کی خوبی کو دیکھو کہ اسلام کا بہت بڑا عقیدہ یہ ہے کہ خدا کو واحد مانو موجود جانو۔ یعنی تمام کمالات علم و قدرت وغیرہ میں وہ یکتا ہے اس کا علم ایسا ہے کہ اس سے کوئی چیز خارج نہیں۔ قدرت ایسی ہے کہ کوئی ممکن چیز اس کی قدرت سے خارج نہیں۔ یہ عقیدہ قطع نظر اس سے کہ دلائل سے اس کا ہونا ثابت ہے، اس کے ثمرات دنیوی کو دیکھئے جو شخص اپنے سر پر ایسے مالک کو مانے گا جو ہر طرح سے کامل ہے اس کا اثر خاص یہ ہو گا کہ اس کے دل میں خدا تعالیٰ کی ہیبت وعظمت ہوگی اور ان سے محبت ہوگی کیوں کہ بادشاہ جتنا کامل ہوگا اتنی ہی محبت وہیبت زیادہ ہوتی ہے پھر حق تعالیٰ ایسے جمیل ہیں کہ کوئی ان کے جمال کے قریب قریب بھی نہیں۔ جب کسی کے قلب میں خدا تعالیٰ کی ہیبت و محبت ہوگی تو کسی شخص کو اس سے ایذا نہ پہنچے گی وہ کسی کا حق تلف نہ کرے گا کیوں کہ ڈرے گا کہ خدا ناراض ہوگا۔ ادھر تو محبت کا تقاضا محبوب کو راضی رکھنا ہے پھر ہیبت کے سبب اس کی مخالفت کرتے ہوئے جان نکلے گی۔ قطع نظر دوزخ جنت کے خوف وطمع کے اگر حق تعالیٰ کی یہ محبت وہیبت پیدا ہو جائے تو ایسا شخص ہرگز مخالفت نہیں کر سکتا چنانچہ حدیث میں ایک صحابی کی بابت آپ فرماتے ہیں کہ اگر ان کو خدا کا خوف بھی نہ ہو تو بھی نافرمانی نہ کرے گا وہ کیا چیز ہے جو نافرمانی نہ کرنے دے گی؟ وہ محبت ہی تو ہے۔ دیکھئے فوائد اس عقیدے کے بھلا جو شخص خدا کے ساتھ یہ عقیدہ رکھے گا کیا وہ کبھی اس کی نافرمانی کرے گا ہرگز نہیں برخلاف اسکے جو

کوئی حاکم دنیا ہی سے خائف ہو وہ جرائم سے اتنا پرہیز نہ کرے گا۔ کیوں کہ دنیا کا حاکم ہر وقت سامنے نہیں اگر پیٹھ پیچھے کچھ کر لیا تو اس کو خبر بھی نہ ہوگی مثلاً کسی کے پاس کوئی خط آیا اس وقت اس کے سامنے کوئی پولیس کا آدمی بھی نہیں ہے اور لفافہ کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ ٹکٹ پر مہر نہیں پڑی بالکل سادہ صاف ہے تو اب دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ جن کو خدا کا خوف یا اس سے محبت ہے اور ایک وہ جس کو خوفِ خدا نہیں ایسے شخص کو اس وقت کوئی قوت روکنے والی نہیں ہے کہ وہ پھر اس سے کام نہ لے اور یہ جرم ہے جس میں ڈاکخانہ کا نقصان ہے گو کم ہی ہو مگر خبر بھی ہے کہ ایک پائی کی خیانت بھی خیانت ہی ہے بخلاف اس شخص کے جسکو خوفِ خدا ہے وہ اس پر ہرگز جرأت نہیں کر سکتا کہ اس ٹکٹ سے پھر کام لے گو کسی کو اس کی خبر نہ ہو کوئی اس کو دیکھ نہ رہا ہو مگر مالک حقیقی کو تو خبر ہے اس لیئے وہ خط پڑھنے سے پہلے اس ٹکٹ کو چاک کر دیگا۔ دیکھئے یہ دنیا کا نفع پہونچا حکومت کو یا نہیں؟ اور یہ محض اسلیئے کہ اس شخص کا عقیدہ یہ ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ رحم میں کامل ہیں انتقام میں بھی کامل ہیں۔

اور دیکھو فرض کرو کہ تم ریل میں جا رہے ہو ایک بچہ ملا۔ یتیم جس کے ساتھ کوئی نہیں اور ایک ہزار کا نوٹ اس کے پاس ہے اس نے کہا ہم کو فلاں جگہ پہونچا دو۔ راستہ میں اتفاق سے وہ مرگیا اور کوئی نہیں جانتا کہ اس کے پاس اتنے روپے ہیں نہ ریل والے جانتے ہیں اور نہ کسی مسافر کو خبر ہے اور نہ ہم کو اس کی جان پہچان ہے صرف اتنا جانتے ہیں کہ فلاں جگہ جانیوالا ہے غسل دینے کے وقت جو پہلا کپڑا اس کے بدن سے نکالا تو جیب سے ہزار کا نوٹ نکلا اب کسی کو خبر بھی نہیں اور تم حاجتمند بھی ہو کہ دس ہزار کے قرضدار بھی ہو جسمیں جائداد نیلام ہونیوالی ہے ابرو پر بن رہی ہے۔ فرمائیے کوئی قوت ہے اس وقت اس نوٹ کے لینے سے روکنے والی۔ اب خیال کیجئے کہ ایک تو دہری ہے جو خدا کا قائل نہیں اور اس کو ایسا موقع پیش آوے وہ تو یقیناً سب روپیہ دبا لے گا اور ایک وہ ہے جس کے دل میں خدا کا خوف ہے وہ اس یتیم بچہ کے تبلائے ہوئے موقع پر جا دے گا اور اس کے ورثہ

کو تلاش کرکے یہ روپیہ سب کو حصہ رسد بانٹ دیگا اگر وہاں کوئی نہ ملے تو اسمیں لقطہ کے احکام جاری کرے گا۔ دیکھئے یہ کیسا پاکیزہ عقیدہ ہے جس نے ایک عالم کو خطرہ سے بچالیا یہ اسی عقیدہ کی بدولت ہوا کہ خداوند کریم کامل ہے علم و قدرت میں۔

برکاتِ تقدیر اور اسلام کا ایک عقیدہ اور ہے کہ خداوند کریم نے جس چیز کو جسطرح مقدر کیا اسی طرح ہوگا اس کی برکت اور نافع ہونیکو خیال فرمایئے اس کا بیان یہ ہے کہ بڑا دنیوی نفع انسان کا جو اصلی مقصود ہے وہ راحت ہے کماتا ہے اسی لیئے کہ راحت ہو اولاد کی تمنا کرتا ہے اسی لیئے تاکہ راحت ہو دولت جائداد سے بھی مطلوب راحت ہی ہے۔ مکان بناتا ہے راحت ہی کیلئے غرض مطلوب ہر چیز میں راحت ہی ہے اب اس تمہید کے بعد میں کہتا ہوں کہ اگر دنیا میں کوئی ناقابل تدارک مصیبت میں مبتلا ہو جائے تو اب دیکھنا چاہیئے کہ اسکی راحت کا کوئی سامان کسی کے پاس ہے نہیں ہرگز نہیں مگر میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ اسلام کے پاس اس کی بھی راحت کا سامان موجود ہے اور وہ وہی عقیدہ تقدیر ہے بخدا اس عقیدہ کے بدون اس کو راحت ہرگز میسر نہیں ہوسکتی اور یہ عقیدہ اسلام کے سوا کسی کے پاس نہیں کہ ہر چیز مقدر کے موافق ہوتی ہے کسی کا جوان لائق بیٹا مر جاوے اور اس کا یہ اعتقاد نہ ہو تو عمر بھر مصیبت میں مبتلا رہیگا کہ ہائے اس کا علاج اچھی طرح کرتا تو نہ مرتا ہائے اس کا پرہیز اچھی طرح نہ ہوا اگر فلاں ڈاکٹر کے پاس لے جاتا تو اچھا ہو جاتا یہ تو منکر عقیدہ تقدیر کی حالت ہوگی اور ایک وہ ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر چیز تقدیر کے موافق ہوتی اور اسمیں حکمت ہوتی ہے اگر اس کا کوئی ایسا ہی عزیز مر جاوے تو گو اس کو رنج طبعی تو ہوگا اور وسوسہ کے طور پر اگر اس کو یہ خیال بھی ہو کہ دوا میں غلطی ہوگئی تو تھوڑی ہی دیر کے بعد معاً پھر وہ اسی سے تسلی حاصل کریگا کہ یہ بات بھی تقدیر ہی میں تھی کہ دوا میں غلطی ہو جائے اول اول تو اسے ضرور حزن تھا۔ مگر تفویض کے ساتھ تھا پھر بعد چندے وہ بھی زائل ہو گیا بخلاف دہری شخص کے وہ تو تمام عمر ہی غم و الم میں گھٹتا رہے گا تو دیکھئے مسئلہ تقدیر کا دنیوی بھی کتنا بڑا نفع عظیم ہے

اور حق تعالیٰ نے بھی اس حکمت کو بیان فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں۔ ما اصاب من مصیبۃ فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتاب من قبل ان نبرأھا ان ذٰلک علی اللہ یسیر لکیلا تاسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما اتٰکم واللہ لا یحب کل مختال فخور یہ لام کی ایک مقدر کے متعلق ہے جس پر پہلا جملہ دال ہے یعنی اخبرکم بھذا لکیلا تاسوا یعنی ہم نے مسئلہ تقدیر کو اس لئے بیان کیا تاکہ تم کو رنج نہ ہو مافات پر، اور نہ اتراؤ ما اتی پر۔ یہ تو مصیبت کا ذکر تھا۔ میں اور ترقی کر کے کہتا ہوں کہ جو مسئلہ تقدیر کے معتقد نہیں ان کو نعمت میں بھی راحت نہیں ہے کیونکہ انسان کے اندر اکثر طبعاً حرص بہت ہوتی ہے اس کو جتنا بھی ملے اسی قدر اس کی حرص بڑھتی ہے کہ اور ترقی ہو۔۔۔۔ ایک گاؤں کا مالک ہو تو ذہن میں حرکت ہوئی کہ ایک گاؤں اور مل جاوے اسی طرح اس کا کوئی انتہا ہی نہیں ہے عمر بھر چین نہیں ہے چاہے کتنا ہی صاحب جائداد ہو جاوے مگر حرص کا مادہ اور بڑھتا ہے اور جو تقدیر کا قائل ہے وہ ہر درجہ میں قانع ہو جاتا ہے اسے جتنا بھی ملا کہے گا کہ اتنا ہی میری تقدیر میں تھا اور بھی کچھ اگر تقدیر میں ہو گا وہ بھی ضرور ملیگا وہ ہر وقت بادشاہ ہے گو ظاہر میں مفلس ہو۔ چین سے بیٹھا ہے اسے کوئی فکر و رنج پریشانی نہیں ہے۔

ان کے چین کا حال کیا بیان کروں۔ حضرت شیخ عبدالقادر کو ملک نیمروز کے بادشاہ سنجر نے لکھا تھا کہ آپ کی خانقاہ کیلئے میں ملک نیمروز کا ایک معتدبہ بڑا حصہ دینا چاہتا ہوں آپ نے جواب میں یہ تحریر فرمایا ؎

چوں چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد ... در دل بود اگر ہوس ملک سنجرم
زانگہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب ... من ملک نیمروز بیک جو نمیخرم

یعنی میرے دل میں اگر ملک نیمروز کی ہوس ہو تو میرا چہرہ سنجری چتر کیطرح سیاہ ہو جائے اس وقت ان سلاطین کا چتر سیاہ ہوتا تھا اور فرمایا ؎

زانگہ کہ یافتم خبر از ملک نیمشب ... من ملک نیمروز بیک جو نمیخرم

جب سے مجھے نیم شب کی سلطنت ملی ہے میں اس نیمروز کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتا یعنی آدھی رات کو اٹھ کر اللہ اللہ کہنا یہی ہے بڑی سلطنت ۔ نیمروز کی سلطنت سے کیا ہو گا صاحبو! آخر یہ کاہے کی برکت ہے ۔ مسئلہ تقدیر ہی کی برکت ہے وہ جانتے تھے کہ جو ملنے والا ہے ضرور ملے گا ہم کو اس میں سرگردانی اور پریشانی اٹھانے کی کیا ضرورت پڑی ہے اور واقعی ایسا ہی ہوتا ہے کہ جو ملنے کی چیز ہے وہ ضرور ملتی ہے اور جو تقدیر میں نہیں وہ ہزار تدبیر سے بھی حاصل نہیں ہوتی یہ ہے عیش اور راحت جو بادشاہوں کو بھی میسر نہیں اور جس طرح اس عقیدہ والے کو کسی سے طمع نہیں ہوتی جیسا کہ بیان ہوا اس طرح اس کو کسی سے خوف بھی نہیں ہوتا وہ بڑے سے بڑے بادشاہوں کو بھی منہ نہیں لگاتے کیوں کہ ان کا عقیدہ یہ ہے وما هم بضارين به من احد الا باذن الله کہ بلا حکم پروردگار کوئی تکلیف نہیں پہونچا سکتا اور اگر ادھر ہی سے حکم ہے تو بدل و جان راضی ہیں۔ حضرت علیؓ صفین کی لڑائی کے میدان میں گھوڑے پر اونگھ رہے تھے کسی نے عرض کیا حضرت یہ میدان حرب و ضرب ہے گردنیں گیند کی طرح اڑ رہی ہیں آپ کو نیند آرہی ہے جواب دیا ؎

ای یومین من الموت افر ∴ یوم لا یقدر او یوم قدر

فرمایا کونسی تاریخ میں موت سے بھاگوں یا تو مقدر دن میں یا غیر مقدر دن میں ؎

یوم لا یقدر لا یاتی القضا ∴ یوم قد قدر لا ینفع الحذر

ہے کوئی ایسا شخص جو میدان جنگ میں اپنے کو ایسی شان سے دکھلا سکے؟ یہ حضرت علی ہی کی ہمت ہے یا ان کے غلاموں کی ۔ فرمائیے یہ ہمت و جرأت کاہے سے ہے؟ اسی عقیدہ کی بدولت اسی کو فرماتے ہیں ؎

موحد چہ برپائے ریزی زرش ∴ چہ فولاد ہندی نہی بر سرش

امید و ہراسش نباشد ز کس ∴ ہمیں ست بنیاد توحید و بس

اور اگر کسی معتقد تقدیر میں اتنی قوت نہ پائی جاوے تو اس کی وجہ یہ ہو گی کہ خود اس اعتقاد

میں اتنی ہی کمی ہوگی خواہ جزم کی کمی ہو خواہ غلبۂ حال کی کمی ہو یہ تو بڑے درجہ والوں کی باتیں ہیں۔

اب میں ادنیٰ سا ایک نمونہ دکھلاتا ہوں اصلی کے تو ہم اہل ہی کہاں ہیں گو اس نمونہ کو بیان کرتے ہوئے شرم بھی آتی ہے کیوں کہ صورت دعویٰ کی سی ہے۔ مگر حاشا وکلا میرا مقصود دعویٰ نہیں ہے صرف ایک نمونہ دکھلانا ہے۔ میرے پاس ایک رئیس کا خط آیا تھا کہ میں تمہارے مدرسہ کیلئے دو سو روپیہ بھیجتا ہوں اور میں تم کو بلاؤں گا بھی میں نے منی آرڈر واپس کر دیا اور یہ لکھا کہ آپ روپے بھیج کر مجھ کو متاثر بنانا چاہتے ہیں، روپیہ اپنے پاس رکھئے اور اب بلانے کی تحریک کیجئے لوگوں کو خیال بھی ہوا کہ اتنی بڑی رقم کو کیوں واپس کر دی۔ مدرسہ کا کوئی کام نکل جاتا میں نے کہا اگر یہ مدرسہ کی تقدیر کا ہے تو پھر آویگا چنانچہ پھر منی آرڈر آیا اور معذرت کی کہ میری غلطی ہوئی یہ رقم حسبتہً للہ مدرسہ کو دیتا ہوں اور بلانیکی درخواست کو واپس لیتا ہوں اب میں نے لے لیا اور لکھ دیا کہ آپ کی تہذیب سے اب مجھ کو آپ کے ملنے کا اشتیاق ہو گیا پھر مدت کے بعد انہوں نے بلایا تو چلا گیا اب تبلائیے روپے آنے والے تھے۔ "ٹالنے سے بھی نہ ٹلے۔ کیا کوئی منکر تقدیر ایسا کر سکتا ہے؟ اور ایک جگہ سے پانچ روپے آئے اور لکھا کہ طلبہ سے میرے واسطے دعا کراؤ۔ میں نے واپس کر دیا اور لکھا کہ یہاں دعا کی کوئی دکان نہیں ہے پھر اس نے لکھا میں دعا نہیں چاہتا اور معذرت کے ساتھ روپیہ پھر بھیجا ہم نے لے لیا اور لکھ دیا کہ آپ کے واسطے خاص طور پر دعا بھی کی گئی مگر تمہیں یہ حق نہیں ہے کہ روپیہ دیکر دعا کی درخواست کرو تم کو تو برعکس ہمارے لیئے دعا کرنا چاہیئے کہ تمہاری رقم ہم نے لے لی اور تمہاری طرف سے کار خیر میں لگا دی۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

ویطعمون الطعام علی حبہ مسکینا ویتیما واسیرا انما نطعمکم لوجہ اللہ لانرید منکم جزاء ولا شکورا اسمیں مخلصین کی حالت بیان فرما کر یہ تعلیم دی گئی ہے کہ کھانا کھلا کر یہ کہو کہ نہ ہم اس کا بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ جسمیں دعا بھی داخل ہے بلکہ اللہ واسطے

خدا ہی کی محبت سے کھلاتے ہیں رقم دے کر دعا کی درخواست کرنا ایک قسم کا بدلہ لینا ہے بس ادب یہ ہے کہ دینے والا لینے والے سے دعا بھی نہ طلب کرے آگے اس کا فعل ہے خواہ دعا کرے یا بد دعا بلکہ خود ہدیہ دینے کا ادب یہ ہے کہ دے اور پھر اس کیلئے دعا کرے کہ انہوں نے لے تو لیا میرے مال کو ٹھکانے پہ لگا دیا۔ دیکھو مجذوب گالیاں دیتے ہیں اور پھر لوگ ان کے پیچھے پیچھے لئے پھرتے ہیں مولویوں نے کیا جرم کیا کہ وہ بیچارے گالی بھی نہیں دیتے بلکہ رقم لے لیتے ہیں اور پھر ان سے دعا کی بھی درخواست ہے گو مدرسہ ہی کیلئے دی ہو اصل میں بعضے مولویوں نے ہی عوام کو خراب کیا ہے اگر ان کے مدرسہ کیلئے کہیں سے روپیہ آتا ہے تو یہ اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ارے یہ شکریہ کیسا ایک تو تم نے اس کا کام کیا کہ اس کی رقم کو ٹھکانے لگا دیا پھر شکریہ بھی تم ہی ادا کرو ہاں پچاس روپے خود تم نے رکھ لئے ہیں اور پچاس مدرسہ میں لگا دیئے تو بیشک نصف شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔

وہ بھی اگر لگانا حقیقی لگانا ہو نہ ایسا لگانا جیسے ایک شخص کی حکایت ہے کہ باہر جا کر روپیہ مسجد کے نام سے چندہ کر کے لاتا اور خود کھا جاتا پھر جا کر چندہ کرتا اور کہتا کہ وہ تو مسجد میں لگا دیئے اور دو ایک واقف راز شخص نے کہا ارے ظالم کچھ خدا سے بھی ڈر کہ مسجد کے نام سے مانگ کر لاتا ہے اور خود ہی ہضم کر لیتا ہے اور جھوٹ بولتا ہے کہ میں نے مسجد میں لگا دیئے۔ کہا خدا کی قسم میں مسجد میں لگاتا ہوں تو آ میرے ساتھ دیکھ لگاتا ہوں یا نہیں بس اگر کیا کیا کہ سب روپے کو مسجد کے فرش سے رگڑ کر پھر گھر لے گیا تو یہ بھی ایک قسم کا لگانا ہے اگر پچاس روپیہ مدرسہ کو اسطرح لگایا ہے تو البتہ پورا شکریہ ادا کرنا آپ کے ذمہ ہے

اور اس لگانے کی تاویل پر ایک اور حکایت یاد آ گئی ایک قصبہ میں ایک شخص تھا نیک تہجد گزار وہ دودھ میں پانی ملا کر بیچتا تھا اور قسمیں کھا جاتا تھا کہ میں دودھ میں پانی نہیں ملاتا ایک شخص نے کہا ارے جھوٹی قسم کیسے کھاتا ہے؟ کہا جھوٹ کہاں میں تو پانی میں دودھ ملاتا ہوں دودھ میں پانی نہیں ملاتا یعنی وہ یہ کرتا تھا کہ پہلے سے برتن میں

پانی ملا کر الگ کر کے اوپر سے دودھ چھوڑ دیتا تھا تاکہ قسم کھا سکے تو بعض ایسے بھی متقی ہیں خدا غارت کرے ایسے متقیوں کو یا اصلاح کر دے اگر قابل اصلاح ہوں غرض اگر ایسے چندہ لینے والے ہوں وہ ضرور شکریہ ادا کریں ہمیں تو اس کی ضرورت نہیں جو لوگ چندہ لے کر شکریہ ادا کرتے ہیں مجھے تو ان پر شبہ ہوتا ہے کہ کہیں انہوں نے غبن تو نہیں کیا؟ کھا یا تو نہیں؟ ورنہ شکریہ کیوں کرتے ہو۔ بلکہ اس سے شکریہ لینا چاہیئے (یہ مزاحاً فرمایا ۱۲ جامع)

اصل بات یہ ہے کہ بعض مدعیان علم کو عزت نہیں رہی جاہلوں کی، عوام کی خوشامدیں کرتے ہیں کوئی رئیس بیمار ہو تو اسکی عیادت کو تو دس دفعہ جائیں گے اور غریب کو پوچھتے بھی نہیں۔

ایک مرتبہ ایک شخص نے ہمارے مدرسہ میں چار ہزار روپیہ بھیجنا چاہا مگر اس شرط کے ساتھ کہ ایک سب رجسٹرار کے سامنے اقرار کر لو کہ ہم نے پایا اور دستاویز پر سب رجسٹرار کے دستخط کرا دو وجہ اس شرط کی یہ تھی کہ اس رقم کی کسی نے وصیت کی تھی اور گورنمنٹ کو اس کا نگراں بنایا تھا تو وصی کو باقاعدہ حساب داخل کرنا ضروری تھا ہم نے کہا ہم ایسی مشروط رقم نہیں لیتے پھر انہوں نے لکھا ہم مجبور ہیں اور وہی وجہ مجبوری کی لکھی میں نے جواب دیا کہ ہم تو مجبور نہیں اگر آپ مجبور ہیں وہ رقم نہ بھیجئے انہوں نے پھر لکھا اچھا قصبہ کے کسی مجسٹریٹ ہی کے دستخط کرا دو میں نے جواب دیا کہ مجسٹریٹ تو خود ہمارے دروازہ پر آ سکتے ہیں مگر مجھے غیرت آتی ہے کہ روپیہ کیلئے مجسٹریٹ سے التجا کروں۔ پھر خط آیا کہ اچھا اپنے مدرسہ کے دو آدمیوں کے ہی دستخط کرا دو گے ہم نے کہا ہاں دو لنگوٹ بندوں کے دستخط کرا دیں گے بالآخر وہ اس شرط سے دست بردار ہوئے اور بدوں کسی شرط کے انہوں نے روپیہ بھیج دیا جس روز یہ روپیہ آیا اتفاق سے ایک ڈپٹی کلکٹر اور ایک جج میرے مہمان تھے میں نے ان کے دستخط کرا دیئے تو دونوں کی شرطیں پوری ہو گئیں ہماری بھی اور ان کی بھی۔ صاحبو! خدا سے تعلق پیدا کرو خدا کی قسم

اگر خدا سے تعلق ہو گیا تو دنیا کی یہ حالت ہوگی اَتَتْہُ الدنیا وھی راغمۃ کہ دنیا ناک رگڑتی ہوئی آوے گی ہم لوگوں نے شرح عقائد تو پڑھی ہے اس میں سب سچے عقائد ہیں اور دلائل سے ہم لوگ ان کو ثابت بھی کرتے ہیں، مگر عمل کے وقت سب ذہن سے رخصت ہو جاتے ہیں بس وہی حالت ہوتی ہے جیسے ایک طوطا ہر وقت کہتا ہے نبی جی بھیجو۔ مگر جب بلی آئی تو بس ٹاں ٹاں رہ گیا وہی حالت ہے جب تک سایہ میں ہیں عیش و عشرت سے ہیں تو اللہ اللہ کرتے ہیں اور جب کوئی مصیبت آئی سب حذف تو یہ ہماری خامی ہے باقی عقیدہ تقدیر کا نور اور برکت اور حکمت تو اوپر دکھلا چکا ہوں کہ اس سے دل کتنا قوی ہوتا ہے حقیقت یہ ہے کہ عقیدہ جس کے دل میں جما ہوا ہو وہ بادشاہ ہے کیونکہ سلطنت سے اصل غرض تو راحت ہی ہے اور اس شخص کو وہ راحت حاصل ہے کہ بڑے بڑے بادشاہوں کو بھی حاصل نہیں اس کی وہ حالت ہے ؎

خوشا وقتے و خرم روزگارے ۔۔ کہ یارے برخورد از وصل یارے

اور یہ حالت ہے کہ ؎

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے ۔۔ بہ ازانکہ چتر شاہی ہمہ روز ہاوہوئے

حضرت سلیم چشتی کا قصہ ہے کہ ایک روز اپنے ایک خادم کو کرتہ دیا جوئیں مارنے کیلئے اتفاق سے بادشاہ بڑے حشم و خدم سے ملاقات کیلئے آیا اس کو دیکھ کر خادم گھبرایا اور دوڑ کر حجرہ پر آواز دی حضرت نے پوچھا کیا ہے؟ کہا بادشاہ مع حشم و خدم کے بڑے کر و فر کے ساتھ آرہا ہے کہا جا بھلے مانس میں تو یوں سمجھا کہ کوئی بڑی سی جوں ہاتھ آئی ہے اس کو دکھلانے کیلئے پکار رہا ہے یہ کہہ کر پھر اپنے کام میں لگ گئے ان کی طرف التفات بھی نہ کیا۔ یہ کیا ہے اسی عقیدہ کی جھلک ہے اور خبر بھی ہے کہ یہ کون چیز ہے۔ کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ وہی مسئلہ تقدیر ہے۔ غرض یہ کہ دریا ہو یا پہاڑ، نجد ہو یا بالا سوسن کا سب جگہ وہی عقیدہ مشعل راہ ہے وہ حالت ہے کہ کان میتاً فاحییناہ

وجعلنا له نوراً یمشی به فی الناس الآیۃ کہ پہلے تو ایک مردہ تھا اب اس کو ایک نور عطا ہوگیا جہاں جاتا ہے وہی نور رہبری کرتا ہے یہ نور کیا ہے وہی عقیدۂ توحید و تقدیر ہے۔ حضرت شیرازی فرماتے ہیں ؎

گر گزندت رسد ز خلق مرنج ∴ کہ نہ راحت رسد ز خلق نہ رنج

از خدا داں خلاف دشمن و دوست ∴ کہ دل ہر دو در تصرف اوست

اور تصرف اسطرح ہوتا ہے کہ ؎

رشتہ در گردنم افگندہ دوست ∴ میبرد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

بزرگوں کی شانیں

ایک مرید نے اپنے پیر سے کہا کہ میں مختلف بزرگوں کی شانیں دیکھنا چاہتا ہوں فرمایا فلاں مسجد میں جاؤ تین آدمی مراقب بیٹھے ہیں ہر ایک کو ایک ایک دھپ مار دینا اس سے اُن کے الوان کا اندازہ ہوگا یہ ان کے پاس گیا تو دیکھا نورانی شکل متقی پارسا اول تو ہول ولا قوۃ ان کو کیسے ماروں مگر اس کو آزمانا تھا اپنی طبیعت پر بار ڈال کر اول ایک کو دھپ مارا وہ اٹھے یہ سمجھے کہ بس اب کم بختی آئی یہ تو کھڑے ہی ہوگئے اب وہ دونوں بھی ان کا ساتھ دینے کو اٹھیں گے اور مار کوٹ کر مجھے پیس لیں گے اچھا امتحان کرنے آیا کہ جان بچانا مشکل ہوگئی مگر وہ بزرگ اٹھ کر اس کے ویسا ہی ایک دھپ مار کر پھر اپنے کام میں مشغول ہوگئے پھر دوسرے کے پاس گئے ان کو بھی ایک دھپ لگایا وہ کچھ نہ بولے اپنی نشست بھی نہیں بدلی پھر تیسری جگہ گئے وہاں بھی یہی حرکت کی وہ اٹھے اور اس کے ہاتھ پکڑ کر سہلانا شروع کیا کہ بھائی تمہارے بہت چوٹ لگی ہوگی کس قدر تکلیف ہوئی ہوگی۔ یہ پیر کے پاس آئے کہا سمجھے کیا دیکھا؟ کہا آپ سمجھائیے۔ فرمایا کہ پہلا شخص تو شریعت کے ضروری درجہ پر ہے اس نے جزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا پر عمل کیا اس لیے اس نے صرف ایک دھپ پر اکتفا کیا اس سے معلوم ہوا کہ ہم لوگ اس پر بھی عمل نہیں کرتے انہوں نے اس قدر مساواۃ برتی

کہ اس سے یہ پوچھنا بھی گوارا نہیں کیا کہ تو کون ہے کیوں مارتا ہے کیوں کہ ادھر سے بھی اس نے تو صرف مارا ہی تھا کچھ بولا نہیں تھا آپ نے بھی صرف مارنے پر اکتفا کیا اور دوسرا صاحب طریقت ہے یعنی شریعت کے کامل درجہ پر اس کو یہ مراقبہ پیش نظر ہو گیا کہ سه

از خداداں خلاف دشمن و دوست ؎ کہ دل ہر دو در تصرف اوست

اس کا یہ مراقبہ راسخ ہو چکا تھا سمجھا کہ اس نے نہیں مارا یہ کون ہوتا ہے مارنے والا جو کچھ ہے ادھر سے ہی ہے یہ تو ایک پرزہ ہے اس کی کیا مجال ہے کہ اپنی طرف سے کچھ کر سکے سه

قال الجدار للوتد لم تشقنی ؎ قال الوتد انظر الی من یدقنی

اور تیسرا شخص شریعت کے اکمل درجہ پر تھا یعنی فنا فی اللہ سے بڑھ کر بقاء باللہ میں پہونچ گیا فنا تک تو غیبت و اضمحلال کا غلبہ رہتا ہے۔ جب اس سے ترقی کر کے بقاء باللہ کو پہنچ جاتا ہے تو وجود کے آثار نمایاں ہوتے ہیں مگر تخلق باخلاق الٰہیہ کے رنگ پر اور خدا تعالیٰ کی شان ہے شفقت اس لیے اس کو غلبہ شفقت سے رحم آیا کہ اس کو تکلیف ہوئی ہوگی اس لیے اس نے شفقت کا برتاؤ کیا۔ شیخ شیرازی نے ایسا ہی قصہ لکھا ہے کہ کسی شرابی کے ہاتھ میں بربط تھا اس نے ایک درویش کے سر میں ایسی زور سے مارا کہ وہ ٹوٹ گیا ظاہر ہے سر کا کیا حال ہوا ہوگا درویش نے ایک دینار پیش کیا کہ میرا سر تو ویسے ہی جڑ جائیگا مگر تمہارا بربط بدون داموں کے درست نہ ہوگا ان داموں سے اس کو درست کرا لینا الخ واقعات والوں پر اس عقیدہ ہی کا تو غلبہ تھا جس کے یہ آثار تھے خدا کی قسم ان عقیدوں نے سارے عالم سے بے فکر کر دیا ہے ان کی بدولت جہان کو کتنی راحت پہنچی ہے سبحان اللہ

اپنا ہی غم اور سنئے اسلام کا عقیدہ ہے جزا و سزا کا کہ نیکی پر جزا ملیگی اور بدی کرنے سے سزا ہوگی اس عقیدہ میں بھی بڑے بڑے منافع ہیں اگر کسی کو محبت نہ ہو ہیبت و عظمت کا بھی خوف نہ ہو تب بھی وہ بہت جرائم سے محض سزا ہی کے خوف سے بچے گا اور سنئے ایک اسلامی عقیدہ ہے العبرۃ للخواتیم اس نے عجب و پندار کی جڑ کاٹ دی کسی

بات پر ناز ہی نہیں کر سکتے۔ اس سے تواضع پیدا ہوئی تکبر زائل ہوگا اور کسی کو اس شخص سے ایذاء نہ پہنچے گی کیوں کہ کینہ بغض حسد عداوت غیبت ظلم سب تکبر ہی سے ہوتا ہے بلکہ جتنے اخلاق ذمیمہ ہیں بعد تامل سب کی جڑ تکبر ہی معلوم ہوتی ہے اسلام نے اس تواضع کو بتلا کر مخلوق کو ساری آفات سے بچا دیا اس کو اپنے غم میں لگا دیا کہ نہ معلوم خدا جانے عاقبت کیا ہوتی ہے ایسا شخص نہ کسی پر ظلم کرے گا نہ کسی کی غیبت میں مبتلا ہوگا۔ رات دن اپنے ہی غم میں گھلتا رہے گا ایسے ہی شخص کے باب میں مولانا فرماتے ہیں ؎

خود چہ جائے جنگ و جدل نیک و بد ⁂ کیں الم از صلح ہا ہم می رسد

یہ چند عقائد ہیں اسلام کے جو مختصر عنوان سے میں نے بیان کر دیئے ہیں آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ ان سے دین کا نفع تو ہوتا ہی ہے دنیا کے بھی کتنے منافع و مصالح ان کے ساتھ وابستہ ہیں اب وقت میں گنجائش نہیں رہی جمعہ کی نماز کا وقت آگیا ہے اگر وقت ہوتا تو اور بیان کرتا۔

غرض یہ ہیں خوبیاں اسلام کی ان کو دوسروں کے سامنے بھی پیش کرو مگر لڑو مت اس وقت دوسری قومیں بھی اپنے اپنے مذہب کی اشاعت میں بہت کوشش کر رہی ہیں اور فساد کرنے پر بھی آمادہ ہیں مگر تم صرف اپنا کام کرو فساد کی تدبیر مت کرو البتہ فساد کی مدافعت مناسب طریقہ سے مضائقہ نہیں بس یہی کافی ہے اب وقت کم ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ یہ ایک ظاہری بہانہ ہے ورنہ دراصل میں خود بھی تھک گیا ہوں اب دعا کرو خدا فہم سلیم عطا فرماویں اور عمل کی توفیق دیں۔ آمین۔

اشرف علی

۱۰ صفر المظفر ۱۳۵۲ھ

الاتمام لنعمۃ الاِسلام ۳

کے بارے میں

احکامِ شریعت کا نام اسلام ہے

یہ وعظ لوگوں کی درخواست پر پانی پت درگاہ حضرت شاہ جلال الدین کبیر الاؤلیا مخدوم صاحبؒ میں ۲۸ شوال ۱۳۴۱ھ بروز جمعرات پونے چار گھنٹے بیٹھ کر ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد ۵۰۰ تھی۔ مولوی اظہر علیؒ نے ضبط اور اُن کے مبیضہ سے مولانا ظفر احمد صاحب تھانویؒ نے صاف کیا۔

مسلمانوں کی یہ حالت ہونی چاہیے

ترکت اللات و العزّٰی جمیعا

کذٰلک یفعل الرجل البصیر

خداتعالیٰ کے احکام مضبوط پکڑو۔ اسمیں دین کا بھی بھلا ہے — اور دُنیا کا بھی نفع ہے

(از حضرت حکیم الامّت صاحب تھانوی)

بعد از خطبہ ماثورہ

امابعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہ الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دیناہ

تمہید

یہ ایک آیت کا حصہ ہے۔ اس کی تلاوت کل بھی کی گئی تھی اور یہ بھی ظاہر کیا گیا تھا کہ اس کے قبل اور بھی چند موقعوں پر اس آیت کی تلاوت کی گئی ہے اور تکرار تلاوت کی وجہ بھی بیان کردی گئی تھی کہ بیان کرنے سے جو مقصود اس کے متعلق تھا وہ اتنی جگہ بیان کرنے سے بھی مکمل نہیں ہوا اور مقصود بھی کل بیان کردیا تھا یعنی اسلام کی خوبی ایسی ہے کہ دنیا کے لئے بھی نافع ہوتا ہے اور آخرت کے لئے بھی یعنی اس کے قواعد وضوابط تمام عالم کے لئے دونوں جہاں میں راحت رساں ہیں بشرطیکہ ان پر عمل کیا جائے۔

عمومی غلطی اور یہاں سے ایک مسئلہ طے ہو جاتا ہے، جس کا سمجھنا ضروری ہے اور اس کے نہ سمجھنے سے لوگ بہت بڑی غلطی میں پڑے ہوئے ہیں۔

وہ غلطی یہ ہے کہ بہت لوگوں کا یہ خیال ہو گیا ہے یعنی اُن کے معاملہ اور طرز سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اُن کا عقیدہ یہی ہے کہ اصل مقصود شریعت اور احکام سے اغراض دنیاویہ ہیں اور شریعت کے احکام کو اُن اغراض کا آلہ بنا رکھا ہے۔ چنانچہ مشاہد ہے کہ یہ لوگ جب احکام کو بیان کرتے ہیں اُن کی حکمت کو بھی ساتھ ساتھ بیان کرتے ہیں اور وہ حکمتیں سب کی سب دنیوی ہوتی ہیں اور اس حکمت کا نام فلاسفی رکھا ہے یہ لفظ موقع بے موقع ہمیشہ مقررین کی زبان پر آتا ہے۔ کہتے ہیں روزہ کی فلاسفی یہ ہے، حج کی فلاسفی یہ ہے، زکوٰۃ کی یہ ہے علیٰ ہٰذا اور احکام کی بھی فلاسفی بتلاتے ہیں اور بزعم خود اپنے کو احکام جاننے والا اور اسرار و حکم کا واقف سمجھتے ہیں بلکہ اسی کو علوم مقصودہ سمجھتے ہیں اور ایسی تقریریں کر کے اپنے کو دین کا بڑا خدمت گذار بلکہ علماء راسخین کے درجہ میں سمجھتے ہیں اور علماء محققین کو اپنے سامنے صورت پرست خیال کرتے ہیں بلکہ ان کو پست خیال اور خود کو روشن خیال جانتے ہیں۔ گو ایک صیغہ کی تحقیق یا تعلیل بھی نہ جانتے ہوں۔ ایک چھوٹے یا بڑے جملہ کی ترکیب بھی نہ کر سکتے ہوں۔ لیکن اُن کو اُس کی ضرورت ہی کیا اُن کے نزدیک تو یہ سب فضول ہیں۔ بس وہی علوم و اسرار اُن کے نزدیک مطلوب ہیں اور اسرار بھی وہ جو اُن کے ذہن میں آ گئے۔ گو فی الواقع باطل محض ہی ہوں۔

مقصود احکام شریعت حقیقت یہ ہے کہ حکمت اور اسرار کے درپے ہونا یہ خود مضر ہے کیونکہ مقصود شریعت کے احکام جاننے سے کیا ہے اس کو خیال کرنا چاہیے۔ سو حق تعالیٰ فرماتے ہیں ما خلقت الجن والانس الا لیعبدون یعنی مقصود عبدیت ہے اور عبدیت یہ ہے کہ جہاں حکم ہوا ہیں گردن جھکا دی۔ کیا ہے کی حکمت اور مصلحت؟ یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فعل یا حکم

حکمت سے خالی نہیں ہو سکتا مگر ہم کو حکمت کے درپے تو نہیں ہونا چاہیئے۔

اور تجربہ سے معلوم ہوا کہ جس حکم کی علت بلکہ یوں کہیئے کہ مصلحت و حکمت نہ معلوم ہو اس میں عبدیت زیادہ ظاہر ہوتی ہے اور میں نے لفظ علت کو بدل کر اس کی جگہ لفظ حکمت و مصلحت کو اس لیئے اختیار کیا کہ علت کا اتباع اور تتبع ممنوع نہیں مگر تتبع علل مجتہد کا منصب ہے کہ جو حکم منصوص ہو اور اس کے اندر کوئی علت ہو اور وہ علت غیر منصوص میں بھی موجود ہو تو منصوص کا حکم غیر منصوص میں بھی ثابت کر دیا جاتا ہے یعنی بعض احکام قیاسی ہیں جو قیاس سے ثابت ہیں اور بعض منصوص غیر قیاسی ہیں جو صراحۃً ثابت ہیں سو قیاس مجتہد کا حاصل غیر منصوص کو منصوص پر قیاس کرنا ہے یعنی جس کے ساتھ یہ غیر منصوص مشابہ ہو، اس مشبہ بہ کا حکم اس مشابہ پر کر دیتے ہیں جس سے ظن غالب یہ ہو جاتا ہے کہ اس کا بھی حکم وہی ہے جو منصوص کا اور اصل کا ہے تو جہاں فرع کو اصل پر کسی علت جامعہ کی وجہ سے قیاس کرتے ہیں۔ وہاں کہتے ہیں کہ اس حکم کی یہ علت ہے تو علت قیاس میں ہوتی ہے جو مجتہد کا منصب ہے حکمت کو علت کہنا صحیح نہیں۔ اس لیئے میں نے لفظ علت کو لفظ حکمت سے بدل دیا۔ گو اس کو بھی محاورہ میں بعضے علت کہتے ہیں لیکن اصل میں یہ علت نہیں ہے تو خلاصہ یہ ہے کہ احکام کی حکمت اور مصلحت تلاش کرنے میں بڑی خرابی یہ ہے کہ مثلاً ایک مصلحت پر ہماری نظر ہے، دوسری پر نہیں ہے۔ تو احتمال ہے کہ جب ایک مصلحت اٹھ جاوے، گو دوسری باقی ہے تو یہ شخص جو حکمت کی وجہ سے احکام کا متبع تھا اُس حکم کی تعمیل ہی چھوڑ دیگا۔

صاحبو! ہمیں تو حکم ہوا ہے کام کرنیکا تو بلا مطالبہ حکمت و مصلحت اُس کو کرنا چاہیئے۔ غرض تجربے سے معلوم ہوتا ہے کہ عبدیت اس میں زیادہ ظاہر ہوتی ہے کہ احکام کی حکمت معلوم نہ ہو اور پھر بھی اُس کا امتثال کرے۔ محض حاکم کا حکم سمجھ کر اُس کی پابندی کرے اس میں عبدیت زیادہ ظاہر ہوتی ہے مثلاً حاکم نے کہا دوڑ، وہ دوڑنے لگا۔ بلا وجہ پوچھے ایسے احکام کو تعبدی کہتے ہیں اس میں قیاس کی بھی گنجائش نہیں ہوتی اس نام ہی سے معلوم

ہوتا ہے کہ اس میں عبدیت زیادہ ہے بخلاف اُن احکام کے جن کی حکمت معلوم ہو گو اُن کا بجالانا بھی موجب اجر ہے بلکہ ایک معنی کر کے زیادہ قابل اہتمام ہے کیونکہ بعض طبائع کو اس سے زیادہ شگفتگی و طمانینت ہوتی ہے مگر بعض موقع پر حکمت کا جاننا مضر بھی ہوتا ہے میں اس کو آگے بیان کروں گا (جس جگہ یہ شعر مذکور ہے دوستی بے خرد چوں دشمنی ست) بہرحال اُن احکام کے امتثال میں بھی اجر ہوتے ہیں شبہ نہیں مگر انمیں ظہور عبدیت زیادہ نہیں۔

اس میں یہ وہم ہوتا ہے کہ شاید مصلحت کی وجہ سے امتثال کیا ہو اگر مصلحت سمجھ میں نہ آتی۔ شاید امتثال نہ کرتا اور یہ عبدیت کے خلاف ہے کہ جو سمجھ میں آوے کرے اور جو نہ آوے نہ کرے۔ چنانچہ بہت لوگوں کو اس میں کلام ہے کہ حج کیوں مقرر ہوا۔ اس کی حکمت سمجھ میں نہیں آئی۔ روزہ نماز کی حکمت تو سمجھ میں آ گئی مگر حج کے بارہ میں حکمت سمجھ میں نہ آنے سے بعض لوگوں کا یہ حال ہو گیا کہ فرضیت حج ہی سے انکار کے قریب ہو گئے۔ نماز میں تو یہ سمجھے کہ اس میں عبدیت کی صورت ہے۔ تسبیح و تقدیس رکوع و سجود میں اپنی شکستگی نمایاں ہے بہت خشوع خضوع ہے اور روزہ واقعی قوت بہیمیہ کو توڑ دیتا ہے اس کا نکتہ بھی سمجھ میں آ گیا۔ اسی طرح زکوٰۃ کی حکمت تو کھلی ہوئی ہے۔ اس میں مساکین کا اغناء ہے مادۂ بخل کو توڑنا ہے یہ سب کچھ سمجھ میں آ گیا مگر حج کا فلسفہ سمجھ میں نہیں آیا کہ بادلوں کی طرح رہو سلا ہوا کپڑا نہ پہنو سر کھلا ہوا ہو ٹوپی نہ ہو اس میں کیا فائدہ؟ اور لیجئے بیت اللہ کے طواف میں دیوانوں کی طرح دوڑتے ہیں، صفا و مروہ میں دوڑتے ہیں اور کنکریاں مارتے ہیں یہ کیا ہے؟ یہ حرکات عاقلانہ تو ہیں نہیں۔ بے شک عقل پرستوں کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آسکتیں مگر باوجود اس کے یہ لوگ فرضیت کا انکار اس لئے نہ کر سکے کہ قرآن میں اس کی تصریح ہے اس پر ایمان ہے کہ قرآن حق ہے اور حکمت کی ضرورت تھی لہٰذا حکمت اور مصلحت ڈھونڈھی۔ چنانچہ ایک بات نکالی کہ گو افعال حج تو غیر معقول ہیں۔ مگر پھر بھی اس

کو شریعت میں جو رکھا گیا ہے اس لئے کہ اہل عرب پہلے سے کرتے ہوئے آرہے تھے اس لئے اگر اب روکتے، تو روکنے سے اُن کو وحشت ہوتی لہٰذا اُن کو اپنی پہلی حالت پر برقرار رکھا گیا تو اس حکمت کی رعایت کی گئی۔ زوائد کا لحاظ نہیں کیا گیا۔ طواف سعی وغیرہ زوائد ہیں۔ اگر روکتے تو یہ حکمت مختل ہوجاتی۔

بعض نے ایک اور حکمت نکالی کہ سارے مسلمان اگر جمع ہوں گے تو باہم تبادلہ خیالات کر سکیں گے۔ نہ معلوم یہ تبادلہ کیسا لفظ ہے اگر تفاعل کا مصدر ہے تو دال کا ضمہ کہاں گیا پھر آخر میں یہ ہ کیسی یہ لغت بھی نیا نکالا ہے اتنی بڑی تو غلطی اور اس پر غضب ہے کہ کہتے ہیں فصیح ہوگیا "غلط العام فصیح"۔ اسی طرح آجکل کی اُردو میں اور بھی بعض الفاظ ہیں چنانچہ ایک لفظ تشکر یہ مستعمل ہے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ یا اور ہا کیسی اور ایک لفظ صداقت ہے اُس کو صدق کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ صداقت کے معنی صدق کبھی نہیں سنے۔ دوستی کے معنی میں تو البتہ آتا ہے باقی صدق کے معنی میں میری نظر سے نہیں گذرا مگر عام لوگوں میں رائج ہے۔ عداوت کے مقابلہ میں صداقت آتا ہے نہ کہ کذب کے مقابلہ میں۔ بس اسی طرح یہ لفظ تبادلہ ہے (البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر زبان کو دوسری زبان کے الفاظ میں تصرف کا حق ہے جیسا عربی میں فارسی الفاظ کے اندر تصرف کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اُردو زبان بھی عربی اور فارسی لغات میں تصرف کرتی ہے اگر وہ تصرف عام طور سے مستعمل ہوجائے تو محل اعتراض نہ ہے گا ۱۲ ظ) غرض یہ لوگ کہتے ہیں کہ حج اس لئے مقرر ہوا تاکہ تبادلہ خیالات اور اموال ہو سکے۔ اصل مقصود یہ ہے کہ ایک دوسرے سے بیع فروخت کریں ایک دوسرے کو اپنے خیالات پر مطلع کر سکیں یہ اتفاق کی جڑ ہے یہ حاصل ہے اس فلسفہ مخترعہ کا مگر ہم نے تو حاجیوں کو اکثر لڑتے دیکھا ہے اسی لئے ارشاد ہے ولاجدال فی الحج۔ غرض یہ سب بے سر دپا مجذوب کی سی بڑ ہے نہ اس کی کوئی دلیل ہے نہ ثبوت ہے۔ جو جی میں آیا ہانک دیا۔ ان کو تو ہر جگہ فکر بنیا

کی ہے۔ اور اسی کی مصلحت کی تلاش ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن افعال کو جو فی الواقع زوائد تھے اصل سمجھ لیا یعنی تجارت اموال و تبادلہ خیالات۔ حج میں تجارت کی اجازت تو ہے مگر یہ مقصود تو نہیں ہے۔

رہا تبادلہ خیالات تو اُس کا موقع ہی کہاں ملتا ہے اور اگر موقع بھی ہوتا تو ایک بات اس سے مانع تھی۔ وہ یہ کہ ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتے دوسرے اگر سمجھتے بھی تو اس وقت پریشانی اتنی ہوتی ہے کہ اس کے انسداد کے لئے حق تعالیٰ نے فرمایا۔ فلا رفث و لا فسوق و لا جدال فی الحج یعنی دیکھو حج میں بیہودہ باتیں اور لڑائی جھگڑا نہ کرنا اب فرمائیے یہ فلاسفیاں کیسی مہمل باتیں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لکھنے والے نے کبھی حج ہی نہیں کیا اگر حج کرتا تو معلوم ہوتا کہ وہاں اس کی فرصت ہے یا نہیں؟ مگر یوں ہی ہندوستان میں بیٹھے بیٹھے جو جی میں آیا ہانک دیا۔ غرض تبادلہ خیالات کی مصلحت تو مہمل ٹھہری وہ تو باطل ہو گئی ہاں تبادلہ اموال کی حکمت کچھ کچھ صحیح نظر آتی ہے مگر حقیقت اس کی صرف اتنی ہے کہ جائز ہے واجب اور مقصود نہیں۔ کما قال تعالیٰ لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلا من ربکم صحابہ کو یہ شبہ تھا کہ ایام حج میں تجارت کرنا کہیں گناہ نہ ہو تو اللہ تعالیٰ نے اس شبہ کو دور فرما دیا کہ اگر کوئی کرنا چاہے تو اُس کو گناہ نہ ہوگا اگر حج سے مقصود ہی تجارت ہوتی تو صحابہ کو گناہ کا خیال ہی نہ ہوتا اور ہوتا بھی تو اللہ تعالیٰ اس خیال کو رد فرماتے اور رد بھی اس عنوان سے نہ فرماتے بلکہ بلیغ عنوان سے زور سے رد کرتے یہاں رد کہاں بلکہ لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلا من ربکم سے ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ گناہ کے نہ ہونے کو بیان فرمایا ہے کہ تھا تو حج کی وضع کے خلاف کام، مگر بندوں کی مصلحت سے اجازت دے دی ہے تو یہ صرف اجازت ہے تجارت کی نہ کہ مقصودیت تجارت کی۔ کیونکہ مقصود کو ایسے عنوان سے بیان نہیں کیا جاتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ مقصود نہیں۔ اور جن کو یہ لوگ زوائد سمجھتے ہیں

ان کے متعلق حکم ہے ولیطوفوا بالبیت العتیق یعنی امر کے صیغہ سے اس کو بیان فرمایا جو وجوب کے لئے ہے اور حدیث میں ہے الحج عرفۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں حج عرفات میں جانیکا نام ہے۔ استغفر اللہ استغفر اللہ ان لوگوں کو قرآن حدیث کی پرواہ نہیں۔ بس اپنے ہوائے نفسانی کو رہبر بنالیا ہے اور قرآن وحدیث کو چھوڑ دیا۔ جس کو قرآن و حدیث نے فرض اور مقصود تبلایا تھا، یہ اس کو زوائد کہتے ہیں اور جس کو زوائد تبلایا تھا اس کو اصل مقصود قرار دیتے ہیں اور ان میں بعضے وہ لوگ بھی ہیں جو منشی فاضل مولوی فاضل وغیرہ بڑے بڑے پاس حاصل کئے ہوئے ہیں۔ میں نے تو ایک موقع پر ایسے لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ یہ زبان دانی تو ابوجہل کا علم ہے۔ جرمن۔ بیروت میں بھی بہت سے عیسائی بڑے بڑے عربی داں اور ادیب ہیں مگر کیا وہ مقتدائے دین ہیں۔ ہرگز نہیں۔ بس یہ لوگ دو چار عربی کے دیوان دیکھ کر دیوانے ہو گئے اور اپنے نزدیک بڑے عالم اور کامل ہو گئے مگر محض دعویٰ سے آدمی کامل نہیں ہو سکتا کامل تو وہ ہے جس کو کوئی کامل کہدے۔ ؎

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خود را | عیسیٰ نتواں گشت بتصدیق خرے چند

جب تک کہ اہل فن کسی کی نسبت نہ کہے کہ یہ کامل ہے اُس وقت تک کسی کو حق نہیں کہ اپنے کو کامل سمجھے تو کیا یہ غضب ہی نہیں کہ عربی کی دو چار کتابیں پڑھ کر لوگ یوں سمجھ لیں کہ ہم عالم متبحر ہو گئے ہیں اور قرآن وحدیث کی تاویل کرنے بیٹھ جاویں۔ اس طرح تو جس کا دل چاہے تاویل کر لے۔ چنانچہ قرآن کی تاویل کر کے ہی بہتر (۷۲) فرقے ہوئے ان کا یہ مقصود ہی نہ تھا کہ حق کو معلوم کریں اگر یہ قصد ہوتا تو غلط تاویل کی حرکت ہی نہ ہوتی۔ باقی اہل حق میں جو اختلاف ہے تو اس کا منشاء یہ ہے کہ انہوں نے قصد تو کیا اتباع قرآن وحدیث کا اُس قصد کیا تو مختلف محمل سامنے آگئے تو اہل حق کا تو قصد اتباع حق کا ہوتا ہے مگر اہل ہوا کا یہ خیال نہیں ہوتا۔ میں بقسم کہتا ہوں اُن کا حال یہ ہے کہ پہلے ایک رائے آزادی سے قائم کر لی اس کے بعد قرآن وحدیث کو دیکھتے ہیں کہ اپنی خواہش کے موافق

کوئی آیت حدیث مل جاوے۔ اور ملنے کی بھی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ جس طرح شیعوں کو قرآن میں جہاں کہیں میم تے عین کا مادہ ہو متعہ ہی نظر آتا ہے اسی طرح اہل ہوا کو بھی کسی ایک جگہ اپنی خواہش کے موافق کوئی لفظ مل گیا تو قرآن میں ہر جگہ اپنی خواہش کو ٹھونسنے لگتے ہیں اور معانی میں تحریف کرنے لگتے ہیں۔ سو اس کا نام اتباع حق نہیں یہ تو دلیل اصلیت کیسی ہے اور اس دلیل پر دعوی مبنی نہیں کیا گیا بلکہ دعوی پر دلیل کو مبنی کیا گیا ہے کیونکہ انہوں نے تو دلیل کو اس نظر سے دیکھا ہے کہ ہمارے دعوی کے مخالف ہے یا موافق اگر مخالف ہوئی تو اس کے معنی میں تاویل اور ہیر پھیر کر لیتے ہیں مولنا فرماتے ہیں ؎

بر ہوا تاویل قرآں میکنی پست و کژ شد از تو معنی سنی

کردہ تاویل لفظ بکر را خویش را تاویل کن نے ذکر را

چوں ندارد جان تو قندیلہا بہر بینش میکنی تاویلہا

سو اس طرح سے فرق باطلہ پیدا ہو گئے کہ انہوں نے قرآن کو اپنی ہوا کے تابع بنایا یعنی تابع بنانا چاہا گو ہوا نہیں کیونکہ ؎

کلامیکہ محتاج یعنی باشد لا یعنی ست

سو قرآن ایسا کلام کیوں ہونے لگا اس لئے قرآن میں ایسی تاویلیں نہیں چلتیں اسکو اہل حق سمجھتے ہیں اور اگر ذوق صحیح ہو اور آدمی منصف ہو تو ہر شخص معلوم کر یگا کہ کس جگہ کیسی دلیل ہے یعنی کس جگہ تو دلیل کی بناء ہے دعوی پر اور کہاں دعوی کی بناء ہے دلیل پر۔

حقیقت علم اس کے سمجھنے کے لئے قلب میں نور ہونا شرط ہے اور وہی نور علم ہے حقیقت میں۔ امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ ؎

شکوت الی وکیع سوء حفظی فاوصانی الی ترک المعاصی

فان العلم فضل من اللہ وفضل اللہ لا یعطی العاصی

پس علم وہ ہے جو گناہ کرنے سے زائل ہو جاتا ہے اور گنہگار کو حاصل نہیں ہوتا۔ اگر محض

الفاظ دانی کا نام علم ہوتا تو وہ معاصی کے ساتھ بھی جمع ہو جاتا ہے بلکہ کفر کے ساتھ بھی ورنہ جریر اور جریر میں عیسائی عرب کے ادیب کیسے ہوتے۔ ان کا حافظہ بھی قوی ہے ذہن بھی تیز ہے۔

پس معلوم ہوا کہ علم اس کا نام نہیں ہے، حقیقت میں علم کی حقیقت نور ہے جس کی نسبت قرآن میں ہے قد جاءکم من اللہ نور وکتاب مبین اُسی کو روح بھی فرمایا ہے وایدہم بروح منہ پس حقیقت میں یہی چیز علم ہے۔ امام ابوحنیفہؒ نے کتابیں زیادہ نہیں پڑھی تھیں مگر اللہ تعالیٰ نے قلب میں ایک نور بخشا تھا کہ جس چیز کو بیان فرماتے تھے بالکل صحیح فرماتے تھے اور اب کسی کو کتنا ہی تبحر ہو جاوے مگر وہ علم نصیب نہیں جو امام صاحب کو حاصل تھا۔ اس حالت میں اگر کوئی کہنے لگے کہ میں ابوحنیفہؒ سے علم میں زیادہ ہوں تو وہ جاہل ہے۔ اس کو حقیقت معلوم نہیں کہ علم کہتے ہیں کس کو۔ عارف شیرازیؒ فرماتے ہیں۔

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند ۔ نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند
ہزار نکتۂ باریک تر ز مو اینجاست ۔ نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

حقیقت میں فن دانی اور ہے تحریر اور روایات کا معلوم ہونا اور بات ہے۔ خوب کہا ہے عارف شیرازیؒ نے

شاہد آں نیست کہ موئے و میانے دارد ۔ بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

اس آن کا نام شان اجتہادی ہے جو اب مفقود ہے جس کا امتحان بہت آسانی سے اہل علم کر سکتے ہیں یعنی اپنی اور سلف کی علمی شان کا وہ یہ کہ چند سوال ایسے تجویز کئے جائیں کہ واقعات اور حوادث پیش آتے رہتے ہیں وہ سوالات ان کے متعلق ہوں مگر اُن کے جواب سلف کے کلام میں نہ دیکھے ہوں پس ایسے سوالات قائم کر کے بدون فقہ کی کتاب دیکھے محض قرآن و حدیث سے اُن کا جواب نکالا جائے۔ پھر سلف کے کلام میں اُن سوالات کے جواب دیکھے جائیں۔ اس کے بعد انصاف کی نظر سے موازنہ کر کے دیکھا جائے کہ دونوں کے جواب میں کس قدر فرق ہے۔ قرآن و حدیث پر اُن کے جوابات زیادہ چسپاں ہیں یا تمہارے؟ ہیں

بقسم کہتا ہوں کہ ہمارا جواب تو اوپر اوپر ہوگا اور وہ تہ سے ہوگا۔ نکال کر لائے اور موازنہ کر لیجئے مگر شرط یہ ہے کہ مخاطب اہل فہم ہو معاند نہ ہو، تو اس کو صاف معلوم ہو جائیگا کہ دونوں کے علوم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس وقت خود فیصلہ ہو جائیگا کہ کون اجتہاد کی صلاحیت رکھتا ہے کون نہیں؛ یقیناً اقرار کرنا ہوگا کہ تم کو اجتہاد کا حق نہیں ہے۔ وہی اس کے لئے مخصوص تھے۔ علوم حقیقی انہیں کے پاس تھے انہوں نے ہی دین کو مکمل کیا۔ یہ نہیں کہ اپنی طرف سے کچھ بڑھا دیا بلکہ قرآن اور حدیث سے نکال کر سب کچھ بیان کیا۔ ہمارا علم اُن کے علم کے سامنے حقیقت میں علم ہی نہیں۔

بہرحال علم خاص نور سے نصیب ہوتا ہے گو اجتہاد کے درجہ کا نہ ہو مگر اس کے تابع تو ہو اور اُس وقت اس نور میں کمی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ نور عمل سے بڑھتا ہے اگر عمل ہے تو علم صحیح بھی نصیب ہے اگر عمل نہیں تو وہ علم بھی میسر نہیں۔ سلف کو دیکھ لیجئے کہ وہ کیسے عمل کرنے والے تھے۔ اس لئے ان کو وہ نور حاصل تھا وہ کہیں جائیں نور اُن کے ساتھ ساتھ تھا۔ ادھر ہمارے اعمال دیکھ لیجئے کیسے گندے ہیں اس لئے وہ نور بھی نصیب نہیں۔ پس ہمارے نہ سمجھنے کی زیادہ وجہ یہ ہے کہ ہم میں وہ نور نہیں ہے اور اب بھی جنکو وہ نور حاصل ہے وہ جیسا سمجھتے ہیں دوسرا انہیں سمجھ سکتا حتی کہ اُن کے یہاں جو چیزیں بدیہیات بلکہ حسیات ہیں دوسروں کے یہاں عقلیات اور حسیات سے بھی زیادہ خفی ہیں۔ پھر ان میں اور سلف میں وہی نسبت ہے جو اس زمانہ کے صاحب نور اور غیر صاحب نور میں فرق ہے کہ سلف کے یہاں جو چیز بدیہی بلکہ بدیہی سے بھی زیادہ جلی ہے، ان کے یہاں نظری ہے اور اس فرق کے امتحان کی وہی صورت ہے جو میں نے اُوپر بتلا دی ہے۔ جب چاہو امتحان کر کے دیکھ لو اور حقیقی فرق تو مدت کے بعد معلوم ہوتا ہے مگر کوشش کرو بقدر ضرورت ضرور ہدایت ہوگی اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا وان اللہ لمع المحسنین۔ غرض حقیقت میں علم وہ ہے جس میں نور ہے مگر اب تو یہ حال ہے کہ چار حرف

بڑھ گئے بس اپنے ہی کو ناخنل کامل سمجھنے لگے اور علماء کو ناواقف کم فہم اور اپنے کو عاقل ہوشیار سمجھنے لگے اور پھر اس پر لطف یہ ہے کہ علماء کو گمراہ کر دیں نمرود۔ میں نے ایک موقع پر کہہ دیا کہ ان علماء سے تم یہ توقع رکھو مت کہ وہ تمہارا اتباع کریں گے کیونکہ وہ تو پرانے دقیانوسی ہیں تمہارے کہنے پر نہیں آویں گے ہاں تم خود مولوی بن جاؤ پھر مولوی بن کر جو چاہو کرو مگر ان کو رائے مت دو۔ ایک شخص صدقہ فطر دے رہا تھا اُن کے ایک رشتہ دار صاحبزادے کہنے لگے یہ حکم فطرہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہر زمانہ میں نصف صاع گیہوں دیا جائے اُس زمانہ میں اناج سستا تھا نصف صاع کا حکم مناسب تھا۔ اب اناج کی قیمت زیادہ ہے نصف صاع کے دام بہت ہوتے ہیں اب کم دینا چاہیئے اُس شخص کا بیان ہے کہ میں نے کہا ہاں آپ اس کا اعلان کر دیجئے مگر مولویوں سے ایسے فتویٰ کی توقع نہ رکھیئے۔ کہا سبحان اللہ میں گالیاں کھاؤں میں نے کہا سبحان اللہ اور وہ گالیاں کھاویں تم کو تو کم گالیاں پڑیں گی کیونکہ تم جاہل ہو اور اُن کو زیادہ گالیاں دیں گے کیونکہ وہ عالم ہیں جب میں نے یہ کہا تو آپ چپ ہوئے۔

غرض یہ حالت ہے کہ ہر شخص رائے دیتا ہے علماء کو میں تو ایسے رائے دہندوں کے بارہ میں یوں کہتا ہوں۔ ؎

گر بہ میر و سگ وزیر و موش را دیوان کنند — ایں چنیں ارکان دولت ملک را ویران کنند

اگر دین اُن کے ہاتھ ہوتا تو خدا جانے یہ کیا کرتے وہ تو خدا کے

آثار منصوصیت

کو مانتے ہی نہیں دیتے خدا نے اپنے دین کی حفاظت خود کی ہے حدیث

؎ مگر افسوس اب تو اکثر علماء جاہلوں کے تابع ہو گئے اب تم دیکھو گے کہ وہ ایجی ٹیشن میں بھی مارے مارے پھرتے ہیں اور ووٹروں کی زیارت بھی کرتے ہیں۔ خان بہادروں کی خوشامد بھی کرتے ہیں اور ہندو لیڈروں کا استقبال بھی کرتے ہیں ؎ قد کان ماخفت ان یکونا — انا الی اللہ راجعونا ۱۲ ظ

میں ہے لایزال طائفۃ من امتی ظاھرین علی الحق منصورین لایضرھم من خذلھم کہ اس امت میں ہمیشہ ایک گروہ حق پر قائم رہ کر اہل باطل پر غالب رہیگا اُن کا مقابلہ کوئی نہ کر سکے گا اس لئے تحریف محرفین سے کچھ ضرر دین کو نہیں پہونچتا حدیث میں طائفہ کا جو لفظ آیا ہے غالباً اشارہ اس طرف ہے کہ وہ جماعت قلیل ہوگی مگر مؤید من اللہ ہوگی خدا کی طرف سے اُس کی تائید ہوگی اگر کوئی اُن کا ساتھ نہ دے تو اُن کو کچھ ضرر نہ ہوگا بلکہ اُن کی منصوریت کی شان یہ ہوگی کہ اگر کوئی اُن کی مخالفت کرے وہ خود مخذول ہوگا خاذل توکیا ہوتا عارف شیرازیؒ فرماتے ہیں ؎

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات　　　　با دُردکشاں ہرکہ درافتاد برافتاد

اور مولنا فرماتے ہیں ؎

ہیچ قومے را خدا رسوا نہ کرد　　　　تا دل صاحب دلے نامد بدرد

انکی یہ شان ہے اُن کی منصوریت کا یہ اثر ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے من عادی لی ولیاً فقد اذنتہ بالحرب کہ جو ہمارے کسی ولی سے عداوت کرے ہم اُس کو اعلان جنگ سناتے ہیں۔ لڑائی کا الٹی میٹم دیتے ہیں۔ پھر کیا خدا کا کوئی مقابلہ کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ بغرض وہ اتنے قوی ہوتے ہیں۔ ظاہر میں تو بہت لپست اور ضعیف مگر باطن میں بڑے رفیع اور قوی۔ مولنا اُسی اثر کو فرماتے ہیں ؎

ہرکہ ترسید از حق و تقویٰ گزید　　　　ترسد از وے جن و انس و ہر کہ دید

اور وہ کیا چیز ہے جو بزرگوں کو عطا ہوتی ہے جس سے سب پر اُن کی ہیبت ہو جاتی ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں جب اُن کو حکم ہوا کہ جاؤ فرعون کے پاس اُس کو توحید کی دعوت کرو۔ اُس وقت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا رب انی قتلت منھم نفساً فاخاف ان یقتلون واخی ھارون ھو افصح منی لسانا فارسلہ معی ردأ یصدقنی انی اخاف ان یکذبون کہ میں نے قبطیوں میں سے ایک کو

قتل کر دیا تھا مجھے خوف ہے کہیں مجھے قتل نہ کریں اور میرے بھائی ہارون کی زبان صاف ہے اُن کو بھی رسول بنا کر میرے ساتھ کر دیجئے مجھے ڈر ہے کہیں وہ لوگ میری تکذیب نہ کریں تو اللہ تعالیٰ جواب میں فرماتے ہیں۔ سنشد عضدك باخيك ونجعل لكما سلطانا فلا يصلون اليكما بآياتنا انتما ومن اتبعكما الغالبون یعنی وعدہ فرمایا کہ تمہارے بھائی کو تمہار اقوت بازو بنا دیں گے یہ اجابت ہے اُنکی درخواست کی مگر حقیقت میں اُس کے علاوہ ایک اور قوت کی ضرورت تھی وہ موسیٰ علیہ السلام کے ذہن میں ظاہراً نہ آئی تھی۔ مہیں نہیں ذہن میں تو کیوں نہ ہوتی۔ انبیاء کے قلوب میں تو یہ بات راسخ ہے کہ بغیر تائید ایزدی کے کچھ ہو نہیں سکتا بلکہ زبان پر نہ آئی تھی اُس کو فرمایا نجعل لکما سلطانا کہ ہم تم کو ایک قوت دیں گے اس سے وہ قوت مراد نہیں جو اُن کے جسم میں تھی بلکہ سلطان غلبہ کو کہتے ہیں۔ یہ وہی ہے جس کو ہیبت اور رعب کہا جاتا ہے حالانکہ یہاں کوئی سامان نہ تھا بیک بینی و دو گوش سیدھے سادھے طریق سے دونوں حضرات تشریف لے گئے تھے نہ کوئی بندوق تھی نہ تلوار تھی مگر فرعون کی حالت یہ ہے کہ دیکھ کر تھرا گیا زبان نہیں کھلتی تھی بات نہ کر سکتا تھا مولانا فرماتے ہیں۔

ہیبت حق است ایں از خلق نیست　　　ہیبت ایں مرد صاحب دلق نیست

یہ رعب اس گدڑی پوش کا نہیں یہ خدا کا رعب ہے۔ اب بھی اکثر اہل باطل کو دیکھا ہے کہ اہل حق کے سامنے دب جاتے ہیں تو یہ آثار ہیں منصوریت کے کہ جو اُن کے آزار کے در پے ہو وہ اُن کا ضرر تو کیا کرے گا خود کو ذلیل کر دیگا تو اس طائفہ کا کام شریعت کو تحریف سے بچانا ہے اگر ساری دنیا باطل پر جمع ہو جاوے تب بھی دین اسلام میں تحریف نہیں کر سکتی کیونکہ یہ طائفہ دین کو محفوظ رکھے گا ورنہ ان مخالفین دین نے تو جن میں بعضے مدعیان دین بھی ہیں دین کے مٹانے میں کچھ تقصیر نہیں کی بقول شیرازی ؒ ۔

قتل ایں خستہ بشمشیر تو تقدیر نبود　　　ورنہ ہیچ از دل بے رحم تو تقصیر نبود

شریعت زبان حال سے گویا کہتی ہے کہ تم نے تو میرے بگاڑنے میں کسر نہ کی تھی مگر میری تقدیر ہی میں تمہارے ہاتھوں مٹنا نہ تھا اور یہ اہل حق عدد میں قلیل ہوتے ہیں مگر قوت میں بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ دیکھئے فرق باطلہ کثیر اور اہل حق قلیل اور پھر ان اہل حق میں بھی محقق بہت کم گو محض کثرت سے ہوں مگر بایں ہمہ دین کی وہی حالت ہے کہ ؎

ہنوز آں ابر رحمت درفشاں ست خم وخمخانہ با مہر ونشان ست

وہی مہر وہی علامت وہی مارکہ باقی ہے یعنی ایسا محفوظ ہے کہ یہ ہی سمجھ میں نہیں آسکتا کہ اس میں سے کیا چیز خراب ہوئی یا تی جس دن خدانخواستہ خراب ہو جائیگا بس سمجھ لو قیامت قریب ہے اس کی نسبت فرماتے ہیں۔ لایزال طائفۃ من امتی ظاھرین علی الحق یعنی وہ غالب رہیں گے اور جن مخالفین کا اوپر ذکر ہے ان لوگوں کی یہ حالت ہے کہ انہوں نے دین کے مٹانے میں کوئی کسر نہیں رکھی حتی کہ علماء حق کو لکیر کا فقیر سمجھتے ہیں اور ان کو رائے دیتے ہیں کہ یوں ہونا چاہیئے یوں کرنا چاہیئے۔

<u>بد دینی عقلاء</u> اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اسرار واحکام شریعت کے سمجھنے کیلئے اپنی عقل کو کافی سمجھتے ہیں۔ بس جہاں جو کچھ سمجھ میں آگیا اس کو تسلیم کر لیا اور بعض جگہ جو سمجھ میں نہیں آیا تو اس کی نسبت کہہ دیتے ہیں کہ اس کو علماء نے بنا لیا ہے۔

چنانچہ ایک بیرسٹر تھے الہ آباد میں انہوں نے ایک مولوی صاحب سے کہا کہ سود کو حلال کر دو وہ غریب یہی سمجھا تھا کہ مولوی صاحب کی قدرت میں ہے حلال کرنا۔ مولوی صاحب نے کہا بھلا یہ کس کو قدرت ہے کہ سود کو حلال کرے یہ کیونکر ممکن ہے کہ صریح نص قرآن کے خلاف جرأت کرے تو آپ حیرت سے پوچھتے ہیں کیا قرآن میں سود کا حرام ہونا مذکور ہے۔ مولوی صاحب نے قرآن کی آیت سنائی تو اس خیال سے توبہ کی اور کہا واللہ میں تو اب تک یہی سمجھے ہوئے تھا کہ یہ مولویوں نے بنا رکھا ہے

خیر یہ ہدایت بھی ایمان کی بدولت ہوگئی۔ وہ بیرسٹر صاحب مشہور تھے مولوی کر کے مگر
قرآن کی خبر نہیں تھی اُن کو یہ خیال تھا کہ سود کو مولویوں نے حرام کیا ہے اب سب مولوی جمع
ہوکر دوسرا حکم کر دیں گے۔ بیچارے کو علم نہ تھا۔ علم کے بعد توبہ کرلی۔ پھر بھی غنیمت ہے
کیونکہ وہ ممالک متحدہ کے نہ تھے بمبئی کے تھے۔ جہل بسیط میں مبتلا تھے جہل مرکب میں
نہ تھے کیونکہ جو جہل مرکب میں مبتلا ہے اُس کی اصلاح نہیں ہوتی۔ اب تو یہ حالت ہے
کہ اُس کو قرآن کا حکم تسلیم کر کے جان بوجھ کر بدلتے ہیں چنانچہ ایک رسالہ میں یہ لکھا تھا کہ
احل اللہ البیع وحرم الربوا میں یہ لفظ ربوا نہیں ہے بلکہ رُبا بالضم الرا ہے جیسے ہوش ربا
ودلربا بولتے ہیں جس کے معنی چھیننے غصب کرنے کے ہیں۔ مولویوں نے زیر لگا دیا نہ معلوم
قرآن میں فارسی کہاں سے آگئی؟ وہ تو لغت عرب پر نازل ہوا ہے اور یہ اُن کے نزدیک
بالکل ٹھیک تھا۔ چودہ[۱۴] قرأت میں تو کہیں یہ ہے نہیں یہ پندرھویں[۱۵] قرأت ہوگی تو لکھا ہے کہ
مطلب قرآن کا یہ ہے چھین جھپٹ کر کے مال نہ کھاؤ باقی سود تو رضامندی سے ہوتا ہے
مولویوں نے زیر لگا کر ربا بنا دیا۔ حضرت کے زمانہ میں زیر نہ تھا۔ کوئی پوچھے اس احمق سے
کہ اُس وقت کیا تھا تیرے پاس اُس کی کوئی دلیل ہے اگر دلیل ہو تو لا۔

پھر یہ کہ قرآن میں فارسی اور اگر فارسی بھی ہے تو مصدر معنی نہیں بلکہ اسم فاعل
سماعی تو معنی یہ ہوئے کہ ربا ئندہ کو نہ کھاؤ یہ تو لغتہً حماقت ہے اور عقل کی رُو سے یہ جہالت
ہے کہ اگر ربا حلال ہو تو کافروں سے لیں یا مسلمانوں سے کافروں کو تو ضرورت نہیں کیونکہ
کافروں کے پاس بہت مال ہے تو کافروں سے تو سود لینے کی نوبت نہ آوے گی وہ خود ہی
مالدار ہیں وہ تو مہاجن ہیں۔ مہاجن تمہارے در پر کیوں آویگا۔ کافر سے تو لے نہ سکے اب
مسلمان سے لو گے۔ تو ایک تو مسلمان ہندوؤں ہی کے ہاتھ تباہ حال ہیں اب دو طرف
سے ذبح ہوں گے کہ کافر ان سے الگ سود لیں مسلمان الگ لیں پھر مسلمان کو فائدہ کیا
ہوا سود کے حلال ہونے سے افسوس اتنی عقل بھی جس کو نہ ہو وہ قرآن میں دخل دے پھر

لوگ اُس کو زمانہ شناس بھی کہتے ہیں۔ زمانہ شناس تو ہے نہیں ہاں زمانہ شناس اگر کہتے تو اچھا تھا کہ گھر کے اندر بی بچہ ہی کو جانتے ہیں اور کسی بات کی خبر نہیں۔ غرض یہ حالت ہے ہم لوگوں کی کہ دین کی خدمت کرنا تو الگ رہی الٹے دین کے دشمن بنے ہوگئے ہیں اور لیجئے ایسے ہی ایک اور شخص کا واقعہ ہے وہ کہتے تھے کہ نماز کے لئے وضو کی ضرورت نہیں وضو مقصود فی نفسہ نہیں ہے۔ پہلے وضو کا حکم اس لئے تھا کہ وہ لوگ بکریاں چراتے تھے اونٹ پالتے تھے وہ موت دیتے تھے چھینٹیں پڑتی تھیں اونچی لنگی ہوتی تھی ہاتھ پیر پر موت کے چھینٹے لگ جاتے تھے اس لئے حکم ہوا کہ ہاتھ پاؤں دھو لو اور ہمیں کیا ضرورت ہے؟ ہم تو سر سے پیر تک بوٹ سوٹ دستانوں جرابوں میں جکڑے رہتے ہیں۔ بند کروں میں بیٹھے رہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اچھا منہ اور سر پر تو موت نہیں پہونچ سکتا تھا پھر اس کے دھونے کا حکم کیوں ہے؟ اس پر شاید یہ کہا جائیگا کہ وہ ریگستانی ملک ہے وہاں غبار بہت اڑتا تھا منہ اور سر پر غبار لگ جاتا تھا اس لئے اُس کے دھونے کا حکم ہوا اس لغو تاویل کی بزعم ان کے اس بات سے اور تائید ہوگئی کہ وضو میں اعضائے مکشوفہ ہی کے دھونے کا حکم ہے اعضائے مستورہ کا نہیں۔ ایک تو یہ دعویٰ ہی بے دلیل تھا پھر شیطان نے یہ تائید بھی تبلادی اُس پر اس مقدمہ کا اضافہ ہوگیا کہ ہم تو ہمیشہ غسل کرتے ہیں آئینہ دار مکان میں رہتے ہیں عالی شان کروں میں رہتے ہیں جس میں ہر میل کچیل سے مامون رہتے ہیں پھر ہمیں کیا ضرورت ہے وضو کرنے کی؟ بس یہ مقدمات گڑھ کے اُن کو باہم ترتیب دے کر یہ نتیجہ نکال لیا کہ بدون وضو کے نماز جائز ہے۔

کوئی اس جاہل سے یہ پوچھے کہ حضرات صحابہ ہی کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ نے قیصر و کسریٰ کے خزائن اور محلات و قصور فتح کرا دیے تھے اور یہ بکری چرانے والے ایسی عالی شان بادشاہت کے مالک بنے تھے جس کا تم کو خواب بھی نہیں آسکتا تو کیا اس وجہ پر پہونچکر انہوں نے وضو کو ترک کر کے بے وضو نماز شروع کر دی تھی۔ اگر نہیں تو کیا تم ان

سے زیادہ قرآن کو سمجھتے ہو؟

اور لیجیے ایک بہت بڑے بیرسٹر فرزیہ کہتے تھے کہ ہم نے جس روز امتحان کا پرچہ لکھا ہے نماز قصر پڑھی تھی کسی نے پوچھا کیوں کہا قرآن میں آیا ہے لیس علیکم جناح ان تقصروا من الصلوٰۃ ان خفتم اور ہمیں امتحان کی وجہ سے خوف تھا کہ پرچہ اچھا لکھا گیا یا نہیں ان سے کوئی پوچھے کہ ان خفتم کا مفعول کیا ہے مگر یہ لوگ کہہ دیں گے ان یفتنکم جو امتحان کے معنی میں بھی آتا ہے اور ممتحن کفار تھے اُس لئے ان یفتنکم الذین کفروا صادق تھا۔ مگر ایک شخص نے بہت اچھا جواب دیا کہ اگر تم نماز نہ پڑھتے تو اچھا تھا کہ اپنے کو گنہگار تو سمجھتے اور نماز کی قضا تو کرتے اب تو اس اجتہاد کی گھمنڈ میں تم نے اپنے کو گنہگار بھی نہ سمجھا اور نہ نماز کی قضا کی حالانکہ یہ اجتہاد محض غلط ہے کیونکہ یہ حکم ایک ۔۔۔ اور شرط سے بھی مشروط تھا جسکو تم نے حذف کر دیا کیونکہ آیت کی ابتدا اس طرح ہے واذا ضربتم فی الارض فلیس علیکم جناح اور تم نے امتحان کے دن کونسی منزل یا مسافت طے کی تھی۔ اب بیرسٹر صاحب کی آنکھیں کھلیں کہنے لگے واقعی ہم نے اس شرط پر غور نہیں کیا پھر نماز قضا کی۔ کیونکہ اتنا وہ بھی جانتے تھے کہ کوئی قانون معاہدہ اگر مشروط ہو دو شرطوں کے ساتھ وہ ایک شرط کے پائے جانے سے متحقق نہیں ہوتا ہے اور یہاں قصر مشروط ہے دو شرطوں کے ساتھ ایک تو خوف کفار دوسرا سفر۔ گو اس شخص نے کسی درجہ میں تاویل کر کے ایک شرط پیدا کرلی تھی یعنی خوف کفار مگر دوسری شرط تو موجود نہیں تھی یعنی اذا ضربتم فی الارض یعنی جب سفر کرو زمین میں۔ مگر سمجھانے سے وہ مان گئے کہ واقعی مجھ سے غلطی ہوگی۔ خیر صاحب پھر بھی وہ اوروں سے غنیمت تھے غلطی کا اقرار تو کر لیا۔ مگر ممکن ہے کہ کوئی صاحب امتحان کے دن اس شرط کو بھی پورا کرلیں اور کہنے لگیں ضرب کے معنی چلنے کے ہیں اللہ میاں فرماتے ہیں جب چلو زمین میں اور ہم بھی تو زمین میں چلے ہیں۔ کہ گھر سے دارالامتحان تک چل کر آئے مگر میں ۔۔۔۔ کہتا ہوں پھر اس طرح تو امتحان کی

بھی تخصیص نہ رہے گی تم کو ہمیشہ قصر ہی پڑھنا چاہیئے کیونکہ دو چار قدم تو گھر میں بھی چلنے کی نوبت آتی ہے۔

اب ان سب سے بڑھ کر اور سنیئے ایک شخص ہمیشہ گھر میں بھی قصر پڑھا کرتے تھے آپ کا استدلال بھی سنیئے کہتے تھے کہ حدیث میں آیا ہے کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل کہ دنیا میں اپنے کو مسافر سمجھ کر رہو بس ہم تو دنیا میں مسافر ہیں اور مسافر کو قصر پڑھنا چاہیئے۔ ایک اور صاحب تھے معقولی انہوں نے ترمذی شریف کی حدیث میں ایک باطل تاویل کی تھی حدیث میں ہے لا یقبل اللہ صلوٰۃ بغیر طہور۔ فرماتے تھے اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بغیر وضو کے نماز کو قبول نہیں کرتے ہیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ بدون وضو کے نماز صحیح بھی نہیں ہوتی اور عدم قبول کو عدم صحت لازم نہیں۔ ممکن ہے بلا وضو صحیح تو ہو جاوے مگر مقبول نہ ہو۔ پھر بعد میں وضو کر لے تو قبول بھی ہو جاوے گی تو وضو شرط قبول ہے نہ کہ شرط صحت۔

کانپور میں ایک شخص نے بیان کیا کہ ایک مدعی حدیث دانی سڑک پر جا رہا تھا سڑک کے ایک جانب مسجد تھی جس میں پانی تھا مگر باوجود اس کے اس مدعی نے تیمم کر کے نماز پڑھی۔ راوی نے کہا بھائی پانی تو قریب ہے تم نے تیمم کیسے کیا کہا وہ مسجد میں تھا ہم نے جہاں نماز پڑھی وہاں تو نہ تھا۔ انہوں نے کہا فقہاء نے تو دوری کی حد بتلادی ہے کہ کتنے دور ہونے سے تیمم کر سکتا ہے کہا وہ دوری ابو حنیفہ کی شرط ہے قرآن میں اس کا ذکر کہاں ہے قرآن میں تو مطلق آیا ہے کہ جب پانی نہ ملے تیمم کر لو۔ یہ آپ کے اجتہاد اور فتویٰ کا حال دیکھئے۔ آپ کیا پوچھتے ہیں اگر دین ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا تو نہ معلوم اس کی کیسی بری گت بنتی۔

مطلوب اہل باطل

اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اہل باطل نے اپنا اصل مطلوب تو ہوائے نفسانی کو بنایا اور قرآن و حدیث میں تاویلیں کر کے

ان کو اپنی اغراض کی آڑ بنایا جہاں وہ سہارا ملا وہ تو ان کی دلیل ہو ہی گئی مگر جہاں خلاف بھی ہو گیا اس کو ہیر پھیر کر اپنے موافق کر لیا۔ اس قسم کی جماعتیں پہلے بھی رہی ہیں مگر اُن کے یہاں کچھ تدین تھا قرآن و حدیث سے کچھ نہ کچھ سہارا حاصل کر لیتے تھے اور اب تو یہ کہتے ہیں کہ ہماری رائے یہ ہے یوں ہونا چاہیئے۔ چنانچہ احکام میں اس قسم کی فلاسفی اور اسرار بیان کرتے ہیں جو اُن کی ہوا کے موافق ہو سو خوب سمجھ لو اس میں دین کا بہت ہی بڑا ضرر ہے اولاً تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ آپ نے جنکو حکم اور مصالح خیال کیا آیا واقع میں بھی وہ مصالح ہیں یا نہیں اور اگر فرضاً وہ مصالح بھی ہوں تو ان کو حکم کا بنیٰ قرار دینا بڑی خرابی کا سبب ہے کیونکہ وہ احکام کی علت اور لم تو نہیں ہیں مصالح ہی تو ہیں اور جب مصالح کو بنیٰ قرار دیا تو اگر کسی وقت یہ مصالح زائل ہو جائیں تو حکم ہی کو منعدم سمجھے گا یا اگر کسی دوسرے فعل سے وہ مصلحت حاصل ہو جائے تو یہ شخص اس دوسرے فعل کو کافی سمجھے گا اور پہلے کو چھوڑ دیگا اور ظاہر ہے کہ یہ صریح تغیر ہے دین میں اور تبدیل ہے شریعت کی۔ مسلمان کو ایسا کرنا کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ یہ دین کے خیر خواہ بنتے ہیں مگر انکی خیر خواہی کی حقیقت وہ ہے جس کو مولنا فرماتے ہیں ؎

دوستی بے خرد چوں دشمنی ست حق تعالیٰ زیں چنیں خدمت غنی ست

جیسے کسی نے ایک ریچھ کو تعلیم دی تھی کہ جب وہ سوجاتا تھا تو یہ بیٹھ کے مکھی اڑاتا تھا۔ ان جانوروں کی تعلیم تو ہو جاتی ہے مگر ایسی تعلیم کہ حفظت شیئاً وغابت عنک اشیاء ایک خیر خواہ نے کہا کہ آپ نے کس کو مقرب بنایا ہے یہ تو انسان کا دشمن ہے تم نے یہ کام کیسے سپرد کیا تو آپ فرماتے ہیں ہمارا ریچھ تعلیم یافتہ ہے وہ ہمارا خیر خواہ ہے اُس سے نقصان نہیں ہوگا واہ رے تعلیم یافتہ اسپر رڑکی کا ایک واقعہ یاد آگیا جنٹلمین کیچڑ میں جلدی جلدی قدم بڑھائے جا رہے تھے ہمارے ماموں صاحب بھی وہاں تھے انہوں نے فرمایا کہ بھائی پاؤں جما کے رکھو آہستہ آہستہ چلو کہیں گر نہ جاؤ آپ نے کہا میں گر

نہیں سکتا میں اقلیدس کے قاعدہ پہ چل رہا ہوں ماموں صاحب خاموش ہو گئے وہ تھوڑے ہی دور چل کر گر پڑے تو ماموں صاحب نے پوچھا کہ ہاں بھائی یہ کونسی شکل بنی تو جیسے یہ تعلیم یافتہ تھے اور ان کو اقلیدس کے اوپر ناز تھا تو وہ ان کا ریچھ بھی ایسا ہی تعلیم یافتہ تھا ایک روز آپ سو رہے تھے اور ریچھ صاحب بیٹھے ہوئے مکھی اڑاتے تھے ایک مکھی آپ کے ناک پر آ بیٹھی ریچھ نے اس کو اڑا دیا تو وہ پھر آ گئی پھر اڑایا پھر آ گئی۔ بعض مکھی بڑی ضدی ہوتی ہے۔ غرض اس کو اڑاتا رہا اور بار بار وہ آ کے بیٹھتی رہی۔ ایک بادشاہ کا قصہ ہے کہ اس نے ایک دفعہ مکھیوں سے تنگ آ کر اپنے وزیر سے کہا کہ خدا نے جو مکھی پیدا کی ہے اس کے پیدا کرنے سے معلوم نہیں کیا فائدہ وزیر نے کیا خوب جواب دیا وہ یہ کہ متکبروں کا غرور ٹوٹ جاوے یعنی خدا نے اس کو اس لئے پیدا کیا تاکہ فرعونیت دور ہو کہ تم ایک مکھی کے اڑانے پر بھی قادر نہیں ہو اگر وہ ضد پر آ جائے تو تمہاری ناک میں دم کر دے اس جواب سے بادشاہ کا دماغ سیدھا ہو گیا۔ غرض ریچھ بار بار مکھی کو اڑاتا وہ پھر آ جاتی وہ کسی طرح جاتی نہ تھی ریچھ کو غصہ آ گیا کہا اب تجھے ٹھیک کروں گا چنانچہ ایک بڑا پتھر اٹھا لایا جب وہ پھر آ کر بیٹھی آپ نے زور سے پتھر مارا جس سے مکھی تو کیا مرتی مگر مالک کے دماغ کا کچلہ بن گیا اور ریچھ خوش تھا کہ لے اب بیٹھ کہاں بیٹھے گی اب میں نے اڑا ہی اڑا دیا۔ مکھی تو خدا جانے اڑی یا مری مگر اس کے سر کا تو قیمہ ہو گیا اس کا تو چکنا چور کر دیا تو جس طرح یہ ریچھ خادم تھا ایسے ہی یہ لوگ خادم دین ہیں۔ ؎

دوستی بے خرد چوں دشمنی ست　　حق تعالیٰ زیں چنیں خدمت غنی ست

دین اور مصالح عقلیہ

چنانچہ اس خادم نے بزعم خود یہ خدمت کی کہ نماز روزہ کی حکمت بیان کرنا شروع کی کہ نماز جماعت کے ساتھ ادا کرنے کا جو حکم ہے اس میں یہ حکمت ہے کہ اس سے اتفاق پیدا ہوتا ہے اور اتفاق مطلوب ہے اور یہ ایک عام مرض ہو گیا ہے۔ سب کی زبان پر آتا ہے کہ جماعت سے

مطلوب ہے کہ اتفاق ہو اور اس کو عجیب ترتیب سے بیان کرتے ہیں کہ اتفاق کی رعایت شارع نے کیسی عجیب کی ہے کہ اول تو اہلِ محلہ کے اتفاق کی ضرورت ہے تو اس کے لئے یہ تجویز کیا کہ پانچ وقت مسجد میں جاکر جماعت سے نماز پڑھو جس میں ہر شخص کو آنا ضروری ہے جب دن میں پانچ دفعہ ملیں گے اور آپس میں سلام کلام ہوگا تو ایک دوسرے سے محبت ہو جائے گی ایک دوسرے کا ہمدرد ہو جائیگا۔ آپس میں جنگ وجدال باقی نہیں رہیگا تبادلہ خیالات ہوگا وہی تبادلہ تبادلہ ہر جگہ ہے وہ ٹیپ کا بند ہے۔ غرض پنج وقتی نمازوں میں تو اہلِ محلہ کا اتفاق اور تبادلہ خیالات ہو گیا مگر شہر کے سب لوگ پانچ وقت جمع نہیں ہو سکے لہٰذا اس کے لئے جمعہ رکھا اس لئے کہ شہر کے سارے لوگوں کا ہر وقت جمع ہونا مشکل تھا کسی کا مکان قریب ہے کسی کا دور۔ لہٰذا ان کے لئے ہفتہ میں ایک دن مقرر کیا کہ جامع مسجد میں آؤ اور یہاں سب مل کر تبادلۂ خیالات کرو۔ پھر اطراف و نواح کے لوگ شریک ہونے سے رہ گئے تھے تو ان کی رعایت سے عیدین کی نماز رکھی گئی کہ وہ اس میں شرکت کر کے تبادلہ خیالات کر سکتے ہیں۔ پھر ضرورت ہوئی تمام عالم کے جمع ہونے کی تاکہ سارے عالم میں اتفاق ہو ہر ایک جگہ سے بطور نمائندہ کچھ آدمی آدیں اور تبادلہ خیالات کر کے جاویں اور اپنے اپنے شہروں کو جاکر خبر کریں اس لئے حج مقرر کیا گیا کیا واہیات خرافات ہے۔

فلاسفہ کی بدفہمی اپنے نزدیک تو یہ لوگ بڑے خوش ہوئے ہوں گے کہ ہم نے بڑے حکم اور مصالح بیان کئے مگر یہ ساری تک بندی ایسے ہے جیسے یونانی حکماء نے نظامِ عالم کے لئے عقول عشرہ کو گھڑ لیا ہے اور اپنی گھڑت کے ایسے معتقد ہیں گویا اُن کے گھڑنے سے ہی نظامِ عالم ٹھیک ہو گیا۔ حیرت کی بات ہے کسی ایسے ہی فلسفی سے سوال کیا گیا تھا کہ جتنے کا رنگ مختلف کیوں ہے کہیں سفید کہیں سیاہ جب تمہارے نزدیک طبیعت فاعل ہے اور وہ واحد ہے تو اس کا فعل ایک ہی نہج پر ہونا چاہیے تھا تو

نہ ہونا چاہئیں فلسفی صاحب نے جواب دیا کہ اس کا کوئی جد امجد ایک درخت کے سایہ میں بیٹھا
کرتا تھا جس سے کچھ حصہ تو اس کا دھوپ میں رہتا اور کچھ سایہ میں جتنا سایہ میں تھا وہ تو
سیاہ ہو گیا اور جو دھوپ میں آ گیا وہ سفید ہو گیا واہ کیا خوب اپنے نزدیک تو فلسفہ ختم کر
دیا مگر اس احمق کو خبر نہیں کہ اگر دھوپ سے سفید ہوا ہے تو کیا ہمیشہ ایک ہی جگہ دھوپ پڑتی
ہے وہ تو بدلتی رہتی ہے اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ جیتا بڑا مہندس اور اعلیٰ درجہ کا انجینئر
تھا کہ ہمیشہ پرکار لگا کر بیٹھا کرتا تھا اور انجینئر ہونے کے ساتھ اتنا بڑا صاحب کرامت بھی تھا
کہ آفتاب کو مقید کر دیا تھا کہ اپنی جگہ سے بالکل ٹل نہ سکے ورنہ سایہ کی جگہ دھوپ اور
دھوپ کی جگہ سایہ آفتاب کی حرکت سے ہوتا رہتا ہے تو پھر یہ علت صحیح ہوئی۔ دیکھئے
کیا حساب بنا دیا؟ ایسے ہی احمقوں نے انسان کے جد اعلیٰ کو بندر بنا دیا کہ انسان پہلے بندر
تھا پھر آدمی ہوا میں کہا کرتا ہوں کہ تمہارے باپ دادا بندر ہوں گے۔ ہمارے آباء واجداد تو
ہمیشہ سے آدمی ہی تھے۔ اور غضب ہے مولوی عالم فاضل کی زبان سے ایسی باتیں صادر
ہوں۔ چنانچہ ایک صاحب علامہ کے لقب سے مشہور ہیں اُن سے کسی نے سوال کیا وہ سائل
بھی بڑے آدمی تھے سوال یہ کیا کہ اگر انسان بندر سے آدمی بنا ہے جیسا آپ کا عقیدہ ہے
کہ طبیعت حیوانیہ ترقی کرتے کرتے بندر بنی پھر جو بندر نے ترقی کی تو انسان ہو گیا یہ
قرآن کے خلاف ہے قرآن سے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام انسان آدم علیہ السلام سے پیدا
ہوئے تو علامہ نے کہا ممکن ہے کہ پہلا بندر جو انسان بنا تھا وہ آدم ہی ہوں نعوذ باللہ تو بہ توبہ
یہ مسلمان ہیں علامہ ہیں صاحب تصانیف کثیرہ ہیں۔ انکا یہ جواب اور یہ عقیدہ۔ ڈاروِن کو تو
اس عقیدہ کی اس لئے ضرورت تھی کہ وہ کافر تھا مگر وہ پھر عاقل تھا ان علامہ کی طرح بیوقوف
نہ تھا کیونکہ ان علامہ کے قول پر تو یہ اشکال لازم آتا ہے کہ پہلا بندر جو انسان بنا۔ وہ ایک ہی ہو
اور یہ خود قانونِ ارتقاء کے خلاف ہے اور ڈارون پر یہ اعتراض نہیں پڑتا کیونکہ وہ ایک بندر
کو اصل انسان نہیں سمجھتا وہ تو یہ کہتا ہے کہ جس وقت بندر نے ترقی کی ہے تو ایک دم

بہت سے بندر انسان ہو گئے تو یہ ان مسلمانوں پر کیا غضب ہے کہ ان میں نہ عقل ہے جیسا ابھی بیان ہوا نہ دین ہے کہ قرآن میں تحریف کی نہ تہذیب ہے کہ آدم علیہ السلام کے نہ باپ ہونیکا لحاظ ہے نہ نبی ہونیکا۔

اس سے بڑھ کر اُن کے ایک شاگرد نے یہ کہہ دیا کہ آدم علیہ السلام نبی ہی نہ تھے ایک مثل ہے کہ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا اُن کو اسی مثل کے موافق اس کی تائید میں بزعم اُن کے ایک جملہ حدیث کا مل گیا۔

ایک حدیث ہے میں اس کو بیان تو نہ کرتا مگر اب کروں کیا قرآن حدیث سب کا ترجمہ اردو میں ہے اور ان بددینوں کی کتابیں بھی اردو میں ہیں نہ معلوم اس سے کون کس غلطی میں پڑ جائے اس لئے بیان کرنا پڑتا ہے۔ اگر ہم قادر ہوتے تو بدفہم لوگوں کو ان کتابوں کے مطالعہ سے روک دیتے۔ غرض ان کو ایک حدیث مل اس سے دھوکہ ہو گیا کہ آدم علیہ السلام نبی نہ تھے وہ حدیث شفاعت کی ہے۔ اس میں یہ آیا ہے کہ لوگ قیامت کے روز پریشان ہو کر شفاعت کے لئے مختلف پیغمبروں کے پاس جاویں گے پہلے آدم علیہ السلام کے پاس جاویں گے پھر نوح علیہ السلام کے پاس آویں گے اور نوح علیہ السلام سے کہیں گے کہ آپ اول رسول ہیں آپ ہمارے واسطے سفارش کیجئے یہ حدیث اُن کو مل گئی استدلال کا حاصل ہے یہ کہ دیکھو اس میں آیا ہے نوح علیہ السلام اول رسول ہیں تو سب سے پہلے نبی نوح علیہ السلام ہوئے ان سے پہلے کوئی نبی نہیں ہوا اور آدم علیہ السلام نوح علیہ السلام سے پہلے ہیں لہٰذا وہ نبی نہیں یہ دلیل تو پیش کی مگر حفظت شیئاً وغابت عنک اشیاء یہ خبر نہیں کہ یہی حدیث تبلا رہی کہ آدم علیہ السلام نبی تھے اور یہ موٹی بات ہے کیونکہ اس حدیث میں غیر پیغمبروں سے طلب استعانت کا کہیں ذکر نہیں صرف انبیاء علیہم السلام سے مدد طلب کرنا مذکور ہے اور سب سے اول آدم علیہ السلام سے شفاعت کے خواہاں ہوں گے اگر غیر انبیاء سے بھی شفاعت میں استعانت

کرتے تو خیر انبیاء بہت تھے اولیاء اقطاب لقمان علیہ السلام خضر علیہ السلام جن کی نبوت مختلف فیہ ہے ان کا بھی ذکر نہیں وغیرہم مگر ان سے استعانت نہیں کرینگے تو آدم علیہ السلام کے پاس شفاعت کے لئے جانا اگر وہ نبی نہ ہوتے تو ان کو انبیاء علیہم السلام کی ساتھ کیوں ذکر فرماتے یہ خود دلیل ہے اس کی کہ وہ نبی تھے بلکہ ورنہ سب سے اول نوح علیہ السلام کے پاس جاتے خود اسی حدیث سے ثابت ہو گیا کہ وہ نبی تھے۔ باقی نوح علیہ السلام سے جو کہا گیا کہ آپ اول رسول ہیں اس کے یہ معنی نہیں کہ نوح علیہ السلام سے پہلے کوئی نبی نہیں ہوئے بلکہ اور بھی نبی ہوئے۔ تاریخ سے متعدد نبیوں کا نوح علیہ السلام سے پہلے ہونا ثابت ہے قرآن سے بھی ادریس علیہ السلام کی نبوت و رسالت ثابت ہے کما قال تعالیٰ فی سورۃ مریم علیہ السلام واذکر فی الکتاب ادریس انہ کان صدیقا نبیا الآیۃ اور وہ باتفاق مورخین نوح علیہ السلام سے پہلے تھے تو نوح علیہ السلام کو اول رسول کہنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان سے پہلے اور نبی نہیں ہوئے بلکہ اس کا مطلب دوسرا ہے جس کو وہ مستدل سمجھا نہیں اس لئے میں کہا کرتا ہوں کہ ضرورت ہے بزرگوں کی جوتیاں سیدھی کرینگی اس مطلب کی تقریر میں نے کسی کتاب میں نہیں دیکھی مجھے تو اپنے ایک بزرگ کی تقریر سے قناعت ہو گئی۔ شاید کسی کتاب میں بھی موجود ہو اور ممکن ہے کتابوں میں اس سے بھی اچھا جواب ہو میری نظر زیادہ وسیع نہیں مگر ہمیں تو ایسے بزرگ مل گئے تھے کہ باوجود اپنی عدم وسعت نظر کے ہم کو ان کی شرح ..... کفایت ہو گئی۔ وہ تقریر میں نے استاد علیہ الرحمۃ سے سنی ہے انہوں نے فرمایا کہ نوح علیہ السلام کو جو اول رسول فرمایا گیا تو وجہ اس کی یہ ہے کہ پیغمبر دو قسم کے ہوئے ایک تو وہ جو کہ تعلیم معاد کے ساتھ تعلیم معاش بھی کرتے تھے کیونکہ ابتدائے عالم میں تعلیم معاش کی بھی ضرورت تھی انسان کی عقل اتنی کامل نہ تھی کہ بغیر کسی کے بتلائے تمام ضروریات معاش کو خود سمجھ لیتے اس لئے معاش کی بھی تعلیم

ہوتی تھی انسان کی تو بس اتنی عقل ہے کہ جب ہابیل کو قابیل نے قتل کر دیا تو اُس کی سمجھ میں آیا کہ اس کو چھپائے کیسے آدمی اُس وقت تک دفن کرنا نہیں جانتے تھے کیونکہ کسی کو ذبح تو آئی نہ تھی تو جو بات اب ایک چھوٹا بچہ بھی جانتا ہے وہ اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ غرض لاش کو لئے لئے مارا مارا پھرتا تھا مورخین نے لکھا ہے کہ ایک سال کامل لاش کندھے پر لادے پھرا اس حالت پر خدا کو رحم آیا وہ ایسے رحیم ہیں کہ گنہگار پر بھی اُن کو رحم آتا ہے فبعث اللہ غرابا یبحث فی الارض لیریہ کیف یواری سوأۃ اخیہ خدا نے دو کوؤں کو بھیجا کہ آپس میں لڑیں اور ایک دوسرے کو مار کر زمین میں دفن کر دے تا کہ اس کو دفن کرنا سکھلا دے قال یویلتی اعجزت ان اکون مثل ھذا الغراب فاواری سوأۃ اخی یہ کیفیت دیکھ کر قابیل بے ساختہ بول پڑا کہ افسوس میں اس کوے کے برابر بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش کو دفن کر دیتا غرض اس کو اپنی بے عقلی پر بڑی ندامت ہوئی تو انسان کی عقل تو یہ ہے اگر معاش کو انسان کی رائے پر چھوڑا جاتا تو اس سے کوئی کام بھی نہ ہوتا نظام عالم بگڑ جاتا خدا نے اپنی عنایت و شفقت سے انبیاء کے ذریعہ سے ضروری معاش کی بھی تعلیم دی۔ آدم علیہ السلام نے کپڑا بننا سکھلایا۔ کھیتی سکھلائی ادریس علیہ السلام نے سینا سکھلایا۔ اسی طرح دوسرے انبیاء کے ذریعہ سے تدابیر معاش سکھلائی گئیں تو جب تک اصول معاش مکمل نہ ہو گئے تھے انبیاء علیہم السلام دونوں کام کرتے تھے معاش کی بھی تعلیم دیتے تھے اور معاد کی بھی اور جب یہ ضرورت رفع ہو گئی تو معاش کی تعلیم بند کر دی گئی کیونکہ دنیا مقصود تو تھی نہیں بلکہ ضرورت کی وجہ سے اس کی تعلیم دی گئی تھی اور بقدر ضرورت تعلیم ہو گئی والضروری یتقدر بالقدر الضرورۃ اُس کے بعد سے صرف معاد کی تعلیم کرتے تھے تو ایسے انبیاء جو فقط معاد ہی کی تعلیم دیتے تھے ان کا سلسلہ نوح علیہ السلام سے شروع ہوا تو الرسل پر جو الف لام ہے وہ عہدی ہے۔ یعنی جو رسل فقط معاد ہی کے لئے مبعوث ہوئے تھے ان میں اول نوح علیہ السلام ہیں یہ ہے حقیقت

اس جملہ کی مگر ان لوگوں کو حدیث سمجھنے کی فرصت کہاں؟ ان کو تو اس کی پرواہ ہی نہیں کہ بات صحیح ہو بس جو زبان پر آگیا کہہ دیا کچھ خیال نہیں کرتے کہ اس کا وبال کیا ہوگا؟ دین پر ان لوگوں کی زیادتی حد سے بڑھ گئی چنانچہ نماز کے متعلق ایک ترتیب گھڑی کہ اصل مقصود اتفاق ہے جس کی تقریر عنقریب گذری جس جگہ شعر دوستی بخیز د چوں دشمنی ست الخ دوسرے مقام پر مذکور ہے اور ظاہر میں اس کو بڑا اچھا نکتہ سمجھا جاتا ہے مگر واقع میں یہ دین کو سخت مضر ہے اس میں دین کی بڑی خرابی ہے کیونکہ ممکن ہے کہ ایک وقت ایسا آجاوے کہ نماز سے اتحاد نہ ہو یعنی لوگ نماز تو پڑھیں مگر آپس میں اتحاد کی جگہ تبدد و تشتت ہی بڑھے جیسا اب ہے کہ نماز پڑھتے ہیں لیکن قلوب میں اتفاق نہیں بلکہ بجائے اس کی جنگ و جدل ہے مؤذن کو امام سے لڑائی ہے دوش بدوش صف میں کھڑے ہیں مگر دلوں میں کینہ و فساد ہے یہ تو نمازیوں کا حال ہوا اور جو لوگ کلب گھر میں گیند بلا یا شطرنج کھیلتے ہیں اُن کے آپس میں اتحاد و اتفاق ہے پس اگر ایسا زمانہ آگیا تو جس کے ذہن میں یہ ہے کہ مقصود نماز اور جماعت سے صرف اتفاق ہے اور وہ یہ بھی دیکھے کہ اب نماز سے یہ مقصود حاصل نہیں ہوتا اور کلب گھر میں اتحاد اور اتفاق حاصل ہوتا ہے تو لا محالہ وہ یہ کہے گا کہ نماز کو چھوڑ کر کلب گھر کی خدمت اختیار کرنی چاہیئے اب تبلایئے یہ بددینی ہے یا نہیں یہ گناہ عظیم بلکہ کفر میں ابتلا ہوا یا نہیں؟ حضرت یہ مضرت ہے احکام کی حکم اور مصالح تلاش کرنے میں اگر یہ مرض نہ ہوتا تو لوگ خدا کا حکم سمجھ کر دیوانوں کی طرح ہر حکم کو بجا لاتے اب وہ بات نہ ہوگی بلکہ اب تو حکمت کی وجہ سے نماز پڑھی۔ نماز خاص خدا کے حکم کی وجہ سے نہ ہوئی اور اس کے مقابلہ میں ایک وہ شخص ہے جس کا مذہب یہ ہے ؎

زبان تازہ کردن باقرار تو ... نیگیختن علت از کار تو

اور جس کا مشرب یہ ہے ؎

زندہ کنی عطائے تو ... ور بکشی فدائے تو

دل شدہ مبتلائے تو ہر جہ کنی رضائے تو

یہ ایسا مشرب ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے شیطان کبھی وسوسہ دل میں ڈال ہی نہیں سکتا۔ بخلاف مشرب مصلحت واتباع حکمت کے کہ اکثر طبائع ایسے مصالح کے تبلانے سے بگڑ جاتی ہیں عقائد تباہ ہو جاتے ہیں۔

علاج فلاسفہ خدا کی توحید کے بارہ میں کسی فلسفی نے سو دلیلیں جمع کیں اور یہ طریقہ اختیار کیا کہ ہر شخص سے پوچھتے پھرتے کہ خدا واحد ہے اس کی کیا دلیل؟ جو نہ تبلا سکتا اس کو جاہل اور حقیر سمجھتے غرض لوگوں کو پریشان کر دیا۔ ایک گاؤں والے کے پاس جا کر کہا اس کی کیا دلیل ہے کہ اللہ واحد ہے۔ دیہاتی نے کہا ذرا ٹھہرو گھر میں سے لٹھ لایا اور اس کے پیچھے لٹھ لیکر دوڑا کہا ٹھہر تجھے دلیل تباتا ہوں یہ لٹھ دلیل ہے وہ بھاگا۔

تو صاحبو یہ ایسی دلیل ہے کہ ٹوٹتی ہی نہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ بلا دلیل اللہ واحد ہے۔ سنار کی کھٹ کھٹ لوہار کی ایک یہ سو کی ایک دلیل ہے مولنا یعقوب صاحب اسی باب میں فرماتے ہیں ؎

الوعظ ینفع لو بالعلم والحکم والسیف ابلغ وعاظ علی القمم

اور یہ بھی فرماتے تھے دیکھو لوگ تو کہتے ہیں چار کتابیں نازل ہوئی ہیں مگر میں کہتا ہوں کہ ایک پانچویں کتاب بھی اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے وہ یہ ہے لقد ارسلنا رسلنا بالبینات وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط وانزلنا الحدید فیہ باس شدید ومنافع للناس

کتب اربعہ کے بارے میں بھی انزلنا آیا ہے کہ سب کتابیں آسمان سے نازل ہوئی ہیں اور حدید کے واسطے بھی انزلنا آیا ہے یہ پانچویں کتاب ہے اور بعض دقت ظرافۃً فرماتے تھے کہ حدید سے مراد ہے نعلدار جوتا اور مولنا نے اس کا نام رکھا تھا روشن دماغ کہ سر پر

دو چار لگانے سے دماغ درست ہوجاتا ہے۔ اس سے بھی ایک نور پیدا ہوتا ہے۔

توحضرت دلائل علمیہ اور مصالح عقلیہ بعض کے لیے مضر ہوتی ہیں ہر جگہ ہر کس وناکس سے ان کو بیان کرنا بُرا ہے کہیں لٹھ ہی کام دیتا ہے چنانچہ لٹھ سے اس فلسفی کا دماغ ٹھیک ہوگیا۔

دلائل عقلیہ کی بے بسی ایک اور فلسفی کی حکایت ہے وہ بڑے عالم تھے جب مرنے لگے تو مرتے وقت شیطان اُن سے مناظرہ کو کھڑا ہوگیا۔ مناظرہ توحید ہی میں تھا جس کے سو دلائل ان کے پاس تھے شیطان توحید کے دلائل پر نقوض وارد کرنے لگا یہ جو دلیل قائم کرتے وہ اس کو رد کردیتا جتنے دلائل ان کے پاس تھے سب ہی پیش کیے اُس نے سب کو توڑ دیا اس کے بعد اُس نے شبہ ڈالدیا کہ توحید جو اصل الاصول ہے جب اس کی یہ حالت ہے تو اور اُصول کی کیا اصل ہے خود ہی سمجھ لو قریب تھا کہ اُن کو اصولِ اسلام کی حقانیت میں شبہ یا تذبذب ہوجاتا کہ ایک بزرگ نے ان کی دستگیری فرمائی وہ بزرگ شیخ نجم الدین کبریٰؒ تھے جو اُس وقت صدہا میل کے فاصلہ پر اپنے گھر میں وضو کررہے تھے ان کو مکشوف ہوا کہ اس عالم فلسفی کے اوپر مصیبت نازل ہے آپ نے اپنے خدام سے فرمایا کہ اس وقت ایک بڑے عالم کا ایمان خراب ہوا جاتا ہے کسی نے عرض کیا کہ حضرت بچا لیجئے آپ نے وضو کا پانی زور سے اُس طرف پھینکا اور فرمایا کہدو بلا دلیل خدا واحد ہے اللہ تعالیٰ نے یہ پانی اور آواز اُن کے کان میں پہونچادی اور انہوں نے شیطان سے یہی کہا کہ میں بلا دلیل خدا کو واحد مانتا ہوں شیطان یہ سنکر بھاگا اور اُس کے دام تزویر سے رہائی ہوئی اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

دست پیر از غائباں کوتاہ نیست — دستِ او جز قبضۂ اللہ نیست

وہ فلسفی عالم ان بزرگ کی خدمت میں آئے تھے۔ آپ نے ذکر کی تلقین فرمائی اور خلوت کا حکم دیا ذکر شغل شروع کیا تو ان کو معلوم ہوا کہ کوئی چیز اندر سے نکل رہی ہے۔

شیخ سے اس حال کو عرض کیا تو فرمایا کہ تمہارا فلسفہ دل سے نکل رہا ہے یہ اُن کو گوارا نہ ہُوا شیخ نے فرمایا کہ بھائی ذکر شغل سے اللہ تعالیٰ تم کو اس سے بہتر علم عطا فرما دے گا مگر دل نے نہ مانا اور ذکر شغل چھوڑ کر چلے آئے کہ نقد را بنسیہ گذاشتن پر کون عمل کرے فلسفہ تو اس وقت موجود ہے اور علم باطن اب تک حاصل نہیں ہوا نہ معلوم ہوگا بھی یا نہیں غرض شیخ کو چھوڑ کر چلے آئے تھے لیکن فقط اُن کی خدمت میں جانے سے یہ فائدہ ہوا کہ مرتے وقت انہوں نے کیسی بڑی دستگیری فرمائی کہ عذاب ابدی سے بچا لیا۔ ایک اور شخص تھے حضرت حاجی صاحبؒ کے ایک جملہ سے اُن کا کام بن گیا تھا اُن کو قبض شدید تھا وہ غایت مسرت سے یہ کہتے تھے ؎

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند — واندراں ظلمت شب آب حیاتم دادند
کیمائیست عجب بندگی پیر مغاں — خاک اُو گشتم وچندیں درجاتم دادند

حضرت جب وہ غائبین کی دستگیری فرماتے ہیں تو حاضرین کو کیسے محروم کر دیں گے مولانا اسی کو فرماتے ہیں ؎

غائباں را چوں نوالہ مید ہند — حاضراں از غائباں لاتنگ بہند

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُن کو علم ہوتا ہے وقائع کا بلکہ جب خدا تعالیٰ کو رحم آتا ہے تو کسی کے ایک کلمہ سے دور تک کام بن جاتا ہے چند روز کسی اللہ والے کے پاس جا کر رہو تو معلوم ہوگا کہ برکت علم اور ساتھ ہیں علم حقیقی سب اُن ہی کے پاس ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

بینی اندر خود علوم انبیاء — بے کتاب وبے معید و اوستا

دیکھئے اُن بزرگ نے پانی کا ایک چھینٹا دیا اور اس کے ساتھ ایک آواز بھی دی کہ کیوں نہیں کہہ دیتا کہ خدا کو بے دلیل واحد مانتا ہوں۔ یہ کہنا تھا کہ شیطان وہاں سے بھاگا تو دیکھئے کہ دلائل نے کچھ کام نہ دیا البتہ سادہ ایمان نے کام دیا اور آخیر میں فلاسفہ بھی اسی

طرف آجاتے تھے۔

امام رازی کا فرمان

چنانچہ امام رازی بہت بڑے عالم اور فلسفی تھے مگر آخر میں اُن کی تحقیق یہ تھی جس کو نظم میں فرماتے ہیں۔ ؎

نھایۃ اقدام العقول عقال　　وغایۃ سعی العالمین ضلال

ولم نستفد من بحثنا طول عمرنا　　سوی ان جمعنا فیہ قیل یقال

مگر یہ حقیقت اُس وقت منکشف ہوئی جب یہ شیخ کے پاس جانے کا موقع نہ رہا۔ حقیقت میں علم یہ ہے یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ سلف کے علوم جو صحابہ بھی نہ تھے کیسے تھے پھر صحابہ کے علوم کیسے ہونگے اور اس سے بڑھ کر انبیاء علیہم السلام کے علوم کیسے ہوں گے۔ (اشعار مذکورہ بالا کے پڑھنے کے بعد آنا فرمانے پائے تھے کہ بعض سامعین نے درخواست کی کہ ان اشعار کا مطلب بیان فرما دیجیے پس فرمایا) امام رازی فرماتے ہیں کہ عقل نے بہت ترقی کی مگر ساری ترقی کی انتہا یہ تھی کہ عقل ایک عقال ثابت ہوئی یعنی مانع از حقیقت بڑے بڑے اہل علوم کے علم کا نتیجہ یہ ہوا کہ عقل کی رہبری سے راستہ نظر نہ آیا ساری عمر جو بحث کی وہ سب قیل وقال ہی تھی جس سے حقیقت واضح نہیں ہوئی یہ حاصل ہے ترجمہ کا (اس کے بعد فرمایا) میرا معمول یہ ہے کہ جس مضمون کو پہلے بیان کرتا ہوں اُس کی تائید میں کوئی شعر عربی یا فارسی کا پڑھ دیتا ہوں اُس کا ترجمہ نہیں کرتا ترجمہ کرنے سے لطف نہیں رہتا اور ترجمہ کی ضرورت بھی نہیں رہتی کیونکہ اُس کا مطلب اور مقصود تو پہلے بیان ہو چکتا ہے۔ غرض امام رازی فرماتے ہیں کہ ساری عمر کی تحقیقات کا یہ نتیجہ نکلا کہ سب فضول قیل وقال ہے۔ علم حقیقت میں وہ ہے جس کو مولانا نظامی گنجوی فرماتے ہیں ؎

زبان تازہ کردن بہ اقرار تو　　نینگیختن علت از کار تو

یعنی علم یہ ہے کہ جو ارشاد اُدھر سے ہو اس کا اقرار کر لینا۔ یوں نہ کہنا کہ یہ کیوں ہے؟

[illegible]

باب [illegible] اور سالک

[illegible]

کی. غرض مطلب یہ ہوا کہ اہل علم کو مصالح وحکم تبلانے کی اجازت ہے مگر غیر کو نہیں اور انہیں کو پوچھنے کی بھی اجازت ہے پھر اسی کی ساتھ یہ بھی ہے کہ ہر طالب علم کو بھی تبلا دینا ٹھیک نہیں طلبہ میں سے جو محقق ہوں صرف ان کو تبلائے باقی جو اس کے اہل نہ ہوں اور پوری سمجھ نہ رکھتے ہوں انہیں نہ تبلائے چنانچہ جن مولانا کا یہ مقولہ ہے کہ ہر طالب علم کہ چون وچرا کند اورا درچراگاہ باید فرستاد. میرے ہی سامنے کا ان کا یہ معاملہ بھی ہے کہ ایک طالب علم نے مولانا سے پوچھا تھا کہ ایام حیض میں نماز وروزہ دونوں کی ممانعت ہے پھر پاک ہونے کے بعد نماز کی تو قضا نہیں اور روزہ کی قضا لازم ہے اس میں کیا حکمت ہے فرمایا حکمت یہ ہے کہ اگر اس پر عمل نہ کروگے تو اتنی جوتیاں لگیں گی کہ سر گنجا ہو جائیگا. سر کے بال اڑجادیں گے اس جواب کی وجہ یہ تھی کہ سائل مہمل تھا اس کو تبلانا مضر تھا اور ان کا مہمل ہونا ان کے ایک شعر ہی سے معلوم ہوتا ہے جو انہوں نے بنایا تھا وہ شعر یہ ہے ؎

خواہ مخواہ کی بات بھی مخفی بنے — جیسے حامل پیٹ سے سقطی جنے

یہ آپ کا شعر ہے الفاظ بھی بے جوڑ اور مراد بھی کسی کی سمجھ میں نہ آئے کہ کیا مراد ہے؟ آپ نے پوچھنے پر اس کا مطلب یہ بیان فرمایا تھا کہ عاشق ومعشوق جمع تھے رقیب کو ناگوار ہوا اس نے حسد کرنے کی یہ ترکیب کی کہ معشوق سے کہا ذرا یہاں آنا کچھ مخفی بات کہونگا حالانکہ خواہ مخواہ ہی بلایا کوئی بات نہ تھی مگر اس حیلہ سے وہ عاشق سے علیحدہ ہوگیا اس پر سب سامعین ہنس پڑے کہ اتنا لمبا مطلب مگر شعر کی اب بھی اس پر دلالت نہیں نہ دوسرے مصرع کا پہلے سے کچھ جوڑ معلوم ہوا. بس اس ہنسنے پر آپ خفا ہوگئے کہنے لگے جاؤ ہم تم سے نہیں بولتے اور چلدیئے. میں نے کہا دوسرے مصرع کو میں حل کردوں گا مطلب یہ ہے کہ جیسے حامل کے پیٹ سے ساقط حمل نکلے تو وہ بے چاری خواہ مخواہ بدنام بھی ہوگئی اور بچہ بھی نہیں جنا۔

ان ہی حضرت کے مہمل ہونے کا ایک واقعہ سنیئے ایک روز جلالین کی جلد

پڑھی آیت یہ تھی حملنا کم فی الجاریۃ ترجمہ تو اس کا یہ ہے ہم نے سوار کیا تم کو کشتی میں مگر آپ نے یوں ترجمہ کیا ہم نے حاملہ بنایا تم کو لونڈی میں بندہ خدا نے حملنا کم کے ترجمہ میں محمول بھی نہ کیا حالانکہ ظاہر ہے کہ کم محمول ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایسا جاہل شخص نماز اور روزے کا فرق کیا سمجھے گا؟ پس چونکہ یہ سائل مہمل تھا اس لئے اُس کو یہ جواب دیا اور دوسری مجلس میں سمجھدار لوگوں کے سامنے فرق بھی بیان کر دیا۔

بہر حال محقق ہر ایک کو ایک جواب نہیں دیتا۔

عوام کے لئے جواب

اب ہمارے علماء اس کی رعایت نہیں کرتے سب کو حکمت اور اسرار بتلانے لگتے ہیں حالانکہ مخاطب سمجھتا بھی نہیں کہ انہوں نے کیا کہا میں ایک مرتبہ سہارنپور گیا تھا وہاں ایک شخص بہشتی زیور بغل میں دبائے ہوئے آئے اور ایک مسئلہ نکال کر مجھ سے کہنے لگے کہ یہ مسئلہ دیکھ لیجئے میں نے کہا کہ میری تو ساری کتاب دیکھی ہوئی ہے مجھے آپ کیا دکھلاتے ہیں۔ کہنے لگے یہ مسئلہ سمجھ میں نہیں آیا میں نے کہا کیا خود اس مسئلہ کا مفہوم سمجھ میں نہیں آیا یا اُس کی دلیل سمجھ میں نہیں آئی۔ کہنے لگے مطلب تو سمجھ لیا دلیل سمجھ میں نہیں آئی میں نے کہا اس مسئلہ کے سوا باقی تمام فقہی مسائل کی دلیلیں آپ نے سمجھ لی ہیں یا اور بھی کچھ ایسے مسائل ہیں جن کی دلیل آپ کو معلوم نہیں ہوئی؟ اگر سب کی دلیلیں آپ کو معلوم ہو چکی ہیں تو مجھے سوالات کی اجازت دیجئے کہ میں کسی مسئلہ کی دلیل آپ سے دریافت کروں؟ کہنے لگے کہ بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کی دلیل مجھے معلوم نہیں۔ میں نے کہا پھر اس کو بھی اُسی فہرست میں داخل کر لیجئے اسی کی دلیل جاننے کی کیا ضرورت ہے؟ بس اب اُن کی منطق ختم ہو گئی اور کتاب بغل میں دبا کر رخصت ہو گئے بعد میں معلوم ہوا کہ اس شخص نے کئی روز سے حضرات علماء سہارنپور کو تنگ کر رکھا تھا اور وہ حضرات خوش اخلاقی سے اُس کو دلیل سمجھا رہے تھے۔ لیکن میں نے چار منٹ میں اُس کو لاجواب کر کے اُٹھا دیا۔

ایک سے نجات ہوئی تو ایک جنٹلمین صاحب آئے یہ ذرا مہذب تھے۔ کہنے لگے جناب سے کچھ عرض کرنا ہے۔ میں نے کہا فرمائیے۔ کہنے لگے بعض جہلاء علماء پر اعتراض کرتے ہیں اس سے رنج ہوتا ہے دل دکھتا ہے کہ ہمارے سامنے ہمارے بزرگوں کو بُرا بھلا کہا جاوے اس رسالہ میں یعنی بہشتی زیور میں ایک مسئلہ ہے جس کی وجہ سے جہلاء اعتراض کرتے ہیں اس لئے مناسب ہے کہ بہشتی زیور کے اس مسئلہ کے متعلق مخالفین کا جو اعتراض ہے اُس کے جواب کے لئے ہم ایک مجلس منعقد کریں اور اُس میں حق کو واضح کر کے سب کو سمجھا دیا جائے تاکہ علماء کو بُرا نہ کہیں۔ میں نے کہا جناب کی خیر خواہی میں شک نہیں باقی قاعدہ شرعیہ وعقلیہ یہ ہے الاہم فالاہم یعنی اہم کو غیر اہم سے مقدم رکھنا چاہیئے سو ایک جماعت تو وہ ہے جو علماء کی شان میں گستاخی کرتی ہے اس سے بدتر وہ جماعت ہے جو ائمہ مجتہدین پر طعن و تشنیع کرتی ہے اس سے بدتر وہ جو صحابہ کو سب و شتم کرتی ہے اس سے بدتر وہ لوگ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کرتے ہیں اس سے بدتر وہ جو خدا تعالیٰ ہی کی نفی کرتے ہیں یعنی دہریہ پس کام ترتیب سے شروع کیجئے اول ان لوگوں کو سمجھا دیجئے جو خدا تعالیٰ کی شان میں بے ادبی کرتے ہیں پھر اُن کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتے ہیں پھر جو صحابہ کو بُرا کہتے ہیں پھر جو آئمہ دین کو بُرا کہتے ہیں پہلے آپ ان سب کا انتظام کر لیجئے پھر میں اخیر میں ایسی جماعت کا انتظام کر دوں گا جو بہشتی زیور پر طعن کرتے ہیں کہنے لگے واقعی بہشتی زیور کے مسئلہ کی تقدیم کی ضرورت تو نہیں لیکن اس میں ضرر بھی تو نہیں کہ ایک غیر اہم کو مقدم کر دیا جاوے میں نے کہا یہ مشورہ ہے یا حکم۔ کہا مشورہ ہے میں نے کہا بس آپ مشورہ دے چکے آپ سبکدوش ہو گئے آگے میرا کام ہے عمل کروں یا نہ کروں آپ تشریف لے جائیے۔

غرض میں مذاق عوام کا اتباع نہیں کرتا۔ اندھے کے آگے روئیے اپنی

آنکھیں کھولیے۔ ایک سب انسپکٹر تھے قصبہ رامپور میں میرے پاس اُن کا خط آیا کہ کافر سے سود لینا کیوں حرام ہے؟ میں نے جواب میں لکھا کافرہ سے زنا کرنا کیوں حرام ہے؟ انہوں نے لکھا کہ علماء کو اتنا خشک نہ ہونا چاہیئے میں نے دل میں کہا جہلاء کو اتنا تر نہ ہونا چاہیئے کہ ڈوب ہی جائیں ایک دفعہ رامپور میں وہی صاحب ملے اور کہا میں وہی ہوں جس سے اس قسم کی مکاتبت ہوئی تھی پھر انہوں نے پوچھا آپ نے ایسا جواب کیوں دیا میں نے کہا آپ سے جن لوگوں کا واسطہ پڑتا ہے وہ دو قسم کے ہیں ایک وہ جن سے آپ کی خصوصیت ہے اور دوسرے وہ جن سے اجنبیت ہے میں نے کہا کیا سب سے آپ کا ایک ہی قسم کا برتاؤ ہوتا ہے کہا سب سے ایک قسم کا برتاؤ نہیں ہوتا ہے میں نے کہا ہمارے یہاں بھی ایسا ہی ہے جن سے خصوصیت نہیں ان کو ضابطہ کا جواب دیا جاتا ہے کیونکہ اُن کی فہم کا اندازہ نہیں ہوتا اور جن سے خصوصیت ہے اُن کو دوسرا جواب دیا جاتا ہے پہلا جواب ناشناسائی کی حالت کا تھا مگر اب آپ سے شناسائی ہوگئی ہے تو اب ایسا جواب نہ ملے گا مگر میں نے سوچا کہ ان کو بھی بالکل آزاد کرنا ٹھیک نہیں کہ جو جی میں آوے پوچھ بیٹھیں اس لئے ایک پیخ لگائی میں نے کہا مگر اس ملاقات سے جیسا مجھ پر اثر ہوا ہے کہ ایسا جواب نہ آویگا آپ پر بھی یہ اثر ہوگا کہ آپ بھی ایسے مہمل سوال نہ کریں گے اُن پر اُس کا بڑا اثر ہوا پھر کبھی انہوں نے ایسا سوال نہیں کیا غرض عوام کے لئے یا تو پانچویں کتاب ہو یا یہ کہ اُن کو جواب مت دو بلکہ دھمکا دو یا خشک جواب دے دو جیسا میں نے دیا۔ ان لوگوں سے اسی طرح ملنا چاہیئے۔ یہ لوگ پہلے ہی سے اعتراض لے کر علماء کے پاس جاتے ہیں۔ اب علماء دو قسم کے ہیں ایک تو وہ جو اُن کو جواب دیتے اور دلیل و حکم سمجھاتے جاتے ہیں یہ تو خلیق مشہور ہیں اور ایک وہ جو فضول قیل و قال نہیں کرتے وہ بد دماغ کہلاتے ہیں گو وہ واقع میں با دماغ ہی ہوں۔ صاحبو علماء کس کو سمجھائیں مخاطب میں قابلیت بھی تو ہو مگر اب تو یہ مرض ہو گیا کہ عوام اپنے کو ہر بات کے

سمجھنے کے لائق سمجھتے ہیں اور اگر کسی بات کو نہ سمجھے تو اعتراض کر دیا کہ علماء ہم کو سمجھا نہیں سکتے۔

میں یہ تو نہیں کہتا کہ ہم کو سب اسرار معلوم ہیں بلکہ ہم صاف کہتے ہیں کہ بعض اسرار تو فقط اللہ ہی کو معلوم ہیں اور کسی کو معلوم نہیں بعض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہیں اوروں کو معلوم نہیں اور بعض اولیاء کو معلوم ہیں غیر اولیاء کو معلوم نہیں اور بعض علماء کو معلوم ہیں جہلاء کو معلوم نہیں۔ یہ نہیں کہ مولویوں کو سب ہی چیزیں معلوم ہیں مگر عوام کی طرح اتنے ناواقف بھی نہیں۔ ہزاروں باتیں ان کو معلوم ہیں مگر عوام کو نہیں تبلاتے ایک دولت مند ہے کروڑوں روپیہ اس کے پاس ہے مگر کیا ضرورت ہے کہ جس کے پاس روپیہ ہو وہ تمہیں اس کا پتہ بھی دیدے۔ ایک شخص کے پاس محل ہے۔ بالاخانہ ہے تم نے مانگا تم کو نہ دیا تو کیا یہ کہا جاوے گا کہ اس کے پاس محل ہی نہیں ہے جھونپڑا ہے اس کہنے سے کیا وہ تمکو محل دے دے گا اچھا جھونپڑا ہی سہی۔ اس کو تو راحت میسر ہے اب خواہ کوئی نفی کردے یا جھونپڑا سمجھے اس کا کیا نقصان ہے۔ اسی طرح اگر علماء کو عوام عالم نہ سمجھیں ان کا کیا نقصان ہے وہ تو راحت میں ہیں اور تمہارے اس جہل و نفی پر یوں کہتے ہیں۔ ؎

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

ان کے پاس اسرار بہت ہیں مگر وہ ظاہر نہیں کرتے اسی کو عارف شیرازی فرماتے ہیں۔ ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ برون افتد راز ورنہ در مجلس رندان خبرے نیست کہ نیست

یعنی کون سی ضروری خبر ہے جو ان کو معلوم نہیں مگر تبلانے میں مصلحت نہیں اور وہ کیوں نہیں اس لئے کہ اس کا مخاطب کے دین پر اثر پڑتا ہے مصالح و حکم ظاہر کرنے سے ان کا دین سست ہوتا ہے دین کی قوت اسی میں ہے کہ ان کو کبھی مصالح نہ تبلادیں

البتہ مصالح کا بھی ایک درجہ ہے مگر مصلحت مقصود نہیں۔ مقصود صرف ایک چیز ہے اُس کے سامنے سب مصالح قابل پینے کے ہیں مصالح پینے ہی سے سالن میں مزہ آتا ہے وہ مقصود کون سی چیز ہے وہ چیز ہے جس کو شیرازی فرماتے ہیں ؎

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار
بگذارند و خم طرہ یارے گیرند

یعنی بڑی مصلحت یہی ہے کہ سب کو آگ لگادو ایک ذات

مذہب عشق کے راضی کرنے کی فکر کرو۔ عاشق کا کام ہے کہ معشوق اُس سے راضی ہو جائے معشوق اگر عاشق سے کہے اس نکڑ سے اُس نکڑ تک ننگا پھر تو کیا عاشق یہ کہیگا کہ ہم نے تو مکان پر بھی کرتا تک نہیں اتارا کیوں ہماری ہتک کراتے ہو یعنی شرمندہ کرتے ہو بے عزت کرتے ہو۔ بخدا اگر عاشق ہے تو پوچھے گا بھی نہیں بے دھڑک ننگا ہو جائیگا اگر سچا عاشق ہے تو زبان حال سے یوں کہے گا۔ ؎

ناخوش تو خوش بود بر جان من
دل فدائے یار دل رنجان من

اگر کوئی اس سے کہے کہ کام سمجھ سوچکر کرو محض محبوب کے کہنے پر نہ چلو لوگوں سے پوچھ کر مشورہ کر کے کام کرنا چاہیے تو کہیگا بھائی کس سے پوچھوں یہ تو مذہب عشق کے خلاف ہے اُس کا مذہب تو یہ ہے۔ ؎

دل آرامے کہ داری دل درو بند
دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

عاشق کا وہی مذہب ہے جو محبوب کہدے دوسرا عاشق کہتا ہے ؎

ہمہ شہر پُر ز خوباں منم و خیال ماہے
چہ کنم کہ چشم بدبیں نکند بکس نگاہے

سارا شہر حسینوں سے بھرا ہوا ہے مگر مجھے تو ایک ذات کے سوا اور کوئی نظر نہیں آتا۔ ہم نے اپنے کو ایک ذات کے سپرد کر دیا ہم کو مشورہ کی ضرورت نہیں ہے۔ جب عشق مجاز کا یہ حال ہے تو عشق حقیقی کا کیا حال ہوگا؟ خود سمجھ لو۔ ممکن نہیں کہ خدا کا عشق ہو اور یہ حالت نہ ہو۔

اگر کہو ہم خدا پر عاشق ہی نہیں جو عاشق ہو اُس کی حالت ایسی ہو گی ہم تو عاشق ہی نہیں۔ میں کہتا ہوں تم غلط کہتے ہو تم اپنے کو مومن تو کہتے ہو تم نے لا الہ الا اللہ کہا ہے اور مومن کے لئے عاشق ہونا لازم ہے رجسٹری شدہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے والذین امنو اشد حبا للہ یہ شدت حب عشق نہیں تو کیا ہے؟ آمنا کے لئے عشقنا لازم ہے۔

اُس کی ایسی مثال ہوئی جیسے کسی نے نکاح کے وقت کہا میں نے فلاں عورت کو قبول کیا۔ خبر بھی ہے اس کا کیا مطلب ہوا؟ اور کیا ہو گا یہ دولہا قبلت کہنے کے بعد ایک ماہ تک تو نوشاہ ہے یعنی نیا بادشاہ ہے کہ کسی قسم کا غم نہیں دعوتیں ہو رہی ہیں خوشیاں منا رہے ہیں اس کے بعد کیا ہو گا۔ حضرت علیؓ سے کسی نے شادی کے متعلق دریافت کیا تھا فرمایا مسرور شھر ایک ماہ تک تو خوشی ہی خوشی ہے۔ دعوت ہوتی ہے۔ چاروں طرف سے سلام کلام ہوتے ہیں۔ سائل نے کہا ثم ماذا پھر کیا ہو گا فرمایا لزوم مہر یعنی اُس کے بعد مہر لازم ہو گا وہ بھی عرب میں ہندوستان میں نہیں ہندوستان میں تو اس کو دین ہی نہیں سمجھتے سائل نے کہا ثم ماذا پھر کیا ہو گا فرمایا غموم دھر کہ پھر ساری عمر کا غم ہے آج آٹا نہیں ہے آج دال نہیں پوچھا ثم ماذا پھر کیا ہو گا فرمایا کسور ظھر یعنی پھر ہڈیاں ٹوٹنے لگیں گی کمر جھک جائیگی غرض ایک مہینہ تک تو بادشاہ تھے اب اباجان نے گھر سے الگ کر دیا۔ اب بڑی مشکل اس کی خبر نہ تھی نواب صاحب کو اب بی بی کہتی ہے اناج لاؤ لکڑی لاؤ۔ گھی لاؤ اب میاں کہتے ہیں کہ تم نے یہ کیا تخ لگائی ہے۔ میں نے تجھے قبول کیا تھا۔ اناج لکڑی گھی کو تو نہیں قبول کیا تھا؟ بیوی نے کہا نادان مجھے قبول کرنا ان سب کو سر دھرنا ہے۔ لگی دونوں میں لڑائی ہونے۔ تو اب محلے کے لوگ جمع ہو گئے اور اُس وقت آپ بھی جو آمنا کے لئے عشقنا کو لازم نہیں مانتے تھے وہاں قاضی بن کر پہنچے۔ سو آپ بھی اور سب

لوگ یہی کہیں گے کہ تو نے بیوی کو قبول کیا تھا وہ کہتا ہے ہاں مگر اناج لکڑی کو قبول نہ کیا تھا اس پر آپ کہیں گے کہ بھائی یہی تو غضب کی پڑ یہ سستم کی پوڑیہ تھی جب تو نے ایجاب قبول کیا تو اناج بھی دینا ہوگا لکڑی اور گھی بھی۔ غرض پورا نان نفقہ دینا ہوگا فرمایئے یہ فیصلہ صحیح ہے یا غلط؟ اگر صحیح ہے اور ضرور صحیح ہے؟ تو یہی فیصلہ آپ پر بھی جاری ہوگا کہ جب آپ نے آمنا کہا تو انقیاد و اطاعت عشق و محبت سب کو قبول کیا اب جاتے کہاں ہو؟ تم تو عاشق ہو گئے اور اس کے مذہب میں لم اور کیف نہیں ہوتا ہے اگر عشق سے گھبراتے ہو تو آمنا سوچ کے کہا ہوتا اُس وقت خیال کرنا تھا۔ خوب کہا ہے عارف شیرازیؒ نے ؎

من ازاں حسن روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم

کہ عشق از پردہ عصمت بروں آرد زلیخا را

محقق نے تو اُسی وقت سمجھ لیا تھا کہ آمنا کہا اور عشق کا طوق گردن میں ڈال لیا۔

اور یہ بھی ظاہر میں آج ڈالا ہے ورنہ وہ تو روز میثاق ہی سے پڑا ہوا ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں انا عرضنا الامانۃ علی السموات والارض والجبال فابین ان یحملنھا واشفقن منھا وحملھا الانسان انہ کان ظلوماً جھولا یہی تو امانت ہے یعنی انقیاد و اطاعت، جس کی ایک تعبیر عشق ہے گو قرآن میں لفظ عشق نہیں ہے مگر جو الفاظ ہیں حقیقت تو اُن کی عشق ہی ہے۔

اس پر استطراداً ایک بات یاد آگئی وہ یہ کہ دنیا میں ایسے جاہل صوفی بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ قرآن میں لفظ عشق

جاہل صوفیا

موجود ہے بھائی قرآن میں کہاں ہے اوّل سے آخر تک دیکھ لو الفاظ قرآن تو محدود ہیں معانی البتہ غیر محدود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دریا کو کوزہ میں بھر دیا ہے۔

جاہل صوفی جواب میں کہتا ہے کہ تم عسق یہ اصل میں عشق ہے کسی نے کہا کہ اس میں تو سین ہے اور عشق میں شین ہے تو آپ کہتے ہیں کہ اصل میں تو شین ہی تھا مگر چونکہ حضور پڑھے ہوئے تھے نہیں (نعوذ باللہ) اس لئے آپ سے شین ادا نہ ہو سکتا تھا اس لئے آپ کی رعایت سے سین نازل کیا گیا اب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی وہی اعتراض ہو گیا جو بلالؓ پر تھا کہ اسہد کہتے تھے مجھے اس روایت پر یقین نہیں ہے نہ معلوم کہاں کی روایت ہے اور اگر ثابت بھی ہو تو کچھ حرج نہیں کیونکہ وہ حبشی کے رہنے والے تھے ان سے شین نہ نکلنا کچھ عجب نہیں مگر حضور تو اعرب العرباء افصح البلغاء تھے آپ سے شین کا ادا نہ ہونا بہت تعجب کی بات ہے اگر ایسا ہوتا اور ایسی رعایت ہوتی تو معوذتین میں بھی شین نہ ہوتا من شر کی جگہ من سر ہوتا من سر ما خلق ومن سر غاسق ومن سر النفثت ومن سر حاسد ہوتا اور سارے قرآن میں بھی کہیں شین نہ ہوتا استغفر اللہ استغفر اللہ قرآن کا ناس کیا ہے۔ ان جاہلوں نے دیکھیے کیا نکتہ نکالا ہے۔

اور یہ جاہل صوفی اس سے بھی بڑھ کر نکتے نکالتے ہیں۔ ہمارے یہاں ایک جاہل صوفی والضحیٰ واللیل اذا سجیٰ کے معنی بیان کرتا تھا اے نفس تیری بھی سجا سزا کوئی پوچھے یہاں نفس کہاں سے آگیا؟ شاید اس کا ماخذ یہ ہو کہ لیل بھی کالی ہوتی ہے اور نفس بھی کالا ہے۔ اس مناسبت سے لیل کے معنی نفس کے لئے اور اذا میں ہمزہ زائد آگیا ہوگا اور ذا کے معنی ہیں یہی۔ کیونکہ اسم اشارہ ہے اور سجا معرب سزا کا بس تفسیر مکمل ہو گئی۔

ایسے ہی ایک اور قصہ ہے ہم نے اپنے چھوٹے ماموں صاحب سے سنا تھا کہ ایک بانوا فقیر نے ماموں صاحب سے پوچھا تبلا رزق بڑا ہے یا محمد؟ ماموں صاحب نے کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا رتبہ سب سے زیادہ ہے جن کے خاطر دونوں عالم پیدا ہوئے

وہ اشرف المخلوقات ہیں اور رزق مخلوق ہے کہا جا بے پر معلوم ہوتا ہے پھر ڈنڈا کھا کر کہا اشہدان محمدا رسول اللہ دیکھو ان پہلے آیا اور محمد پیچھے۔ اُن کہتے ہیں اناج کو یہ تحقیقات ہیں آج کل کے تصوف کی خدا بچاوے اس جہل سے۔

ایسے ہی نے تو کہا تھا کہ قرآن میں یہ آیا ہے کہ جو کچھ ہے بیوی کا ہے ماں کا کچھ حق نہیں اس لئے وہ اپنی ماں کو کچھ نہیں دیتا تھا بی بی کی خدمت کیا کرتا تھا جب پوچھا جاتا کہ ماں کو کیوں نہیں دیتے ہو تو وہ جواب دیتا ہے کہ قرآن میں ہے اطعمھم من جوع یعنی کھانا دو جورو کو اور ماں کا کہیں ذکر نہیں اور جورو کہتے ہیں ہندی میں بیوی کو کم بخت نے جوع کو جورو بنایا عربی میں ہندی ٹھونسی۔ لوگ اس کو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے پاس لے گئے آپ نے یہ استدلال سنکر بطور الزامی جواب فرمایا کہ تو نے سورۂ تبت بھی پڑھی ہے؟ ہاں فرمایا پڑھ جب اس نے کہا ما اغنی عنہ مالہ وما کسب فرمایا دیکھو ما کسب سے کیا معلوم ہوا؟ یعنی ماں کا تو سب ہے اور جورو کا فقط کھانا ہی کھانا ہے کہا ہاں ٹھیک ہے بس ایسوں کا علاج یوں ہی ہوتا ہے۔ یہ جواب الزامی تھا۔ اُسی کے اصول پر۔ اللہ بچاوے جہل سے اُس نے لایلاف سے استدلال کیا تو شاہ صاحب نے تبت یدا سے جواب دیا غرض قرآن میں عشق کا لفظ نہیں ہے ہاں ایک ضعیف حدیث میں ہے من عشق فکتم فمات فھو شھید یہ حدیث مقاصد حسنہ میں ہے مگر اس کی صحت میں کلام ہے اگر اس حدیث کو صحیح بھی مان لیا جاوے تو صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ عشق[ع] کا لفظ حدیث میں ہے مگر قرآن میں تو پھر بھی نہیں البتہ معنی موجود ہیں کہیں اُس کو امانت کہا گیا کہیں حُب سے تعبیر کیا گیا کہیں اطاعت

ع قلت قد ورد لفظ العشق فی حدیث آخر اخرجہ الحاکم فی المستدرک فی مناقب خدیجہ رضی اللہ عنہا من طریق (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

کے عنوان سے بیان کیا گیا یہ اطاعت طوع سے ماخوذ ہے یعنی خوشی سے کام کرنا اور یہ شان عاشق ہی کی ہے کہ وہ ہر کام خوشی سے کرتا ہے گو کیسا ہی دشوار ہو کبھی طبعی ناگواری بھی ہوتی ہے مگر پھر عقلی خوشی سے کرتا ہے اور طبعی ناگواری منافی نہیں محبت کے ورنہ اسباغ الوضوء علی المکارہ کیوں فرماتے معلوم ہوا کہ گرانی اور ناگواری طبعی خلاف عشق نہیں جیسا اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سردی وغیرہ میں اسباغ الوضوء ہے تو مکروہ یعنی طبعاً مگر عاشق بوجہ عشق کے محبت سے کرتا ہے۔ غرض قرآن میں معنی عشق تو ہیں گو لفظ دوسرا ہے مگر مقصود ایک ہے

عبارا تنا شتیٰ وحسنک واحد ۔ وکل الی ذاک الجمال یشیر

الغرض آپ حامل عشق ہو چکے ہیں جو چیز آسمان زمین نہ اٹھا سکے آپ نے اس کو اٹھایا اب اگر اس سے بھاگو گے تو تم سے خطاب کیا جاوے گا

تو بیک نخے گریزانی ز عشق ۔ تو بجز نامے چہ میدانی ز عشق

عارف شیرازیؒ اسی کو فرماتے ہیں

آسماں بار امانت نتوانست کشید ۔ قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

دیوانہ کے لفظ میں اشارہ ہے کہ منشا تحمل امانت کا عشق تھا کیونکہ عشق سے آدمی دیوانہ ہو جاتا ہے پس جب امانت اٹھا چکے تو اب اس کے لوازم بھی ماننا پڑیں گے الشیٔ اذا ثبت ثبت بلوازمہ بقول عارف شیرازیؒ

یا مکن با پیل باناں دوستی ۔ یا بنا کن خانہ برانداز پیل

یا مکش بر چہرہ نیل عاشقی ۔ یا فرو شو جامۂ تقوی بہ نیل

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) سفیان بن حسین عن الزهری مرسلاً قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الحمد للہ الذی اطعمنی الخیر والبسنی الحریر وزوجنی خدیجۃ کنت لہا عاشقا اھ ج ۳ ص ۱۸۲ وسفیان ضعیف فی الزهری خاصۃ وھو مع ذالک مرسل ۱۲ منہ

صاحبو! یا تو عشق یعنی ایمان کا نام نہ لو اور اگر لیا ہے تو اس کے لوازم کو بھی اختیار کرو لوازم یہ ہیں :-

حیاتِ عشاق

اگر مرد عشقی کم خویش گیر
وگرنہ رہِ عافیت پیش گیر

یہ تعلیق بالشرط ہے تخییر نہیں ہے یعنی یہ عشق اختیار کرو گے تو گم ہونا پڑے گا آگے خود رائے دیتے ہیں ؎

مترس از محبت کہ خاکت کند — کہ باقی شوی چوں ہلاکت کند

اس لئے کہ عاشق ہلاک نہیں ہوتا ابدالآباد کی زندگی اُس کو عطا ہوتی ہے یہ وہ چیز ہے جس کے متعلق ارشاد ہے من عمل صالحاً من ذکر او انثیٰ وھو مومن فلنحیینہ حیوۃ طیبۃ اس کے سامنے امراء بادشاہوں کی حیات کوئی چیز نہیں سب کا نام مٹ جاتا ہے مگر اہل اللہ کا ذکر زندہ رہتا ہے کیونکہ وہ حی و قیوم میں اپنے کو فنا کر چکے ہیں تو اُن کو بھی حیات و قیام سے ایک حصہ مل گیا اسی کو عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

ہر گز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق — ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

یعنی عشق سے زندہ ہو جاؤ پھر تو ابدالآباد کی حیات حاصل ہو جائے گی۔

اگر کوئی شبہ کرے کہ عشق کی کیا تخصیص ہے دوزخی کو بھی تو حیات ابدی نصیب ہو گی کیونکہ کوئی دوزخی بھی تو نہیں مرے گا قرآن میں ہے خالدین فیھا ابدا اُس کا جواب یہ ہے کہ وہ زندگی نہیں ہے وہ تو موت سے بدتر ہو گی کہ نہ موت ہی ہے نہ حیات ہی ہے چنانچہ ارشاد ہے لا یموت فیھا ولا یحییٰ ایسی زندگی سے تو اگر اُن کو موت ہی آجاتی تو جان بچ جاتی چنانچہ کفار اس زندگی سے موت کی تمنا کریں گے ویقول الکافر یلیتنی کنت ترابا اور یومئذ یود الذین کفروا وعصوا الرسول لو تسوی بھم الارض

ولا یکتمون اللہ حدیثا اگر یہ حیات حیات مطلوبہ ہوتی تو وہ موت کی تمنا کیوں کرتے
معلوم ہوا کہ یہ حیات حیات نہیں ہے حیات وہ ہے جس سے شیفتگی ہو محبت ہو جس سے
قرب محبوب حاصل ہو تو یہ حیات خاص عشاق ہی کو حاصل ہو گی عشق کی برکت سے
ہو اگر عاشق ہو تو بس یہ مذہب رکھو زندگی کا مدار منافع دنیوی پر مت رکھا کرو غرض
مصالح کی تعیین سے یہ مفاسد پیدا ہوتے ہیں جن کو میں نے تفصیل سے بیان کر دیا ہے
اتنے بسط کا ارادہ نہ تھا مگر بلا ارادہ بڑھ گیا کیا کیا جاوے ؎

رشتہ در گردنم افگندہ دوست ۔۔۔ میبرد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

واللہ یقبض ویبسط وہ بے حد رزق کا بسط فرماتے ہیں کلام کا بھی فرما دیتے ہیں ہم تو مشین کی طرح ہیں۔

دوسرے یہ حضرت مخدوم صاحب کی بھی برکت ہے جن کے مزار کے قریب بیان ہو رہا ہے کہ تفصیل کے ساتھ بیان ہو گیا۔

فلسفی اور سالک کی غلطی

میں یہ کہہ رہا تھا کہ احکام میں دنیوی منافع بھی ہوتے ہیں مگر مقصود نہیں ہوتے اسمیں لوگوں کے عمل سے دو درجے ہیں ایک یہ کہ احکام کو مصالح پر مبنی کیا جاوے سو یہ تو مضر ہے کیونکہ جب وہ مصالح فوت ہو جائیں گے احکام کا بھی خاتمہ ہو جائیگا جیسا اوپر آچکا ہے اور ایک یہ کہ احکام تو مبنی ہوں خدا اور رسول کے ارشاد پر اور مصالح تبعاً اُس پر خود مرتب ہو جاویں سو اس عنوان سے اُن کا بیان کر دینا جائز ہے۔ بس ہمیں ان فضول تدقیقات سے کچھ فائدہ نہیں کہ یہ واجب کیوں ہے؟ یہ فرض کیوں ہے؟ یہ مستحب کیوں ہے؟ اس میں فائدہ ہی کیا ہے مقصود تو رضا حاصل کرنا ہے جس کا ظہور آخرت میں ہوگا۔ گو حصول یہاں بھی ہو جاتا ہے مگر یہاں ظہور نہیں ہوتا گو آثار وامارات سے یہاں بھی ہو جاتا ہے۔ بس فلسفی کی یہ غلطی ہے کہ احکام سے رضا کے سوا دوسری اشیاء کو مقصود

سمجھتا ہے۔

اور اسی قبیل کی ایک غلطی سالک کو بھی ہوتی ہے جو ایک اعتبار سے فلسفی کی غلطی سے بھی اشد ہے کیونکہ فلسفی کا مقصود تو محض دنیا ہے وہ احکام شرعیہ کو بھی اسی نظر سے دیکھتا ہے مگر سالک تو احکام سے مقصود منافع دنیوی کو نہیں سمجھتا اُس کی نظر میں دنیا مقصود نہیں ہوتی مگر پھر وہ ایسی غلطی کرتا ہے جس سے عاجل کی مقصودیت کا ایہام ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ بعض لوگ ثمرات و کیفیات و انوار کو مقصود سمجھنے لگتے ہیں سو سمجھ لو کہ گو نیت اُنکی دنیا کی نہیں مگر لازم تو یہی آگیا۔

باقی اہلِ تحریف کی تو نیت صاف دنیا ہی ہے چنانچہ ایک شخص نے ایک تفسیر لکھی ہے اُس میں یہ لکھا ہے کہ جتنے احکام شرعی ہیں سب سے مقصود سیاست ہے یہاں تک لکھا ہے کہ نماز باجماعت اس لئے مشروع ہوئی تاکہ میدانِ جنگ میں پریڈ کرنے کی عادت ہو اور اس میں اس بات کی عادت ڈالی گئی کہ افسر کی اطاعت کس طرح کرنا چاہیے وہ جو کرے اُس کے ساتھ ساتھ تم بھی اسی کا اتباع کرو تو جماعت اس لئے ہے تاکہ تم لڑائی کر سکو۔

غرض ہر حکم کے ساتھ لڑائی ہے وہ تفسیر ایسی ہی ہے جیسے کپاس کہانی ہوتی ہے کہ ہر جگہ یہی ٹیپ کا بند ہوتا ہے کپاس کہانی بوجھو گے، اسی طرح یہاں تفسیر میں ہر جگہ جنگ ہی کا سبق ہے۔ نکاح وطلاق کے احکام میں بھی جنگ ہی کے احکام اُس کو نظر آئے ہیں یہ فتنہ ایک مسلمانوں کے کالج سے اُٹھا ہے نماز کے بعد روزہ کی باری آئی تو لکھا کہ روزہ کا حکم اس لئے ہے کہ ہم کو فاقہ کشی کی عادت ہو کیونکہ لڑائی میں فاقہ کشی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ حج اس لئے مشروع ہوا تاکہ سب کمیٹی ایک جگہ جمع ہو کر تبادلہ خیالات کرے تاکہ عالم میں نظام ہو۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوگا کہ اب تک تو احکام کی نظر میں یہ تھا کہ مسلمانوں کے بعض امور تو مذہبی سیاسی ہیں اور بعض غیر سیاسی خالص

عبارت مختصر ہیں اب جب اُن کو معلوم ہوگا کہ یہ عبادات بھی سیاسی ہیں مذہبی نہیں ہیں تو اس سے بھی اُن کو کھٹک پیدا ہوگی ان مصالح وحکم کے بدولت وہ مسلمانوں کی نماز روزہ کو بھی خطرہ کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ عدت طلاق کے بارہ میں لکھا ہے کہ جیسے عدت کا زمانہ زوج سے خالی ہوتا ہے اسی طرح بعض وقت حاکم سر پر نہیں ہوتا ہے اُس وقت دوسرا حاکم تلاش کرنا چاہیئے گویا احکام عدت میں اس وقت کے مناسب احکام تبلائے گئے ہیں۔ غرض اِدھر اُدھر سے سب کو چپکا کے رہی لڑائی وہی لڑائی وہی لڑائی۔

یہ تو وہی قصہ ہوا جیسے کسی اوچھے آدمی کے پاس ایک دوشالہ تھا اُس کے کسی دوست نے اپنے لڑکے کی شادی کے موقع پر اُس سے مانگ کر دولہا کو اُڑھا دیا۔ بعضے تو وارد لوگ پوچھنے لگے کہ دولہا کونسا ہے؟ تو آپ کہتے ہیں کہ دولہا تو یہ ہے مگر دوشالہ میرا ہے دولہا کے باپ نے کہا یہ کیا لغو حرکت تھی دوشالہ جتلانے کی کیا ضرورت تھی کہا اچھا اب نہیں کہوں گا کوئی دوسرا پوچھتا ہوا آیا کہ دولہا کونسا ہے؟ تو آپ فرماتے ہیں کہ دولہا تو یہ ہے مگر دوشالہ میرا نہیں پھر شکایت کیگئی کہ یہ کیا واہیات ہے اس کے ذکر ہی کی کیا ضرورت ہے کہا اب نہیں کہونگا پھر ایک شخص پوچھنے لگا کہ دولہا کونسا ہے! آپ نے کہا دولہا تو یہ ہے مگر دوشالہ کا کچھ ذکر ہی نہیں۔ دولہا کے باپ نے دوشالہ اُتار کر اس کے منہ پر پھینک مارا کہ لے تھے اسی کا سبق رہ گیا ہر وقت دوشالہ ہر وقت دوشالہ۔

اسی طرح کی ایک اور حکایت یاد آئی کہ کسی اوچھے نے کسی کو ایک مرغی دی تھی اب ہر جگہ ہر بات میں مرغی کا ذکر تھا کہ یہ بات اُس دن ہوئی تھی جس دن میں نے آپ کو مرغی دی تھی یا یہ کہ جس دن مرغی دی تھی اُس سے ایک دن پہلے کا یہ قصہ ہے یا اس دینے سے دو دن پہلے یا پیچھے ایسا ہوا تھا غرض ہر بات میں مرغی کیا ہوئی

غدر ہی ہو گیا بعضے لوگ واقعات کا وقت بتلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ غدر کے زمانہ میں یہ واقعہ ہوا یا غدر سے ایک سال آگے یا پیچھے۔ بس جس طرح دوشالہ اور مرغی کے قصہ میں ہر جگہ اور ہر وقت دوشالہ اور مرغی کا سبق رہ گیا تھا یوں ہی ان مفسر صاحب نے ہر جگہ لڑائی ہر جگہ لڑائی کا سبق یاد کر لیا ہے یہ خدمت کی قرآن کی۔ افسوس ان لوگوں نے یہ گت بنا رکھی ہے کلام اللہ کی اور عوام ہیں کہ ایسی تفسیروں پر لٹو ہیں مگر میں صاف کہتا ہوں کہ یہ تفسیر نہیں بلکہ قرآن کی تحریف ہے۔ نماز دنیا کے لئے ہرگز نہیں ہے وہ خدا ہی کے لئے ہے کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے اقم الصلوٰۃ لذکری۔ نماز کو میری یاد کے لئے بجا لاؤ۔ روزہ کے بارہ میں آیا ہے کتب علیکم الصیام الی قولہ لعلکم تتقون وہ بھی خدا ہی کے لئے ہے جس سے مقصود تقویٰ اور کمال دین ہے حج کے بارہ میں وللہ علی الناس حج البیت اس میں للہ صاف آیا ہے تو اصل مقصود تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ محض رضائے حق کے لئے ہے۔

حقیقت بلاء و نعمت

مگر یہ احکام اپنی خاصیت سے ایسے ہیں اور ان میں ایک جامعیت اور برکت ہے کہ ان سے منافع دنیوی بھی بلاقصد نصیب ہو جاتے ہیں مگر مختلف طور پر حاصل ہوتے ہیں حتیٰ کہ بعض اوقات حساً اور ظاہراً تو بلا ہوتی ہے مگر معنیً و باطناً نعمت ہوتی ہے یہ نکتہ حضرت حاجی صاحبؒ کے ارشاد سے معلوم ہوا۔ ایک بار فرمایا کبھی نعمت بصورت بلا ہوتی ہے چنانچہ خضر علیہ السلام کا کشتی کا توڑنا ظاہر میں بلا تھی مگر حقیقت میں نعمت تھی۔ نعمت کا بصورت بلا ہونا قرآن میں بھی آیا ہے ولنبلونکم بشیء من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات ظاہر میں یہ بلائیں ہیں مگر اصلاح اخلاق کے اعتبار سے یہ نعمتیں ہیں کہ اس سے تربیت باطنی ہوتی ہے۔ ایک بار حضرت اس مسئلہ کو اس طرح بیان فرما رہے تھے گویا اس کا مشاہدہ ہو رہا تھا۔ اس مجلس میں ایک شخص آ گیا جس کا ایک ہاتھ زخمی تھا اور وہ

سیاہ ہوگیا تھا اُس نے کہا حضرت بہت تکلیف ہے میرے لئے دعا کیجئے ہم طالب علم لوگ شبہ کی پوڑیاں ہم نے دل میں کہا اب دیکھیں حضرت کیا کرتے ہیں اگر دعا نہ کی تو اس بے چارہ کی دل شکنی ہوگی تو یہ شان شیخ کے خلاف ہے اور اگر کی تو ابھی فرما چکے ہیں کہ بلا بھی نعمت ہے تو اس صورت میں یہ دعا سلب نعمت کی دعا ہوگی تو یہ دعا کیا ہوئی مگر اللہ اکبر ان حضرات کو کون سکھلاوے اُن کی تو وہ شان ہوتی ہے ادبنی ربی فاحسن تادیبی وعلمنی ربی فاحسن تعلیمی حضرت نے اُس کے لئے دُعا کی اور مضمون دعا کا ایسا اختیار فرمایا کہ اگر ہم دس برس بھی سوچتے تب بھی نہ سوجھتا مگر حضرت نے بے ساختہ فرمایا کہ اے اللہ ہم جانتے ہیں کہ یہ بلا بھی نعمت ہے مگر اے اللہ ہم اپنے ضعف کی وجہ سے اس نعمت کا تحمل نہیں کرسکتے جیسے جھوٹی ہرٹی بوٹی بھی نعمت ہے مگر شیر خوار بچہ اپنے ضعف کی وجہ سے تحمل نہیں کرسکتا پس اس نعمت مرض کو نعمت صحت سے مبدل فرما دیجئے میں نے اپنے دل میں کہا سبحان اللہ ان کو کون سکھلائے ؟ یہ عجیب نہیں کہ ہمارے اس شک کو رفع کرنے کے لئے ہی حضرت نے دعا زور سے کی ہو غرض نعمت کبھی صورۃً بلا ہوتی ہے اور حقیقۃً رحمت جیسے اپریشن ہے کہ ہے تو لطف مگر بصورت قہر۔ اگر لطف نہیں تو ڈاکٹر اُس پر انعام کیوں لیتا ہے اور آپ اُس کو فیس اور انعام کیوں دیتے ہیں ؟ صاف کہہ دیتے کہ ایک تو ہمارے بدن میں زخم کیا پھر اُس پر انعام چاہتے ہو ؟ مگر وہاں انعام دیکر بھی ہاتھ جوڑتے ہیں کہ حضور معاف کیجئے گا بہت قلیل ہدیہ ہے ہم آپ کو کچھ بھی نہ دے سکے۔ بلکہ بعض اوقات اگر مریض کو کلوروفارم نہ سونگھایا جائے کیونکہ اُس کا دماغ کمزور ہے تو وہ اپریشن کے وقت ہائے واویلا بھی کرتا ہے مگر دل میں اُس سے خوش ہے کیونکہ اُس کا انجام راحت ہے۔ ایسے ہی اللہ تعالیٰ کا معاملہ اپنے بندوں سے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ صورت تو غضب کی ہے مگر واقع میں ہوتی ہے رحمت۔

چنانچہ ایک رحمت کا ذکر اس آیت میں فرمایا گیا ہے لیذیقھم بعض

الذی عملوا لعلھم یرجعون ۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس واسطے ایسا کرتے ہیں تاکہ بندہ توبہ کرکے پاک و صاف ہو جاوے۔

اس پاک صاف ہونے پر ایک واقعہ یاد آگیا ایک دفعہ ہم نے بچپن میں سر کے بال بڑھائے تھے مگر پڑھنے کے وقت تو پڑھنے سے فرصت نہ تھی اور چھٹی کے وقت کھیل سے فرصت نہ تھی اس لئے ان کے دھلوانے کی نوبت نہ آتی تھی۔ تائی صاحبہ ہر روز کہا کرتیں کہ آؤ سر دھو دوں بالوں میں تیل لگا دوں مگر ہم ایک نہ سنتے ایک دن انہوں نے پہلے سے کھلی بھگو رکھی جب میں پڑھ کر آیا فوراً میرے سر میں کھلی لپیٹ دی اب میں سر دھلوانے پر مجبور ہو گیا اور بہت رویا چلایا، تو یہ تھا تو لطف مگر بصورت قہر۔ اسی طرح کبھی اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہوتا ہے۔ دیکھئے بچہ کی یہ حالت ہوتی ہے ؎

طفل میلرزد ز نیشش احتجام

مگر ماں کی یہ حالت ہوتی ہے۔ ؏

مادر مشفق ازاں غم شاد کام

چنانچہ ماں حجام کے سامنے بچہ کا سر دھر دیتی ہے کہ چیر دے اور بچہ روتا ہے مگر ماں باپ ہنستے ہیں کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ ظالم ہیں؟ ان کو محبت نہیں اپنے بچہ سے؟ ضرور ہے مگر اس محبت کا تمہیں رنگ نہیں معلوم۔ جب بندوں کے معاملات میں ایسی نظیریں موجود ہیں تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ بدگمانی کیوں ہے؟ کہ ہر بلا کو بلا ہی سمجھتے ہو نعمت نہیں سمجھتے۔

یہاں تک طالبان دنیا کی غلطیاں بیان کی گئی تھیں ایک یہ کہ نفع عاجل کو نفع سمجھتے ہیں حتیٰ کہ احکام سے بھی اسی کو مقصود سمجھتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ بلا کا نعمت ہونا انکی سمجھ میں نہیں آتا۔

اہل طریق کی غلطی کی تفصیل :۔ اب اسی کی نظیر بعض طالبان آخرت کی ایسی

ہی غلطیوں پر متنبہ کرتا ہوں جس کا اجمالا اور جب جگہ تلاوت سیاست کے مقصود ہونے کا خیال بعض لوگوں کا بیان کیا گیا ہے اس کے قبل تفصیلاً بھی طریق کی غلطی پر اجمالی تنبیہ کی گئی ہے اب اس کی قدرے تفصیل کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ سی طرح سالک کو بھی اسی کے مشابہ ایک غلطی ہوتی ہے وہ یہ کہ ذکر اللہ اور طاعات و عبادات میں ایک نفع تو عاجل ہے اور ایک آجل یعنی ایک نقد ہے ایک ادھار ہے ادھار تو جنت اور نعماے جنت لقاء و ظہور رضا ہے اور نقد ذوق شوق اور انوار وغیرہ ہیں اس میں بھی بڑی حلاوت ہے یہ حلاوت سلاطین کو بھی نصیب نہیں ہوتی یہ وہ حلاوت ہے جس کے متعلق حافظ شیرازیؒ فرماتے ہیں ؎

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روے | بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہاے وہوے

اور خاقانی فرماتے ہیں ؎

پس از سی سال ایں معنی محقق شد بہ خاقانی

کہ یک دم با خدا بودن بہ از ملک سلیمانی

مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے جو ملک تھا اس سے اچھا ہمارا ذکر ہے کیونکہ ان کے لئے وہ ملک بھی ذکر تھا بلکہ مطلب یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام کا جو ملک تھا وہ اگر ہمیں مل جاوے تو ہمارے لئے ہمارا ذکر اس سے اچھا ہے

غرض یہ وہ حلاوت ہے جو بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں ہوتی ہے۔ بعض اہل سلوک اس حلاوت کے طالب ہو جاتے ہیں۔ اگر کبھی یہ حلاوت نصیب نہ ہو یا کم ہو جائے تو پریشان ہوتے ہیں حتی کہ اس کی وجہ سے بعض لوگوں نے خودکشی تک کر لی ہے۔ پس اس حلاوت کا ظاہر تو دین ہے مگر واقع میں دین بالمعنی الاعم دو حصے ہیں ایک موعود ایک غیر موعود۔ سو مطلوب صرف موعود ہے اور وہ جنت ولقاء ہے اور غیر موعود مقصود نہیں اور ظاہر ہے کہ ذوق وشوق موعود نہیں ہے کیونکہ ذوق وشوق کا کہیں

وعدہ نہیں لہٰذا وہ مطلوب بھی نہیں ہے ہاں اس کیلئے دعا کا مضائقہ نہیں سو ذوق و شوق کے لئے دعا تو کرو کہ خدا نصیب کرے مگر مطلوب کی توفیق ہوتے ہوئے غیر موعود کے نہ ہونے سے اپنے کو محروم نہ سمجھو، یہ ناشکری ہے ؎

دست بوسی چوں رسید از دست شاہ — پائے بوسی اندراں دم شد گناہ

بادشاہ اگر چومنے کے لئے ہاتھ دے پاؤں کیوں چومو؟ اسی طرح اگر تم کو رضا و اسباب رضا حاصل ہوں اور ذوق و شوق نہ ہو تو غم نہ کرو۔ رضا کے مقابلہ میں ذوق و شوق کیا چیز ہے؟ تو سالکین سے یہ غلطی ہوئی ہے کہ وہ موعود و غیر موعود میں فرق نہیں کرتے ہیں اگر ذوق و شوق نہیں ہوتا ہے تو سمجھتے ہیں کہ ہم گئے گذرے ہیں چنانچہ شکایت کرتے ہیں شیخ سے کہ ہم کو ذوق و شوق نہیں ہے۔ اے صاحب مزا مطلوب ہے یا خدا کی رضا؟ عارف شیرازیؒ فرماتے ہیں ؎

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب
کہ حیف باشد ازو غیر او تمنائے

چاہے ذوق ہو یا بد ذوقی ہر حال میں اسی کے طالب رہو ؎

بدرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش
کہ آنچہ ساقی ماریخت عین الطاف است

اُدھر سے جو کچھ عنایت ہو سر آنکھوں پر ہے قبض ہو تو سر آنکھوں پر بسط ہو تو سر آنکھوں پر مولٰنا اسی کو فرماتے ہیں ؎

روزہا گر رفت گو رو باک نیست — تو بماں اے آنکہ چوں تو پاک نیست

روز کہتے ہیں احوال و واردات کو تو بماں کا مطلب یہ ہے کہ تو ہمارے ساتھ رہ آپ کی معیت ہونی چاہیئے اور بس۔ ان شاکیوں کی نسبت حضرت سرمدؒ فرماتے ہیں ؎

سرمد گلہ اختصار می باید کرد — یک کار ازیں دو کار می باید کرد

مجذوب تھے اس لئے صاف صاف آزادی سے کہتے ہیں کہ دو میں سے ایک بات اختیار کرنا چاہیے ؎

یا تن برضائے دوست می باید داد یا قطع نظر زیار می باید کرد

یعنی قسمت سے جو ملے خواہ تمہاری مرضی کے موافق ہو یا ناموافق یا اس پر راضی رہو ورنہ دوسرا محبوب تلاش کر لو جو تمہاری مرضی کا تابع ہو اللہ تعالیٰ تو کسی کے تابع نہیں ہو سکتے

؎ یا تن برضائے دوست می باید داد یا قطع نظر زیار می باید کرد

اپنے کو اُن کے سپرد کر دو جو ملے اُس پر راضی رہو۔

بوستان میں ایک حکایت ہے کہ ایک درویش کو غیب سے آواز آئی کہ تمہاری عبادت مقبول نہیں آواز اس طور سے آئی کہ اُن کے ایک مرید نے بھی سُنی مگر وہ پھر بھی تہجد کے وقت بوریا بدھنا لیکر کھڑے ہو گئے مرید نے کہا کہ جب اُدھر سے قبول ہی نہیں پھر فائدہ کیا مصیبت اُٹھانے سے ؟ درویش رونے لگے فرمایا کہ بھیا یہ سب کچھ سچ ہے مگر اس ایک در کے سوا اگر کوئی اور در ہوتا تو اس کو چھوڑ کر وہاں چلا جاتا مگر جب کوئی اور ... در ہی نہیں تو کہاں جاؤں ؟ اُنہیں اختیار ہے چاہے جگہ دیں چاہے نکال دیں معاً آواز آئی ؎

قبول ست گرچہ ہنر نیستت کہ جز ما پناہے دگر نیستت

یعنی جاؤ ہم نے قبول کر لیا مگر ساتھ ہی ایک چرکہ بھی لگا دیا اگرچہ ہنر نیستت کہ گو تمہاری عبادات قابل قبول نہیں مگر ہمیں رحم آتا ہے کہ اس کے لئے اور کوئی دروازہ نہیں ہمارے دروازہ پر پڑا ہوا ہے اس لئے قبول کر لیا ۔ اسی واسطے متقدمین نے کہا ہے

؎ خسرو غریب ست و گدا افتادہ در شہر شما

باشد کہ از بہر خدا سوئے غریباں بنگری

حق تعالیٰ کا یوں ہی رحم ہو جاتا ہے کہ کوئی اُن کے دروازہ پر جا پڑے اور اُن کی رضا کا طالب ہو

اپنی رضا کا طالب نہ ہو یہ ہے مذہب عشاق کا۔ حضرت حاجی صاحبؒ سے جب کوئی اس قسم کی شکایت کرتا کہ ذکر سے نفع (یعنی ذوق و شوق وغیرہ) نہیں معلوم ہوتا اُس وقت حضرت جو جواب دیتے اُن جوابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام وقت تھے وہ جواب یہ تھا کہ حضرت یوں فرماتے کہ میاں اللہ اللہ کرتے ہو شکر کرو حق

بلا بودے اگر ایں ہم نبودے

اگر یہ بھی نہ ہوتا تو کیا ہوتا یہ نفع کیا کم ہے جو اپنے ذکر کی انہوں نے توفیق دی ہے اور یہ شعر فرماتے تھے ؎

یابم اورا یا نیابم جستجوئے میکنم ‌ ‌ ‌ ‌ حاصل آید یا نیاید آرزوئے میکنم

ہمارا کام تو طلب ہے، دینا نہ دینا اُن کا کام ہے۔

میں نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے سنا کہ بندہ کا کام طلب ہے، وصول اُس کا کام نہیں وہ غیر اختیاری ہے۔ تم طلب پیدا کرو جو تمہارا کام ہے اُسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

آب کم جو تشنگی آور بدست ‌ ‌ ‌ ‌ تابجوشد آبت از بالا و پست

اور اُس کی وجہ کیا ہے ؎

تشنگان گر آب جویند از جہان ‌ ‌ ‌ ‌ آب ہم جوید بہ عالم تشنگان

یہ مت سمجھو کہ تم ہی کو اُن کی محبت ہے پہلے اُن کو تم سے محبت ہوئی پھر تم کو اُن سے محبت ہوئی ہے۔ آگے اُس کو صاف کر کے فرماتے ہیں ؎

ہر کہ عاشق دیدیش معشوق داں ‌ ‌ ‌ ‌ کو بہ نسبت ہست ہم ایں و ہم آں

لیکن ایک فرق ہے عاشق و معشوق کی طلب میں گو بظاہر دونوں ایک دوسرے کو تلاش کرتے ہیں وہ فرق یہ ہے کہ عاشق تلاش کرے تو ممکن ہے کہ معشوق نہ ملے مگر معشوق کی تلاش سے ممکن نہیں کہ عاشق نہ ملے۔ اسی لئے کسی نے کہا ہے ؎

خود بخود آں شہ ابرار بہ بر می آید　　نہ بزور و نہ بہ زاری نہ بزر می آید

مگر طلب ہونا شرط ہے ورنہ غیر طالب کے لئے تو یہ ارشاد ہے انلزمکموھا وانتم لھا کارھون اور اگر طلب ہے تو اس کے لئے یہ بشارت ہے من تقرب الی شبراً تقربت الیہ ذراعا الحدیث خدا کا وعدہ ہے کہ طالب پر اُدھر سے عنایت ہوتی ہے اگر اُن کی عنایت نہ ہو تو اُس کی قطع سے راستہ کبھی منقطع نہ ہو۔

میں اس کی ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ ایک بچہ ایک فرلانگ کے فاصلہ پر ہے ماں باپ اُس سے کہتے ہیں کہ چلو اور اپنے پاؤں سے مسافت طے کرو۔ وہ رو رہا ہے کہ ہم کو لے جاؤ یہ کہتے ہیں خود چلو تو اگر وہ اُن کے کہنے سے چلا اور قدم بڑھایا اور گر گیا تو وہ دوڑ کر خود ہاتھ پکڑ لیتے اور گود میں اٹھا لیتے ہیں یہ نہیں کہ وہ شفیق نہیں رحیم نہیں وہ شفیق بھی ہیں مگر چاہتے ہیں کہ چلنا اور گرنا دیکھیں۔ جہاں وہ چلا اور گرنے لگا تو پھر اُن سے رہا نہیں جاتا دوڑ کر گود میں اٹھا لیتے ہیں۔ ایسا ہی اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو دیکھتے ہیں کہ چلا یا نہیں؟ اگر نہیں چلا تو انلزمکموھا وانتم لھا کارھون اور اگر چلا تو من تقرب الیّ شبرا تقربتُ الیہ ذراعاً ومن تقرب الی ذراعا تقربت الیہ باعا الحدیث غرض وہ اگر دستگیری نہ فرمادیں تو یہ راستہ ہرگز منقطع نہ ہو اسی کو فرماتے ہیں ؎

نگردد قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدنہا
کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

یہ راستہ کسی کے ختم کئے ختم نہیں ہوتا بس خدا ہی کے ختم کرنے سے ختم ہوتا ہے اور وہ ختم جب کرتے ہیں کہ تمہارے اندر طلب دیکھیں۔

ایک بادشاہ کا قصہ ہے کہ بالاخانہ پر بیٹھا تھا دریچہ سے دیکھا کہ ایک درویش جا رہے ہیں اُن کو اپنے پاس بُلایا کہ کچھ دریافت کرنا ہے۔ بزرگ نے فرمایا میں کیوں

کر آؤں تم بلندی پر ہیں پستی میں اور محل شاہی کا دروازہ بہت دور بادشاہ نے فوراً ایک کمند لٹکا دی اور کہا اس کو پکڑ لیجئے پھر خود اُن کو اوپر کھینچ لیا جب وہ اوپر آ گئے تو پوچھا کہ آپ خدا تک کس طرح پہونچے فرمایا جیسے تم تک پہونچا اگر ہم کوشش کرتے اور تم نہ کھینچتے کسی طرح وصول نہ ہوتا تم نے کھینچ لیا تو ذرا سی دیر میں وصول ہو گیا۔ اسی طرح خداتعالٰے نے ایک کمند لٹکا دی ہے جو اُس کو پکڑ لیتا ہے اُس کو وہ خود کھینچ لیتے ہیں اور وہ کمند ہے قرآن جس کے بارہ میں ارشاد ہے واعتصموا بحبل اللہ جمیعا۔ خداتعالٰی اگر نہ کھینچتے تو وصول ممکن نہ تھا۔ بندہ کا کام کمند پکڑ لینا ہے کھینچنا اُن کا کام ہے بندے کا کام تلاش ہے وصول وہی عطا کریں گے۔ بہرحال اعمال سے نہ دنیوی نفع مطلوب ہے جیسا مدعیان عقل نے سمجھا اور نہ وہ باطنی احوال مطلوب ہیں جو موجود نہیں صرف ایک چیز مطلوب ہے جس کو لوگ مولویانہ بات سمجھتے ہیں یعنی رضا بس عمل کرتے رہو اور اُن کی رضا کو مطلوب سمجھو اسی طرح ایک دن عنایت متوجہ ہو جائے گی۔

اندریں رہ میتراش و میخراش ✿ تا دم آخر دمے فارغ مباش

تا دم آخر دمے آخر بود ✿ کہ عنایت با تو صاحب سر بود

طلب اور سعی کو مت چھوڑو سب کچھ حاصل ہو جاویگا۔ خلاصہ یہ ہے کہ میں یہ کہہ رہا تھا کہ احکام شرعیہ سے جو ثمرہ مقصود ہے اُس کا کامل ظہور تو ہوگا آخرت میں مگر حصول یہاں بھی ہوتا ہے اسی باب میں دو فرقے غلطی میں پڑ گئے ایک اہل دنیا کہ مقصود اُن کا دنیا ہے دوسرے غیر محقق اہل دین دونوں مختلف غلطیوں میں پڑ گئے جیسا مفصلاً مذکور ہوا اب ثابت ہو گیا کہ مقصود تمام احکام دینی سے صرف رضائے حق ہے لیکن اتفاق سے احکام دین ایسے واقع ہوئے ہیں کہ اُن سے منافع دنیوی بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ اہل اللہ کو دیکھو اُن کو دنیوی منافع بھی دنیا داروں سے زیادہ حاصل ہیں عیش و عشرت و مسرت جیسی اُن کو حاصل ہے دُنیا داروں کو اُس کی ہوا بھی نہیں لگی سو

اس سے ہم کو بھی انکار نہیں کہ احکام میں منافع دنیوی بھی ہیں چنانچہ میں نے احکام کے یہ دنیوی منافع بیان بھی کئے ہیں یعنی اس وعظ الاتمام لنعمتہ الاسلام کے پہلے دونوں حصوں میں مگر وہ منافع اس درجہ میں نہیں ہیں کہ اُن ہی کو مقصود بنایا جاوے ہاں منافع تابع ہیں۔

چنانچہ میں نے ایک جلسہ میں عقائد کے اور ایک جلسہ میں دیانات کے اور ایک جلسہ میں اخلاق کے محاسن ومنافع بتلائے ہیں صرف معاملات ومعاشرات کے کے منافع کا بیان باقی رہ گیا تھا آج ان دونوں کے متعلق بیان کا خیال تھا۔

تہذیب اخلاق

ہاں کل اخلاق کے متعلق یہ کہنا بھول گیا تھا کہ حکماء نے بھی اقرار کیا ہے کہ تہذیب اخلاق جیسی شریعت نے کی ہے اُس کے بعد کسی اور بیان کی ضرورت نہیں رہی چنانچہ مشاہدہ ہے حکماء کی کتابوں کو دیکھئے پھر قرآن وحدیث کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ تہذیب اخلاق میں شریعت نے اس قدر تدقیق کی ہے کہ حکماء اُس کی گرد کو بھی نہیں پہونچے چنانچہ شریعت میں طلب رضاء کی بھی تعلیم ہے جس کو فلاسفہ نے چھوا بھی نہیں۔ یہ رضا جڑ ہے سارے اخلاق کی اور جس کا ایک بیّن اور نقد نفع تو یہ ہے کہ جو خدا سے ہر حال میں راضی ہوگا اُس کو کبھی پریشانی اور ناگواری نہ ہوگی۔

یہ کتنی راحت ہے اس سے بڑھ کر اور کیا راحت ہوگی جیسا مشاہدہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ صاحب شریعت کو ہر چیز میں راحت ہے۔

حضرت بہلول نے کسی بزرگ سے دریافت کیا کہئے کیا حالت ہے کہا اُس شخص کی حالت کیا پوچھتے ہو کہ دنیا میں اُس کے خواہش کے خلاف کوئی کام نہیں ہوتا ظاہر ہے کہ وہ ہر وقت خوش رہیگا یہی میری حالت ہے حضرت بہلول نے کہا یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ کوئی ایسا شخص ہو کہ کوئی بات اُس کے خواہش کے خلاف

نہو۔ فرمایا یہ تو ظاہر ہے کہ کوئی کام بلا ارادہ حق نہیں ہوتا ہے۔ جو کچھ ہوتا ہے مشیت ایزدی سے ہوتا ہے پس اگر کسی نے اپنے ارادے کو خدا کے ارادے میں فنا کر دیا ہو تو جو کام خدا کی مشیت وارادہ کے موافق ہوگا وہ اُس کے ارادہ وخواہش کے موافق بھی ہوگا مثلاً یہ شخص بیمار ہو اور معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ کا یہی ارادہ ہے تو یہی اس شخص کی بھی . . . مرضی ہوگی یعنی وہ یہ سمجھے گا کہ اگر ہمارا بیمار ہونا خدا کو پسند ہے تو ہم کو بھی پسند ہے اس لئے کوئی کام دنیا میں اس شخص کی مرضی کے خلاف نہیں ہوگا یہ ہے رضا کی تعلیم جس میں بے شمار منافع ہیں۔

پھر شریعت نے اس میں بھی ایک دقیقہ رکھا ہے وہ یہ کہ رضا کے اختیار کرنے میں بھی دو طرح کی نیت ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ رضا اختیار کرنے سے راحت حاصل ہوتی ہے، حکمائے شریعت کہتے ہیں کہ یہ درجہ طلب رضا کا خفی شرک ہے کیونکہ یہ شخص طالب راحت ہے مقصود اس کا راحت ہے اور ظاہر ہے کہ راحت خدا نہیں بلکہ غیر خدا ہے تو یہ شخص غیر خدا کا طالب ہوا۔ اور ایک اس نیت سے رضا اختیار کرتا ہے کہ بندہ کے ذمہ خدا کا یہ حق ہے کہ وہ جو حکم کرے اُس پر بندہ راضی رہے سو یہ درجہ مطلوب ہے اور یہ شخص موحد کامل ہے مومن ہے عارف ہے اب تبلائیے ہے کوئی حکیم ارسطو۔ سقراط۔ بقراط اس دقیقہ کو سمجھنے والا؟ وہ تو اس گرد کو بھی نہیں پہونچے۔

دقائقِ شریعت

میں نے ایک حکایت دیکھی ہے ایک بزرگ دوسرے بزرگ کی زیارت کو گئے حجرہ سے باہر انکی آواز آرہی ہے انہوں نے کان لگا کر سنا تو وہ بزرگ پناہ مانگتے تھے لذت تفویض سے کہ مبادا ہم لذت کی وجہ سے تفویض ورضا اختیار کئے ہوئے ہوں۔ تبلاؤ اس دقیقہ کو کوئی حکیم سمجھ سکتا ہے؟

اور ایک حکایت ہے کہ جس سے ان محققین کی شانِ تدقیق معلوم ہوتی ہے ایک بزرگ قرآن شریف پڑھنے کے لئے بیٹھے پہلے اعوذ باللہ من الشیطن

الرجیم پڑھا اس کے بعد کہا اے شیطان تو خوش نہ ہونا کہ میں تجھ سے ڈرتا ہوں اس لئے پناہ مانگتا ہوں۔ نہیں نہیں ہرگز نہیں بلکہ محض خدا کا حکم بجا لانے کے لئے استعاذہ پڑھا ہے ورنہ میں تجھے اس قابل نہیں سمجھتا کہ تجھ سے ڈر کر پناہ مانگوں۔ خدا کے بغیر تو کیا کر سکتا ہے؟ تو ناز مت کرنا اور واقعی ایسے بزرگوں کا وہ کیا کر سکتا ہے انہ

لیس لہ سلطان علی الذین امنوا وعلی ربہم یتوکلون

غرض بزرگوں کی حکایات سے حیرت ہوتی ہے کہ کہاں تک انکی نظر پہونچی ہے امام غزالی کی ایک تدقیق یاد آگئی ہے انہوں نے اپنی کسی کتاب میں لکھا ہے کہ ریاء مذموم کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ بندہ خدا سے ریاء کرے سبحان اللہ یہ حضرات کیا غائر النظر ہیں اور خدا سے ریاء کی صورت یہ لکھی ہے کہ ایک شخص خلوت میں تو نماز پڑھتا ہے جلدی جلدی اور جلوت میں لمبی۔ پھر ایک دفعہ خیال ہوا کہ اللہ میاں کیا کہیں گے کہ خلوت میں تو تقصیر کرتا ہے اور جلوت میں تطویل۔ آپ نے تنہائی میں بھی لمبی لمبی نماز شروع کر دی تو اس شخص کا مقصود خدا کے لئے تطویل صلوٰۃ نہیں ہے بلکہ مخلوق کے لئے ہے دراصل اس کو تطویل جلوت ہی میں مقصود ہے مگر اس خیال سے کہ خدا تعالیٰ یوں نہ کہیں کہ ہمارے لئے تطویل نہیں کرتا ہے اس لئے خلوت میں بھی تطویل اختیار کی تاکہ جلوت میں تطویل کر سکے سو یہ کتنا بڑا خداع ہے ایسے ہی مخادعین کے حق میں کہا گیا ہے ؎

زنہار ازیں قوم نباشی کہ فریبند ۔۔۔ حق را بسجودے و نبی را بدرودے

تو کیا یہ علم کسی فلسفی کے پاس ہے جو غزالی کے پاس ہے ہرگز نہیں اور یہ انہوں نے شریعت ہی سے سمجھا ہے۔ شریعت کے احکام پر قربان جایئے اُس میں وہ دقائق و اسرار ہیں جو کسی حکیم کے یہاں نہیں۔ افلاطون کو کسی نے خواب میں دیکھا پوچھا حکماء کون کون ہیں اور کچھ حکماء کے نام گنوائے کہا یہ کچھ بھی نہیں وہ دیوانے کیا جانیں کہ حکمت کیا چیز ہے پھر اہل حق میں سے کسی کا نام لیا تو کہا اولئک ھم الفلاسفۃ حقاً

واقعی فلسفی یہ ہیں مگر اب ہماری کیا حالت ہے اپنے گھر کی خبر نہیں دوسروں کے پیچھے پھرتے ہیں اور اُن ہی سے علوم و تہذیب کو حاصل کرنا چاہتے ہیں حالانکہ وہ سب تمہارے گھر کے فقیر ہیں اس باب میں ہماری وہی مثال ہے ؎

یک سبد پُر نان ترا بر فرق سر — تو ہمی جوئی لب نان در بدر

ٹوکرہ روٹیوں کا سر پر رکھا ہوا ہے اور بھیک مانگتے پھرتے ہیں ؎

یک سبد پر نان ترا بر فرق سر — تو ہمی جوئی لب نان در بدر
تا بہ زانوئی میاں قعرِ آب — وز عطش وز جوع گشتی خراب

یعنی گھٹنے تک پانی میں ڈوبے ہوئے ہیں اور ہائے پانی ہائے پانی اور ہائے روٹی ہائے روٹی پکار رہے ہیں۔ ارے اوپر دیکھ روٹی کا ٹوکرہ سر پر ہے اور نیچے دیکھ پانی ہے ہمارے گھر میں اتنی بڑی دولت ہے پھر بھی ہم دوسروں پر حسرت کرتے ہیں تف ہے ہماری اوقات پر۔ کل میں یہ بات کہنا بھول گیا تھا آج اُس کو بیان کر دیا۔

محاسن معاملہ و معاشرت

میں نے ابھی کہا ہے کہ عقائد و دیانات واخلاق کے مصالح تو بیان ہو چکے ہیں معاشرت ومعاملات کا بیان رہ گیا تو آج معاشرت و معاملات کے حکم اور مصالح کا بیان ہونا چاہیئے اور ان دونوں میں ایک وجہ جامع بھی موجود تھی کہ دونوں کا تعلق عباد کے ساتھ ہے چنانچہ آج یہی ارادہ تھا کہ ان کا بیان استیعاب کیساتھ ہو جائے گو قدرے بیان مجملاً ہو بھی چکا ہے مگر تمہید اتنی لمبی ہو گئی کہ اس میں وقت زیادہ گذر گیا پھر ایک اور کام نکاح کا بھی ہے لہٰذا آج بھی استیعاباً اس کا بیان نہ ہو سکے گا اور گو استیعاباً تو پہلے بھی نہ ہوتا مگر اجمال کے مقابلہ میں کچھ تفصیل ہوتی مگر چونکہ تمہید میں بہت وقت گذر گیا ہے لہٰذا اب مختصراً بیان ہو گا۔

تو سمجھو کہ معاملات و معاشرات کے سارے احکام کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی سے

کسی کو ایذاء و ضرر نہ ہو خواہ جانی ہو یا مالی۔ اس کا لحاظ شریعت میں کمال درجہ پر کیا گیا ہے چنانچہ کتب فقہ میں لکھتے ہیں کہ تجارت میں کسی کو دھوکا نہ ہونا چاہیے اور لکھتے ہیں بائع مبیع کے عیوب نہ چھپائے تو دیکھئے اس راست گوئی میں دنیا کا کتنا نفع ہے۔

کانپور میں ایک بانس منڈی ہے بہت سے بانس بیچنے والے اس میں تجارت کرتے تھے ان میں سے ایک شخص ایسا سچا تھا کہ اس سے جس بانس کے متعلق دریافت کیا جاتا کہ یہ کتنے دن چلے گا وہ صاف کہہ دیتا کہ دو برس یا ایک برس یا چھ ماہ اسی طرح کہہ دیا کرتا مگر دوسرے دکاندار اپنے مال کی نسبت یہ کہہ دیتے کہ یہ مدت دراز تک چلے گا گویا اسرافیل علیہ السلام کے صور پھونکنے تک رہیگا اس وجہ سے اوروں کی دکان پر خوب بکری ہوتی تھی اور ان کے یہاں بہت کم۔ بعضوں نے اس سے کہا کہ اس طرح کہنے سے مال بکیگا نہیں وہ جواب دیتا تھا کہ بکے یا نہ بکے میں اپنے مالک کو ناراض نہ کروں گا جھوٹ نہیں بولوں گا۔

آنکس کہ ترا شناخت جاں راچہ کند فرزند و عیال و خانماں راچہ کند

غرض بلائے عشق نے اس کو مجبور کیا سچ بولنے پر مگر اس کے یہاں کچھ بکری نہ ہوتی تھی یوں ہی بیٹھا رہتا لیکن کچھ دنوں کے بعد قسمت نے پلٹا کھایا لوگوں نے جو تجربہ کیا تو دوسرے دکانداروں کی تعریف کے موافق مال نہ پایا خراب بانس نکلے اور جتنے دن کہہ دیتے اس سے بھی کچھ زیادہ ہی چلتا اب خریدار جو گرے ان کی دکان پر تو بے چارے کو کام سے فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ غرض سچ بولنے سے برکت ہوتی ہے۔ چند دن تو نقصان معلوم ہوتا ہے مگر بعد میں نفع ہی نفع ہوتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ اگر مال میں عیب ہو تو صاف کہہ دے کہ اس میں یہ کھوٹ ہے۔ اس سے برکت ہوتی ہے فان بینا وصدقا بورک لھما وان کذبا وکتما محقت برکتھما

اگر عیب کو چھپایا یا جھوٹ بولا برکت مٹ جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کماتے

ہیں مگر برکت نہیں دیکھتے۔ یہ ایک چھوٹا سا دستور العمل ہے دین کا۔ دیکھئے اس میں کتنا نفع ہے دنیا کا۔

اسی طرح کسی معاملہ میں بھی دھوکا نہ ہونا چاہیئے۔ بات ٹھی ہو تو اس میں بھی دھوکا نہ ہو۔ شریعت نے اس دھوکے سے روکنے کا اس قدر اہتمام کیا ہے کہ بعض مواقع پر قصداً کسی کی طرف سے دھوکا تو نہ تھا مگر واقع میں دوسرے کا ضرر تھا اور اس کو خبر بھی نہیں تھی کہ مجھ پر ظلم کیا جا رہا ہے تو یہ ایک درجہ دھوکا کا بہت خفی تھا بلکہ وہ اپنے اس ضرر پر راضی بھی تھا مگر شریعت نے اس سے بھی منع کر دیا جیسے سود۔ اس میں چونکہ فی الواقع ضرر اور ظلم ہے اس لئے منع کر دیا گیا گو متعاقدین اس پر راضی تھے۔ سبحان اللہ کس قدر شفقت ہے شریعت کی جیسے بچہ سانپ پکڑنا چاہتا ہے تو ماں باپ اس سے روکتے ہیں۔ حالانکہ بچہ تو خوشی سے پکڑتا ہے کیونکہ وہ ضرر سے واقف نہیں اس لئے پکڑتا ہے۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ ماں باپ نے بیچ میں ٹانگ کیوں اڑائی ؟ اس کو منع کیوں کرتے ہیں پکڑنا چاہتا ہے پکڑنے دیں۔ تو اس سے یہی کہا جائیگا کہ بات یہ ہے کہ ان کو بچہ سے محبت ہے اس لئے روکتے ہیں تاکہ اس کا ضرر نہ ہو۔ ایسے ہی خدا کو تم سے محبت ہے اس لئے جو چیز تمہارے لئے مضر ہے اس سے منع کرتے ہیں اگرچہ اس کے ضرر کی تمہیں خبر بھی نہیں۔

ایک قصہ مشہور ہے کسی کا جوان لڑکا دھوپ میں کھڑا تھا باپ نے کہا بھائی سایہ میں آجاؤ کئی دفعہ کہا مگر وہ آتا نہیں تھا آخر جب دیکھا کہ وہ آتا نہیں تو اس نے خود اس کے بچہ کو اٹھا کر دھوپ میں دھر دیا اب تو آپ چلانے لگے کہ اس کو دھوپ سے الگ لے جاؤ۔ باپ نے کہا کہ جو نسبت اس کو تجھ سے ہے وہی نسبت تجھ کو مجھ سے ہے اسی طرح میں بھی تڑپ گیا تھا تو دیکھئے یہ نوجوان اپنے ضرر پر راضی تھا مگر باپ کو گوارا نہیں ہوا اسی طرح سود دینے اور لینے پر آپ گو راضی ہوں مگر وہ روکتے ہیں ان کو معلوم

ہے کہ اس میں ضرر ہے اور واقعی سود کا ضرر بہت ہے۔

میرے ایک دوست نے سترہ سو روپیہ سودی لئے تھے اور یہ سب ہماری غفلت عن الاحکام کا نتیجہ ہے اور بے فکری کا اگر شریعت کے پابند ہوتے تو اول تو سودی قرض لیتے ہی کیوں؟ اور اگر لیا تھا تو جلد سے جلد ادا کرنے کا اہتمام ہوتا مگر اب تو مسلمانوں میں غفلت ہے، نوابی ہے اور وہ مہاجن بولتا نہیں وہ تو دل سے چاہتا ہے کہ بیس برس دس برس تک قرض وصول نہ ہو تو اچھا ہے غرض تھوڑی مدت میں سود در سود ملکر چالیس ہزار ہوگیا جس میں سب جائیداد نیلام ہوگئی۔ ان حضرت کو ایک اور بھی خبط تھا کہ اتنے روپیہ کے تو مقروض لیکن کہیں کوئی جائیداد بکتی تو فوراً خرید لیتے وہ بھی قرض لے کر۔ اگر کہا جاتا کہ قرض لے کر کیوں خریدتے ہو؟ جواب ملتا ہے ارے جائیداد ہمیشہ نہیں ملتی پھر سب اسی قرض میں اڑادی۔

اس جواب پر ایک مشہور قصہ یاد آگیا ایک بزرگ کرایہ کی بہلی میں جونپور سے دہلی گئے۔ وہاں پہونچکر بہلی والے سے پوچھا کہ یہاں سے واپسی میں کتنے کرایہ پر جاؤگے معلوم ہوا کہ جتنے میں آئی ہے اس سے آدھا کرایہ لے کر چلا جائیگا آپ اسی وقت جونپور واپس آگئے کہ شاید پھر اتنے کرایہ پر گاڑی ملے یا نہ ملے۔ یہی اس جواب کا رنگ ہے کہ اب جائیداد سستی ملتی ہے خرید لو۔ مسلمانوں کا اس بے فکری نے ناس کردیا۔ اس ضرر کو دیکھ کر شریعت نے سود کو حرام کردیا۔

اور سنیئے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر ایک جائیداد بیچنا چاہتے ہو تو اس کی قیمت سے دوسری جائیداد خرید لو ورنہ اس روپیہ میں برکت نہ ہوگی۔ کیونکہ نقد میں برکت نہیں ہوتی خرچ ہوجاتا ہے۔ دیکھئے شریعت نے ہماری دنیوی راحت کی کتنی رعایت کی کہ جائیداد بیچنے سے منع بھی نہیں کیا کیونکہ بعض دفعہ ایک جائیداد سے نفع نہیں ہوتا تو اس کی تو اجازت دی کہ بیچ دو مگر ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ جلد سے

کرو اور اس رقم سے دوسری جائیداد خرید لو یہ نہ کرو کہ جائیداد بیچ کر تجارت کرنے لگو کہ اس میں نفع زیادہ ہوگا شریعت نے اس میں دست اندازی اس لئے کی کہ اس میں بقاء کی صورت ہے جائیداد کو کوئی چور چرا نہیں سکتا اور یوں جائیداد بیچ کر روپیہ سے تجارت کی جاوے یا گھر میں رکھا جاوے تو اس میں خوف ہے نقصان کا بھی اور چوری کا بھی۔ چنانچہ ایک مقام پر ایسا واقعہ ہوا ہے۔ ایک مہاجن آدمی نے جائیداد بیچ کر کھدر کا کارخانہ کھولا۔ کپڑا بننے کا۔ تو ان حضرت نے چار ہزار کی جائیداد بیچی اور ایک ہزار سے کام شروع کیا تین ہزار گھر رکھے۔ جب کھدر کا زور شور کم ہوا کھدر میں تو یوں نقصان ہوا اور روپیہ چور لے گئے نہ جائیداد رہی نہ روپیہ رہا۔

وہی حال ہوا جیسے کسی چور کا قصہ ہے کہ ایک گھوڑا بہت قیمتی چرا کر لایا تھا ایک چور اس کے پیچھے بھی لگ گیا نے سن کر اس کے پاس آیا کہ گھوڑا بیچتے ہو کہا ہاں اس نے کہا اچھا ذرا میں سوار ہو کر دیکھ لوں کہا دیکھ لو۔ اس نے اپنے جوتے تو اس کے حوالہ کئے اور سوار ہو کر کچھ دور گیا پھر چلا آیا تاکہ اس کو شبہ نہ ہو۔ پھر کچھ دور گیا اور چلا آیا تیسری مرتبہ پھر کچھ دور گیا اور ایسا غائب ہوا کہ پھر پتہ ہی نہ دیا اب آپ اس کی جوتیاں لے کر گھر واپس آئے کسی نے پوچھا وہ گھوڑا کتنے میں دیدیا کہا جتنے میں لیا تھا اتنے ہی میں دے دیا یہ جوتیاں نفع میں ہیں۔

اسی طرح یہاں سب برابر ہو گیا اور کھڈیاں نفع میں رہ گئیں اور پھر بھی فرق ہے کہ وہاں تو مفت کا گھوڑا تھا مگر یہاں تو مول کی چیزیں اور روپیہ بھی جائیداد بیچ کر آیا تھا غرض نہ جائیداد ہی رہی نہ روپیہ رہا تو حضور ﷺ نے ہماری راحت کی کتنی رعایت کی ہے فرماتے ہیں کہ اگر ایک جائیداد بیچو تو دوسری جائیداد جلد خرید لو اور معاملات و معاشرت میں سے باب سفر کو دیکھو چنانچہ آداب سفر میں سے ایک یہ ہے کہ سفر میں چار آدمیوں کا ساتھ ہونا چاہیئے علماء نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اگر اس سے کم

ہوں گے تو دو ہوں گے یا تین اگر دو ہوں تو اس میں یہ خرابی ہے کہ ایک کسی کام کو گیا دوسرا تنہا بیٹھے گھبرائیگا بھی اگر تین ہوں تو اس میں بھی بعض اوقات ایک تنہا ہوگا اور اگر چار ہوں گے تو ہر طرف دو دو ہوں گے گھبراہٹ کی کوئی بات نہیں ہوگی سچ جانیئے اگر عمر بھر کے تجربے جمع کئے جائیں تو وہ باتیں سمجھ میں نہیں آویں گی جو شریعت نے ملحوظ رکھی ہیں کیونکہ اس کی تعلیم تو اور ہی جگہ سے ہے علمنی ربی فاحسن تعلیمی وادبنی ربی فاحسن تادیبی اور سنیئے معاشرت میں ایک ادب یہ ہے کہ اگر تین آدمی ہوں تو دو شخص باہم سرگوشی نہ کریں کیونکہ تیسرا کبیدہ خاطر ہوگا کہ مجھ ہی سے اخفا مقصود ہے اور اگر چار آدمی ہوں تو دو کی سرگوشی میں تیسرا شخص یہ سمجھ سکتا ہے کہ شاید مجھ سے چھپاتا نہیں دوسرے سے چھپاتا ہو رنجیدگی نہ ہوگی ایک میرا واقعہ اسی طرح کا ہے۔

میرے پاس ایک نائب تحصیلدار آئے ان کو اپنے بچہ کی تعلیم کے لئے مدرس کی ضرورت تھی۔ مجھ سے تجویز کرنے کی درخواست کی مجھ سے یہ حماقت ہوئی کہ میں نے ایک مولوی صاحب سے جو مجھ سے پڑھتے تھے اس کے متعلق عربی میں گفتگو شروع کی تھوڑی ہی گفتگو کرنے پایا تھا کہ نائب صاحب نے کہا عربی میں بات کرنے سے معلوم ہوتا ہے شاید آپ مجھ سے مخفی رکھنا چاہتے ہیں سو میں عربی سمجھتا ہوں آپ اجازت دیجئے میں یہاں سے اٹھ جاؤں۔ میں بہت شرمندہ ہوا اور کہا ایسے مہذب سے میں کوئی راز مخفی نہیں رکھنا چاہتا غرض ناواقف کے سامنے دو آدمیوں کا عربی میں کلام کرنا بھی اسی ممانعت میں داخل ہے۔

نیز انہوں نے اس حدیث کو بھی سمجھا کہ اگر دو آدمی پوشیدہ باتیں کرتے ہوں تو کسی کو ان کی باتوں پر کان نہ لگانا چاہیئے فرمائیے کس قدر تدقیق ہے۔ غرض شریعت کا ایک ایک باب کھولو اور اس کے منافع و محاسن کو دیکھو تو خود فیصلہ کر لوگے کہ احکام

شرع میں جو جو خوبیاں اور منافع ہیں اور کسی میں نہیں ہیں۔

شریعت و غیر شریعت میں فرق

اگر تمہاری سمجھ میں شرع اور غیر شرع کا فرق نہ آوے تو ایک طریقہ فرق معلوم کرنے کا میں بتلاتا ہوں اور وہ بہت موٹی بات ہے وہ یہ کہ شرع کے خلاف تو بہت دفعہ کام کیا ہوگا ایک بار شریعت کے موافق بھی عمل کر لو تو ان دونوں میں رات دن کا فرق محسوس ہوگا۔ خلاصہ یہ ہے کہ اسلام میں ایسے احکام ہیں کہ اُن کے اندر دنیوی راحت اور خوبی بھی ہے جب نعمت اسلام ایسی چیز ہے تو تم خود بھی اُس پر عمل کرو اور دوسروں کو بھی ترغیب دو یہی عمل مقصود ہے اس امتنان سے الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی۔ اب میں بیان کو ختم کرتا ہوں اور مطلع کرتا ہوں کہ خداوند تعالےٰ نے ہم کو بہت بڑی نعمت دی ہے ہم کو اس کی قدر کرنی چاہیئے اور اس سے نفع حاصل کرنا چاہیئے

محاسن نکاح

میں نے درمیان میں آپ کو مطلع کیا تھا کہ ایک نکاح ہوگا کہ سب صاحب ٹھہریں اور معلوم کریں کہ شریعت کی تعلیم اس کے متعلق بھی کتنی راحت کی ہے برخلاف اُن رسوم کے جو ہم نے ایجاد کی ہیں کہ ان میں کتنی مشکلات ہیں۔ دیکھیئے نکاح کتنا مختصر ہے کوئی چیز ایسی مختصر نہیں ہے۔ سب چیزوں میں پیسہ لگتا ہے مگر اس میں ایک پیسہ بھی صرف نہیں ہوتا آدمی کو سب سے پہلے رہنے کے لئے مکان کی ضرورت ہے دیکھیئے اس میں پیسہ لگتا ہے پھر کھانے میں بھی پھر پینے میں بھی یعنی پانی تو سقے سے منگاتے ہیں مگر سقہ کو پیسے دینے پڑتے ہیں لیکن نکاح میں ایک پیسہ بھی نہیں لگتا کیونکہ نکاح کا رکن ہے ایجاب قبول۔ صرف زبان سے دو لفظ کہنا اس میں کیا لگا۔ اگر کہو کہ نکاح میں لگتا کیوں نہیں؟ چھوہارے تقسیم ہوتے ہیں اور مہر میں تو پیسہ ہی پیسہ لگتا ہے؟

جواب یہ ہے کہ جھوہار تقسیم کرنا واجب نہیں، رہا مہر سو مہر اکثر ادھار ہوتا ہے اصل چیز جس سے مفر نہیں وہ عقد ہے اور عقد نکاح میں تو ایک پیسہ کا بھی خرچ نہیں البتہ عرب میں مہر فوراً دینا پڑتا ہے مگر یہاں تو کچھ نہیں ہاں جائیداد نیلام ہو تب مہر کا پتہ لگتا ہے پہلے سے کچھ بھی خبر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل مہر بہت زیادہ باندھتے ہیں کیونکہ دینا تو ہی نہیں اور یہ تکثیر مہر عادۃ عامہ ہو گئی ہے۔ میں نے ایک جگہ سنا تھا کہ مہر سوا سیر کودوں ہوتا ہے ہم نے سمجھا بڑا ارزاں ہے بعد میں معلوم ہوا کہ مقصود اس سے سوا سیر کودوں کے دانوں کی گنتی کی برابر روپیہ ہے۔ ایک جگہ سنا کہ دس مٹکے کھٹمل پسو مچھر میں نے کہا اگر بادشاہ بھی جمع کرے تو وہ بھی اتنے پسو مچھر جمع نہ کر سکے۔ غرض ایسا مہر مقرر کرتے ہیں کہ وہ دے ہی نہ سکے ہمیشہ شیطان کے پنجے میں پھنسا رہے اور بعض جگہ ڈیڑھ لاکھ سوا لاکھ مہر مقرر کرتے ہیں جیسا ہمارے قریب میں ایک قصبہ افغانوں کا ہے وہاں یہی دستور ہے۔ حالانکہ حدیث میں ہے کہ سب سے زیادہ برکت اس نکاح میں ہے جس میں مہر کم ہو۔

رہا ولیمہ سو وہ بھی سنت ہے واجب و فرض نہیں پھر وہ نکاح کے بعد کا قصہ ہے اور ولیمہ بھی پہلے زمانہ میں سنت تھا۔

رسوم تفاخر

باقی اس وقت جو اکثر رسمی ولیمہ ہوتا ہے وہ محض تفاخر کے لئے ہے اس میں روپیہ بالکل برباد ہی جاتا ہے اور غور کیا جائے تو بھاری زیادہ روپیہ تفاخر ہی میں برباد ہوتا ہے حتیٰ کہ حیرت ہے کہ آج کل مرنے میں بھی فخر کا اہتمام ہے۔ میں نے حضرت مولانا دیوبندیؒ سے سنا تھا۔۔۔ کسی کتاب سے نقل فرمایا کہ ایک قبر پر لکھا تھا اے شخص عبرت حاصل کر میں ایسے شخص کا بیٹا ہوں جس کے قبضے میں ہوائیں ہیں میں نے سمجھا یہ شخص حضرت سلیمان علیہ السلام کی اولاد میں سے ہوگا مگر اس کے قریب ہی دوسری قبر پر لکھا تھا اے ناظر دھوکہ میں نہ

بڑا نایہ لوہار کا بیٹا تھا۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے مردوں میں بڑائی اور تفاخر اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا خیر یہ فخر تو کسی زندہ کی تفریح تھی مگر موت کے متعلق واقعی فخر کا قصہ بھی بعض مقامات پر واقع ہوتا ہے چنانچہ فخر بہت کرے قبر تک پہنچ گئے۔ کیرانہ کا قصہ ہے کہ ایک گوجر بہت بڈھا تھا وہ بیمار ہوا اُس کا بیٹا حکیم کے پاس آیا اور کہنے لگا جی حکیم جی جس طرح ہو اب کی دفعہ تو میرے باپ کو اچھا ہی کردو۔ پھر کہنے لگا اس کے مرنے کا تو غم نہیں غم اس کا ہے۔ اس سال چاول بہت مہنگا ہے اگر بڈھا مر گیا تو برادری کو کہاں سے کھلاؤں گا؟ اللہ اللہ کس قدر معاشرت بگڑی ہے کہ مُردے کا تو غم نہیں زندوں کا غم ہے کہ وہ جو چڑھائی کریں گے اُن کو کھلانا پڑیگا اس کے لئے روپیہ کی ضرورت ہوگی۔

ایسے تفاخر کا علاج ضلع بلند شہر میں ایک رئیس زادہ نے خوب کیا تھا۔ میں نے یہ قصہ سنا ہے اس رئیس زادہ کو دیکھا نہیں۔ قصہ یہ ہے کہ ان کے باپ کا انتقال ہوا۔ برادری کے لوگ جمع ہوئے۔ لڑکے نے سب لوگوں کی دعوت کی۔ بڑی تعظیم و توقیر سے مہمانوں کو رکھا اور ایک بڑے خیمہ میں کھانے کا اہتمام کیا گیا جب مہمان جمع ہو گئے اور کھانا دسترخوان پر چُنا گیا تو رئیس زادے صاحب تشریف لائے اور کہا صاحبو! کھانے کے قبل مجھے کچھ عرض کرنا ہے سب صاحب ذرا غور سے سنئیں۔ آپ کو خوب معلوم ہے کہ آپ حضرات کس تقریب میں تشریف لائے ہیں وہ یہ کہ میرے والد صاحب کا انتقال ہوا ہے اور والد کے فوت ہونے سے اولاد کو جو صدمہ ہوتا ہے اُس کو آپ بھی خوب جانتے ہیں اب انصاف سے کہئے کہ صدمہ زدہ کا کیا حق ہے آیا ہمدردی کرنا یا آستین چڑھا چڑھا کر کھانے کو اُس کے گھر آپڑنا۔ تمہیں کھانے کے لئے تیار ہو کر بیٹھنے پر شرم بھی آئی؟ بس میری گذارش ختم ہوگئی اب بسم اللہ کر کے کھانا شروع کیجئے اب لوگ کیا شروع کرتے سب کھڑے ہو گئے اور الگ بیٹھ کر عقلاء نے مشورہ کر کے اس رسم کو بالکل موقوف کر دیا اور کہا کہ لڑکے نے بالکل ٹھیک کہا سب دستخط کرو کہ

آئندہ یہ رسم نہ ہو اس کو اٹھاؤ۔ آئے تو تھے قورمہ پلاؤ کھانے اب بے کھانا کھائے چلے گئے اُس نے بھی کھانے پر اصرار نہ کیا بلکہ غرباء کو بلایا اور اُن کو وہ سب عمدہ کھانا کھلا دیا جو اُن کے باپ دادوں نے بھی نہ کھایا ہوگا۔ اُن لوگوں نے دعائیں دیں۔ ایک شخص نے اس رئیس زادہ سے کہا کہ تم کو یہ کرنا تھا تو کھانا ہی نہ پکواتے یہ کیا کہ کھانا تیار کرایا اور نہیں کھلایا اُس نے کہا کہ اگر پہلے سے ایسا کرتا تو یہ کم بخت مجھے کنجوس کہتے کہ اس نے اپنی غرض کے واسطے شرع کو آڑ بنایا نیز یہ کہ مجھے تو کھلانا مقصود تھا مگر اُن کو نہیں بلکہ غرباء کو۔ بھلا غرباء کیلئے ایسے کھانے کہاں پکتے غرض اب تو موت میں بھی فخر ہے جب موت میں فخر ہے تو شادی میں تو کیا کچھ نہ ہوگا لوگ کہتے ہیں کہ شادی بیاہ میں پہلے رسمیں تھیں اب کہاں؟ مگر میں کہتا ہوں کہ اب شرک کی رسوم تو کم ہو گئی ہیں مگر تفاخر کی رسوم اب تک موجود ہیں بلکہ زیادہ ہو گئیں یعنی اب وہ رسوم تو نہیں ہیں جن میں کفر و شرک تھا مگر تفاخر کی رسم موجود ہے بلکہ اور زیادہ فرعونیت ہے۔ ہر ایک شادی میں غریبوں کے یہاں بھی اتنے جوڑے ہوتے ہیں جو پہلے رئیسوں کو بھی میسر نہ ہوتے تھے۔

پہلے زمانہ میں ہمارے یہاں ایک رئیس تھے اُن کے یہاں کچھ مراد آبادی برتن تھے سب لوگ شادی میں اُن کے یہاں سے مانگ کر لاتے تھے اب تو یہ حالت ہے کہ ہر شخص ریشمی جوڑے تیار کرتا ہے جس میں گوٹہ لچکہ ٹھپہ کناری سب کچھ ہوتا ہے اور اُس وقت تو خرید لیا پھر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُسے دیمک کھاتی ہے۔

شادی و غمی میں اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

ہم کہتے ہیں کہ جب ہم غلامان رسول ہیں اور حق تعالیٰ نے فرمایا لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ آپ ہمارے لئے نمونہ ہیں تو جس طرح آپ قولاً نمونہ ہیں ایسے ہی فعلاً بھی آپ نمونہ ہیں خوشی میں بھی نمونہ ہیں اور غمی میں بھی خوشی آپ نے کی یعنی نکاح کیا اور غمی بھی کی۔ اللہ میاں نے سب

واقع کر کے دکھلا دیا تاکہ امت کو معلوم ہو کہ جیسے رسول نے کیا ہے ہم کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیئے چنانچہ جب آپ کے صاحبزادہ حضرت ابراہیم کا انتقال ہوا تو نہ کوئی مجمع ہوا نہ کوئی رویا نہ چلایا آنسو البتہ خود آپ کے بھی نکلے اتنی اجازت تھی آپ نے یہ بھی فرمایا تھا انا بفراقک یا ابراھیم لمحزونون یہ تو آپ نے غمی کر کے دکھلائی اور شادی کر کے اس طرح دکھلائی کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح ہوا اس میں نہ نائی خط لیکر آیا نہ ڈومنی آئی خود دولہا صاحب آئے اور انہوں نے خواستگاری کی اس میں نہ نشانی تھی نہ انگوٹھی نہ خط نہ شکرانہ نہ نائی کو روپیہ دیا جیسا آج کل جب نائی دولہن کی طرف سے بیاہ کی تاریخ کا خط لاتا ہے تو اس کے سامنے سو دو سو روپے پیش کئے جاتے ہیں اور وہ دو سو روپیہ میں سے ایک اٹھا لیتا ہے مگر جب اس کو ایک یا دو ہی دینا ہے تو اتنی رقم دکھلانا محض مکر و فریب ہے مگر مکر بھی نہیں کیونکہ ساری برادری کو معلوم ہے کہ ساری رقم دینی مقصود نہیں تو پھر یہ لغو حرکت نہیں اور کیا ہے؟ ہم تو جب جانیں کہ وہ سب لے لے اور آپ اس سے خوشی سے کہہ دیں کہ بھائی سب لے جا تیری ساری عمر کے لئے کافی ہے مگر وہ بے چارہ بھی مجبور ہے ایک دو سے زیادہ لے ہی نہیں سکتا۔ پھر برادری کو جمع کیا جاتا ہے کہ نائی کو شکرانہ کھلا دکیا اس کے منہ میں لقمے دیں گے نہیں بلکہ لقمے گنتے ہیں مگر وہ ایسا بہادر بلکہ بے حیا کہ سب کے سامنے بے تکلف کھا لیتا ہے خوب مشاق ہے یہ کیا فضول اور بے ہودہ رسم ہے۔

ہم ایک شادی میں دولہا کے سرپرست بن کر گئے تھے اور یہ پہلے سے قرار پا گیا تھا کہ کوئی رسم نہ ہوگی خیر عصر کے بعد نکاح تو ہو گیا اور مغرب کے بعد کھانا آیا تو نائی ہاتھ دھلا کر منتظر تھا کہ اب کچھ ملیگا مگر کچھ بھی نہ ملا کھانے کے بعد پھر منتظر رہا آخر ایک طباق میرے سامنے رکھ کر زبان سے کہا حضور ہمارا حق دیجئے۔ ہم نے کہا کہ کیسا حق قانونی حق یا رسمی۔ میاں نے کہا اپنے آقا سے کہو انہوں نے تمام رسموں کے بند ہونے کو

کیوں منظور کر لیا تھا اُس وقت ایک مولوی صاحب بھی کھانے میں تھے انہوں نے آہستہ سے کہا یہ تو رسم نہیں ہے بلکہ حق خدمت ہے۔ خدمت گذار کو تو دینا مستحسن ہے مگر میں نے بلند آواز سے کہا کہ حق خدمت اپنے خادم کو دیا جاتا ہے یا دنیا بھر کے خادموں کو میرے نائی نے میری خدمت کی اس کو اگر ہم کچھ دیں تو اُس کا حق ہو سکتا ہے دوسرے کے خدمت گذار کا ہم پر کیا حق ہے " اس تقریر سے مولوی صاحب کی آنکھیں کھل گئیں۔ خدا خدا کر کے رات گذری صبح ہوئی تو فرد خرچ کے متعلق گفت و شنید ہوئی اہل رسوم میں ایک فرد ہوتی ہے کمینوں کی جس میں اُن کا نیگ لکھا ہوا ہوتا ہے مگر کسی کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ ہمارے سامنے پیش کرے۔ میرے ایک دوست تھے اُن کے ذریعہ سے پیش ہوئی انہوں نے کہا اس میں کیا رائے ہے میں نے کہا وہی رات کی رائے اور میں یہ بھی کہا کرتا ہوں کہ لوگوں کو شرم نہیں آتی فرد پیش کرتے ہوئے کہ نائی سے خود اپنا کام تو کرایا سقے سے پانی بھرایا اور اُجرت دیں ہم۔ اپنے مہمان سے اُجرت دلانا کس قدر بے غیرتی کی بات ہے۔ مگر ان رسموں کی پابندی میں عقل تو رخصت ہوئی ہی تھی غیرت بھی جاتی رہی۔ اب وقت آیا رخصتی کا۔ لڑکی والوں نے تقاضا کیا کہ پالکی یا میانہ لاؤ ہم رخصتی بدون پالکی یا ڈولہ کے نہ کریں گے میں نے کہا ہم رخصتی ہی نہیں چاہتے ساتھیوں نے کہا کیا رائے ہے کیا کرنا چاہیئے میں نے کہا رائے یہ ہے کیونکہ نکاح تو ہو ہی چکا ہم اپنے گھر جاتے ہیں تم خود دلہن کو ہمارے پیچھے پیچھے لاؤ گے اب تو سیدھے ہو گئے پھر کہنے لگے جہیز کے لئے جھگڑا لاؤ میں نے کہا ہم جہیز ہی نہیں لے جاتے آخر جھگڑا بھی خود لائے عورتیں کوستی رہیں مگر ہم مظلوم تھے ظالم کے کوسنے سے مظلوم کا نقصان نہیں ہوتا۔ غرض ایسی برکت کا نکاح ہوا کہ دونوں طرف کا نفع ہوا ایک پیسہ خرچ نہ ہوا۔

اسی دولہا کے ایک دوسرے بھائی کا نکاح رسم کے ساتھ ہوا تو وہ قرضدار ہو گیا میں نے کہا ایک نکاح ہوا تو اس میں قرض ہوا اگر دوسرا ہوا تو ختم ہی ہو جائیگا۔ اس قرضدار

کی دولہن کو سستی تھی ماں باپ کو بھی ساس سسر کو بھی کہ اُن کا کیا نقصان ہوا ہم پر روٹی کی کمی ہوگئی۔ خیال فرمایئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ کا نکاح کیا اور کر کے دکھلا دیا کہ نکاح اس طرح ہونا چاہیئے۔ اس میں کوئی بکھیڑا نہیں ہوا حضرت علیؓ کو بلایا اور کسی کو نہیں بلایا جو موجود تھے اُن کے سامنے نکاح پڑھ دیا۔

اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ غالباً مواہب لدنیہ میں ہے کہ نکاح کے وقت حضرت علیؓ بھی موجود نہ تھے اس لئے آپ نے یوں فرمایا تھا ان رضی علیؓ کہ اگر حضرت علی راضی ہوں جب حضرت علیؓ آئے انہوں نے کہا رضیت کہ میں راضی ہوں جہاں دولہا کی بھی ضرورت نہ ہو وہاں برات تو کیا ہوتی مگر ہمارے یہاں تو سب تھوخیرا کو موجود ہونا چاہیئے کہتے ہیں اب تک فلانا تو آیا نہیں نکاح کیسے ہو وہ تو روٹھ جائیگا اُس کو لاؤ مناؤ بھائی اس بکھیڑے کی ضرورت ہی کیا ہے، سیدھا نکاح ہونا چاہئے۔ اس کے بعد حضرت فاطمہؓ کو اُم ایمنؓ کے ہمراہ حضرت علیؓ کے یہاں پہونچا دیا گیا۔ حضور اُن کے یہاں رات کو تشریف لے گئے فرمایا فاطمہ پانی لاؤ۔ دیکھئے نئی دلہن ہیں وہ خود اپنے ہاتھ سے پانی لائی ہیں اب تو نکاح سے پہلے دولہن کو مائیوں بٹھلاتے ہیں۔ اس بے چاری کو تو سرسام ہو جاتا ہے اختلاج قلب ہوجاتا ہے۔ اور اوپر سے تعلیم دیتی ہیں کھاؤ مت وہ بے چاری تو ناتجربہ کار ہے ان کے کہنے سننے سے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ آخر نتیجہ یہ ہوا کہ بیمار ہوگئی تو کہتے ہیں اللہ بخش آگیا وہ کہاں آگیا بھلا گنگوہ سے وہ یہاں آگیا اُس کو اور کوئی عورت ملی نہیں یہی ملی ہی پسند آگئی۔ اب نہ دوا نہ دارو کیونکہ اللہ بخش کی دوا کیا ہو غرض ایک جیلخانہ سے چھوٹی تھی اب دوسرا جیل خانہ موجود ہے جیسے قیدیوں کو آگرہ سے جھانسی بدل دیتے ہیں۔ غرض مائیوں بٹھلانے میں دلہن کو تعلیم ہوتی ہے کہ کھجلی اُٹھے تو کھجلانا نہیں پیشاب پاخانہ نہ کرنا اگر وہ پیشاب کرنا چاہے تو کہتی ہیں یہ کیسی بے حیا ہے کہ لوٹا لے کر چل پڑی۔

نانوتہ کا قصہ ہے کہ کسی نئی دولہن نے نائن سے کہا پانی لا کر نماز پڑھوا دے مگر وہ بیٹھی رہی آخر وہ خود لوٹا لے کر پیشاب سے فارغ ہوئی پھر وضو کر کے نماز پڑھی پھر دوپٹہ اوڑھ کر بیٹھ گئی عورتوں نے بہت بک بک کی کہ جب ایک دفعہ شرم اتار دی پھر شرم کی صورت بنانے سے کیا فائدہ مولانا مملوک علی صاحب کو خبر ہوئی دروازہ پر تشریف لائے اور بہت شاباشی دی کہ نیک دلہن کو ایسا ہی ہونا چاہیے پھر دلہن کا منہ پر ہاتھ رکھواتی ہیں اور غریب کو دنیا اور دین کے سب کاموں سے معطل کر دیتی ہیں پھر اس میں شرط یہ ہے کہ ٹس سے مس نہ ہو ایک ہی نشست پر بیٹھی رہے۔ پھر ایک امتحان یہ کرتی ہیں کہ اس کی گدگدی اٹھاتی ہیں اگر بہو کو ہنسی آگئی تو بے شرم ہے یہ کیسی خرافات ہے لاحول ولا قوۃ الا باللہ بھلا یہ رسوم حضور کے یہاں بھی ہوئی ہیں ہرگز نہیں حضرت فاطمہؓ تو اسی رات اپنے ہاتھ سے پانی بھر کر پیالہ میں لائی تھیں۔

ایک رسم یہ ہے کہ بہو ڈولہ سے خود نہیں اترتی بلکہ دوسرے اتارتے ہیں ہٹی کٹی موٹی ہتھنی سی لیکن گود میں چڑھی چڑھی پھرتی ہے۔ کبھی گرتی بھی ہے چوٹ بھی کھاتی ہے۔ بعض جگہ دولہا ہی اس کو اتارتا ہے لاحول ولا قوۃ ان لوگوں کو شرم بھی نہیں آتی۔ کیا یہ سب خرافات حضرت فاطمہؓ کے نکاح میں ہوا ہرگز نہیں غرض شادی ایسی کرو جیسی حضور نے کی غمی بھی ایسی ہی کرو جیسی آپ نے کی لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ کے یہی معنی ہیں اب دینے لینے کی رسم کا بیان رہ گیا اس میں بھی شریعت کی پابندی کرو۔ ایک بری لائی جاتی ہے۔ بھائی یہ بری کیسی ہے یہ ہنود کی رسم ہے۔ بر کہتے ہیں خاوند کو اور یائے نسبتی ہے یعنی خاوند کے گھر کی چیز یہ لفظ بتلا رہا ہے کہ کفار کی رسم ہے مسلمانوں کی رسم نہیں۔ مسلمانوں نے خدا کے احکام کو چھوڑ کر کفار کے رسوم کو لے لیا ہے حالانکہ مسلمانوں کی حالت یہ ہونی چاہیے تھی

ترکت اللات والعزیٰ جمیعاً ۔۔۔ کذلک یفعل الرجل البصیر

خدا کے احکام کو مضبوط پکڑو اس میں دین کا بھی بھلا ہے اور دنیا کا بھی نفع ہے اب معلوم کرتا ہوں کہ یہاں جو نکاح ہوگا اُس میں بہت سادگی ہوگی اگر اسی کا اتباع کر لو تو غنیمت ہے کوئی گری پڑی جگہ بھی نہیں ماشاءاللہ دونوں طرف مالدار ہیں اگر چاہیں تو بہت کچھ خرچ کر سکتے ہیں غریبوں کو اب یہ عذر بھی نہ رہا کہ شریعت پر عمل کرنے سے لوگوں میں سبکی ہوتی ہے اب تو سبکی بھی نہیں ہے کہ مالدار شریعت کے موافق شادی کر رہے ہیں۔ اس کو غنیمت سمجھو۔ بس اب ختم کرتا ہوں دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہمیں اسلام کے احکام پر عمل کرنے کی توفیق دیں اور ہمارے تمام دنیوی معاملات کو احکام کے موافق کر دیں آمین

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

اشرف علی

۱۵۔ محرم ۵۶ھ

محاسنُ الاسلام
کے بارے میں
اسلام کی خوبیاں

۲۸ر شوال المکرم ۱۳۴۱ھ بروز جمعرات۔ درگاہ حضرت شاہ جلال الدین کبیر الاولیاء مخدوم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ پانی پت میں یہ وعظ ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ۵۰۰ تھی۔ مولوی اظہر علی صاحب سلہٰٗ نے ضبط کیا۔ اور ان کے مبیضہ سے مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے صاف فرمایا۔

سکون و وقار سے کام کرو۔ جہاں مباحثہ کی دوسری بھی طرف سے تحریک ہو۔ وہاں کرو۔ خود چھیڑ مت اُٹھاؤ۔ بلکہ صاف کہدو کہ ہم اپنا کام کریں۔ تم اپنا کرو۔ جس کا مذہب حق ہوگا۔ اس کی حقانیت خود واضح ہوجائیگی واللہ! اسلام کی تعلیم وہ ہے کہ اس کی سادہ تعلیم کے مقابلہ میں کوئی تعلیم ٹھہر نہیں سکتی۔ اسلام کی دلربائی کی یہ شان ہے ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم ❊ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یہدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولٰنا محمداً عبدہ ورسولہ صلے اللہ تعالٰے علیہ وعلٰی آلہ واصحابہ وبارک وسلم۔ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم قال اللہ تبارک وتعالٰے ان الدین عند اللہ الاسلام

منشی عزیز الرحمٰن صاحب نے بعد وعظ کے اعلان کیا کہ جو لوگ دیہات سے آئے ہیں وہ کھانا کھا کر جائیں چنانچہ بہت سے ملکانے راجپوت بھی ٹھہر گئے اور اس وعظ کی برکت یہ ہوئی کہ ان لوگوں نے ساری عمر گائے کا گوشت نہ کھایا تھا مگر اس دن بہت شوق سے کھا گئے اور آپس میں وہ یہ باتیں کرتے تھے کہ دیکھا بھی ہمارا ہی مذہب سچا ہے بھلا آریوں میں بھی کوئی ایسا ہے جو اس طرح چار گھنٹے تک کھڑا ہو کر بیان کرتا رہے پھر ان کی سب باتیں سمجھ میں آتی ہیں دلکو بھی لگتی ہیں اور آریوں کی باتیں سمجھ میں تو نہیں آتیں نہ معلوم کیا کہا کرتے ہیں بس جی ہم تو مسلمان ہی رہیں گے ہم شدھی نہ ہونگے معلوم ہوا کہ اس وقت بعض گاؤں شدھی ہونے والے تھے مگر وعظ کی خبر سنکر انہوں نے اس ارادہ کو ملتوی کر دیا کہ پہلے وعظ سن لیں دیکھیں مسلمان عالم کیا کہتا ہے وعظ سنکر اسلام پر جم گئے ثبتہم اللہ وایانا علٰی دینہ القویم واماتنا وایاھم علیہ وحشرنا مع نبیہ الکریم۔

فضیلتِ اسلام اور تقسیمِ فضیلت

یہ ایک لمبی آیت میں سے چھوٹا سا ٹکڑا ہے اس کے متعلق اس وقت مجھے کچھ بیان کرنا ہے جس کا خلاصہ اسلام کی فضیلت ہے چنانچہ آیت ہی کو سنکر اکثر حضرات نے عموماً اور بعض حضرات نے خصوصاً اس مقصود کو سمجھ لیا ہوگا۔ ہر چند کہ اسلام کی فضیلت کا ہر مسلمان کو اعتقاد ہے مگر جو درجہ اسکی فضیلت کا ہے اس درجہ کا استحضار بہت کم لوگوں کو ہے چنانچہ عنقریب واضح ہو جائیگا۔ پس یہ اشکال مندفع ہو گیا کہ یہ مضمون تو ہر شخص کو معلوم ہے پھر اس کے بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وجہ اندفاع یہ ہے کہ جس درجہ کا علم ہونا چاہئے اس درجہ کا علم حاصل نہیں ہے اس لئے اس پر تنبیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اسلام کی فضیلت اس درجہ کی ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی بھی فضیلت نہیں ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ فضیلت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ فضیلت ہے کہ اگر وہ حاصل نہ ہو تو ضرر کچھ نہیں یہ درجہ فضیلت استحباب کا ہے۔ ایک درجہ فضیلت کا وہ ہے کہ اگر اس کو حاصل نہ کیا جائے تو ضرر ہوتا ہے اس کا حاصل کرنا ضروری اور ترک کرنا ناجائز ہے۔ یہ فضیلت فرض کہلاتی ہے اور ایک درجہ اس سے بھی بڑھ کر ہے وہ یہ کہ تمام فرائض کی تحصیل کسی خاص فضیلت کی تحصیل پر موقوف ہو کہ بدون اس کے کوئی فرض ادا نہیں ہو سکتا سب کی صحت اس پر موقوف ہے یہ درجہ بھی گو فضیلت فرض ہی کا ایک فرد ہے لیکن تمام افراد میں سب سے اعلیٰ ہے۔ یہ درجہ اسلام و ایمان کو حاصل ہے کہ اس کا حاصل کرنا خود بھی فرض ہے اور تمام فرائض کا موقوف علیہ بھی ہے۔ اب سمجھ میں آگیا ہوگا کہ اسلام کی فضیلت کا کتنا بڑا درجہ ہے۔ آجکل عام طور پر مستحبات میں فرض سے زیادہ فضیلت سمجھتے ہیں۔ چنانچہ نوافل و مستحبات کا جو پابند ہو اس کی بہت تعریف کیجاتی ہے، گو وہ فرائض کو اچھی طرح بھی نہ ادا کرتا ہو اور جو شخص محض فرائض و واجبات پر اکتفا کرتا ہو مگر ان کو اچھی طرح ادا کرتا ہو اسکی

زیادہ قدر نہیں کیجاتی نہ بہت تعریف ہوتی ہے۔ یوں سمجھتے ہیں کہ اُنھوں نے کوتاہی کیا ہے۔ مگر حقیقت اس کے خلاف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فرض کی فضیلت مستحبات و نوافل سے بڑھی ہوئی ہے اور ثواب بھی اُسی میں زیادہ ہے۔ اس سے بڑھ کر اس کی کیا فضیلت ہوگی کہ وہ ضروری ہے اور مستحب ضروری نہیں۔ تو فرض کا وہ درجہ ہے جو غذا کا درجہ ہوتا ہے اور نوافل و مستحبات کا درجہ چٹنی کے مشابہ ہے اور ظاہر ہے کہ غذا کو چٹنی سے زیادہ فضیلت ہے، محض چٹنی بدوں غذا کے بے سود ہے، اور غذا بدوں اس کے بے سود نہیں اس مسئلہ کو حدیث میں بھی صاف بیان کیا گیا ہے، فقہا نے بھی اس کو طے کر دیا ہے اور صوفیہ نے بھی تصریح کی ہے کہ بہ نسبت نوافل کے فرائض سے قرب زیادہ ہوتا ہے اس سے ہماری غلطی معلوم ہوگئی کہ آجکل ان لوگوں کی زیادہ قدر ہے جو مستحبات میں مشغول ہوں، گو فرائض میں کوتاہی کرتے ہوں اور تعجب یہ ہے کہ فرض ادا کرنے والا بھی اپنے کو کچھ نہیں سمجھتا، یہ خیال کرتا ہے کہ میں کوتاہی کیا ہوں صرف فرائض ادا کرتا ہوں اس میں در پردہ فرائض کا استخفاف ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس نعمت پر شکر ادا کرنیکی توفیق کم ہوتی ہے اور جو مستحب میں مشغول ہو گو فرائض ملاتی طریقے سے ادا کرتا ہو۔ لوگ بھی اس کے معتقد ہیں۔ اور وہ خود بھی اپنا معتقد ہوتا ہے، سمجھتا ہے کہ میں رات کو جاگتا ہوں گو فرائض میں بھاگتا ہی ہو، جاگنا یہ کہ صرف اٹھک بیٹھک کرتا ہے ارکان کو تعدیل سے ادا نہیں کرتا۔ اسی غلطی کا اثر یہ ہے کہ لوگوں کو نعمت اسلام کی قدر زیادہ نہیں اگر کوئی شخص دولت اسلام سے مشرف ہو اور دیگر فرائض و واجبات میں کوتاہی کرتا ہو تو وہ سمجھتا ہے کہ میرے

عہ اشارة الى حديث اخرجه البخاري عن ابي هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الله تعالى قال من عادى لي وليا فقد اذنته بالحرب وما تقرب الي عبدي بشئ احب الي مما افترضت عليه وما يزال عبدي يتقرب الي بالنوافل حتى احبه الحديث كذا في المشكوٰة (ص ۱۹۵ ج ۱)

مطبوعة المطبعة النظامية الدهلوية ۱۲ جامع

پاس کیا ہے کچھ نہیں۔ حالانکہ اس کے پاس ایک بہت بڑی دولت ہے۔ یعنی اسلام، گو دوسرے واقعض میں کوتاہی کرنے سے اس کو گناہ ہو لیکن پھر بھی اس کے پاس ایک ایسی دولت ہے، کہ اگر اس کو صحیح سلامت اپنے ساتھ لیگیا تو انشاء اللہ نجات ہو جائے گی۔

اسی مضمون کو اس آیت میں بیان فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے

تفسیر آیت کریمہ

ان الدین عند اللہ الاسلام کہ دین خدا تعالیٰ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔ اہل علم اس کو سمجھتے ہیں کہ یہ ترکیب مفید حصر ہے جس سے گونہ قوت پیدا ہو گئی مضمون میں۔ اس سے اسلام کی فضیلت ظاہر ہے کہ وہ ایسا دین ہے کہ خدا کے نزدیک وہی مقبول ہے۔ یہاں یہ شبہ ظاہر میں ہو سکتا ہے کہ ادیان تو بہت ہیں۔ پھر اس کا کیا مطلب کہ خدا کے نزدیک دین صرف اسلام ہی ہے، یوں فرمانا چاہیئے تھا کہ دین حق صرف اسلام ہی ہے۔ مطلق دین کو اس میں منحصر کر دیا گیا؟ میں کہتا ہوں کہ حصر کے علاوہ یہ دوسرا مبالغہ ہے کیونکہ قاعدہ ہے المطلق اذا اطلق یراد بہ الفرد الکامل کہ مطلق سے فرد کامل مراد ہوا کرتا ہے۔ پس ہر چند کہ مطلب تو یہ ہے کہ دین کامل اسلام ہی ہے اور یہ حصر بلا کلام صحیح ہے کیونکہ دوسرے بعض ادیان تو اصل ہی سے حق نہیں اور باقی منسوخ ہیں مگر مطلق کو منحصر کرنے میں ایک قسم کا دعویٰ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اسلام ایسا کامل دین ہے جس کے سامنے اور مذاہب اس قابل نہیں ہیں کہ ان کو دین کہا جائے چنانچہ محاورات میں بولا جاتا ہے کہ بس حسین تو فلاں شخص ہے جس میں دعویٰ ہے کہ اس کا حسن ایسا کامل ہے کہ دوسرے حسین اس قابل نہیں ہیں کہ ان کو اس کے سامنے حسین کہا جائے اس ادعا کی وجہ سے مطلق کا حصر کر دیا جاتا ہے۔ یہی صورت اس جگہ ہے پس حاصل یہ ہوا کہ گو ادیان اور بھی ہیں مگر اسلام ایسا کامل و مکمل دین ہے کہ اس کے سامنے دوسرے ادیان دین کہلانے کے مستحق نہیں ہیں یہ فضیلت تو اس آیت میں مذکور ہے اور دوسری جگہ ارشاد ہے ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ ط جو شخص اسلام کے سوا کسی دین کو طلب کرے گا وہ ہرگز قبول نہ ہوگا۔ یہاں حقیقت کے موافق کلام فرمایا گیا ہے کہ دوسرے

مذاہب کو بھی دین کہدیا گیا، مگر اسلام کے مقابلہ میں ان کو غیر مقبول قرار دیا گیا۔ یعنی اسلام کے بغیر کسی دین کے اختیار کرنے سے نجات حاصل نہیں ہو سکتی۔

یہ کہ فضیلت کے اوّلاً دو درجے تھے ایک فرض کا ایک استحباب کا، پھر فرض

خلاصہ: میں بھی دو درجے ہیں۔ ایک وہ جو مطلق نجات کا مدار ہو دوسرے وہ جو نجاتِ کامل کا مدار ہو اور ظاہر ہے کہ درجۂ اوّل درجۂ ثانی سے بڑھا ہوا ہے کیونکہ ایک کام تو وہ ہے جس کے بغیر نجات تو ہو سکتی ہے مگر کامل نجات نہ ہوگی۔ مثلاً فوراً دخولِ جنت نہ ہوگا، کچھ دنوں کے بعد ہوگا اور ایک کام وہ ہے جس کے بغیر نجات ہو ہی نہیں سکتی، نہ کامل نہ ناقص۔ اسلام اسی درجہ کا فرض ہے کہ اس کے بغیر نجات کسی طرح ہو ہی نہیں سکتی۔ اب یہ بات واضح ہو گئی کہ اسلام سے بڑھکر کسی چیز کی فضیلت نہیں یہ تمام اعمال و فرائض میں سب سے بڑی نعمت ہے مستحبات و سنن کے ترک سے تو عتاب ہوتا ہے مگر عتاب کا نہ ہونا بھی ممکن ہے اور فرائض و واجبات کے ترک سے عذاب ہوگا، اور ممکن ہے کہ بدوں عذاب ہی کے مغفرت ہو جاوے۔

مغفرتِ کبائر بلا عذاب: اور ایسا ہوگا بھی یعنی یہ محض امکانِ عقلی ہی نہیں بلکہ اس کا وقوع بھی ہوگا۔ بعض گنہگار بدوں عذاب ہی کے بخش دیئے جائیں گے معتزلہ کے سوا کسی کا اسمیں اختلاف نہیں ہے ان کے نزدیک گنہگار کو عذاب ہونا لازم ہے۔ تماشہ ہے نہ معلوم ان لوگوں کی عقل کہاں گئی؟ وہ خدا کے ذمہ عقاب و ثواب کو واجب کہتے ہیں، گویا خدا تعالےٰ کو نعوذ باللہ قانون کا تابع کرتے ہیں حالانکہ قانون کا بنانے والا قانون کے تابع نہیں ہوتا بلکہ خود قانون اس کے تابع ہوا کرتا ہے۔ اگر ان کے نزدیک عذاب و ثواب کا وجوب عقلی ہے اس سے واجب کا مضطر ہونا لازم آتا ہے اور اضطرار امارت حدوث سے ہے اور واجب اضطرار سے منزہ ہوتا ہے اگر یہ وجوب شرعی ہے تو اس کے لئے دلیل شرعی کی ضرورت ہے، اگر وہ دلیل میں آیاتِ وعید کو پیش کریں تو ہم آیاتِ عفو و مغفرت و شفاعت کو پیش کریں گے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ بہت

ہے گناہوں کو بدون عذاب کے بھی معاف کر دیتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ ویغفر ما دون ذالک لمن یشاء۔ باقی جن آیات میں افعال کبیرہ کا عقاب مذکور ہے وہاں استحقاق مراد ہے، لزوم و وقوع مراد نہیں یعنی کبائر سے وہ شخص عذاب کا مستحق ہو جاتا ہے، وقوعِ عقاب لازم نہیں، ممکن ہے حق تعالیٰ ویسے ہی بخش دیں باقی وقوع کے متعلق آیت ان اللہ لا یغفر ان یشرک الخ سے صاف معلوم ہو گیا کہ سب گناہوں پر عذاب لازم نہیں بجز شرک و کفر کے کہ ان پر عذاب لازم ہے (یعنی شرعاً) غرض گناہ کبیرہ تو بدون عقاب کے معاف ہو سکتا ہے مگر کفر و شرک کا ارتکاب بدون عذاب کے نہیں رہ سکتا اس پر عذاب لازم ہے اور وہ بھی ابدالآباد کے لئے جس کا انقطاع کبھی نہ ہوگا یہ جرم کسی طرح معاف نہ ہوگا نہ عذاب سے نہ بغیر عذاب کے۔

مغفرتِ کبائر بلا عذاب پر شبہ کا جواب

آجکل بعض لوگوں نے اسلام پر اعتراضوں کی فہرست میں ایک اعتراض بھی داخل کیا ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک کبائر بھی بدون عقاب کے معاف ہو سکتے ہیں تو اس اعتقاد کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو کبائر پر اقدام زیادہ ہے وہ بڑے سے بڑا جرم کر کے بھی نجات کے امیدوار رہتے ہیں۔ میں اس اعتراض کا جواب دینا چاہتا ہوں اس کا جواب یہ ہے کہ اقدام جرائم اگر اس عقیدۂ اسلام کا ثمرہ ہوتا تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ جن لوگوں کو اسلام سے جتنا زیادہ تعلق ہے مثلاً علماء و اتقیاء و صوفیاء ان میں یہ ثمرہ زیادہ ظاہر ہوتا۔ کیونکہ قاعدہ ہے کہ مذہب کے ثمرات کا ظہور ان ہی لوگوں میں زیادہ ہوتا ہے جن کو مذہب سے تعلق زیادہ ہے۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں اور کفار بھی اس کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ جن لوگوں کو اسلام سے تعلق زیادہ ہے وہ جرائم کا ارتکاب تو کیا کرتے وہ تو شبہات سے بھی احتراز کرتے ہیں۔ چنانچہ جامع ایک دوست کا، جو کہ بی اے ہیں، واقعہ ہے کہ وہ ایک بار ریل کا سفر کر رہے تھے ان کے پاس اسباب پندرہ سیر سے زیادہ تھا اسٹیشن پر تنگیٔ وقت کی وجہ سے

وہ اسکو وزن نہ کرا سکے۔ اسوقت تو جلدی میں سوار ہو گئے لیکن جب منزل مقصود پر اُترے تو وہاں کے بابو سے جاکر اپنا واقعہ بیان کیا کہ میں جلدی میں اسباب کو وزن نہ کرا سکا اب آپ اس کو وزن کریں اور جو محصول میرے ذمہ ہو اس کو وصول کر لیجیے۔ بابو نے انکار کیا کہ مجھ کو فرصت نہیں تم ویسے ہی لے جاؤ ہم تم سے محصول نہیں لیتے۔ انہوں نے کہا کہ صاحب آپ کو اس معافی کا کوئی حق نہیں۔ کیونکہ آپ ریلوے کے مالک نہیں بلکہ ملازم ہیں آپ کو محصول مجھ سے لینا چاہیئے مگر اُس نے پھر بھی انکار کیا تو یہ اسٹیشن ماسٹر کے پاس گئے۔ اُس نے بھی کہا کہ آپ بلا تکلف سامان لے جائیں ہم آپ سے محصول نہیں لیتے۔ انہوں نے اُس سے بھی کہا کہ آپ کو معافی کا کوئی حق نہیں۔ اس کے بعد اسٹیشن ماسٹر اور اس بابو میں انگریزی میں گفتگو ہونے لگی۔ وہ یہ سمجھے کہ یہ مسافر انگریزی نہیں سمجھتا ہوگا (کیونکہ ان کی صورت مُلانوں کی سی تھی)

غرض ان دونوں کی اس گفتگو میں یہ رائے قرار دی کہ یہ شخص شراب پیے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود ہمارے انکار کے یہ محصول دینے پر اصرار کرتا ہے

انہوں نے جواب دیا کہ صاحب! میں نے شراب نہیں پی بلکہ ہمارا مذہبی حکم ہے کہ کسی کا حق اپنے ذمہ نہ رکھو۔

اسپر وہ دونوں بولے کہ صاحب! ہم تو اس وقت اسباب وزن نہیں کر سکتے آخر یہ اسباب اٹھا کر پلیٹ فارم سے باہر لائے، اور سوچنے لگے کہ یا اللہ! اب میں ریلوے کے اس حق سے کس طرح سبکدوشی حاصل کروں۔ آخر خدا نے امداد کی، اور یہ بات دل میں ڈالی کہ جتنا اسباب زیادہ ہے اُس کے محصول کے برابر ایک ٹکٹ اسی ریلوے کے کسی اسٹیشن کا لیکر چاک کر دیا جائے۔ اس طرح ریلوے کا حق اسکو پہنچ جائیگا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا۔

میرے ایک دوست کا جو کہ ڈپٹی کلکٹر بھی تھے۔ واقعہ ہے کہ ان کا ایک بچہ ریل کے سفر میں ان کے ہمراہ تھا، جس کا قد بہت کم تھا کہ دیکھنے میں دس سال کا معلوم ہوتا تھا۔ مگر اُس

کی عمر تقریباً تیرہ سال کی تھی اور ریلوے کے قاعدے سے اس عمر کے بچے کا ٹکٹ پورا لینا ضروری ہے انہوں نے اس کا پورا ٹکٹ لینا چاہا تو ساتھیوں نے بہت منع کیا کہ اس کو تیرہ سال کا کون کہہ سکتا ہے آپ آدھا ٹکٹ لے لیجئے کوئی کچھ نہ کہے گا انہوں نے کہا کہ بندے کچھ نہ کہیں گے تو کیا حق تعالےٰ بھی باز پرس نہ فرمائیں گے کہ تم نے دوسرے کی چیز میں تھوڑی اُجرت پر بدوں اسکی اجازت کے کیوں تصرف کیا۔ غرض انہوں نے پورا ٹکٹ لیا اور اُن کے ساتھی ان کو بیوقوف بناتے رہے مگر

مصرعہ
اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد

بھلا اس کی نظیر کوئی قوم بھی دکھلا سکتی ہے کہ ایک شخص کو ریل بابو اور اسٹیشن ماسٹر خود کہدے کہ تم بلا تکلف اسباب لیجاؤ ہم محصول نہیں لیتے اور پھر بھی وہ اپنے اصرار کرے کہ نہیں تم کو محصول لینا پڑے گا تمکو معافی کا کوئی حق نہیں اور جب وہ کسی طرح وصول نہیں کرتے تو یہ شخص خدا کے خوف سے ریلوے کا ٹکٹ مقدار المحصول کے برابر خرید کر چاک کرتا ہے۔ اور یہ صورت شبہات سے احتراز کی گو عام لوگوں کی نظروں میں ہے ورنہ حقیقت میں یہ شبہات کی قسم سے نہیں بلکہ صریح واجب کا امتثال ہے، پس اگر اس عقیدہ کا اثر اقدام علی الجرائم ہوتا تو علماء و صلحاء سب سے زیادہ بے باک اور جرائم پر اقدام کرنے والے ہوتے، حالانکہ مسلمانوں میں یہ طبقہ جو اسلام کے حقیقی مرتبہ کو پہچانتا ہے، سب سے زیادہ جرائم سے بچنے والا اور شبہات سے احتراز کرنے والا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اس عقیدہ کا یہ اثر نہیں ہے جو ان معترضوں نے سمجھا ہے بلکہ اس کا اثر جرائم سے رکنا اور گناہوں سے نفرت پیدا ہونا ہے جس کی وجہ میں عنقریب بتلاؤں گا کہ اس عقیدہ کا اثر گناہوں سے نفرت پیدا ہونا کس طرح ہے مگر افسوس ؎

چشم بد اندیش کہ برکندہ باد   عیب نماید ہنرش در نظر

ایسا پاکیزہ مسئلہ جو جرائم کی جڑ کاٹنے والا ہے بد اندیش کو اقدام جرائم کا سبب معلوم ہوتا ہے۔ یہ جواب تو مشاہدہ کے متعلق ہے کہ خود مشاہدہ اس عقیدہ کا یہ اثر جو تم بتلاتے ہو غلط ثابت ہو رہا ہے۔

جواب ۲: اور جواب عقلی اس کا یہ ہے کہ یہ عقیدہ عقلاً اقدام جرائم کا سبب نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کا حاصل صرف یہ ہے کہ حق تعالیٰ جس کو چاہیں گے باوجود کبائر کے عذاب سے معاف کر دیں گے جس میں تعیین کسی کی نہیں ہے، یعنی کسی شخص کو معلوم نہیں کہ میرے متعلق مشیت الٰہی بصورت عفو ہے یا بصورت عذاب (نظراً الی اصل الاستحقاق فافہم ۱۲ جامع)، پھر اس صورت میں کوئی شخص بھی عذاب سے بےفکر نہیں ہو سکتا بلکہ ہر ایک کو یہ اندیشہ لگا ہوا ہے کہ شاید میرے ساتھ قانونی برتاؤ کیا جاوے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک مثلاً شخص شرم و ندامت کی وجہ سے خودکشی پر آمادہ ہو کر سنکھیا استعمال کرے اور اتفاقاً وہ سنکھیا کھا کر ہلاک نہ ہو بلکہ سنکھیا ہضم ہو کر اس کے اندر قوت مردمی پیدا کر دے چنانچہ بعض جگہ ایسے واقعات ہوئے ہیں مگر کیا اس اتفاقی واقعہ سے کسی کو سنکھیا کھانے پر جرأت ہو سکتی ہے، ہرگز نہیں بلکہ ہر عاقل سمجھتا ہے کہ زہر کا خاصہ تو ہلاک کرنا تھا مگر اتفاقاً اس شخص میں اس کی خاصیت کا ظہور نہ ہوا تو اس سے خاصیت نہیں بدل گئی اس لئے مردانگی بڑھانے کے لئے سنکھیا کھانے کی نہ کوئی اجازت دے سکتا ہے اور نہ ہر شخص اس پر جرأت کر سکتا ہے۔ علیٰ ہذا سب لوگوں کو معلوم ہے کہ بعض دفعہ حکام و سلاطین مراحم خسروانہ سے کسی قاتل کو رہا بھی کر دیتے ہیں مگر اس علم کی وجہ سے ہر شخص کو قتل پر جرأت نہیں ہوتی کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ قتل کی اصل سزا تو قتل ہی ہے اور عمل بھی اکثر اسی قانون کے مطابق ہوتا ہے اور مراحم خسروانہ کوئی قانون نہیں بلکہ محض حاکم کی مشیت پر ہے، کچھ معلوم نہیں کہ وہ کس کے ساتھ مراحم خسروانہ کا برتاؤ کرے کس کے ساتھ نہ کرے۔ لہٰذا مراحم خسروانہ کے بھروسہ پر اقدام قتل کی جرأت نہیں ہو سکتی بعینہٖ اسی طرح کبائر کا بدون عذاب کے معاف ہو جانا بطور مراحم خسروانہ کے ہے۔ پس اس مسئلہ کو اقدام جرائم کا سبب کیونکر سمجھ لیا گیا؟ بھلا اگر کوئی شخص جنگل میں پاخانہ کرنے جائے اور استنجے کے لئے ڈھیلا توڑتے ہوئے اسکو زمین میں سے سونے کا گھڑا مل جاوے تو کیا اس اتفاقی بات پر بھروسہ کر کے کوئی شخص بھی تجارت و زراعت سے مستغنی ہو کر بیٹھ سکتا ہے کہ مجھ کو بھی اسی طرح پاخانہ کرتے ہوئے سونے کا گھڑا مل جاوے

تھا، ہرگز نہیں۔ اسی طرح اتفاقاً کسی مرتکب کبائر کا بدون عذاب کے بخش دیا جانا اتفاقی ہے۔ اس لئے یہ اقدام جرائم کا سبب ہرگز نہیں ہو سکتا مگر پھر بھی جو لوگ جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں وہ اپنی طبیعت کے خبث سے ایسا کرتے ہیں اس عقیدہ کو اس میں کیا دخل ہے؟

جواب ۳: پھر یہ جو بعض گنہگاروں کی مغفرت بدون عقاب کے ہو جاتی ہے اس کی وجہ بھی معلوم ہے کہ یہ مغفرت کیونکر ہوگی یہ بھی کسی عمل صالح ہی کی وجہ سے ہوگی۔ ابوداؤد کی ایک حدیث سے بھی یہ مسئلہ معلوم ہوا ہے وہ حدیث یہ ہے کہ ایک شخص نے کسی مقدمہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جھوٹی قسم کھائی اور اس طرح کہا اشہد باللہ الذی لا الٰہ الا ھو مافعلت ذالک قسم اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ میں نے ایسا نہیں کیا فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلی قد فعلت ولکن غفر اللہ لک باخلاص قول لا الٰہ الا ھو حضور نے فرمایا کہ تو نے یہ کام ضرور کیا ہے (اور تیری قسم جھوٹی ہے جس کا بہت بڑا گناہ ہوتا) لیکن حق تعالیٰ نے تجھے اس اخلاص کی برکت سے بخش دیا جو لا الٰہ الا ھو کہتے ہوئے تجھ سے صادر ہوا۔ نہ معلوم اس وقت کس دل سے اس نے خدا کا نام لیا تھا جو اس درجہ مقبول ہو گیا (یعنی اس نے خدا کا نام اس وقت کامل اخلاص سے لیا تھا اس کی برکت سے حلف کاذب کا گناہ معاف ہو گیا) اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضور نے ڈگری اسی کی کر دی بلکہ محض اس گناہ کی مغفرت کا بیان فرمانا مقصود ہے۔ کیونکہ جب وحی سے اس کا کاذب فی الحلف ہونا معلوم ہو گیا تو اب ڈگری اس کے حق میں کیونکر ہو سکتی تھی؟ تو دیکھئے گناہ کتنا سنگین تھا کہ جھوٹی قسم کھائی اور وہ بھی حضور کے سامنے کہ حضور کے سامنے جھوٹی قسم کھانا ایسا ہے جیسا خدا کے سامنے اور ظاہر ہے کہ محل و زمان کی عظمت سے بھی فعل میں عظمت پیدا ہو جاتی ہے۔ زنا کرنا گناہ ہے مگر مسجد میں زنا کرنا اور بھی اشد ہے اور اگر کوئی نامعقول کعبہ میں ایسا فعل کرے تو بہت ہی سخت ہے، اسی طرح جھوٹی قسم کھانا گناہ ہے مگر حضور کے سامنے اس کا گناہ اور بڑھ جاتا ہے کیونکہ آپ نائب خدا ہیں آپ کے سامنے جھوٹی قسم ایسی ہے، جیسے خدا کے سامنے ہو۔

شاید کوئی یہ کہے کہ ہم تو اس وقت بھی جو کچھ کرتے ہیں سب خدا ہی کے سامنے ہے اور جس جگہ جو کام ہوگا وہ خدا کے سامنے ہوگا تو چاہیے کہ ہر جگہ وہی گناہ ہو جو حضور کے سامنے جھوٹی قسم سے ہوتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ اس وقت تم خدا کے سامنے ہو مگر خدا تمہارے سامنے نہیں اور میرا مطلب یہ ہے کہ حضور کے سامنے قسم کھانا ایسا ہے جیسا خدا تعالے کو سامنے سمجھ کر قسم کھانا۔

خلاصہ یہ کہ قرب کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قرب حسی یہ تو جہاں ہوتا ہے طرفین سے ہوتا ہے اور ایک قرب علمی یہ ایک طرف سے بھی ہو سکتا ہے پس اس وقت جو تم خدا کے سامنے ہو یہ قرب علمی ہے کہ خدا تعالے سے تمہارا کوئی حال مخفی نہیں وہ سب کچھ جانتے ہیں مگر اس حالت میں تم کو قرب حاصل نہیں، ورنہ ہر شخص کا مقرب ہونا لازم آئے گا اور قیامت میں جو تم خدا کے سامنے ہو گے وہ قرب جانبین سے ہوگا کہ تم بھی خدا تعالیٰ کے سامنے ہو گے اور خدا تعالے بھی تمہارے سامنے ہوں گے نحن اقرب الیہ من حبل الورید میں قرب علمی مراد ہے اسی لئے یہ نہیں فرمایا کہ تم بھی ہم سے قریب ہو بلکہ صرف اپنا قرب بیان فرمایا کیونکہ یہاں تماشہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ تو ہم سے قریب ہیں مگر ہم ان سے دور ہیں۔ ؎

یار نزدیک تر ز من بمن است　　　　وین عجب تر کہ من ازو دورم

تو حضور کے سامنے جھوٹی قسم ایسی ہے جیسے قیامت میں خدا کے سامنے جھوٹی قسم کھانا جب کہ تم بھی حق تعالیٰ کو اپنے سامنے سمجھو گے۔

یہاں شاید کسی مخالف کو یہ شبہ ہو کہ کیا مسلمانوں کے نزدیک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم خدا تعالے کے برابر ہیں تو ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ عبادت میں مسلمانوں کے نزدیک خدا کا کوئی شریک نہیں حضور بھی اس میں شریک نہیں ہیں اسی لئے حضور کو سجدہ کرنا نہ زندگی میں جائز تھا نہ اب آپ کی قبر کو سجدہ جائز ہے مگر اطاعت میں حضور کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے نہ اس لئے کہ آپ شریک فی الاطاعت ہیں بلکہ اس لئے کہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں وہ سب خدا کی طرف سے پیغام

ہوتا ہے۔ تو آپ کا حکم درحقیقت آپ کا حکم نہیں بلکہ پیغمبر ہونے کی وجہ سے وہ خدا ہی کا حکم ہے۔ اس لئے یہ کہا جاتا ہے کہ آپ کے احکام کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے من یطع الرسول فقد اطاع اللہ اور ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے بادشاہ وزیر کو حکم دیتا ہے کہ رعایا میں یہ قانون شائع کر دو پس اس وقت وزیر کی زبان سے جو قانون شائع ہوتا ہے وہ درحقیقت بادشاہ کا حکم ہے اس لئے وزیر کی اطاعت بعینہٖ بادشاہ کی اطاعت ہے۔ مگر اس سے ہرگز کوئی شخص یہ نہیں سمجھتا کہ وزیر بادشاہ کے برابر ہو گیا۔ اور اگر کوئی جاہل ایسا سمجھنے لگے اور آئندہ سے بجائے بادشاہ کے تخت کو بوسہ دینے کے وزیر کی کرسی کو بوسہ دینے لگے تو یقیناً وہ معتوب ہوگا۔

اسی طرح اگر آپ کسی مقدمہ میں ایک شخص کو وکیل کر دیں تو جو کچھ وہ کہتا ہے سب آپ کی طرف منسوب ہوتا ہے کہ گویا تم خود کہتے ہو مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وکیل تمہارے برابر ہو گیا کہ تمہاری تمام جائیداد کا مالک ہو جاوے کہ اس میں جو چاہے تصرف کرے۔ ہرگز نہیں۔ پس مسلمان رسول کی اطاعت کو خدا کی اطاعت اسی معنی کر کہتے ہیں جیسے وزیر کی اطاعت بادشاہ کی اطاعت ہوتی ہے اور وکیل کا قول مؤکل کا قول ہوتا ہے۔ خوب سمجھ لو۔ اس سے شرکت و مساوات ہرگز لازم نہیں آتی۔ افسوس یہ ہے کہ مخالفین اعتراض کرتے ہوئے مسائل اسلامیہ کی حقیقت کو ذرا نہیں سمجھتے اور اگر سمجھتے ہیں تو منشا اعتراض کا محض حسد ہے۔ ورنہ مسائل اسلامیہ پر کوئی اعتراض بھی وارد نہیں ہو سکتا۔ غرض ابو داؤد کی حدیث سے معلوم ہوا کہ بعض دفعہ کوئی گناہ بدون عذاب کے اس لئے معاف ہو جاتا ہے کہ اس شخص کے پاس ایک عمل صالح ایسا ہے جو موجب ہے جو خدا کے یہاں بہت مقبول ہو چکا ہے اس کی برکت سے دوسرے گناہ معاف ہو جاتے ہیں تو اب کوئی شخص اس مسئلہ عفو و مغفرت کے بھروسہ گناہ پر دلیر نہیں ہو سکتا ہے کیونکہ یہ بات تو کسی کو معلوم نہیں کہ میرے پاس کوئی ایسا عمل بھی ہے جو خدا تعالیٰ کے یہاں بہت زیادہ مقبول ہو چکا ہے کیا کسی کو اپنا کوئی عمل ایسا یاد ہے جو نہایت اخلاص سے ہوا ہو۔ اگر کوئی کہے کہ ہاں ہم کو بعض اعمال اپنے یاد ہیں جو ہم نے نہایت اخلاص سے

کہتے ہیں تو سمجھ لو کہ

اخلاص کلی مشکک ہے جس کے تحت میں افراد متفاوت ہیں تو کسی عمل میں اخلاص ہو جانے سے یہ کیونکر معلوم ہو گیا کہ یہ اخلاص اُس درجہ کا ہے جس سے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں بہرحال بےفکری کسی حال میں نہیں ہو سکتی گو ناامیدی بھی نہ چاہیے۔

چوتھا جواب یہ ہے کہ بعض گناہوں کا بدون عقاب کے معاف ہو جانا

جواب ۴: یہ حق تعالیٰ کا عفو و کرم ہے اس کو سنکر لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ حق تعالیٰ بڑے ہی رحیم و کریم ہیں جو اپنے بندوں پر بےحد عنایت فرماتے ہیں اور قاعدہ ہے کہ طبائع سلیمہ میں عنایت و کرم سے اطاعت و عبادت کو ترقی ہوتی ہے نہ کہ سرکشی کو۔ اگر آقا کی عنایات زیادہ ہوں تو اس کی اطاعت کا شوق بڑھتا ہے۔ وہ نوکر بڑا ہی پاجی ہے جو آقا کی بےحد عنایات کے بعد بھی سرکشی ہی کرے طبائع سلیمہ تو احسان و کرم و عنایات سے بندہ بےدام ہو جاتی ہیں اس لئے یہ عقیدہ اقدام علی الجرائم کا سبب ہرگز نہیں بلکہ جرائم و سرکشی کا جڑ کاٹنے والا ہے جن لوگوں کی طبائع سلیم ہیں وہ خدا کی ان نعمتوں اور عنایتوں کو دیکھ کر اور زیادہ عبادت کرتے ہیں چنانچہ جو لوگ اسلام سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں ان میں یہ اثر مشاہد ہے۔ اب اگر اس عقیدہ سے کسی میں اقدام جرائم کا وصف پیدا ہو تو کہا جائیگا کہ یہ اس عقیدہ کا اثر نہیں بلکہ اس شخص کی کجی طبع کا اثر ہے۔ جیسے بادشاہ کا کریم ہونا طبائع سلیمہ کیلئے زیادت وفاداری کا سبب ہوتا ہے۔ گو بعض نالائق بادشاہ کے کرم کی وجہ سے جرائم پر بھی دلیر ہو جاتے ہیں، مگر کیا اسکا سبب بادشاہ کے کرم کو کہا جاوے گا یا ان کی بدطینتی کو؟ اس کا فیصلہ عقلاء خود کر سکتے ہیں۔

بعض لوگوں کو آیت لَا تقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا سے دھوکہ ہوا ہے اور وہ بےفکر ہو گئے ہیں کیونکہ وہ اس کا مطلب یہ سمجھے ہیں کہ حق تعالیٰ یقیناً سب گناہوں کو معاف کر دینگے کیونکہ یہاں لمن یشاء کی قید نہیں ہے، سو ان کو سمجھ لینا چاہئے کہ اول تو یہ آیت عام نہیں ہے بلکہ اس کا نزول ان لوگوں کے بارہ میں ہوا ہے جو کفر سے اسلام

کی طرف ناچاہتے تھے مگر ان کو اسلام سے یہ خیال مانع تھا کہ ہم نے حالت کفر میں بڑے بڑے جرائم کئے ہیں اُن کا کیا حشر ہوگا۔ آیا اسلام کے بعد ان پر مواخذہ ہوگا یا نہیں، اگر مواخذہ ہوا تو پھر اسلام سے ہی کیا فائدہ، چنانچہ حدیث میں آیا ہے۔ کہ کفار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا واسلمنا فما یفعل بذنوبنا التی اسلفنا، اولما قالوا کہ اگر ہم اسلام لے آئیں تو ہمارے پہلے گناہوں کے متعلق کیا برتاؤ ہوگا۔

اسپر یہ آیت نازل ہوئی جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے بعد پہلے گناہ جو حالت کفر میں کئے گئے ہیں۔ سب معاف ہوجاویں گے پس اس میں جو مغفرت کا وعدہ حتمی ہے وہ عام نہیں بلکہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اور لوگوں کے گناہ بدون عقاب کے معاف نہ ہوں گے۔ نہیں دوسروں کے بھی معاف ہوں گے جیسا کہ میں پہلے بیان کرچکا ہوں لیکن اُن کے لئے وہی وعدہ ہے جو دوسری آیت میں مذکور ہے۔ ویغفر مادون ذالک لمن یشاء، جس میں حتمی وعدہ نہیں بلکہ مشیت کی قید سے مشروط ہے اور اس آیت میں جو بلا قید مشیت وعدہ حتمی کیا گیا ہے یہ صرف نومسلموں کے لئے ہے کہ اسلام سے ان کے پہلے گناہ ضرور معاف ہوجاویں گے۔ جیسا کہ شان نزول سے معلوم ہورہا ہے اور شان نزول مثل تفسیر کے ہے

شان نزول سے نصوص عامہ کی تخصیص۔ شان نزول سے نصوص عامہ کی تخصیص ہوجاتی ہے۔ بہت سے نصوص بظاہر عام ہیں لیکن شان نزول سے اُن کی تقیید کیجاتی ہے جیسے لیس من البر الصیام فی السفر بظاہر عام ہے کہ سفر میں روزہ رکھنا اچھا نہیں حالانکہ فتویٰ یہ ہے کہ اگر سفر میں مشقت نہ ہو تو روزہ رکھنا افضل ہے اور حدیث کو مقید کیا گیا ہے حالت مشقت کیسا تھ۔ کیونکہ حضور نے یہ ارشاد ایسے موقع پر فرمایا تھا جبکہ آپ کا گذر ایسے شخص پر ہوا جو سفر میں روزہ دار تھا اور ضعف کیوجہ سے بیہوش و بدحواس ہوگیا تھا لوگ اس پر سایہ کر رہے تھے تاکہ دھوپ سے دماغ پر زیادہ گرمی نہ چڑھ جاوے۔ اس واقعہ میں آپ کا یہ ارشاد فرمانا اس کا قرینہ ہے کہ مراد ایسا سفر اور ایسی حالت ہے کہ اس میں روزہ رکھنا خلاف افضل ہے۔ بلکہ

اگر جان کا اندیشہ ہو تو حرام ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ ہم اس آیت کو شانِ نزول سے مقید نہیں کرتے کیونکہ اصل قاعدہ تو یہ ہے العبرۃ لعموم اللفظ لا لخصوص المورد اور آیت میں یا عبادی الذین اسرفوا علی انفسہم بظاہر سب کو عام ہے خواہ نومسلم ہوں یا مسلم قدیم تو میں کہتا ہوں کہ آپ شانِ نزول سے مقید نہیں کرتے تو دوسری آیت سے اس کو مقید کرنا پڑیگا اور ایک آیت کو دوسری آیت سے مقید کرنا اتحادِ واقعہ میں لازم ہے اور ظاہر ہے کہ آیت ان اللہ لا یغفران یشرک بہ ویغفر مادون ذالک لمن یشاء اور آیت یا عبادی الذین اسرفوا علی انفسہم دونوں عصاۃ کے بارہ میں وارد ہوئی ہیں اور ایک جگہ مغفرت بقیدِ مشیت مشروط ہے اور دوسری جگہ مطلق ہے۔ تو مطلق کو مقید پر حمل کیا جاوے گا۔

رہا یہ سوال کہ جب دونوں جگہ مشیت کی شرط ہے تو ایک آیت میں اطلاق کیوں رکھا گیا اس میں نکتہ یہ ہے کہ ایک جگہ تو قاعدہ اور قانون کا بیان کرنا مقصود ہے۔ اس لئے وہاں تو قید کو ظاہر کر دیا کہ حق تعالٰی بدون عقاب کے بھی اگر چاہیں گے تو معاف کر دیں گے اور دوسری جگہ مایوسین کی یاس کا زائل کرنا مقصود ہے۔ وہاں شرطِ مشیت کے ظاہر کرنے سے یاس کا ازالہ نہ ہوتا۔ کیونکہ مایوس آدمی کو طرح طرح کے توہمات پیدا ہوا کرتے ہیں۔ شرطِ مشیت کے اظہار سے اس کو اور وساوس پیدا ہوتے کہ نہ معلوم میرے متعلق مشیت ہو گی یا نہیں تو اس کی یاس زائل نہ ہوتی۔ اس لئے وہاں قید کو بیان نہیں فرمایا تاکہ آیت کو سنتے ہی اس پر رجاء کا غلبہ ہو جاوے اور یاس کا غلبہ جاتا رہے اور واقعی مایوس کا علاج یہی ہے کہ اس کو ایک دفعہ کامل اطمینان دلا دیا جاوے۔ جب وہ حالت یاس سے نکل جائے پھر اس کو تدریجاً اصل قانون سے مطلع کر دیا جاوے۔

اس کو وہ لوگ سمجھ سکتے ہیں جن پر کبھی یہ حالت گذری ہو یہ تو حکمت ہے اس اطلاق کی اور اس کی ضرورت بھی تھی کیونکہ اس میں مانع اسلام کو بھی مرتفع کیا گیا ہے۔

اگر یہ آیت نہ ہوتی تو کفار کو سخت وسوسہ لاحق ہوتا اور وہ اسلام سے محروم رہتے اور یہ وسوسہ واقع بھی ہو چکا ہے۔ لہٰذا ان کو مطمئن کر دیا گیا کہ تم بے فکر ہو کر اسلام لے آؤ۔ حق تعالیٰ تمہارے سب گناہ معاف کر دیں گے۔

گناہ سے ناامیدی اور نیکی سے امید

اس تقریر سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ آیت لاتقنطوا میں صرف مایوسین کی یاس کا ازالہ مقصود ہے اور یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اعمال کی ضرورت اور گناہوں سے بچنے کا اہتمام لازم نہیں بلکہ لفظ لاتقنطوا ضرورت اعمال پر خود دلالت کر رہا ہے کیونکہ اس میں قنوط و یاس کی ممانعت ہے اور تجربہ ہے کہ معاصی میں قنوط و یاس پیدا کرنے کی خاصیت ہے، رجاء بدون اعمال صالحہ کے پیدا نہیں ہوتی۔ مجرم کو اپنے جرم کا استحضار جب وقت ہوتا ہے اسوقت رجاء کا مضمون دل میں نہیں آسکتا اور اگر کسی مجرم کو رجاء ہوگی بھی تو کسی عمل صالح کی برکت سے ہوگی کہ اس کے پاس کوئی نیک کام ضرور ہوگا۔ جب قنوط سے بچنا واجب ہے تو اسباب قنوط سے بچنا بھی واجب ہوگا لان مقدمۃ الواجب واجبٌ سرکش غلام کو امید کا درجہ کبھی نصیب نہیں ہوتا۔ جب چاہے تجربہ کر لیا جائے۔ ؎

احب مناجاۃ الحبیب باوجہ ولکن لسان المذنبین کلیل

واقعی مجرم کی زبان مناجات سے بھی بند ہو جاتی ہے غرض اور افعال تو ایسے ہیں کہ بدون ان کے کبھی نہ کبھی مغفرت اور نجات ہو جائے گی خواہ بعد عقاب یا قبل عقاب۔ مگر اسلام وہ چیز ہے کہ اس کے بغیر مغفرت و نجات ممکن نہیں یہ مطلب نہیں کہ خدا اس پر قادر نہیں کہ کافر کی مغفرت کر دے بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ کافر کی مغفرت چاہیں گے نہیں۔ گو قادر ضرور ہیں۔ ورنہ تعذیب کافر پر خدا تعالیٰ کا مضطر ہونا لازم آئے گا اور اضطرار منافی وجوب ہے اور بدون ایمان واسلام کے حق تعالیٰ کا کسی کی مغفرت نہ چاہنا قرآن میں جابجا مذکور ہے۔ چنانچہ ایک آیت تو یہی ہے ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ

مگر شاید کوئی اسپر یہ شبہ کرے کہ یہاں تو صرف شرک کا ذکر ہے کفر کا ذکر نہیں اور بعض کافر ایسے بھی ہیں جو مشرک نہیں بلکہ موحد ہیں، مگر اسلام سے ابا کرتے ہیں انکی مغفرت نہ ہونا اس آیت میں کہاں مذکور ہے ؟

تو سنیئے دوسری جگہ مذکور ہے ان الذین کفروا من اهل الکتاب والمشرکین فی نار جهنم خلدین فیها اولئک هم شر البریه اس میں کافر واہل کتاب و مشرکین کا مقسم قرار دیا گیا ہے اور دونوں کے لئے خلود فی جہنم مذکور ہے جس سے کافر کی مغفرت نہ ہونا بھی معلوم ہوگئی اور یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ یہاں تو صرف خلود کا ذکر ہے۔ جس کے معنے مکث طویل کے ہیں اور اس کے لئے دوام لازم نہیں۔

جواب یہ ہے کہ دوام خلود کے منافی بھی نہیں۔ پس اگر کوئی قرینہ قائم ہو تو خلود سے دوام کا قصد ہو سکتا ہے اور یہاں خلود بمعنے دوام ہونے پر قرینہ قائم ہے۔ وہ یہ کہ مشرکین کے لئے خلود بمعنی دوام ہی ہوگا اور یہاں کافر و مشرک دونوں کا حکم مذکور ہے، جب مشرک کے لئے خلود بمعنی دوام ہے تو کافر کے لئے بھی دوام ہی ہوگا۔ ورنہ کلام واحد میں ایک لفظ سے جدا جدا معنی کا قصد لازم آئے گا۔ اور یہ ممتنع ہے۔

علاوہ ازیں یہ کہ بعض آیات میں کافر کے لئے خلود کو دوام سے موصوف بھی کیا گیا ہے چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے ان الذین کفروا قطعت لهم ثیاب من نار الی قوله تعالیٰ کلما ارادوا ان یخرجوا منها من غم اعیدوا فیها اور ارشاد ہے فالذین کفروا وصدوا عن سبیل الله ثم ماتوا وهم کفار فلن یغفر الله لهم۔ پس اب کافر کا بھی ہمیشہ کیلئے معذب ہونا صاف طور پر معلوم ہوگیا۔ جس سے اس کی عدم مغفرت بھی سمجھ میں آگئی ہوگی۔

اور یہاں سے ایک اشکال کے مندفع ہونے پر تنبیہ کئے دیتا ہوں وہ یہ کہ خلود کے معنے مکث طویل ہونے سے اس آیت کی تفسیر واضح ہوگئی جو قاتل عمد کے بارہ میں وارد ہے ومن یقتل مؤمنا متعمدا فجزاؤه جهنم خالدا فیها کہ اس سے قاتل عمد کی توبہ کا مقبول نہ

ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ اس میں خلود بدون قید دوام مذکور ہے اور خلود دوام کو مستلزم نہیں۔ نہ یہاں کوئی قرینہ ارادۂ دوام کے لیے مرجح ہے۔ اس لئے مدلول آیت صرف اس قدر ہے کہ قاتل عمد کو زمانہ دراز تک عذاب جہنم ہوگا مگر کسی وقت نجات ہو جائے گی، گو مدت دراز کے بعد ہو اور جب وہ مستحق نجات ہے تو اس کی توبہ بھی قبول ہونی چاہیے اس میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا اختلاف ہے، کہ ان کے نزدیک قاتل عمد کے لئے توبہ نہیں۔ مگر جمہور صحابہؓ کے نزدیک قبول ہے پھر صحابہ کے بعد تابعین و تبع تابعین و ائمہ مجتہدین کا اس پر اجماع ہو گیا کہ اس کی توبہ مقبول ہو سکتی ہے۔ جب کہ قاعدہ شرعیہ سے ہوا اور قاعدہ ہے کہ اجماع متاخر اختلاف متقدم کا رافع ہوتا ہے۔ لہٰذا اب یہ مسئلہ اجماعی ہے مگر کفار و مشرکین کے لیے دوسری بعض آیات میں خلود کے ساتھ دوام بھی مذکور ہے اس لئے وہاں مغفرت کا کوئی احتمال نہیں۔ کیونکہ خلود کے معنی بہت دن رہنا ہے اور ابد وہ ہے جس کا کبھی انقطاع نہ ہو حاصل یہ ہوا کہ کفار و مشرکین جہنم میں ایسی دراز مدت کے لئے داخل ہوں گے جس کا انقطاع ہی نہ ہوگا اور ظاہر ہے کہ کفر کہتے ہیں خلاف اسلام کو خواہ اس کے ساتھ شرک بھی ہو یا نہ ہو۔ دونوں کے لیے سزا ابد الآباد جہنم ہے۔

جب ترک اسلام کی سزا یہ ہے تو اس سے اسلام کی عظمت و

کفر سے بڑا جرم: فضیلت اور اس کی ضرورت کا درجہ معلوم ہو گیا اور ترک اسلام کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ اول ہی سے اسلام قبول نہ کرے۔ دوسرے یہ کہ بعد قبول کر کے ترک کر دے۔ دونوں صورتوں میں یہی سزا ہے بلکہ دوسری صورت پہلی سے اشد ہے۔ چنانچہ قوانین سلطنت میں بھی باغی کی سزا ان لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے جو پہلے ہی سے اس سلطنت کی رعایا نہیں ہیں بلکہ کسی مخالف سلطنت کی رعایا ہیں ایسے لوگوں پر اگر کبھی غلبہ ہو جائے تو ان کو غلام بنا لیتے ہیں یا احسان کر کے رہا کر دیتے ہیں یا عزت کیساتھ نظر بند کر دیتے ہیں مگر باغی کے لیے بجز قتل یا عبور دریائے شور کے کچھ سزا ہی نہیں۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ رعایا بن کر باغی ہو جانے میں سلطنت کی زیادہ توہین

ہے اسی طرح اسلام لاکر مرتد ہو جانے میں اسلام کی سخت توہین ہے اور اس کی تعلیم کو دوسروں کی نظروں میں حقیر کرنا ہے۔ دیکھئے ایک تو وہ شخص ہے جس سے کبھی آپ کی دوستی نہیں ہوئی بلکہ ہمیشہ سے مخالفت ہے اس کی مخالفت سے آپ کا اتنا ضرر نہیں ہوتا اور کبھی وہ آپ کی مذمت و ہجو کرے تو لوگوں کی نظروں میں اس کی کچھ وقعت نہیں ہوتی سب کہہ دیتے ہیں کہ میاں اس کو تو ہمیشہ سے اس کے ساتھ عداوت ہے دشمنی میں ایسی باتیں کرتا ہے۔ اور ایک وہ شخص ہے جو سالہاسال آپ کا دوست رہا۔ پھر کسی وقت مخالف بن گیا۔ اس کی مخالفت سے بہت ضرر پہونچتا ہے اور وہ جو کچھ برائیاں آپ کی کرتا ہے۔ لوگ ان پر توجہ کرتے ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ یہ شخص جو کچھ کہہ رہا ہے اس کا منشا محض عداوت نہیں ہے اگر دشمن ہوتا تو سالہاسال تک دوست کیوں بنتا؟ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو دوستی کے بعد فلاں شخص کے اندر کے پترے معلوم ہو گئے ہیں اس لئے مخالف ہو گیا (حالانکہ یہ ضرور نہیں ہے کہ جو شخص دوستی کے بعد دشمن بنا ہو وہ گھر کے پترے معلوم کرنے کے بعد ہی دشمن بنا ہو۔ ممکن ہے کہ اس شخص نے دوستی ہی اس نیت سے کی ہو کہ لوگ دوستی کے زمانہ میں مجھے اس کا رازدار سمجھ لیں گے تو پھر مخالفت کی حالت میں جو کچھ کہوں گا اس کو یہ سمجھ کر قبول کر لیں گے کہ یہ شخص رازدار رہ چکا ہے اس کو ضرور کچھ ناگوار باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ اس لئے مخالف ہو گیا چنانچہ بعض یہود نے اسلام کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنے کا ارادہ کیا تھا وقالت طائفة من اهل الكتاب امنوا بالذي انزل على الذين امنوا وجه النهار واكفروا اخره لعلهم يرجعون ؎ ہر چند کہ دوست کی مخالفت میں یہ احتمال بھی ہے مگر عادۃً لوگ دوستوں کی مخالفت سے عموماً جلد متاثر ہو جاتے ہیں اور اس احتمال پر نظر نہیں کرتے) اس لئے عقلاً و شرعاً و قانوناً وہ شخص بہت بڑا مجرم شمار ہوتا ہے جو موافقت کے بعد مخالفت کرے اسی لئے شریعت میں مرتد کے لئے دنیوی سزا بھی سخت ہے اور عذاب آخرت بھی اشد ہے۔

اس تقریر سے آیت کے ترجمہ و تفسیر کا بیان تو ہو گیا کیونکہ اس آیت میں اصل مقصود

؎ عبارت ما بین القوسین من الجامع ۱۲

اسلام کی فضیلت ہی کا بیان ہے مگر مجھے اس وقت صرف بیان فضیلت پر اکتفا مقصود نہیں بلکہ
اسپر ایک دوسرے مضمون کو مرتب کرنا ہے جس کو آئندہ بتلاؤں گا۔
اس سے پہلے ایک شبہ عقلی

محدود کفر پر غیر محدود عذاب، شبہ کا جواب

کا جواب دینا چاہتا ہوں۔ شبہ یہ ہے کہ شریعت میں کفر کی سزا دائمی عذاب جہنم کیوں ہے؟ حالانکہ سزا مناسب جنایت ہونی چاہیے اور یہاں جنایت متناہی ہے۔ کیونکہ عمر کافر کی متناہی ہے تو سزا بھی متناہی ہونی چاہیے۔
اس کا جواب یہ ہے کہ تمہارا یہ مقدمہ تو مسلم ہے کہ سزا جنایت کے مناسب ہونی چاہئے مگر کیا تناسب کے یہ معنی ہیں کہ جنایت اور سزا دونوں کا زمانہ بھی مناسب ہو اگر یہی بات ہے تو چاہئے کہ جس جگہ دو گھنٹہ تک ڈکیتی پڑی ہو اور ڈاکو گرفتار ہو کر آئیں تو حاکم ڈاکوؤں کو صرف دو گھنٹہ کی سزا دیدے۔ اگر حاکم ایسا کرے تو کیا آپ اس کو انصاف مانیں گے؟ اور سزا کو جنایت کے مناسب مانیں گے؟ ہرگز نہیں اس سے معلوم ہوا کہ سزا و جنایت میں مناسبت کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ دونوں کا زمانہ مناسب ہو بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سزا میں شدت بقدر شدت جرم ہو۔ اب تم خود فیصلہ کرلو کہ شریعت نے کفر کی سزا میں جو شدت بیان کی ہے وہ شدت جرم کے مناسب ہے یا نہیں اور یہ جرم شدید ہے یا نہیں؟
شاید آپ کہیں کہ جرم شدید تو ہے مگر

جواب ۲ جزا و سزا میں نیت کا دخل: نہ ایسا شدید کہ اس کی سزا ابدالآباد جہنم ہو میں کہوں گا کہ یہ خیال آپ کو اس لئے پیدا ہوا کہ تم نے فعل کی صرف ظاہری صورت پر نظر کی ہے۔ حالانکہ سزا و جزا کا مدار محض اس کی ظاہری صورت پر نہیں ہے بلکہ نیت کو بھی اس میں بہت بڑا دخل ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اصل مدار نیت ہی پر ہے۔ چنانچہ اگر ایک شخص دھوکہ سے شراب پی لے تو اس کو گناہ نہیں ہوا گو صورت گناہ موجود ہے۔ کیونکہ نیت نہ تھی۔ اور اگر ایک شخص شراب پینے کے لئے دوکان پر جائے اور دوکاندار بجائے شراب کے کوئی شربت اس کو دیدے جسے یہ

شراب سمجھ کر پی لے تو اس کو گناہ ہوگا کیونکہ اس کی نیت تو شراب پینے ہی کی تھی۔ اسی لئے فقہاء نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے مجامعت کرے مگر وہ اندھیرے میں یہ سمجھتا ہے کہ یہ میری بیوی نہیں بلکہ کوئی اجنبی عورت ہے، تو اسکو گناہ ہوگا۔ اسی طرح اگر مجامعت میں تصور کسی اجنبیہ کا کرے یعنی بیوی سے مجامعت کرتے ہوئے یہ تصور کرے کہ میں گویا فلاں اجنبیہ سے مجامعت کر رہا ہوں اور اس کی صورت ذہن میں حاضر کر کے اس سے لذت لے، تب بھی گناہ ہوگا اور اگر شب زفاف میں عورتوں نے اس کے پاس غلطی سے بجائے اس کی بیوی کے کسی دوسری عورت کو بھیج دیا جس کے ساتھ یہ شخص یہ سمجھ کر ہمبستر ہوا کہ یہی میری بیوی ہے تو اس کو گناہ نہ ہوگا اور یہ وطی زنا شمار نہ ہوگی بلکہ وطی بالشبہ ہوگی جس سے ثبوت نسب بھی ہو جاتا ہے اور عدت بھی لازم ہوتی ہے۔ جب یہ بات معلوم ہوگئی تو سمجھو کہ ظاہر میں کفر کافر متناہی ہے مگر اس کی نیت یہ تھی کہ اگر زندہ رہا تو میں ابدالآباد اسی حالت پر رہوں گا اس لئے اپنی نیت کے موافق اس کو ابدالآباد جہنم کا عذاب ہوگا اور اسی طرح مسلمان کا اسلام گو بظاہر متناہی ہے مگر اس کی نیت یہ ہے کہ اگر میں ہمیشہ زندہ رہوں تو ہمیشہ اسلام پر مستقیم رہوں گا اس لئے اُس کے لئے ابدالآباد ثواب جنت ہے۔

اتلاف حقوق الٰہی کی سزا جواب ۳

اور ایک دقیق جواب یہ ہے کہ کفر سے حقوق الٰہی کی تفویت ہے اور حقوق الٰہی غیر متناہی ہیں تو ان کی تفویت کی سزا بھی غیر متناہی ہونی چاہئے اور اسلام میں حقوق الٰہی کی رعایت ہے اور وہ غیر متناہی ہیں تو ان کی رعایت کا بدلہ بھی غیر متناہی ہونا چاہئے۔

الحمدللہ اب یہ اشکال بالکل مرتفع ہوگیا۔

اب میں اس مقصود کو بیان کرنا چاہتا ہوں جو فضیلت اسلام پر مجھے متفرع کرنا ہے اور وہ دو مقصود ہیں ایک راجع ہے اپنی طرف دوسرا راجع ہے دوسروں کی طرف یعنی ایک مقصود لازم ہے ایک متعدی۔

اس آیت سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ اسلام کی نعمت

نعمت اسلام کی ناقدری: جو ہم کو حق تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے یہ بہت بڑی نعمت ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں اس کا مقتضا یہ ہے کہ ہم کو اس نعمت کا شکر ادا کرتے رہنا چاہئے مگر ہماری حالت یہ ہے کہ ہم ادنیٰ ادنیٰ نعمت پر تو شکر کرتے ہیں مگر اسلام عطا ہونے پر شکر بہت کم لوگ کرتے ہیں۔ اور نعمت کا ادنیٰ و اعلیٰ ہونا باعتبار اضافت و نسبت کے ہے کہ بعض نعمتیں بعض کے مقابلہ میں ادنیٰ ہیں اور بعض اعلیٰ ہیں ورنہ فی نفسہ کوئی نعمت ادنیٰ نہیں خدا کی نعمتیں سب بڑی ہی ہیں ؎

آسماں نسبت بعرش آمد فرود　　لیک بس عالی ست نزد خاک تود

غرض ہم لوگ شادی پر شکر کرتے ہیں کہ خدا کا شکر ہے

نعمت اسلام پر شکر: کہ لڑکی یا لڑکے کا نکاح بخوبی ہوگیا۔ اس پر احباب بھی مبارکباد دیتے ہیں۔ خود بھی ہر شخص کا دل اس نعمت سے شاداں و فرحاں ہوتا ہے۔ اسی طرح تنخواہ ملنے پر نوکری مل جانے پر شکر کرتے ہیں روٹی کھا کر بھی الحمد للہ شکر کہہ لیتے ہیں ہر چند کہ ہمارا شکر اس قابل نہیں کہ اسکو شکر کہا جاوے۔ کیونکہ اکثر ہم لوگ دل سے شکر نہیں کرتے صرف زبان سے الحمد للہ شکر بے ساختہ نکل جاتا ہے۔ اور اگر دل سے بھی نکلتا ہو تب بھی وہ شکر ناقص ہی ہے کیونکہ شکر کے تین درجے ہیں۔ دل سے، زبان سے افعال و اعمال سے، ہم لوگ اول تو محض زبان ہی سے شکر کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی دل سے بھی کرتا ہو، تو افعال سے شکر کرنے والے تو بہت کم ہیں۔ اور اگر کوئی اعمال سے بھی شکر کرتا ہو جب بھی خدا کی نعمت کا حق ہم سے ادا نہیں ہو سکتا حق تعالیٰ کی ہر نعمت بہت بڑی ہے ایک کا شکر بھی کما حقہ دشوار ہے۔ خصوصاً جب کہ یہ دیکھا جائے کہ خدا تعالیٰ کا یہ انعام ہمارے اوپر ایسی حالت میں ہوا ہے کہ ہم انعام کے قابل نہ تھے بلکہ سزا کے قابل تھے۔ ہمارے ساتھ جو خدا کا معاملہ ہے۔ اس کے مقابلہ میں خدا تعالیٰ کے ساتھ جو ہمارا برتاؤ ہے اس کو کسی اور آقا کے ساتھ کر کے دیکھا جائے تب حقیقت معلوم ہو کہ ہم حقیقت

ہیں زمین کے اندر گاڑ دیے جانے کے قابل تھے مگر پھر بھی وہاں سے انعام ہی ہوتا ہے۔

پھر نعمت بھی ایک نہیں بلکہ واسبغ علیکم نعمہ ظاہرۃ وباطنۃ۔ حق تعالیٰ کی طرف سے ہم کو ظاہری و باطنی نعمتیں بے شمار عطا ہوتی ہیں۔ باطنی نعمت سے وہ مراد نہیں، جس کو تصوف کی اصطلاح میں باطنی نعمت کہا جاتا ہے تاکہ یہ شبہ پیدا ہو کہ ہم سب اہل باطن صوفی ہو گئے بلکہ مطلب یہ ہے کہ بعض نعمتیں محسوس ہیں، بعض غیر محسوس ہیں۔ نعمت ظاہرہ سے محسوس مراد ہیں اور باطنہ سے غیر محسوس، جس کی ایک فرد وہ بھی ہے جس کو صوفیہ کی اصطلاح میں نعمت باطنی کہتے ہیں۔ مگر سب میں اس کا وجود ضروری نہیں۔ کیونکہ یہاں یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ تمام نعم ظاہرہ اور تمام نعم باطنہ ہر شخص کو عطا ہوئی ہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کو نعم ظاہرہ و باطنہ سے کچھ حصہ ضرور ملا ہے۔ جس کیلئے یہ لازم نہیں کہ ہر شخص میں سب کی سب مجتمع ہوں۔ بہر حال ہر شخص کو ظاہری اور باطنی نعمتیں بقدر کثیر حاصل ہیں تو جب ایک نعمت کا شکر ہم سے ادا نہیں ہو سکتا، تو مقدار کثیر کا شکر کیونکر ادا ہو سکتا ہے؟ یہ تو حقیقت کے اعتبار سے ہے۔

مگر حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ وہ ہم سے شکر حقیقی کا مطالبہ نہیں کرتے بلکہ اسی قدر کا مطالبہ فرماتے ہیں جتنا ہم سے ہو سکتا ہے مگر افسوس کہ ہم اتنا بھی نہیں کرتے کوئی محض شکر لسانی پر اکتفا کرتا ہے۔ کوئی محض قلبی پر، کوئی دونوں کو جمع کرتا ہے تو اعمال میں کوتاہی کرتا ہے۔ مگر خیر جیسا شکر بھی ہم کرتے ہیں وہ دنیوی نعمتوں کے ظہور کے وقت ظاہر ہوتا ہے نعمت اسلام پر کوئی شکر نہیں کرتا بتلائیے یہاں اتنا مجمع موجود ہے ہر شخص اپنے دل میں غور کرے کہ چوبیس گھنٹے میں کوئی ساعت بھی ایسی ہوتی ہے جس میں ہر شخص خدا تعالیٰ کا اس لئے شکر کرے کہ اس نے ہم کو مسلمان بنایا اسلام و ایمان عطا کیا۔ مسلمانوں کے گھر پیدا کیا۔ غالباً کوئی شخص بھی ایسا نکلے گا الا ماشاء اللہ تو یہ ہماری کتنی بڑی کوتاہی ہے کہ ایسی نعمت پر شکر کی توفیق ہم کو نہیں ہوتی۔ جس سے بڑی کوئی نعمت نہیں اور مرنے کے بعد ہمیشہ کی نجات کا مدار اسی پر ہے۔ بھلا اگر یہ نعمت سلب ہو جاوے خدانخواستہ تو پھر ہمارا کہاں ٹھکانا ہے گا جب یہ اتنی بڑی نعمت ہے تو

اس کا شکر نہ ادا کرنا بڑی غفلت ہے۔

تدبیر حسن خاتمہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ کا ارشاد ہے کہ اگر ایمان پر خاتمہ چاہتے ہو تو ہمیشہ نعمت ایمان پر خدا کا شکر کرتے رہو۔ کیونکہ حق تعالیٰ کا وعدہ ہے لئن شکرتم لازیدنکم اگر تم میرا شکر کرو گے تو میں نعمت کو بڑھاؤں گا اسے زیادہ کروں گا۔ سبحان اللہ یہ نہیں فرمایا لئن شکرتم لا اسلبنکم یا لا انقصنکم کہ اگر شکر کرو گے تو میں نعمت سلب نہ کرونگا یا کم نہ کرونگا بلکہ لازیدنکم فرمایا جس میں زیادت کا وعدہ ہے وعدۂ زیادت سے نقصان کی نفی ہو گئی اور نفی نقصان سے سلب کی نفی بدرجۂ اولیٰ ہو گئی کیا بلاغت ہے کہ ایک لفظ ایسا فرما دیا جس سے نقصان و سلب دونوں کی نفی بھی ہو گئی اور ترقی کا وعدہ بھی ہو گیا۔ کوئی کلام ایسا بلیغ ہے جس کے ایک لفظ سے اتنے معانی حاصل ہوتے ہوں اگر خدا فہم دے تو قرآن کا لفظ لفظ اعجاز سے بھرا ہوا ہے جب شکر پر وعدہ زیادت ہے تو جو شخص نعمت ایمان پر شکر ادا کرتا رہے گا اس کا ایمان کبھی زائل یا کم نہ ہو گا بلکہ دن بدن بڑھتا رہے گا۔ پس یہ ورد دستور العمل بنانے کے قابل ہے اگر اپنا ایمان دنیا سے سلامت لیجانا چاہتے ہو تو ایمان کا شکر کبھی نہ بھولو۔ اللھم لک الحمد ولک الشکر علی ما اولیتنی من نعمۃ الاسلام ولک الحمد ولک الشکر علی ما اکرمتنی بنعمۃ الایمان۔ اللھم توفنا مسلمین والحقنا بالصالحین غیر خزایا ولا مفتونین آمین ۱۲ جامع۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا کہ میری امت غافل ہے یہ از خود ایمان و اسلام کا شکر بہت کم ادا کریگی۔

دعا بعد طعام میں شکر اسلام کی تعلیم اس لئے حضور نے بعض دعائیں ہم کو ایسی تعلیم فرمائیں جن میں اسلام کا شکر بھی ادا ہو جاتا ہے مثلاً کھانے کے بعد کے لئے یہ دعا تعلیم فرمائی الحمد للہ الذی اطعمنی وسقانی وجعلنی من المسلمین خدا کا شکر ہے جس نے مجھ کو کھلایا اور پلایا اور مجھے مسلمانوں میں داخل کیا۔ کھانے کے ذیل میں اسلام پر شکر کی تعلیم فرمانے میں ایک نکتہ ہے وہ یہ کہ اس میں

اشارتاً بتلایا گیا ہے کہ تم ایسے نہیں ہو جو مستقلاً اسلام کا شکر ادا کرو۔ اس لئے بچوں کی طرح روٹیوں کے بعد شکر اسلام کی تعلیم فرمائی کہ میاں اور کسی وقت شکر نہ کرو، تو روٹیاں کھانے کے بعد تو اسلام کا شکر ادا کر لیا کرو۔ کیونکہ اس وقت ایک ظاہری نعمت تمہارے سامنے ہوتی ہے اس کا شکر تو تم طبعاً ادا کر رہی ہو گے۔ اس کے ساتھ ساتھ نعمت اسلام کا شکر بھی ادا کر لو۔ جس سے یہ سب کھانا پینا بھی نعمت ہو گیا اور اسلام کی بدولت آخرت میں بھی تم کو یہ نعمتیں نصیب ہوں گی اگر نعمت اسلام نہ ہوتی تو کھانا پینا سب وبال جان ہوتا اور اس کی لذت چند روزہ ہوتی۔ پس روٹیوں کے ساتھ شکر اسلام تعلیم فرمانا ایسا ہے جیسے بچوں کو بتاشہ میں دوا دیتے ہیں۔ افسوس ہم ایسے غافل ہیں کہ حضور ہم کو بچوں کی طرح بہلا پھسلا کر شکر اسلام کی تعلیم فرماتے ہیں۔ اور اسی طرح اپنے کھانے کے ذیل میں کھانے کے بعد حضورؐ نے ایک اور مفید دعا بھی تعلیم فرمائی ہے کہ جب کسی دوسرے کے گھر کھانا کھاؤ تو یوں کہو اللھم اطعم من اطعمنی واسق من سقانی یعنی دعوت کرنے والے کو دعا دو کہ اے اللہ جس طرح اس نے ہم کو کھلایا پلایا ہے آپ بھی اس کو ہمیشہ کھلاتے پلاتے رہیں یا جنت کے طعام و شراب سے ممتاز فرمائیں۔ حضورؐ کی تو یہ تعلیم ہے مگر یہاں یہ عادت ہے کہ کھلانے والے کو دعا تو کیا دیتے اس کا شکر تو کیا ادا کرتے الٹا کھانے میں عیب نکالتے ہیں خصوصاً رسوم کے کھانوں میں تو اکثر یہی ہوتا ہے۔ ایک بنیے نے اپنی لڑکی کی شادی میں بہت بڑی بارات بلائی تھی اور دعوت کا سامان بہت بڑھیا کیا تھا۔ اس کے علاوہ چلتے ہوئے ہر باراتی کو ایک ایک اشرفی بھی دی تھی یہ سب کچھ کر کے اس کو خیال ہوا کہ آج بارات والے میری خوب تعریف کرتے جائیں گے۔ وہ اپنی تعریف سننے کے لئے اس راستہ میں چھپ کر بیٹھ گیا، جہاں سے بارات گزر رہی تھی مگر وہاں بالکل سناٹا تھا۔ کسی نے بھی تو بنیے کی دریا دلی کی داد نہ دی آخر بہت دیر کے بعد ایک گاڑی میں سے آواز آئی کہ کوئی شخص دوسرے سے کہہ رہا ہے کہ بھائی! لالہ جی نے بڑی حوصلہ کی دعوت کی۔ اچھے اچھے کھانے کھلائے اور چلتے ہوئے ایک ایک اشرفی دی تو دوسرا کیا کہتا ہے کیا میاں کیا کیا؛

سسرے کے یہاں اشرفیوں کے کوٹھے بھرے پڑے ہیں۔ ڈو دو بانٹ دیتا تو اس کے کیا کمی آجاتی؟ تب لیجئے ایک ایک اشرفی بانٹ کر تو سسرے کا خطاب ملا۔ زیادہ بانٹتا تو نہ معلوم کیا خطاب ملتا؟

اسی لئے محققین نے کہا ہے کہ اس شخص سے زیادہ

حُبّ جاہ کی حقیقت، کوئی احمق نہیں جو طالب جاہ ہو۔ کیونکہ یہ کمال محض وہمی اختراعی ہے اور اختراعی بھی ایسا جو اس شخص کے ساتھ خود قائم نہیں۔ بلکہ دوسرے کے خیال کے ساتھ قائم ہے۔ کیونکہ جاہ نام ہے دوسروں کی نظر میں معزز ہونے کا جس کا مدار محض دوسرے کے خیال پر ہے جو کہ اپنے وجود میں خود اس دوسرے کے تابع ہے۔ وہ جب چاہے بدل دے، تو ساری جاہ خاک میں ملجاتی ہے۔ مگر طالب جاہ خوش ہے کہ آہا لوگ مجھے اچھا کہتے ہیں۔ جیسے چوہا خوش ہوتا ہے کہ بنئے کی دوکان میں میرے واسطے غلّہ آیا ہے؟ جی ہاں۔ ذرا منہ تو ڈالو ابھی چوہے دان آتا ہے جب سے ساری خوشی کرکری ہوجائے گی۔

اسی طرح دوسرے شخص کا اپنا خیال بدل دینا یہ جاہ کے لئے چوہے دان ہے ایک نقص تو جاہ میں یہ ہے کہ وہ سراسر دوسرے کے تابع ہے وہ ایسا کمال نہیں جو اپنے قبضہ کا ہو۔ دوسرا نقص یہ ہے کہ اس سے نفع جو حاصل ہوتا ہے وہ محض وہمی ہے یعنی بڑائی اور عزت؟ کیونکہ عزت و بڑائی سے نہ گھر میں روپیہ آتا ہے نہ جائیداد بڑھتی ہے۔ محض دل سے خوش کرلو ورنہ جاہ سے تو چکن میں ایک ٹکن بھی نہیں لگتا۔ اور جو لوگ جاہ سے نفع مالی حاصل کرتے ہیں جیسے بعض لوگ بڑا بن کر غریبوں سے بیگار لیتے ہیں یا جا دبیجا فرمائشیں کرتے رہتے ہیں۔ ان کی جاہ بہت جلد زائل ہوجاتی ہے۔ غرض اس سے بدوں خیالی نفع کے اور کچھ فائدہ نہیں۔

ایک رئیس نے دیوبند میں بڑی دھوم دھام کی دعوت کی تھی۔ جس میں بڑا روپیہ صرف ہوا تھا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ نے دعوت کے بعد ان

رئیس صاحب کو اس فراخ حوصلگی کی داد اس طرح دی کہ شیخ صاحب! واقعی آپ نے بڑے حوصلہ کا کام کیا۔ مگر افسوس یہ ہے کہ اتنا روپیہ خرچ کر کے آپ نے ایسی چیز خریدی جو بازار میں پھوٹی کوڑی کو بھی نہیں بک سکتی۔ یعنی نام۔ اور اگر بدنامی ہوگئی تو وہ خیالی جاہ بھی جاتی رہی۔ بس جاہ کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی منہار پوٹلا باندھے ہوئے چوڑیوں کا بیجا رہا تھا۔ ایک گنوار نے لاٹھی کا کھودا مار کر پوچھا کہ میاں اس میں کیا ہے؟ گنوار والوں کی عادت ہے کہ وہ لاٹھی مار کر پوچھا کرتے ہیں۔ اس منہار نے جواب دیا کہ اس میں ایسی چیز ہے کہ ایک کھودا اور مار دو تو کچھ بھی نہیں۔ اسی طرح جاہ ایسی چیز ہے کہ ذرا سی ٹھیس میں جاتی رہتی ہے۔ اس لئے جو لوگ نام کے واسطے روپیہ برباد کرتے ہیں وہ بڑی غلطی کرتے ہیں اور اس سے بڑھ کر غلطی کھلانے والوں کی ہے کہ وہ دوسروں کا مال کھا کر شکر نہیں ادا کرتے۔ نہ اُسے دعا دیتے ہیں۔

ہاں آج کل مُردوں کو فاتحہ میں دُعا دیجاتی ہے وہاں بھی کھلانے والوں کو کوئی دُعا نہیں دیتا۔ حالانکہ پہلے کھلانیوالے کو دُعا دینی چاہئے۔ اگر وہ نہ کھلاتا تو مردوں کو ثواب کیسے پہنچتا؟ بلکہ کھانیوالوں کو بھی دعا دینی چاہیئے اور اُن کا مشکور ہونا چاہیئے کیونکہ وہ نہ کھاویں تب بھی مردوں کو ثواب نہیں پہنچ سکتا۔

میرٹھ میں ایک لطیفہ ہوا کسی جگہ مُردوں کی فاتحہ دی جارہی تھی اور ایک لمبی فہرست پڑھی جارہی تھی جس میں نمبر وار مردوں کے نام تھے۔ جب فہرست کے ختم ہونے میں دیر لگی تو ایک صاحب بولے کہ میاں اس میں ہمارا نام بھی تو لکھا ہوتا کیونکہ خدا کی قسم اگر تم نہ کھاویں تو ان میں سے ایک کو بھی تو ثواب نہ ملے گا اس پر سب لوگ ہنس پڑے اور وہ فہرست مختصر کی گئی۔

ان رسوم میں ایک بات ایسی ضرور موجود ہوتی ہے جو ان کے لغو باطل ہونے پر خود دلالت کرتی ہے۔ چنانچہ کھانے سے پہلے مردوں کے نام ترتیب وار لیا جانا یہ محض لغو حرکت ہے۔ آخر یہ نام کسے سنائے جارہے ہیں۔ اگر کھانے والوں کو سنائے جاتے ہیں کہ تم ان لوگوں کی نیت کر کے کھانا، تو ظاہر ہے کہ کھانے والے جب ہاتھ دھو کر بیٹھتے ہیں

ان کو سوا کھانے کے اور کچھ یاد نہیں رہتا اور نہ اتنی لمبی فہرست یاد رہ سکتی ہے اور اگر خدا کو سنانا ہے تو اس کا لغو ہونا بالکل ظاہر ہے۔ خدا تعالیٰ کو تو ہر شخص کی نیت کا حال معلوم ہے۔ ان کو سنانے کی کیا ضرورت ہے، مگر پھر بھی بعض لوگ اپنی اغراض کے لئے فاتحہ وغیرہ کو دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

چنانچہ ایک صاحب کہنے لگے کہ مولوی خواہ مخواہ فاتحہ کا انکار کرتے ہیں حالانکہ سورۂ فاتحہ خاص اسی واسطے اتری ہے۔ چنانچہ اس کا نام ہی فاتحہ ہے۔ سبحان اللہ! کیا پاکیزہ دلیل ہے۔ پھر یہ لوگ علماء سے بحث کر کے دقائق علمیہ کو سمجھنا چاہتے ہیں اور جب نہیں سمجھتے تو علماء پر الزام لگاتے ہیں۔ یہ ہم کو سمجھا نہیں سکتے۔ غرض حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ہم کو کھانے کے بھی سب آداب بتلائے ہیں۔ جن میں ضمناً اسلام پر بھی شکر کی تعلیم فرمائی۔

شکر کے معنی

اب سمجھیے کہ شکر کے معنی ہیں قدر دانی کے۔ اسی واسطے خدا تعالیٰ کا نام شکور ہے کہ وہ اعمال کی قدر کرتے ہیں۔ قدر کی دو صورتیں ہیں۔ اگر یہ شخص حاجت مند ہے تو اس کی قدر تو یہ ہے کہ اس سے منفعت حاصل کرے اور منعم کا ممنون احسان ہے اور اگر حاجت مند نہیں ہے تو اس کی قدر یہ ہے کہ اس فعل کی جزا و صلہ عطا کرے چنانچہ حق تعالیٰ کو شکور اسی معنی کے اعتبار سے کہتے ہیں۔ ان کی قدر دانی یہی ہے کہ وہ بندوں کے اعمال کا صلہ دیتے ہیں اور بندہ کی قدر دانی یہ ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی نعمتوں سے وہ منافع حاصل کرے جن کے لئے وہ موضوع ہیں۔ مثلاً روٹی کی قدر یہ ہے کہ اسے کھاؤ، پانی کی قدر یہ ہے کہ پیو اور برف کی قدر یہ ہے کہ اس سے ٹھنڈک حاصل کرو۔ اگر کوئی شخص برف کو پانی میں گھول کر معمولی برتن کے اندر رکھ دے تو کہا جاتا ہے کہ اسے برف کی قدر نہیں ہے یعنی جس منفعت کے لئے وہ موضوع تھی اس سے وہ نفع حاصل نہ کیا۔ اس لئے ناقدری کی۔ اسی طرح اسلام کا شکر یہ ہے کہ اس کی قدر کرو اور قدر یہ ہے کہ اس کی برکات و منافع حاصل کرو۔

اب سنو کہ اسلام کے منافع کیا ہیں سو سمجھنا چاہیے کہ اسلام کے دو درجے

منافع اسلام: ہیں ایک درجہ تلفظ و اقرار شہادتین کا ہے کہ خدا کو وحدہ لاشریک لہ سمجھے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار کرے۔ یہ تو ادنیٰ درجہ ہے۔

اور ادنیٰ درجہ کے معنی یہ ہیں کہ ایسا ضروری ہے کہ اس کے بغیر نجات ہو ہی نہیں سکتی یہ تو برکت ادنیٰ درجہ سے حاصل ہو جاتی ہے کہ اس کی بدولت کسی نہ کسی وقت جہنم سے چھٹکارہ ہو جاوے گا۔

اور ایک درجہ اس سے اعلیٰ ہے کہ شہادتین کا اقرار کر کے فرائض و واجبات اسلامیہ کی پابندی بھی کی جائے۔ اس سے نجات کامل حاصل ہوتی ہے کہ بدون عذاب کے جنت میں جانا نصیب ہوتا ہے اور بڑے بڑے درجات ملتے ہیں تو معلوم ہوا کہ نجات کامل کے لئے تکمیل اسلام کی ضرورت ہے اور ظاہر ہے کہ ہر شخص نجات کامل ہی کا متوقع ہوتا ہے۔ مقدمات میں ہر شخص کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ کسی طرح بدون سزا و جرمانہ کے رہائی ہو جاوے۔ اس کا متوقع کوئی نہیں ہوتا کہ بس رہائی ہو جاوے خواہ سزا ہی کے بعد سہی۔

اسی طرح ہر مطلوب میں انسان کو درجۂ کمال ہی مطلوب ہوتا ہے تو اسلام میں بھی درجۂ کمال مطلوب ہونا چاہئے۔ دیکھئے مکان دو قسم کے ہیں۔ ایک تو وہ ہے جس میں گوندے کی دیواریں ہیں، نیچی چھت ہے، نہ ہوا کا آرام، نہ دھوپ کا، پاخانہ باورچیخانہ سب ایک ہی جگہ آس پاس ہیں۔ اور ایک وہ مکان ہے جس کا صحن وسیع ہے۔ ہوا کا بھی آرام ہے اور دھوپ کا بھی، دیواریں بھی مضبوط ہیں، چھت بھی اونچی ہے، غسل خانہ بھی ہے، ہوا کے لئے روشندان اور کھڑکیاں بھی ہیں۔ تمام ضروریات اعلیٰ پیمانے پر ہیں۔ پھر اس میں زینت و آرائش بھی ہر قسم کی ہے۔ خود فیصلہ کر لیجئے کہ مطلوب کون سا مکان ہوگا۔ اسی طرح کپڑا ایک تو وہ ہے جو بدنما صورت ہونے کے ساتھ اتنا کم ہے جس کو کفن کی طرح لپیٹ لیا جاوے (یعنی بدن ڈھانکنے سے قاصر ہے)، ایک وہ کپڑا ہے جس سے بدن بخوبی چھپ سکتا ہے۔ خوش نما خوبصورت ہے

عمدہ وسلا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص کو ایسا ہی کپڑا مطلوب ہوگا نہ کہ پھیلا۔ تو دنیوی امور میں درجۂ کمال کا طالب ہے۔ درجۂ نقصان پر کوئی اکتفا نہیں کرتا بلکہ کمال کی کوشش کرتا ہے مگر دینی کاموں میں ہماری یہ حالت ہے کہ درجۂ نقصان پر راضی ہیں۔ حصول کمال کی کوشش نہیں کرتے۔ چنانچہ بہت لوگ اسلام میں درجۂ ادنیٰ یعنی تلفظ شہادتین پر اکتفا کئے ہوئے ہیں اور نماز وغیرہ کی پروا نہیں کرتے۔

تکمیل اسلام

اس میں علاوہ اس خرابی کے کہ ان کا اسلام ناقص ہے اور فرائض ترک کرنے سے عذاب ہونے کا اندیشہ ہے۔ بڑی خرابی یہ ہے کہ ایسے مسلمانوں پر دشمنوں کے دندان آز تیز ہوتے ہیں۔ تجربہ ہے کہ مخالف کو اُس مسلمان کے بہکانے کی جرات ہوتی ہے جس کا اسلام ناقص ہے کافر اسی مسلمان کو اپنے پھندے میں لانے کی کوشش کر سکتا ہے جس کا اسلام کامل نہیں بلکہ برائے نام ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جن لوگوں کا اسلام کامل ہے ان پر میرے اغواء کا اثر نہیں ہو سکتا۔ ہاں جو لوگ نام کے مسلمان ہیں کہ سوائے اپنے کو مسلمان کہنے کے اور کوئی بات اسلام کی ان کے اندر موجود نہیں، وہ جلد ہمارے بہکانے میں آ سکتے ہیں۔ اس لئے وہ ایسے لوگوں پر اپنے دانت تیز کرتے ہیں۔

چنانچہ آج کل جو فتنۂ ارتداد چل رہا ہے۔ اُس کے شکار ایسے ہی مسلمان ہو رہے ہیں جنکو نہ کلمۂ توحید یاد ہے، نہ نماز روزہ کے پابند ہیں، نہ صورت وضع مسلمانوں جیسی ہے، نہ معاشرت مسلمانوں جیسی ہے، صورت سے کوئی شخص ان کو مسلمان نہیں کہہ سکتا مگر چونکہ وہ اپنے کو مسلمان کہتے ہیں اور ان کے آباء واجداد بھی مسلمان تھے اس لئے شرعاً وہ مسلمان ہیں اور ان کے اسلام کی حفاظت ہمارے ذمہ ضروری ہے۔ بہرحال تکمیل اسلام کی ضرورت عذاب سے بچنے کے لئے تو ہے ہی، مخالفوں کے پھندوں سے بچنے کے لئے بھی اس کی ضرورت ہے۔ اگر دفعۃً پوری تکمیل نہ ہو سکے تو چند باتوں کی ضرورت تو بہت سخت ہے۔ ایک یہ کہ سب مسلمان نماز کی پابندی شروع کر دیں۔ تجربہ ہے کہ نمازی کو کوئی شخص بہکانے کی جرأت

نہیں کرسکتا۔ جس مسلمان کو کفار نماز کا پابند دیکھتے ہیں اس سے بالکل مایوس ہوجاتے ہیں کہ یہ کبھی ہمارے بہکانے میں نہیں آسکتا کیونکہ وہ اس کو پکا مسلمان سمجھتے ہیں۔ پس خدا کیلئے تم نماز کی پابندی تو ابھی سے شروع کردو یہ اسلام کا بڑا پہرہ دار ہے۔ واقعی ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشآء والمنکر کی ایک تفسیر ابھی سمجھ میں آئی۔

مشہور تفسیر تو یہ ہے کہ نماز مسلمانوں کو برے کاموں سے روک دیتی ہے اس پر ظاہر میں اشکال پڑتا ہے کہ ہم تو بہت نمازیوں کو برے کام کرتے دیکھتے ہیں۔ اس کا جواب دیا گیا ہے کہ نماز سے برے کام ضرور کم ہوجاتے ہیں۔ اگر اس شخص کی نماز کامل ہے خشوع وخضوع و جملہ آداب کے ساتھ ہے۔ تب تو یہ شخص بالکل برے کاموں سے محفوظ ہوجائیگا اور اگر اس کی نماز ناقص ہے تو جیسی نماز ہے اسی کے مناسب برے کام چھوٹ جائیں گے۔ غرض جس درجہ کی نماز ہوگی اس درجہ کی نہی عن الفحشاء ہوگی۔ تجربہ کرلیا جاوے کہ دو جماعتوں کا امتحان کر کے دیکھو۔ ایک وہ جو بالکل بے نمازی ہے دوسری وہ جو نمازی ہے اگو ان کی نماز کسی درجہ کی ہو، یقیناً نمازی جماعت کے اندر برے کام کم ہوں گے اور بے نمازیوں میں ان کی نسبت سے زیادہ ہوں گے۔ تو مشہور تفسیر پر اشکال ہوتا تھا جس کا جواب دینے کی ضرورت ہوئی۔ مگر جو تفسیر اس وقت القاء ہوئی ہے اس پر کوئی اشکال نہیں پڑتا وہ یہ کہ نماز اہل فحشاء ومنکر کو نمازی کے پاس آنے اور اس کے بہکانے سے روک دیتی ہے۔

اس کی تائید ایک حدیث سے ہوتی ہے حضور صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اذان سے شیطان گوز مارتا ہوا بہت دور بھاگ جاتا ہے اور اس کا اقرار کفار کو بھی ہے۔ چنانچہ مندر کے پاس اذان دینے سے وہ لوگ روکتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اذان کی آواز سے ہمارے دیوتا بھاگ جاتے ہیں

ایک راجہ کے یہاں ہندو پنڈتوں نے استغاثہ دائر کیا تھا کہ مسلمانوں کی مسجد مندر کے پاس ہے۔ جس میں وہ اذان دیتے ہیں ان کو اس سے منع کیا جائے کہ زور سے اذان نہ کہا کریں، ہمارے دیوتا بھاگ جاتے ہیں۔ راجہ نے وزیر سے کہا کہ ہمارا ایک گھوڑا توپ کی آواز سے چونکتا تھا تو

ہم نے اس کی چمک نکالنے کے لئے یہ تدبیر کی تھی کہ اس کو توپ کے پاس رسوں سے بندھوا کر خوب توپ چلانے کا حکم دیا تھا جس سے اس کی چمک جاتی رہی تھی۔ تو ہمارے دیوتا اگر اذان سے بھاگ گئے ہیں تو یہ ہم کو بہت مضر ہے۔ مسلمان جب چاہا کریں گے ان کو بھگا دیا کریں گے۔ لہٰذا ان کی چمک نکالنی چاہئے اور مسلمانوں سے کہنا چاہئے کہ خوب زور سے اذان دیں یہ تو ہمارے ہی واسطے مفید ہے

غرض جب کفار کے دیوتا اذان سے بھاگ جاتے ہیں تو جب گاؤں میں اذان ہوگی وہاں کفار بھی نہ آسکیں گے اور اگر آدیں گے بھی تو ان کے حوصلے پست ہو جائیں گے۔ پس یہ تفسیر اس آیت کی بہت عمدہ لطیف ہے اور واقعی اس پر کوئی بھی اشکال نہیں چنانچہ اس وقت جو لوگ بھی دشمنوں کے بہکانے سے مرتد ہوئے ہیں یہ وہی لوگ ہیں جن کو نماز سے کچھ علاقہ نہ تھا اس لیے مسلمانوں کو چاہئے کہ فتنۂ ارتداد سے بچنے کے لئے خود بھی نماز کی پابندی شروع کریں اور دیہات میں بھی مسلمانوں کو نمازی بنانے کی کوشش کریں۔ حفاظتِ اسلام کے لئے ایک تو یہ عمل ضروری ہے۔

دوسرا کام یہ کریں کہ کسی بزرگ اللہ والے سے تعلق پیدا کریں یعنی اس سے بیعت ہو جائیں یہ عمل بھی حفاظتِ اسلام کے لئے بڑا سنگین پہرہ دار ہے۔

میرے ایک دوست کانپور میں تھے (جو مجھ سے بیعت بھی ہیں) ان کے پڑوس میں نشن کا ایک عیسائی رہتا تھا۔ وہ کم بخت روز ان سے مذہبی گفتگو کرتا تھا اور اسلام سے بہکانا چاہتا تھا ایک دن اُن دوست نے باتوں باتوں میں اس سے یہ کہہ دیا کہ میں حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ کا معتقد ہوں۔ بس یہ سنکر پھر کبھی وہ اُن کے پاس آکر نہ پھٹکا اور دوسروں کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ عیسائی یہ کہتا تھا کہ جو لوگ بزرگوں سے تعلق رکھتے ہیں ان پر ہمارا داؤ نہیں چلتا۔ واقعی حدیث میں آیا ہے کہ مسلمان کو جماعت میں شامل ہونا چاہئے کیونکہ بھیڑیا اُسی بکری کو پھاڑتا ہے جو گلہ سے الگ ہو جاوے مشہور ہے کہ بھیڑیا گلہ پر حملہ نہیں کرتا بلکہ جب کوئی بکری گلہ سے الگ ہوتی ہے۔ اُسے پھاڑ کھاتا ہے۔ پس مسلمانوں کو چاہئے کہ اللہ والوں سے تعلق پیدا کریں اور اُن کے سلسلہ میں داخل ہو جاویں۔ اس مسئلہ میں رفع بلاء کی بڑی برکت ہے۔ پھر تم کو کوئی بہکانے نہ آوے گا اور اگر کوئی آئے

تو تم اس سے کہہ دو کہ ہم تو فلاں بزرگ سے بیعت ہیں جو طریقہ ان کا ہے وہی طریقہ ہمارا ہے۔ اگر تم کو کچھ کہنا ہے تو ان سے جا کر کہو، ان کو سمجھاؤ، اگر وہ اپنا طریقہ بدل دیں گے تو ہم بھی بدل سکتے ہیں ورنہ ہم تو ان کے ساتھ رہیں گے۔ پس بزرگوں کا نام سُن کر پھر کبھی وہ تم کو بہکانے نہ آوے گا اور بزرگوں سے تعلق پیدا کر کے مہینہ دو دو مہینہ میں ان کے پاس بھی جانا چاہیئے۔ ان کی صحبت سے نورِ ایمان کو ترقی اور اسلام کو پختگی حاصل ہوگی۔ پس حفاظتِ اسلام کے لئے یہ دو عمل ہوئے۔ ایک نماز دوسرے کسی بزرگ سے تعلق پیدا کرنا۔

ایک تیسرا ضروری عمل اور ہے وہ گائے کا گوشت کھانا ہے۔ گائے کا گوشت کھانے والے کو کوئی ہندو نہیں بہکا سکتا۔ بکری کا گوشت کھانے تک تو بکری کا احتمال رہتا ہے مگر گائے کا گوشت کھانے کے بعد پھر کچھ ڈر نہیں رہتا اور اگر اس کو ذبح کرنے لگو تو پھر تمہاری صورت دیکھ کر ہندو بھاگنے لگیں گے۔ چنانچہ ہندوستان میں جن لوگوں کا پیشہ گائے ذبح کرنا ہے ان پر ہندوؤں کو کسی وقت یہ طمع نہیں ہو سکتی کہ وہ ہمارے بہکانے میں آ سکتے ہیں۔

ایک ظرافت کا قصہ ہے ایک دفعہ ریل کے سفر میں ہمارے ایک دوست نے گائے کے پٹھے سے پستول کا کام لیا تھا۔ ریل میں مسافروں کا ہجوم بہت تھا ایک ایک ڈبہ میں چالیس سے اوپر آدمی بھرے ہوئے تھے۔ جب پھر بھی آمد کم نہ ہوئی تو ان حضرت نے کھانے کا دستر خوان بچھا لیا جس میں گائے کا گوشت تھا۔ ہندو آتے اور گائے کا گوشت دیکھ کر رام رام کہتے ہوئے وہاں سے چل دیتے۔ جب کھانا کھا چکے تو ہمارے دوست نے ایک بڑا سا ہڈا ہاتھ میں لے لیا اور جو ہندو آتا اسے وہ ہڈا دکھا دیتے کہ یہاں جگہ نہیں، آگے جاؤ۔ اس ہڈے کی صورت دیکھتے ہی کوئی ہندو وہاں نہ ٹھہرتا۔ اس لئے اس کا نام پستول رکھا گیا تو جب چیز کی صورت سے کفار بھاگتے ہیں اس کو تم کھانے لگو گے تو پھر وہ تمہارے پاس کب آنے لگے۔ بس گائے کا گوشت کھانے سے تو تم بے فکر ہو کر جنت کے گاؤ تکیہ سے کمر لگا کر بیٹھ جاؤ گے۔

بخدا تجربہ نے بتلا دیا کہ ہندوستان میں گائے کا گوشت کھانا ہی کامل مسلمان ہونا ہے۔ بدوں اس کے یہاں اسلام کی تکمیل نہیں ہوتی۔ چنانچہ جو لوگ گائے کا گوشت نہیں کھاتے ہندو ان کے فعل کو اپنی دلیل میں پیش کرتے ہیں۔ ان کی حالت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ مسلمان خوشی سے نہیں ہوئے اسی لئے اسلام کے بعد بھی اپنی اصلی حالت پر قائم ہیں۔ گویا ہندوؤں نے اس قول میں خود اقرار کر لیا کہ کامل مسلمان وہی ہے جو گائے کا گوشت کھاتا ہے اور جو گائے کا گوشت نہیں کھاتا اس کو وہ لوگ بھی ہندوؤں سے قریب اور مسلمانوں سے بعید سمجھتے ہیں پھر اب ذبیحہ گاؤ کے شعار اسلام ہونے میں کیا شبہ رہا، شعار اسلام کے اور کیا سینگ ہوتے ہیں؟

بس جو چیز عام طور پر اسلام و کفر میں امتیاز پیدا کرنے والی ہو وہی شعار اسلام ہے اور ظاہر ہے کہ ہندوستان میں مسلمان کو ہندوؤں سے امتیاز گائے کے ذبح اور اس کا گوشت کھانے ہی سے ہوتا ہے اور اس وقت تجربہ نے بتلا دیا کہ جو لوگ اس شعار اسلام کے تارک تھے، زیادہ تر وہی فتنہ ارتداد کے دام میں مبتلا ہوئے ہیں اور جو اس شعار کو اختیار کئے ہوئے ہیں ان کی طرف کوئی رخ بھی نہیں کرتا تو یہ علاوہ شعار اسلام ہونے کے بڑا سنگین پہرہ دار بھی ہے جیسے ابھی میں نے قصہ بیان کیا کہ ہمارے ایک دوست نے گوشت کے ہڈے کو پستول بنایا تھا واقعی یہ پستول سے بھی زیادہ کارآمد ہے کہ مشرکین اس کی صورت سے بھاگتے ہیں۔

کتابی علم

مگر افسوس کہ آج کل بعض علماء کو بھی ذبح گاؤ کے شعار اسلام ہونے میں شک ہے۔ مگر یہ وہ علماء ہیں جو محض الفاظ کے جاننے والے ہیں اور دین کی فہم سے بالکل کورے ہیں۔ گو بات تو کہنے کی نہیں مگر ضرورت کی وجہ سے کہتا ہوں کہ آج کل بہت سے عالم محض الفاظ کے عالم ہیں جن کا فہم درست نہیں محض کتابیں ختم کر کے عالم کہلانے لگے بعض کی تو یہ حالت ہے کہ درسیات سے فارغ ہو گئے ہیں مگر کتابیں سمجھ کر نہیں پڑھیں اور جنہوں نے کتابیں سمجھ کر پڑھی ہیں ان کا علم بھی ہنوز کتابی علم ہے جو اسرار شریعت سمجھنے کے لئے

تا کافی ہے یاد رکھو اس سے کچھ کام نہیں چلتا گر دو چار آدمی تم کو مولنا اور مولوی کہنے لگے ؎

ہمائے بصاحب نظرے گوہر خود را — عیسیٰ نتواں گشت بتصدیق خرے چند

جہلا کی تعظیم و تکریم اور ان کے مولوی کہنے سے تم سچ مچ مولوی نہیں ہو سکتے بلکہ ضرورت اس کی ہے ؎

قال را بگذار مرد حال شو — پیش مرد کاملے پامال شو

نور فہم تقویٰ اور حال سے پیدا ہوتا ہے اور حال پیدا ہوتا ہے کسی کی جوتیاں سیدھی کرنے سے۔ کیونکہ یہ نفس بدوں اس کے سیدھا نہیں ہوتا۔ جب تک اپنے کو کسی کامل کے اس طرح سپرد نہ کرو گے کہ وہ تمہاری ذات میں جو چاہے تصرف کر سکے اس وقت تک شہوات و اغراض نفسانیہ سے نجات نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے علماء نے دین کو اغراض کے تابع کر رکھا ہے کہ جب موقع و محل دیکھا اسی کے موافق فتوے تراش لئے۔ بھلا ایسا علم بھی کچھ کام دے سکتا ہے یہ علم ابن آدم پر خدا کی حجت ہے، جس کی وجہ سے آخرت میں جہلاء سے زیادہ اس پر مواخذہ ہوگا۔ بعض لوگوں کو معالجہ نفس کا کچھ خیال بھی ہوتا ہے تو وہ یہ غلطی کرتے ہیں کہ اپنی رائے اور اپنے اجتہاد سے عمل شروع کرتے ہیں اور کتابیں دیکھیں مجاہدات و ریاضیات میں مشغول ہو جاتے ہیں مگر یاد رکھو کہ کتابی نسخوں سے شفاء حاصل نہیں ہو سکتی اگر اس طرح شفا ہو جایا کرتی تو دنیا میں ایک بھی مریض نہ رہتا کیونکہ طب کی بے شمار کتابیں موجود ہیں اردو میں بھی ان کے ترجمے ہو گئے ہیں۔ جن میں ہر قسم کے امراض کا علاج درج ہے۔ بس ہر شخص کتابیں دیکھ کر علاج کر لیا کرتا۔ طبیبوں کی ضرورت نہ ہوا کرتی مگر تجربہ شاہد ہے کہ اس طرح شفاء حاصل نہیں ہوتی۔ بدوں رجوع الی الطبیب کے چارہ نہیں۔ یہی حال معالجہ نفس کا ہے کہ اس میں بھی بدوں کسی ماہر طبیب روحانی کے کامیابی نہیں ہوتی جو لوگ خود بخود کام شروع کرتے ہیں ان کی حالت یہ ہے کہ جہاں کچھ سرمستی سی معلوم ہوئی وہ اپنے کو کامل سمجھنے لگے۔ حالانکہ سرمستی کو کامیابی سے کچھ بھی علاقہ نہیں بس میں وہی پھر کہوں گا ؎

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خود را

کسی کامل کو اپنا رہبر بناؤ، اُس کے سامنے اپنی چاندی سونا پیش کرو، وہ کسوٹی پر کھ کر دیکھیگا۔ اس وقت حقیقت منکشف ہوگی، ورنہ ظاہر میں تو کھوٹی اور کھری چاندی یکساں ہی معلوم ہوا کرتی ہے۔

بلکہ بعض دفعہ کھوٹی چاندی بڑی بھڑکدار ہوتی ہے اور کھری چاندی میلی کچیلی خراب ہوتی ہے مگر آگ میں تپانے سے کھوٹی چاندی کی ساری بھڑک دور ہو کر اندر سے تانبا وغیرہ نکل آتا ہے اور کھری چاندی آگ میں ڈالتے ہی میل کچیل سے صاف ہو کر عمدہ نکلتی ہے۔ اس لئے کسی کی ظاہری ریاضت و مجاہدے سے دھوکہ نہ کھانا چاہیئے۔ اور صوفیوں کو اپنے احوال یا کیفیات یا مراتب سے اپنا معتقد ہونا چاہیئے بہت لوگ اس غلطی میں پڑے ہوئے ہیں کہ وہ اپنے کو صاحب نسبت سمجھتے ہیں مگر واقع میں ان کو نسبت مع اللہ حاصل نہیں کیونکہ نسبت نام ہے تعلق طرفین کا چنانچہ اہل علم جانتے ہیں کہ نسبت کے لئے طرفین سے تعلق کی ضرورت ہے ایک طرفہ تعلق کو نسبت نہیں کہا کرتے پس بہت لوگ ایسے ہیں کہ ان کو تو خدا سے تعلق ہے کہ اس کی یاد و ذکر میں مشغول ہیں بلکہ یادداشت بھی حاصل ہے جو کہ تھوڑی سی مشق سے حاصل ہوجاتا ہے۔ مگر خدا تعالٰے کو اُن سے تعلق نہیں تو بات کیا ہے کہ ان لوگوں کو خدا کے ساتھ محض یاد کا تعلق ہے اور یہ تعلق یکطرفہ ہے۔ عمل و اطاعت سے تعلق دوطرفہ ہوتا ہے۔ جب انسان عمل و اطاعت کا اہتمام کرتا ہے۔ اس وقت حق تعالیٰ کو بھی اس سے تعلق ہو جاتا ہے اور اطاعت فقط نماز و نوافل اور روزہ میں منحصر نہیں بلکہ ہر حالت کے متعلق احکام موجود ہیں۔ لین دین اور معاشرت و معاملات میں بھی اطاعت لازم ہے جب تمام احوال میں اطاعت کی جائے اس وقت دوطرفہ تعلق ہوتا ہے ورنہ وہ محض یک طرفہ تعلق ہے جو اس کا مصداق ہے

ہ

وکلٌّ یدعون وصال لیلیٰ ولیلیٰ لا تقرلھم بذا کا

کہ بہت لوگ وصال لیلیٰ کے مدعی ہیں، مگر لیلیٰ ان کو منہ بھی نہیں لگاتی۔ وصال پر تو کیا

راضی ہوتی۔ اسی واسطے محققین نے فرمایا ہے کہ اس راستہ میں بدوں رفیق کے چلنا دشوار ہے قدم قدم پر ٹھوکریں لگتی ہیں۔ کتابی علم اس راہ میں ہرگز کافی نہیں بلکہ یہاں تو اس کی ضرورت ہے ؎

جملہ اوراق و کتب در نار کن — سینہ را از نور حق گلزار کن

اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ ان شاعر صاحب نے تو کتابوں کے جلانے کا حکم کر دیا بھلا ہم فقہ و تفسیر و حدیث کی کتابیں کس طرح جلادیں؟ اس میں تو کتابوں کی اہانت ہے اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہاں حقیقۃً جلانا مقصود نہیں بلکہ یہ ایک محاورہ ہے جس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ ان چیزوں سے ذہن کو خالی کرلو اور واقعی چند روز کے لئے تمام علوم سے ذہن کا خالی کرلینا اس راہ میں ضروری ہے کیونکہ صاف تختی پر نقوش خوب لکھے جاتے ہیں جو تختی پہلے ہی سے نقوش میں بھری ہوئی ہے اس پر کوئی نیا نقش کیونکر جم سکتا ہے یہ تو ظاہری تاویل تھی۔ مگر میں طلبہ کی خاطر اس کی ایک اور تفسیر بیان کرتا ہوں کیونکہ یہ فرقہ بڑا وہمی ہے ان کی ایسی ظاہری باتوں سے تسلی نہیں ہوتی تو میں کہتا ہوں کہ اچھا صاحب آپ محاورہ کی تاویل نہ کیجئے اور مطلب یہی سمجھئے کہ تمام اوراق و کتب کو آگ میں جلادو۔ مگر یہ بھی معلوم ہے کہ یہاں آگ سے مراد کونسی آگ ہے شاید تم نے اسی ظاہری آگ کو مراد سمجھا ہوگا اسی لئے توہین کتب کا شبہ ہوا مگر یہی غلطی ہے ؎ خطاء

سخن شناس نئی دلبرا خطا ایں جا است

صاحب! یہاں نار سے نار عشق مراد ہے اور مطلب یہ ہے کہ محض اوراق و کتب پر اکتفا نہ کرو بلکہ ان سب کو حاصل کر کے پھر سب کو نار عشق الٰہی میں پھونک دو۔ بتلایئے اب تو کچھ توہین نہیں ہوئی، شاید تم یہ کہو کہ پھر اگلے مصرع میں نور حق سے کیا مراد ہے؟ میں کہتا ہوں کہ نور حق اور نار عشق دو نہیں ہیں بلکہ ایک ہی چیز ہے جس کو ابتداء و انتہاء کے اعتبار سے نار و نور کہا گیا ہے عشق الٰہی ابتداء میں سوز و گداز و تپش کے ساتھ شروع ہوتا ہے پھر آخیر میں جب

تمکین حاصل ہوتی ہے تو وہی نار نور و گلزار بنجاتی ہے۔ نور کوئی دوسری شئے نہیں ہے بلکہ وہی نار جب ٹھنڈی کردی جائے نور ہو جاتی ہے قلنا یانار کونی بردا وسلاما علی ابراھیم تو نار ابراھیم و گلزار ابراہیم دو چیزیں تھوڑا ہی ہیں بلکہ وہی نار جو اول بصورت نار تھی اور حقیقت کے لحاظ سے بھی محرق تھی۔ ابراہیم علیہ السلام کے گرتے ہی ٹھنڈی ہو کر گلزار بن گئی پس اس طریق میں ہر سالک کو نار ابراہیم و گلزار ابراہیم کا لطف حاصل ہوتا ہے۔ غرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ آج کل بہت علماء لفظوں کے عالم ہیں اس لیے ان کا علم ناقص ہے ان کو تقویٰ و حال پیدا کر کے اپنے علم کی تکمیل کرنی چاہیے۔ ایسے ہی ناقص علماء نے ذبیحہ گاؤ کے شعار اسلام ہونے کا انکار کیا ہے وہ اس کو شعائر دین میں سے نہیں سمجھتے مگر جن کو خدا نے نور فہم دیا ہے۔ وہ اس حقیقت کو سمجھ گئے اور انہوں نے اس کو شعار اسلام میں داخل سمجھا۔ چنانچہ حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ کا بھی یہی ارشاد ہے کہ

"ذبح بقرہ در ہندوستان از اعظم شعار اسلام است"

اور آج کل کی حالت دیکھ کر مجدد صاحب کے اس قول کی پوری تصدیق ہوتی ہے کہ واقعی جو لوگ گائے کا گوشت نہیں کھاتے ان کو ہندو بھی پورا مسلمان نہیں سمجھتے۔ بلکہ اپنی برادری کا بھائی سمجھتے ہیں۔ ایسی حالت میں اس شعار اسلامی کا انکار وہی کر سکتا ہے جو نور فہم سے بالکل کورا ہو۔

ایک عالم نے میرے سامنے اعتراض کیا کہ دیکھئے صاحب فلاں مولانا نے ذبیحہ گاؤ کو شعار اسلام کہہ دیا۔ میں نے کہا وہ کیا کہتے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو شعار اسلام فرمایا ہے۔ کہنے لگے حضور نے کہاں فرمایا۔ میں نے کہا مسلم کی روایت ہے حضور صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ من صلی صلوتنا واستقبل قبلتنا واکل ذبیحتنا فذلک المسلم الذی لہ ذمۃ اللہ وذمۃ رسولہ الحدیث اس میں حضور نے مسلمان کی علامتیں بیان فرمائی ہیں کہ جس شخص میں یہ علامتیں موجود ہوں۔ اس کو مسلمان سمجھنا چاہئے کہ جو ہماری نماز پڑھے اور ہمارے قبلہ کا استقبال کرے اور ہمارا ذبیحہ کھائے وہ مسلمان جس کے لئے خدا و رسول کی پناہ و عہد ہے۔ پس جہاں

آپ نے صلوٰۃ و استقبال قبلہ کو علامت اسلام قرار دیا ہے وہیں اکل ذبیحنا بھی فرمایا ہے تو جو اعتراض آپ کو اُن مولانا صاحب پر ہے کہ انہوں نے کھانے پینے کی چیز یا ایک جانور کے ذبح کو شعار اسلام کہہ دیا وہی اعتراض حدیث پر وارد ہوتا ہے کہ حضورؐ نے صلوٰۃ و استقبال قبلہ کے ساتھ اکل ذبیحہ کو کیسے بیان فرمادیا۔

شاید کوئی یہ کہے کہ اس میں تو مطلق ذبیحۂ مسلم کے کھانے کو علامت اسلام بتلایا گیا ہے اس سے ذبیحۂ بقر کا کھانا علامت اسلام معلوم نہیں ہوتا کیونکہ اس میں بقر کا لفظ وارد نہیں ہوا۔ میں کہتا ہوں کہ فہیم شخص کے لئے تو ذبیحتنا ہی البقرہ پر دلالت کرنے کے لئے کافی ہے چنانچہ عنقریب آتا ہے اور بدفہم کے لئے خود لفظ بقرہ کا مذکور ہونا بھی ناکافی ہے۔

چنانچہ میرٹھ میں ایک وکیل صاحب نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ اسلام میں گائے کا ذبیحہ کہیں نہیں بلکہ بکری کا ذبیحہ ثابت ہے۔ چنانچہ دیکھئے اس عید کا نام ہی بکرعید ہے۔ یعنی بکرے کی عید۔ اس ظالم نے بقر کو بکرے کی عربی سمجھا۔ واقعی جب ایسے ایسے ذہین دنیا میں ہو گئے تو پھر ذبیحہ گاؤ کی دلیل شریعت میں کیوں ملے گی۔ اسی طرح اگر آپ بھی لفظ بقر حدیث میں ہونے کے بعد یہی تاویل کرنے لگیں تو پھر اس کا جواب بجز اس کے اور کیا ہوگا کہ ؏

جواب جاہلاں باشد خموشی

خوشامد کی خرابی اور یہ ساری خرابی خوشامد کی ہے کہ یہ لوگ ہندوؤں سے اتحاد کرنے کے لئے ایسی لچر باتیں نکالتے ہیں۔ آج کل اتحاد و اتفاق کا بہت جوش ہے۔ اُسی جوش میں ایسے خالی مضامین اور باریک نکات سوجھتے ہیں۔ چنانچہ مظفر نگر میں ایک ہندو نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ جب تک ہم میں اتفاق نہ ہوگا کامیابی نہیں ہو سکتی۔ پھر کہا جانتے بھی ہو کہ ہم کے معنی کیا ہیں؟ ہم کے معنی ہندو اور مسلمان۔ ہؔ سے مراد ہندو اور میمؔ سے مسلمان، پھر کہا کہ ہمارے ہندو بھائی ناخوش نہ ہوں کہ ہا تو ذرا سی ہے اور میم لمبا ہے۔ بات یہ ہے کہ ہندو تو ہندوستان ہی کے اندر رہیں یہ کہیں باہر نہیں

قومیت اسلامی کی یہی حمایت ہے کہ تم اسلامی تعلیم کو دوسرے مذاہب کی تعلیم کے آگے اور اسلامی علماء کو دوسری قوموں کے افراد کے سامنے ذلیل و پست کردو۔ واللہ یہی لوگ اسلام و مسلمانوں کو ذلیل کرتے ہیں اور یہی قومیت اسلامی کو برباد کرتے ہیں۔ ان تحریکات سے خدا تو انکو مطلوب ہے ہی نہیں مگر جس قومیت کا یہ رات دن رونا روتے ہیں اس کی بھی جڑیں اکھاڑ رہے ہیں۔ قومیت کی حفاظت کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی قوم کو دوسروں سے مستغنی ثابت کرو، خود محتاج نہ بنو، دوسروں کو اپنا محتاج بناؤ، اپنی تعلیم کے مقابلہ میں کسی کی تعلیم کو ترجیح نہ دو اور ثابت کرکے دکھاؤ کہ اسلامی تعلیم سے بہتر کوئی تعلیم نہیں۔

نیز اپنے علماء کے سامنے دنیا بھر کے عقلاء کو پست اور نیچا دکھاؤ اور اس کے لئے کچھ تم کو کرنا نہیں پڑیگا۔ میں دعوی سے کہتا ہوں کہ الحمد للہ اسلام میں وہ لوگ موجود ہیں جن کے سامنے دنیا بھر کے سیاست دان طفل مکتب ہیں۔ قرآن و حدیث کے برابر سیاسی اور تمدنی تعلیم کون سی کتاب میں ہے ذرا کوئی لاکر تو دکھائے پھر جو لوگ قرآن و حدیث کے حقیقی طور پر سمجھنے والے ہیں ان کے برابر کوئی بھی عاقل یا سیاست دان ہو سکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ بخدا ہرگز نہیں مگر یہ ساری خرابی ان علماء کی ہے جو ہر بات میں ان لیڈروں کے ساتھ ہو لیتے ہیں اور لیڈروں کی طرح خود بھی کافرونکی سیاستدانی کے معتقد ہیں ان کی علانیہ مدح کرتے اور ممبر پر بیٹھ کر وعظوں میں تعظیم سے ان کا نام لیتے ہیں۔ اور یہ وہ علماء ہیں جنہوں نے کسی صاحب دل کی جوتیاں سیدھی نہیں کیں محض کتابیں پڑھ کر عالم ہو گئے ہیں مگر ؎

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند | نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند
ہزار نکتۂ باریک تر زمو اینجاست | نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

علم اس کا نام نہیں ہے کہ الفاظ یاد کر لئے علم اور ہی کسی چیز کا نام ہے ؎

شاہد آں نیست کہ موئے ومیانے دارد
بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

جس عالم میں ایک خاص آن ہو اس کا غلام بننا چاہئے وہ آن کیا ہے
ضرورت صحبت، عشق و معرفت و تقویٰ۔ چند روز ایسے کسی عالم کی جوتیوں میں جا کر رہو اور اس کے سامنے اپنے لفظی علم کو فنا کر دو۔ پھر علم کی دولت نصیب ہو گی اور کامل کے سامنے لفظی علم کو فنا کرنے کی ضرورت اس لئے ہے کہ ؎

پیش یوسف نازش و خوبی مکن جز نیاز و آہِ یعقوبی مکنے

ناز را روئے بباید ہمچو ورد چوں نداری گرد بد خوئی مگرد

عیب باشد چشم نابینا و باز زشت باشد روئے نازیبا و ناز

یعنی جب تمہارے اندر حسن نہیں ہے تو یوسف کے سامنے ناز مت کرو۔ آہ و نیاز سے پیش آؤ۔ جبھی امید ہے کہ وہ تم کو منہ بھی لگائیگا اور اگر تم نے اس زشت روئی کی حالت میں اس کے سامنے اپنے علوم پر ناز شروع کر دیا تو وہ اپنے علم سے ذرا سا حصہ بھی تم کو نہ دیگا اور صاف کہہ دے گا ؎

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

اب تو کثرت سے وہ لوگ ہیں جو کمال نہیں رکھتے مگر ایک کمال کی نقل کر کے دعوے کمال کا کرتے ہیں۔

ایسوں کی مثال میں ایک حکایت یاد آئی کہ ایک شخص احمق نے کسی ولایتی کو دیکھا جو اپنے گھوڑے کو پیار و شفقت کے ساتھ دانہ کھلا رہا تھا اور وہ گھوڑا کبھی ادھر منہ پھیر لیتا، کبھی ادھر، اور وہ کہتا کھاؤ بیٹا کھاؤ۔ انہوں نے اپنے دل میں سوچا کہ افسوس میری بیوی میری اتنی قدر بھی نہیں کرتی جتنی یہ شخص گھوڑے کی قدر کرتا ہے اب کے گھر جا کر ہم بھی ان ہی نخروں کے ساتھ کھانا کھایا کریں گے۔ چنانچہ گھر تشریف لائے اور بی بی کو حکم دیا ہمارے لئے دانہ بھگو دے پھر شام کو گھوڑے کی طرح کھڑے ہو کر حکم دیا کہ اگاڑی پچھاڑی کھونٹوں سے باندھ دے اور دُم کی جگہ ایک جھاڑو بندھوائی اور حکم دیا کہ ہم کو دانہ کھلاوے اور جب ہم نخرے کریں تو ہماری خوشامد کرے اور کہے بیٹا

آئے اور مسلمان عرب و ایران وغیرہ بہت دور سے آئے ہیں تو ان کی مسافت بہت لمبی ہے۔ اس لئے ان کے واسطے میم اختیار کیا گیا اور اس کو لمبا لکھا گیا۔

مگر اس شخص نے مسلمانوں کی بابت یہ خیال نہ کیا کہ شاید وہ یہ شبہ کرنے لگیں کہ ہا کو پہلے لکھا گیا اور میم کو پیچھے اور ہا کو میم کے سر پر سوار کیا گیا۔ اس کی کیا وجہ؟

شاید اس کا یہ جواب دیا جائے کہ ہندو یہاں پہلے سے رہتے ہیں اور مسلمان بعد میں آئے ہیں اس لئے ہا کو پہلے اور میم کو پیچھے لایا گیا۔ مگر یہ شبہ پھر بھی باقی رہا کہ ہا کو میم کے سر پر سوار کیوں کیا گیا؟ اس کو پہلے ہی لکھا ہوتا مگر میم سے الگ لکھا ہوتا مگر شاید اتحاد و اتفاق ظاہر کرنے کے لئے خلط کی ضرورت پڑی ہو۔ اس لئے ایسا کیا گیا۔

واہیات خرافات یہ آج کل کے نکات ہیں جن کے سر نہ پاؤں مگر لوگ ہیں کہ ان مضامین پر لٹو ہیں اور ستم یہ کہ مسلمان بھی اس تقریر کے مداح تھے بلکہ یہاں نکات و معارف ایسے ایسے عالی ہیں کہ دوسری قوموں کو ان کی ہوا بھی نہیں لگی۔ اسلامی علوم و نکات کے ہوتے ہوئے یہ واہیات باتیں اس قابل ہیں کہ مسلمان ان کی تعریف کریں!

مگر ہماری قوم میں ایک مرض یہ بھی ہے کہ یہ دوسری قوموں کے افعال کی مدح کیا کرتے ہیں اور اپنے گھر کی چیزوں پر ان کو ترجیح دیتے ہیں چنانچہ ایک زمانہ انگریزوں کی پرستش کا تھا اس وقت تک ان کے افعال و معاشرت کی مدح سرائی ہوتی تھی اور مسلمانوں کے طرز معاشرت پر ان کے طرز معاشرت کو ترجیح دی جاتی تھی۔ اب ہندوؤں کی پرستش کا دور ہے اب ان کی باتوں کی مدح و ثنا ہوتی ہے۔ غرض یہ ہمیشہ دوسروں ہی کی پرستش میں رہیں گے۔ ان میں یہ حوصلہ نہیں رہا کہ اپنی دولت کے سامنے کسی کی چیز کو بھی منہ نہ لگاویں بلکہ سب کو اسی کے سامنے جھکانے کی کوشش کریں۔ افسوس ایسے مسلمان تو اب زمین کے اندر پہنچ گئے بس اب تو ایسے مسلمان رہ گئے ہیں کہ ایک صاحب کا مقولہ اخباروں میں شائع ہوا تھا کہ اگر نبوت ختم نہ ہوگئی ہوتی تو فلاں شخص (ایک ہندو کی طرف اشارہ ہے) نبوت کا مستحق تھا۔ افسوس اس شخص کو مسلمانوں میں کوئی اس قابل نہ ملا تھا ایک ہندو ہی اس

قابل ملاتھا۔

اے صاحبو! میں پوچھتا ہوں کہ آخر یہ کونسا اسلام ہے جس میں نبی ہونے کے لئے ایمان کی بھی شرط نہیں۔ پھر لوگ کہتے ہیں کہ ہندو مسلم اتحاد کی مخالفت نہ کرو جب اتحاد کا یہ نتیجہ ہو کہ مسلمان اس سے الحاد کی طرف جائیں اس اتحاد پر صد نفرین ہے پھر کوئی ان لیڈر صاحب سے پوچھے کہ جب تمہارے نزدیک ہندو بھی قابل نبوت ہو سکتا ہے تو تم نے اس قضیہ شرطیہ کو کیوں تکلیف دی کہ اگر نبوت ختم نہ ہو گئی ہوتی۔ کیونکہ ایسی نبوت تو ختم نہیں ہوئی اس لئے کہ ختم تو وہ چیز ہوتی ہے جو پہلے شروع بھی ہو چکی ہو۔ اور ایسی نبوت تو آج تک شروع ہی نہیں ہوئی جس میں اسلام و ایمان کی بھی قید نہ ہو۔ جب وہ شروع ہی نہیں ہوئی تو ختم بھی نہیں ہوئی بلکہ یہ تو تم نے نبوت کی نئی قسم نکالی ہے اس کے لئے یہ شرط بڑھانا کہ اگر نبوت ختم نہ ہوئی ہوتی محض حماقت ہے۔ تم کو یہ کہنا چاہئے تھا کہ نبوت اسلام تو ختم ہو چکی اب میں نبوت کی ایک دوسری قسم ایجاد کرتا ہوں جس میں اسلام و ایمان کی بھی قید نہیں اور اس قسم کا پہلا نبی فلاں شخص ہے۔

غرض عیب کرنے کے لئے بھی ہنر چاہئے۔ کفر یہ کلمہ بھی زبان سے نکالا اور وہ بھی ایسا بے تکا جس کے سر نہ پاؤں اور کمال یہ کہ ایسے کلمات کہہ کر بھی یہ لوگ لیڈر اور مسلمانوں کے مقتدا بنے ہوئے ہیں کوئی عالم یا جاہل اس شخص کو متنبہ نہیں کرتا کہ ان کلمات ناشائستہ سے ایمان میں فرق آگیا۔ تم اپنے ایمان کی سلامتی کی فکر کرو۔ اگر وہ اس سے توبہ نہ کرے تب تو ظاہر ہے اور اگر توبہ کرے جب بھی یہ لوگ لیڈر اور مقتدا بننے کے قابل نہیں۔ کیونکہ ایسے کلمات سے معلوم ہو گیا کہ یہ لوگ اسلام کی تعلیم سے بالکل کورے اور نرے جاہل ہیں۔ سو توبہ کر کے گناہ تو معاف ہو جائیگا مگر ایک منٹ کی توبہ سے علم تو حاصل نہ ہو جائیگا۔

غرض مسلمانوں کے اندر یہ بڑا مرض پیدا ہو گیا ہے کہ ان کو دوسری قوموں کی چیزیں زیادہ وقیع معلوم ہوتی ہیں اور اپنے علماء کو چھوڑ کر یہ دوسری قوموں کے افراد کی عظمت کرنے لگتے ہیں اور پھر دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم قومیت اسلامی کے حامی و محافظ ہیں۔ تف ہے پھر کیا

محبت دنیا ان کے قلب سے بالکل نکل گئی۔ انصار مدینہ نے مہاجرین کے ساتھ جو سلوک کیا اس سے اُن کے قلوب بھی محبت الٰہی سے لبریز اور محبت دنیا سے پاک ہو گئے تھے۔ چنانچہ انصار نے خوش خوش ان حضرات کو اپنے مکانات و اموال میں شریک کرنا چاہا بلکہ بعض صحابہ نے تو یہاں تک کیا کہ ایک مہاجر صحابی سے کہا کہ تم میرے بھائی ہو گئے ہو اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اپنا تمام مال آدھوں آدھ تقسیم کر کے نصف خود لے لوں اور نصف تم کو دیدوں اور میرے پاس دو بیبیاں ہیں اُن میں سے جون سی تم کو پسند ہو۔ میں اُسے طلاق دے کر ابھی الگ کر دوں عدت گذرنے کے بعد تم اس سے نکاح کر لینا۔ مہاجری نے ان کو دعا دی کہ خدا تمہارے مال و عیال میں برکت دے مجھے اس کی ضرورت نہیں تم مجھے بازار کا رستہ بتا دو میں تجارت کر کے اپنا گذر کروں گا۔ غرض واقعہ ہجرت سے مہاجرین و انصار دونوں کا امتحان ہو گیا جس میں وہ کامل اترے۔ اُس کے بعد اُن کو اجازت قتال دی گئی کہ اب یہ جو کچھ کریں گے محض خدا کے لئے کریں گے جوش غضب اور خواہش انتقام و شفاء غیظ نفس کے لئے کچھ نہ کریں گے۔ اس وقت یہ اس قابل ہو گئے کہ حمایت الٰہی ان کا ساتھ دے اور ملائکہ رحمت ان کی مدد کریں چنانچہ حضرات صحابہ کے واقعات اس پر شاہد ہیں کہ وہ جو کچھ کرتے تھے خدا کے لئے کرتے تھے حتیٰ کہ مثنوی میں مذکور ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے ایک یہودی کو معرکہ قتال میں پچھاڑا اور ذبح کا ارادہ کیا مرتا کیا نہ کرتا۔ اُس کم بخت نے آپ کے چہرہ مبارک پر تھوکا۔ اب چاہیئے تھا کہ حضرت علیؓ اس کو فوراً ہی ذبح کر ڈالتے مگر تھوکنے کے بعد آپ فوراً اُس کے سینہ پر سے کھڑے ہو گئے اور فوراً اُسے چھوڑ دیا۔ وہ یہودی بڑا متعجب ہوا کہ میری اس حرکت کے بعد تو اُن کو چاہیئے تھا کہ مجھے کسی طرح جیتا نہ چھوڑتے۔ مگر انہوں نے برعکس معاملہ کیا۔ آخر اُس سے نہ رہا گیا اور حضرت علیؓ سے اس کی وجہ پوچھی کہ اگر آپ نے مجھ کو کافر سمجھ کر قتل کرنا چاہا تھا تو تھوکنے کے بعد کیوں رہا کر دیا۔ اس فعل سے نہ میرا کفر زائل ہوا نہ عداوت سابقہ ختم ہوئی بلکہ اور زیادہ ہو گئی تھی۔

حضرت علیؓ نے فرمایا کہ واقعی اس فعل کے بعد میرا رہا کر دینا بظاہر عجیب ہے

مگر بات یہ ہے کہ اول جب میں نے تجھ پر حملہ کیا تو اس وقت بجز رضائے حق کے مجھے کچھ مطلوب نہ تھا اور جب تو نے مجھ پر تھوکا تو مجھے غصہ اور جوشِ انتقام پیدا ہوا۔ میں نے دیکھا کہ اب میرا تجھے قتل کرنا محض خدا کے لئے نہ ہوگا بلکہ اس میں نفس کی بھی آمیزش ہوگی اور میں نے نہ چاہا کہ نفس کے لئے کام کر کے اپنے عمل کو ضائع کروں اس لئے تجھے رہا کر دیا۔ وہ یہودی یہ سُن کر فوراً مسلمان ہو گیا اور سمجھ گیا کہ واقعی یہی مذہب حق ہے۔ جس میں شرک سے اس درجہ نفرت دلائی گئی ہے کہ کوئی کام نفس کے لئے نہ کرو بلکہ محض خدا کے لئے ہر کام کرو۔ دوستی اور دشمنی میں بھی نفس کی آمیزش سے روکا گیا ہے۔

اب ہماری یہ حالت ہے کہ جو لوگ خدمتِ اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں ان میں اکثر وہ لوگ ہیں جو نفس کے واسطے کام کرتے ہیں اپنے ذرا ذرا سے کارناموں کو اچھالتے اور اخباروں میں شائع کرتے ہیں۔ احکامِ الٰہی کی پرواہ نہیں کرتے۔ بس ان کا مقصود یہ ہے کہ کام ہونا چاہیے خواہ شریعت کے موافق ہو یا مخالف۔ چندہ میں جائز و ناجائز کی پرواہ نہیں صرف میں حلال و حرام کا خیال نہیں۔ پھر حمایتِ الٰہی ان کے ساتھ کیونکر ہو بلکہ اب تو یہ کہا جاتا ہے کہ میاں مسئلے مسائل کو ابھی رہنے دو۔ اس وقت تو کام کرنا چاہیے بعد کو مسئلے مسائل دیکھے جائیں گے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان صاحبوں کو یہ خبر نہیں کہ مسئلے مسائل کے بغیر تو مسلمان کو نہ دنیوی فلاح ہو سکتی ہے نہ اخروی اور سب سے زیادہ اخلاصِ نیت کی ضرورت ہے جس کا یہاں صفر ہے۔

ہمارے بزرگانِ دین جو بحمد اللہ اب بھی موجود ہیں وہ محض خدا کے واسطے کام کرتے ہیں اسی لئے وہ کسی کام میں شریعت سے ایک انچ بھی بڑھنا نہیں چاہتے اسی طرح جو ان حضرات کے صحبت یافتہ ہیں وہ بھی نفس کے لئے کام نہیں کرتے۔ بزرگوں کی صحبت سے اگر اصلاحِ کامل بھی نہ ہو تو کم از کم اپنے عیوب ہی پر نظر ہونے لگتی ہے یہ بھی کافی ہے اور مفتاحِ طریق ہے۔ جس شخص کو اپنے عیوب پر بھی نظر نہ ہو اس سے بڑھ کر محروم

کھاؤ۔ چنانچہ ان سب احکام کی تعمیل کی گئی۔ آپ دانہ کھانے میں جو اُچھلے کودے۔ کیونکہ گھوڑا بن رہے تھے۔ پیچھے کہیں چراغ رکھا تھا، وہ جھاڑو میں لگ گیا اور اگاڑی پچھاڑی بندھی ہونے کے سبب ہاتھ پاؤں بیکار ہو چکے تھے آگ بڑھنے لگی۔ بی بی بھی احمق ہی تھی۔ محلہ میں دوڑی گئی کہ لوگو میرا گھوڑا جل گیا۔ اس کے یہاں گھوڑا کہاں؟ سب سمجھے مسخراپن ہے کوئی نہ آیا۔ گھوڑے صاحب اپنے گدھے پن سے جل کر رہ گئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ کاملین کے سامنے اپنے دعوؤں کو فنا کرنے کی ضرورت ہے مگر اب تو فنا درکنار ان کی موافقت سے بھاگتے ہیں اور بجائے ان کے کفار کا اتباع کرتے ہیں چنانچہ بعضے نام نہاد علماء ہندوؤں کے ساتھ ان تحریکات میں شریک ہوئے ہیں اور یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ اپنی روش پر چلنے سے تو کچھ زیادہ قدر نہیں ہوتی۔ نہ زیادہ دولت ملتی ہے۔ لاؤ وہی طریقہ اختیار کریں جو ہندوؤں نے اختیار کیا ہے شاید اس طرح کچھ زیادہ وقعت مل جائے اور اگر انہوں نے سوراج لے لیا تو اس میں ہمارا بھی حصہ رہے گا اگر ہم الگ رہے تو بالکل محروم رہیں گے؟ افسوس! مسلمان ہو کر غیر پر نظر! بڑی شرم کی بات ہے ان لوگوں نے یہ خیال نہ کیا کہ جو طریقہ کفار کے لئے حصول عزت کا ہے مسلمان کے لئے وہ طریقہ نہیں ہے۔ مسلمان کبھی دوسری قوموں کا اتباع کر کے ترقی نہیں کرسکتا اگر وہ مسلمان ہے۔ مسلمان کی ساری عزت اسی میں ہے کہ وہ اپنے طریقہ پر قائم رہے اور کسی حال میں احکام شریعت سے تجاوز نہ کرے۔ اسی سے فلاح ہوتی ہے گو سامان کم ہو اور اس کے خلاف میں فلاح نہیں گو سامان زیادہ ہو۔

دیکھئے اس کی تائید میں ایک باریک نکتہ بتلاتا ہوں وہ یہ کہ مسلمانوں کو مکہ میں رہتے ہوئے قتال کی اجازت نہیں ہوئی۔ مدینہ میں پہونچکر اجازت ہوئی۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ ظاہر میں یہ سمجھتے ہیں کہ قلت جماعت وقلت اسباب اس کا سبب تھا یہ خلاف تحقیق ہے۔ کیونکہ مدینہ ہی میں پہونچکر کیا جماعت بڑھ گئی تھی؟ کفار کا پھر بھی غلبہ تھا۔ مدینہ کی تمام جماعت تمام عرب کے مقابلہ میں کیا چیز تھی۔ بلکہ اگر یہ دیکھا جائے کہ تمام کفار عالم کے

مقابلہ میں یہ اجازت ہوئی تھی۔ تب تو مدینہ کیا سارا عرب بھی قلیل تھا۔ اسی طرح مدینہ پہنچ کر سامان میں کیا زیادتی ہو گئی تھی۔ کفار ہمیشہ نہایت ساز و سامان سے مقابلہ کرتے تھے اور مسلمانان مدینہ کی یہ حالت تھی کہ بعض مواقع میں ایک ایک سواری میں سات آٹھ آدمی شریک ہوتے تھے بعض دفعہ چند آدمیوں میں ایک ہتھیار مشترک ہوتا تھا۔ پس یہ کہنا بالکل واقع کے خلاف ہے کہ مدینہ میں جا کر جماعت و سامان کی زیادت اس اجازت کا سبب ہوئی۔ نصوص سے خود معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی جماعت کفار کے مقابلہ میں اکثر مواقع میں اس قدر کم ہوتی تھی کہ ملائکہ کا جوڑ لگایا جاتا تھا۔ چنانچہ ارشاد ہے وانزل جنودا لم تروھا اور ارشاد ہے بلی ان تصبروا وتتقوا ویاتوکم من فورھم ھذا یمددکم ربکم بخمسۃ الاف من الملئکۃ مسومین اور یہ صورت ملائکہ کی مکہ میں رہتے ہوئے بھی ممکن تھی مگر پھر بھی اس صورت کو اختیار کر کے وہاں اجازت نہ دی گئی تو اس کی کوئی اور وجہ بتلانی چاہیے۔ اہل ظاہر اس کی شافی وجہ نہیں بتلا سکتے۔

محققین نے فرمایا ہے کہ اصل بات یہ تھی کہ ابھی عام مسلمانوں کے اندر اخلاق حمیدہ اخلاص و صبر و تقویٰ کامل طور پر راسخ نہ ہوئے تھے۔ اس وقت اگر اجازت قتال کی ہو جاتی تو سارا مقابلہ جوش غضب و انتقام للنفس کے لئے ہوتا محض اخلاص و اعلاء کلمۃ اللہ کیلئے نہ ہوتا اور اس حالت میں وہ اس قابل نہ ہوتے کہ ملائکہ کی جماعت سے ان کی امداد کیجاوے اور حمایت الٰہی ان کے شامل حال ہو۔ چنانچہ آیت مذکورہ میں بلی ان تصبروا وتتقوا کی شرط بتلا رہی ہے کہ حمایت الٰہی اسی وقت متوجہ ہوتی ہے جب کہ مسلمان صبر و تقویٰ میں راسخ ہوں اور تقویٰ کے معنے ہیں احتراز عما نہی اللہ عنہ و امتثال ما امر بہ جس میں اخلاص اور احتراز عن الریاء و من شائبۃ النفس بھی داخل ہے ۱۲ جامع / اور مدینہ میں پہونچکر یہ اخلاق راسخ ہو گئے تھے مہاجرین کو مکہ میں رہنے کی حالت میں کفار کی ایذا پر صبر کرنے سے نفس کی مقاومت سہل ہو گئی نیز قوت غضب نفسانی ضعیف بلکہ زائل ہو گئی تھی۔ پھر ہجرت کے وقت جب انہوں نے اپنے وطن و اہل و عیال و مال و دولت سب پر خاک ڈال دی تو ان کی محبت اتنی کامل ہو گئی اور

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت

سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اور اس میں راز یہ ہے کہ اہل اللہ نے ایک سے تعلق جوڑ لیا ہے بس ان کو اگر خوف ہے تو اُسی کا ہے۔ اُمید بھی ہے تو اُسی سے ہے۔ اس لئے ہر حال میں وہ خوش رہتے ہیں۔ کسی بڑے سے بڑے واقعہ میں وہ خلاف حق کچھ نہیں کرتے چاہے کام ہو یا نہ ہو۔ غرض حاصل ہو یا فوت ہو۔ جیسے حضرت علیؓ نے عین موقع پر یہودی کو چھوڑ دیا تھا حالانکہ ظاہر اس میں اپنی جان کا خطرہ تھا کہ دشمن رہا ہو کر پھر مقابلہ پر آمادہ ہو گا۔ مگر ان کو خطرہ کی کچھ پرواہ نہ ہوئی ان کا تو مذاق یہ تھا ؎

دلآرامے کہ داری دل درو بند　　　　دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

اور یہ حال تھا ؎

مصلحت دید من آن ست کہ یاراں ہمہ کار

بگذارند و خم طرۂ یارے گیرند

اور جن کو خدا کے ساتھ یہ تعلق حاصل نہیں ان کی یہ حالت ہے کہ آج ان کے کچھ فتوے ہیں اور کل کو جہاں اغراض بدلیں، ساتھ کے ساتھ ان کے فتوے بھی بدل گئے۔ ارے یہ کیا قصہ ہے یہ کیسا اسلام ہے، جو اغراض کے تابع ہے مسلمان کو تو ایسا ہونا چاہئے کہ ؎

یکے خواں و یکے داں و یکے گو

مسلمان کو تو ایسا ہونا چاہئے کہ اس ذات کے ساتھ علاقہ رکھے، جو ہمیشہ باقی رہنے والی ہے اور اغراض فانیہ کی نفی کرنی چاہیئے اور ان کے متعلق لا احب الآفلین کہہ دینا چاہیئے ؎

خلیل آسا در ملک یقین زن　　　　صدائے لا احب الآفلین زن

پہلے سب علماء کا فتویٰ تھا کہ ریل میں بدون ٹکٹ کے سفر کرنا حرام ہے مگر اب یہ حالت ہے کہ اس کو جائز کر دیا گیا۔ بہت لوگ جو علماء وطلباء کہلاتے ہیں بے ٹکٹ سفر کرنے

لگے۔ میرے پاس ایک طالب علم کا خط آیا کہ میں بدون ٹکٹ کے ریل میں سفر کرنے کو جائز سمجھتا ہوں اور میرے باپ اس سے منع کرتے ہیں۔ ان کے باپ انگریزی خواں دنیادار تھے اللہ اکبر کبھی وہ زمانہ تھا کہ عربی خواں اس سے منع کرتے تھے اور انگریزی خواں جائز کہتے تھے۔ اب یہ حالت ہے کہ عربی خواں جائز کہتا ہے اور انگریزی خواں منع کرتا ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ انگریزی داں کسی دانا، عارف کا ذبح کیا ہوا تھا۔

نور فہم میں قسم کھا کر کہتا ہوں اور اس سے زیادہ اور کوئی ذریعہ اطمینان دلانے کا میرے پاس نہیں ہے کہ نور فہم بدوں کسی باقی باللہ فانی فی اللہ کی صحبت کے حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے بدوں وہ علم ایسا ہوتا ہے جیسے طوطے کو بعض لوگ قرآن کی سورتیں یا فارسی جملے یاد کرا دیتے ہیں۔ ایسا علم صرف زبان پر ہوتا ہے دل میں اس کا اثر نہیں پہنچتا۔ وقت پر سارا علم غائب ہو جاتا ہے۔ محض اغراض نفسانی کی حفاظت کا خیال غالب ہو جاتا ہے جیسے طوطا اگر بلی کے منہ میں آ جاوے تو سوائے ٹیں ٹیں کے اور سارا علم اس کا کافور ہو جاتا ہے چنانچہ ایک ظریف شاعر نے ایک طوطے کی تاریخ موت لکھی ہے ؎

میاں مٹھو جو ذاکر حق تھے   رات دن ذکر حق رٹا کرتے

گربۂ موت نے جو آ دابا   کچھ نہ بولے سوائے ٹے ٹے

کمال یہ کیا کہ تاریخ موت ٹے ٹے ہی سے نکلتی ہے یعنی ۱۲۳۰ھ

اسی طرح اللہ کا ہو ہے تب اسلام کامل ہوتا ہے ورنہ وقت پر سب لکھا پڑھا غائب ہو جاتا ہے صاحبو! بدوں صحبت اہل اللہ کے توحید بھی کامل نہیں ہوتی کیونکہ توحید کی حقیقت یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی سے خوف و طمع نہ ہو ؎

موحد چہ برپائے بریزی زرش   چہ فولاد ہندی نہی برسرش

امید و ہراسش نباشد زکس   ہمیں است بنیاد توحید و بس

مگر ہماری یہ حالت ہے کہ ہم اسلام کے درجہ ناقص پر کفایت کرتے ہیں۔ اس کی

کوئی نہیں۔ بس پھر تو وہی حالت ہوتی ہے کہ جیسا موقعہ دیکھا ویسا کر لیا۔ اپنی اغراض کے موافق فتویٰ نکال لیا جیسا کہ ان مولوی صاحب نے حدیث میں اکل ذبیحتنا سنکر یہی کہا کہ اس سے تو ذبیحہ گاؤ کا شعار اسلام ہونا معلوم نہیں ہوتا۔ اُن کے اندر نرا جوش تھا۔ کسی کے پاؤں تلے ملے نہیں گئے تھے اس لئے جوش غالب رہا فہم درست نہ ہوا۔ فہم درست ہوتا ہے اس سے کہ ؎

قال را بگذار مرد حال شو   پیش مرد کاملے پامال شو

مگر ہائے یہ کس سے ہو۔ اس وقت تو مولنا کہلاتے ہیں لوگ تعظیم کرتے ہیں ہاتھ پیر چومتے ہیں اور اب ایسی جگہ جائیں گے جہاں نالائق کا خطاب ملے۔ بیوقوف بنائے جائیں۔ بات بات پر روک ٹوک کی جائے مگر یہ صرف چند روز کی مشقت ہے پھر ساری عمر کی راحت ہے۔ چند روز کی روک ٹوک سے جب نفس کی اصلاح ہوجائیگی اور خدا تعالیٰ سے تعلق درست ہوجائیگا تو وہ دولت عطا ہوگی جس کے سامنے سلطنت ہفت اقلیم بھی گرد ہے ؎

چند روزے جہد کن باقی بخند

جس شخص کے اندر مادۂ فاسدہ کا غلبہ ہوتا ہے اُس کے لئے ضرور مسہل کی ضرورت ہے مگر مسہل ساری عمر کا نہیں ہوتا چند روز کیلئے ہوا کرتا ہے پھر خمیرہ گاؤزبان کھلایا جاتا ہے۔

جس کو یہ دولت نصیب ہوگئی ہے اس سے پوچھو خدا کی قسم اہل اللہ کے

قلبی دولت برابر کسی کو راحت نہیں۔ ان کو وہ دولت عطا ہوتی ہے جس کی وجہ سے نہ ان کو کسی خوف کی چیز سے خوف رہتا ہے نہ طمع کی جگہ طمع ہوتی ہے اور اگر یہ بات نصیب نہیں تو اس شخص کی پریشانی کی کوئی حد نہیں ؎

ہیچ کنجے بے دد و بے دام نیست   جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

واقعی خلوت گاہ حق ہی میں آرام مل سکتا ہے اور کہیں راحت نہیں۔ اسی کو فرماتے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]   [illegible]

[illegible]

فانهم لا یعلمون (الٰہی میری قوم کی آنکھیں کھول دے کیونکہ یہ مجھ کو پہچانتے نہیں ہیں۔ اس لئے میرے ساتھ ایسا برتاؤ کر رہے ہیں اگر یہ مجھ کو پہچان لیتے تو ہرگز میرے ساتھ یہ معاملہ نہ کرتے ۱۲)

حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تو بڑی شان ہے آپ کے غلامان غلام بھی امت کے حال پر ایسے شفیق و مہربان ہوئے ہیں کہ اپنے ایذا رسانوں کے لئے ہمیشہ دعا ہی کرتے تھے۔ حضرت ابراہیم بن ادھم جب غار نیشاپور سے نکلے ہیں تو انہوں نے حج کا ارادہ کیا اور چونکہ یہ حج نفلی تھا اس لئے تکمیل سلوک کے بعد انہوں نے حج کا قصد کیا۔ اس سے پہلے نہیں کیا کیونکہ تکمیل سے پہلے نفس گندگیوں سے ملوث ہوتا ہے تو اس پاک دربار کے اندر ناپاکیاں لے کر نہ جانا چاہئے۔ جب نفس تمام گندگیوں سے پاک وصاف ہو جاوے اس وقت اس قابل ہوتا ہے کہ اس دربار میں حاضر ہو۔ ہاں فرض حج اس سے مستثنیٰ ہے۔ بعض لوگ تو مکہ ایسے جاتے ہیں کہ ایک نواب کو گورنمنٹ نے جلاوطن کیا اور ان سے پوچھا گیا کہ کہاں رہنا چاہتے ہو؟ انہوں نے مکہ تجویز کیا کہ مجھے مکہ بھیج دیا جائے اب وہاں ان کی یہ حالت تھی کہ روزانہ سڑک پر کھڑے ہوئے عورتوں کو گھورتے تھے۔ اسی طرح بعض لوگ حج کا ارادہ محض سیر و سیاحت کی نیت سے کرتے ہیں۔ اس لئے ان لوگوں کو سفر نامے لکھنے اور راستہ کے حالات قلمبند کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ اس کو حضرت عراقی فرماتے ہیں ؎

بطواف کعبہ رفتم بحرم رہم نہ دادند   کہ بروں در چہ کردی کہ درون خانہ آئی

بزمیں چو سجدہ کردم ز زمیں ندا برآمد   کہ مرا خراب کردی تو بسجدۂ ریائی

اور ایسے ہی لوگوں کو شیخ مسعود بک خطاب فرماتے ہیں ؎

اے قوم بحج رفتہ کجا ئید کجا ئید   معشوق درینجاست بیا ئید بیا ئید

مطلب یہ ہے کہ جس حالت سے تم حج کو جاتے ہو اس حالت میں رضائے محبوب اور وصال تم کو حاصل نہ ہوگا۔ ابھی تم کو اپنے گھر ہی میں کسی شیخ کے پاس رہ کر اصلاح نفس میں مشغول ہونا چاہئے۔

اور یہ مت سمجھو کہ شیخ حج سے روک رہے ہیں نہیں بلکہ وہ تمہارے ایمان کی حفاظت کر رہے ہیں۔ بعض لوگ حج کو جاتے ہیں مگر ایمان کو مکہ ہی میں چھوڑ آتے ہیں۔ اُن میں رستہ میں تکالیف کی جب برداشت نہیں ہوتی تو خدا اور رسول پر اعتراض کرتے ہیں اور حج کو فضول بتلاتے ہیں۔ بتلاؤ ان کا ایمان کہاں رہا۔ ایسے لوگوں سے یہی کہا جائیگا کہ تم ہندوستان میں رہ کر پہلے کسی شیخ سے نفس کی اصلاح کا نسخہ لے کر یں تو جب وہ اجازت دے تب حج کرنا۔ البتہ حج فرض کے لئے جانے کی تو ہر حال میں اجازت ہے۔ ہاں حجِ نفل سے اس کو منع کیا جائیگا۔ کیونکہ بعض لوگ نفل حج کے لئے بہت سے فرائض ترک کر دیتے ہیں۔ چنانچہ جہاز کے اندر آپ کو ایسے حاجی بہت ملیں گے جو دوسرے تیسرے حج کو جا رہے ہوں گے مگر نماز ندارد۔

ہمارے ساتھ ایک سید صاحب عرب تھے وہ جہاز میں نماز نہ پڑھتے تھے اور روتے تھے کہ یہاں پاخانہ میں پانی شرشر چلتا ہے جس سے چھینٹیں پڑ کر کپڑے ناپاک ہو جاتے ہیں۔ میں نماز کیسے پڑھوں۔ میں نے کہا ؂

چوں طمع خواہد زمن سلطان دین	خاک بر فرقِ قناعت بعد ازیں

اگر خزانہ شاہی میں کھوٹے روپے منظور ہوتے ہوں تو ہم کون ہیں جو یوں کہیں کہ نہیں حضور ہم تو کھرے ہی دیں گے، کھوٹے کبھی داخل نہ کریں گے۔ جب حق تعالیٰ کی طرف سے ہم کو حکم ہے کہ جہاز میں تم وسوسہ اور شبہ کی وجہ سے نماز ترک نہ کرو۔ پڑھتے رہو۔ تو ہم کو دسو کی کیا ضرورت ہے؟ بس اگر کہیں ناپاکی آنکھوں سے نظر آ جاوے اس کو پاک کر دو۔ اگر نظر نہ آوے تو وہم کی کیا ضرورت ہے مگر وہ سید صاحب روتے تو بہت تھے جہاز میں نماز ایک دن نہ پڑھتے تھے۔ یاد رکھو بدوں عمل کے رونا کچھ مفید نہیں۔ بعض لوگ صرف وعظ میں رونے کو کافی سمجھتے ہیں مگر یہ تو ایسا ہوا جیسا گنگا کا اشنان کہ ذرا سا پانی بدن پر ڈال لیا اور سب پاپ بہہ گئے۔ لیکن یہ تو ہندوؤں کا اعتقاد ہے۔ مسلمان کا عقیدہ تو یہ ہے ؂

تکمیل کی فکر نہیں کرتے۔ نہ نماز کی فکر ہے نہ روزہ کی۔ اسی قصد پر یہ بیان چلا تھا۔ پس ہم کو تکمیل اسلام کی فکر چاہیے۔ اسلام کامل یہ ہے کہ انسان پورا اللہ والا ہو جاوے جسکا ایک شعبہ یہ ہے کہ دین کو دنیا اور اغراض کے تابع نہ بنایا جاوے۔ اس وقت دین کی فہم حاصل ہوگی اور جس کے اوپر اغراض نفسانی کا غلبہ ہوگا اسے دین کی سمجھ حاصل نہ ہوگی۔ ایسے ہی علماء کا یہ خیال ہے کہ ذبیحہ گاؤ شعار اسلام نہیں اب میں حدیث سے اس کا شعار اسلام ہونا ثابت کرتا ہوں حضور صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں من صلی صلوتنا واستقبل قبلتنا واکل ذبیحتنا فہذا ہو المؤمن الذی لہ ذمۃ اللہ ورسولہ فلا تخفروہ فی ذمتہ (او کما قال) اکل ذبیحتنا میں اضافت تخصیص ہے جیسا کہ من صلی صلوتنا واستقبل قبلتنا میں بھی ایسی ہی اضافت ہے کیونکہ نماز تو یہود و نصاریٰ کے مذہب میں بھی ہے اسی طرح استقبال قبلہ بھی اُن کے مذہب میں موجود ہے تو اضافت تخصیص سے یہ مطلب حاصل ہوا کہ جو شخص ایسی نماز پڑھے جو اسلام کے ساتھ خاص ہے اور اس قبلہ کا استقبال کرے جو مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہے وہ مسلمان ہے تو یہی مطلب ذبیحتنا کی اضافت سے بھی حاصل ہوگا کہ جو شخص وہ ذبیحہ کھائے جو اہل اسلام کے ساتھ مخصوص ہے تو ایسے ذبیحہ کا کھانا اسلام کی علامت ہے۔ اب بتلاؤ کہ ہندوستان میں ایسا خاص ذبیحہ کونسا ہے جو اہل اسلام کے ساتھ خاص ہے ظاہر ہے کہ وہ بجز ذبیحہ گاؤ کے اور کوئی نہیں تو پھر اس کے شعار اسلام ہونے میں کیا شبہ رہا۔ بس میں تو یہ کہتا ہوں کہ مسلمانوں کو اسکی کوشش کرنی چاہیئے کہ جن گاؤں والوں پر ارتداد کا خطرہ ہو۔ اُن کو گائے کا گوشت کھلانا شروع کریں پھر وہ ایسا پہرہ دار ہو جائیگا کہ کفار وہاں سے بھاگ جائیں گے۔ گائے کا گوشت کھا لینے کے بعد اُن کو اُن گاؤں والوں کی طرف سے مایوسی ہو جائے گی۔ اس مضمون سے دوسری قوموں کی دل آزاری مجھے مقصود نہیں ہے بلکہ ہم تو اپنے بھائیوں کی اصلاح کا طریقہ بتلاتے ہیں۔ دوسروں سے ہم کو کیا غرض؟ دل آزاری یا مقابلہ کرنا سیاستدانوں کا طریقہ ہے ہم لوگوں کو سیاسی تدابیر سے کوئی سروکار نہیں ہم تو محض مذہبی احکام بیان کرتے ہیں۔ تو ایک مقصود تو

میرا اس وقت یہ تھا کہ ہم لوگوں کو اپنے اسلام کی تکمیل میں سعی کرنا چاہیئے۔

تبلیغ اسلام: دوسرا مقصود یہ ہے کہ جب اسلام ہی دین کامل ہے تو جن لوگوں کے پاس یہ نعمت نہیں ہے ان کے پاس بھی اس کو پہونچانا چاہئے۔ کیونکہ اول تو یہ بات مروت اور ہمدردی کے خلاف ہے کہ ایک نافع چیز سے خود ہی انتفاع کیا جائے اور دوسروں کو محروم رکھا جائے۔ مثل مشہور ہے کہ ؎

حلوا بہ تنہا نبایست خورد

دوسرے ہم کو شرعاً بھی اس کا حکم ہے کہ جن لوگوں کو اسلام کی خوبیاں معلوم نہیں ہیں۔ اُن کے سامنے اس کے محاسن کو بیان کریں تو اب دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ جن کے پاس نعمت اسلام ہے مگر ادھوری ہے ان کو تو پورا مسلمان بنانے کی سعی کی جائے۔ اس شعبہ کا نام میں تکمیل اسلام رکھتا ہوں۔ دوسرے وہ جن کے پاس یہ نعمت نہیں ہے اُن کو اسلام پہونچانا چاہئیے۔ اس شعبہ کا نام میں تبلیغ اسلام رکھتا ہوں۔ اس میں بہت زمانے سے مسلمان کوتاہی کر رہے ہیں۔ اس فرض کو سبھی نے بھلا دیا۔ حالانکہ انبیاء علیہم السلام کا اصل کام یہی تھا۔ وہاں پڑھنا پڑھانا اور کتابوں کا درس کہاں تھا؟ انبیاء علیہم السلام کا اصل کام تبلیغ ہی تھا۔ اب ہماری یہ حالت ہے کہ بہت لوگ تو اس کو معمولی کام سمجھتے ہیں اور جو اس کی ضرورت و مرتبہ کو کچھ سمجھتے بھی ہیں۔ وہ بھی ایسی جگہ جا کر تبلیغ کرتے ہیں جہاں ان کی خاطر و مدارات ہوتی ہے۔ کفار میں جا کر کوئی تبلیغ نہیں کرتا کیونکہ وہاں خاطر مدارات کہاں؟ بلکہ بعض دفعہ برا بھلا سننا پڑتا ہے۔ اس وجہ سے لوگ کفار کو تبلیغ کرتے ہوئے رکتے ہیں۔ افسوس انبیاء علیہم السلام کی تو یہ حالت تھی کہ جن لوگوں نے اُن کے خون بہائے سر پھوڑے، دانت توڑے لوہے کا خود سر میں گھسا دیا، ان کو بھی تبلیغ کرتے رہے۔ تمام تکالیف جھیلتے رہے، مگر تبلیغ نہیں رکے اور بڑا کمال یہ کہ ایسی ایسی تکالیف سہنے پر بھی کفار کے حق میں بددعا نہیں کی۔ شفقت کا یہ عالم تھا کہ ایسے دشمنوں کے واسطے بھی ان کے منہ سے یہ دعا ہی نکلتی تھی رب اھد قومی

عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال — صد سال میتواں بہ تمنا گریستن

رونے سے بدون عمل کے کچھ نہیں ہوتا اور اگر عمل ہو اور رونا نہ آوے تو اس سے کچھ نقصان نہیں ہوتا۔

میرے ایک دوست نے لکھا کہ مجھے رونا نہیں آتا۔ میں نے لکھا پھر کیا حرج ہے تمہارا دل تو رو رہا ہے تم اس کے مصداق ہو۔ ؎

اے خنک آں دل کہ آں بریان اوست

غرض نفل حج کے لئے جانے سے پہلے نفس کی اصلاح ضرور کر لینی چاہیئے مکہ ایسی حالت میں جاوے کہ وہاں پہنچ کر ہندوستان یاد نہ آوے۔ نہ وہاں کی تکالیف سے گھبرا کر یہاں کی راحتوں کا خیال آوے۔ ہمارے حاجی صاحب کا ارشاد ہے کہ مکہ میں رہنا اور دل ہندوستان میں اٹکا ہو اس سے تو یہ بہتر ہے کہ ہندوستان میں رہے اور دل مکہ سے وابستہ ہو کہ دیکھئے کب زیارت نصیب ہو۔ کس دن جانا ملے۔

اسی واسطے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عادت تھی کہ حج سے فارغ ہونے کے بعد درہ لے کر لوگوں سے کہتے پھرتے تھے کہ بس حج ہو چکا۔ اب اپنے اپنے گھر کا راستہ لو یا اھل الیمن یمنکم و یا اھل الشام شامکم و یا اھل العراق عراقکم واقعی حضرت عمر رضی اللہ عنہ بڑے حکیم تھے۔ وہ جانتے تھے کہ حج کے بعد قدرتی طور پر وطن کا اشتیاق دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے۔ تو اب ایسی حالت میں مکہ کے اندر قیام کرنا باطن کے لئے مضر ہے اس دربار میں اپنے گھر کو یاد کرتے ہوئے نہ رہنا چاہیئے کہ یہ بڑی گستاخی ہے۔

مدینہ منورہ میں ایک صاحب نسبت بزرگ کی زبان سے اتنی بات نکل گئی کہ شام یا ہندوستان کا دہی یہاں کے دہی سے اچھا ہوتا ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے عالم رویا یا عالم واقعہ میں فرمایا کہ نکل جاؤ ہمارے یہاں سے وہیں جا کر رہو، جہاں کا دہی اچھا ہے۔

صاحبو! یہ نقصان ہوتا ہے اس دربار میں پہونچکر اپنے گھر بار کو یاد کرینگا۔

اور اسی واسطے حضرت ابراہیم بن ادھمؒ نے تکمیل سے

شفقت اولیاء اللہ: پہلے حج کا ارادہ نہیں کیا جب سلوک کامل ہو گیا تب حج کو چلے۔ راستہ میں سمندر تھا۔ ایک جہاز میں سوار ہوئے۔ وہاں ایک رئیس رند مشرب بھی پہلے سے سوار تھا۔ اس کے ساتھ گانے بجانے والے بھانڈ بھی تھے۔ پہلے زمانہ کے رؤسا ان خرافات میں تو مبتلا ہوتے تھے مگر آج کل کے رئیسوں سے پھر بھی اچھے ہوتے تھے کیونکہ آج کل کے تعلیم یافتہ رؤسا گو ان ظاہری خرافات سے بری ہیں مگر ان میں باطنی خرافات کوٹ کوٹ کر بھری ہیں وہ کیا تکبر، غرور، حسد، بیدردی اور بے رحمی اور پہلے رؤسا میں یہ باتیں نہ ہوتی تھیں۔ وہ دل کے بہت نرم ہوتے تھے۔ مروت اور رحم اور ہمدردی ان کے اندر بہت ہوتی تھی۔ اپنے کو خاکسار سمجھتے تھے۔ متواضع ہوتے تھے اور آج کل کے تعلیم یافتہ ایسے متکبر ہوتے ہیں کہ انگریزی پڑھ کر اپنے کو دین کا بھی محقق سمجھنے لگتے ہیں احکام شرعیہ میں رائے دیتے ہیں۔ مولویوں کی تو ہستی کیا ہے رسول کی بات کو بھی رد کر دیتے ہیں۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم تو ایک حکم عام بیان فرمائیں اور یہ بلا دلیل محض اپنے اجتہاد سے اس کو اس زمانہ کے لئے خاص بتائیں۔ پہلے رئیسوں میں یہ باتیں نہ ہوتی تھیں۔ باوجودیکہ وہ آج کل کے رئیسوں سے زیادہ دین کا علم رکھتے تھے۔ کیونکہ اس زمانہ میں انگریزی پڑھنے کا نام تو علم تھا ہی نہیں۔ قرآن وحدیث فارسی کی کتابوں کا پڑھنا پڑھانا علم شمار ہوتا تھا اور ان کتابوں میں دین ہی کی باتیں ہوتی ہیں مگر پھر بھی اس زمانہ کے رؤسا سے دین میں دخل اندازی منقول نہیں ہے اور اگر کسی سے منقول بھی ہے تو وہ بھی کسی عالم کے بہکانے سے خود ان کو ایسی جرأت نہ ہوتی تھی۔

غرض بھانڈوں نے ایک دن کہا کہ آج تو ہم اس طرح نقل کرنا چاہتے ہیں کہ کسی شخص کے ساتھ مذاق کریں اس کے چپت اور دھول ماریں۔ اس سے کوئی شخص اس کلم

کے لئے تجویز کیا جاوے وہاں بجز ابراہیم بن ادھم رحمتہ اللہ علیہ کے کوئی شخص ایسا غریب نظر نہ آیا جس کو تختہ مشق بنایا جاوے اللہ اللہ ؎

ایں چنیں شیخ گدائی کو بکو　　عشق آمد لا اُبالی فاتقوا

چنانچہ ان کو لے چلے اور وہ ساتھ ہو لئے۔ وہ اس لئے ساتھ ہو لئے کہ ؎

از خدا داں خلاف دشمن و دوست　　کہ دل ہر دو در تصرف او ست

گر گزندت رسد ز خلق مرنج　　کہ نہ راحت رسد ز خلق نہ رنج

وہ تو یہ سب معاملہ خدا کی طرف سے سمجھے ہوئے تھے اور زبان حال سے یہ کہتے جا رہے تھے ؎

بجرم عشق توام می کشند و غوغائیست　　تو نیز بر سر بام آکہ خوش تماشائیست

وہاں نقل شروع ہوئی اور حضرت ابراہیم کو چھپانے لگے۔ جب حضرت ابراہیم کا امتحان ہو چکا تو اب غضب الٰہی کو جوش ہوا۔ حق تعالیٰ اپنے دوستوں کا امتحان کرنے کے لئے بعض دفعہ مخالفوں اور دشمنوں کو ان پر مسلط کر دیتے ہیں مگر پھر بہت جلد مخالفوں پر غضب و قہر کا نزول ہونے لگتا ہے۔ یہ مت سمجھو کہ ہم کو مخالفت کرتے ہوئے اتنے دن ہو گئے اور کچھ نہیں ہوا۔ اہل اللہ کا ستانا خالی نہیں جاتا ؎

حلم حق با تو مواسا ہا کند　　چونکہ از حد بگذری رسوا کند

اور اسی حالت میں حضرت ابراہیم کو الہام ہوا کہ تم ذرا زبان ہلا دو تو ہم ابھی ان سب کو غرق کر دیں۔ اب ان کا ظرف دیکھئے اگر ہم جیسے ہوتے تو معلوم کیسی تیز بد دعا کرتے وہ عرض کرتے ہیں کہ حضور جب میری خاطر سے آپ ان کے حق میں میری بد دعا قبول فرمانے کا وعدہ فرماتے ہیں تو میری خاطر آپ ان کی آنکھیں ہی نہ کھول دیں کہ جس باطنی بلا میں یہ غرق ہو رہے ہیں۔ اس سے ان کو نجات مل جائے۔ دعا قبول ہوئی اور ان سب لوگوں کی قلبی آنکھوں پر سے غفلت کے پردے ہٹا دیئے گئے اور سب کے سب ولی ہو گئے۔ اب جو آنکھیں

کھلی ہیں اور حضرت ابراہیم کا درجہ وحال معلوم ہوا اور اسپر اپنی حرکتوں کو دیکھا، تو بے اختیار سب قدموں میں گر پڑے۔

سبحان اللہ کیسی شفقت تھی کہ ایسے گستاخ لوگوں پر بھی بد دعا نہ کی گئی اور سنیئے ابھی قریب زمانہ میں ایک بزرگ مولنا محمد یعقوب صاحب دہلوی گذرے ہیں۔ جن کے دیکھنے والوں میں سے شاید اب بھی کوئی زندہ ہو مکہ کو ہجرت فرماگئے تھے۔ ان کا قصہ ہے کہ ایک بار وہ مکہ کے بازار میں کسی دکان پر کچھ خرید رہے تھے۔ آپ کی عادت تھی کہ جتنی رقم ہوتی تھی سب ایک تھیلی میں رکھتے تھے اور بازار میں ساری تھیلی لے جاتے اور جب اس میں سے کچھ نکالنا ہوتا تو ساری تھیلی دکان پر الٹ کر جتنے کا سودا لینا ہوتا۔ لیکر باقی تھیلی میں ڈال لیتے۔ غرض روپیہ کی حفاظت وغیرہ کا کچھ خیال نہ تھا۔ نہ یہ فکر تھی کہ لوگ تھیلی کی جمع دیکھ کر میرے درپے ہوجائیں گے سبحان اللہ یہ باتیں ہیں جو کرامات سے بھی زیادہ ہیں غرض ایک دن اسی طرح سودا لے رہے تھے۔ ایک بدو نے تھیلی کو تاک لیا جس وقت آپ بازار سے لوٹے اور اس گلی میں داخل ہوئے جس میں آپ کا مکان تھا۔ وہاں بجز مولنا کے اور اس بدو کے اور کوئی نہ تھا بدو نے یہ موقعہ غنیمت سمجھا اور تھیلی کو مولنا کے ہاتھ سے چھین وہ جا یہ جا۔ آپ نے کچھ التفات بھی نہ فرمایا۔ سیدھے اپنے گھر میں چلے گئے۔

اب خدا کی قدرت دیکھئے کہ اس بدو نے جو اس گلی سے نکلنا چاہا تو حق تعالیٰ نے راستہ بند کر دیا۔ وہ چل پھر کر پھر اسی موقعہ پر آپہنچا جہاں سے تھیلی لے کر چلا تھا۔ چند بار ایسا ہوا کہ وہ وہاں سے چلتا اور پھر وہیں آموجود ہوتا۔ اب وہ سمجھا کہ یہ شخص خدا کا مقرب ہے شاید اس نے میرے واسطے بد دعا کی ہے جو مجھ کو راستہ نہیں ملتا۔ اس لئے اس نے مولنا کے دروازہ پر آکر پکارنا شروع کیا یا شیخ یا شیخ خذ منی صریتک اے شیخ مجھ سے اپنی تھیلی لے لو۔ مگر مولنا نے ایک آواز کا بھی جواب نہ دیا۔ تو اس بدو نے دوسری ترکیب کی کہ چلانا شروع کیا کہ اے لوگو! دوڑو مجھے ظالم سے بچاؤ۔ اس آواز پر لوگ جمع ہوگئے اور پوچھا

کہ تجھ پر کس نے ظلم کیا ہے؟ کہنے لگا کہ اس گھر میں جو رہتا ہے اس نے مجھ پر ظلم کیا ہے؟ اس کو بلاؤ ذرا گھر سے باہر نکلیں۔ لوگوں نے کہا کہ وہ تو بڑے نیک آدمی ہیں وہ کسی پر ظلم نہیں کر سکتے۔ بدو نے کہا واللہ مجھ پر انہوں نے بڑا ظلم کیا ہے تم ان کو بلاؤ تو آخر لوگوں نے مولانا کو آواز دی کہ ذرا گھر سے باہر تشریف لائیں۔ آخر مولانا حیران (پڑوسیوں کی رعایت سے باہر تشریف لائے تو لوگوں نے بدو سے پوچھا کہ بتلا انہوں نے تجھ پر کیا ظلم کیا ہے؟ کہنے لگا کہ میں نے ان کی تھیلی چھین لی تھی۔ جب میں اس کو لے کر چلا تو راستہ مجھ پر بند ہوگیا۔ میں اس کوچہ سے باہر نکلنا چاہتا تھا مگر چل پھر کر اسی جگہ آموجود ہوتا جہاں اب کھڑا ہوں۔ میں نے اس شخص کو آواز دی کہ اپنی تھیلی مجھ سے لے لو تو اس نے میری آواز کا جواب بھی نہ دیا۔ یہ ظلم انہوں نے میرے اوپر کیا ہے کہ نہ تو تھیلی واپس لیتے ہیں نہ مجھ کو راستہ ملتا ہے۔ اب تم لوگ ان سے کہو کہ مجھ سے اپنی تھیلی واپس لے لیں اور مجھے اس بلاء سے نجات دیں۔ لوگوں نے مولانا سے عرض کیا کہ حضرت اپنی تھیلی واپس لے لیجئے اور اس غریب پر رحم کیجئے۔

اب عجیب بات دیکھئے کہ مولانا فرماتے ہیں یہ تھیلی تو میری نہیں ہے اور بدو کہتا تھا کہ واللہ یہ ان ہی کی ہے میں نے ان کے ہاتھ سے چھینی ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ ہاں چھیننے سے پہلے تو میری تھی مگر چھیننے کے بعد میری نہیں رہی بلکہ تیری ملک ہو چکی ہے کیونکہ جب تو نے اس کو چھینا تھا میں نے اسی وقت حق تعالیٰ سے عرض کر دیا تھا کہ میری وجہ سے اس شخص کو عذاب نہ کیا جاوے۔ میں نے یہ تھیلی اس کو ہبہ کر دی ہے اور قبضہ اس کا ہے ہی۔ بس اس کی ہوگئی۔ اس لئے اب یہ میری نہیں رہی میں اس کو واپس نہیں لے سکتا (اور قبول ابھی تک واقع نہ ہوا تھا مگر واہب تو اپنی طرف سے اخراج عن الملک کا سامان پورا کر چکے اس لئے اپنے حق میں معاملہ ہبہ کا کیا یہ نہایت احتیاط ہے) لوگ حیران رہ گئے کہ کیا عجیب ماجرا ہے آخر بدو نے کہا کہ اگر تم تھیلی کو واپس نہیں لیتے تو میرے واسطے دعا ہی کر دو کہ مجھے راستہ مل جاوے۔ مولانا نے دعا فرمادی اور وہ خوش خوش اپنے گھر چلا گیا۔ صاحبو!

حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے غلامان غلام کی یہ شفقت ہے اپنے ایذا دینے والوں پر پھر حضور کی شفقت کا کیا حال ہوگا واقعی سچ ہے ؎

نماند بعصیاں کسے در گرد — کہ دارد چنیں سید پیشرو

جب حضور کی یہ شفقت ہے تو انشاء اللہ ہم گنہگار بھی آپ کے طفیل سے پار ہو جائیں گے اور تبلیغ اسلام کا کام زیادہ تر شفقت سے ہوا ہے جس کو امت کے حال پر شفقت ہوگی۔ وہی تبلیغ کے مصائب کو خوشی سے برداشت کر سکے گا۔ اب چونکہ ہم لوگوں میں شفقت نہیں ہے اس لئے تبلیغ میں کمی ہو رہی ہے۔ ہم لوگ جو جھوٹے سچے مولوی کہلاتے ہیں، ہم بھی وعظ کہنے وہیں جاتے ہیں جہاں کھانے کو عمدہ عمدہ غذائیں ملیں۔ نخروں سے بلائے جائیں۔ کرایہ ڈبل ملے۔

ایک بار میں ایک انجمن کے جلسہ میں بلایا گیا۔ جب ان لوگوں نے مجھے کرایہ دینا چاہا تو بہت رقم پیش کی۔ میں نے کہا کہ اتنی رقم میں کیا کروں گا؟ میرے تو چند روپے صرف ہوتے ہیں۔ ان کو اس جواب پر بڑی حیرت ہوئی۔ پھر کھانے کے اندر انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ آپ چائے پئیں گے۔ میں نے کہا نہیں، پان کھائیں گے؟ میں نے کہا نہیں۔ مجھے ان میں سے کسی کی عادت نہیں۔ پوچھا کھانا خاص کس قسم کا کھائیں گے؟ میں نے کہا کہ اپنے گھر پر دال روٹی کھاتا ہوں، وہی کھاؤں گا۔ ان کو ہر بات پر تعجب ہوتا تھا۔ آخر میں نے پوچھا کہ آپ کو حیرت وتعجب کیوں ہے اور یہ سوالات آپ مجھ سے کیوں کرتے ہیں۔ کہنے لگے کہ صاحب یہاں ایک واعظ صاحب ابھی آئے تھے جنہوں نے بڑے عیب نکالے۔ بہت نخروں سے کھانا کھاتے تھے۔ دو دن میں گیارہ روپے کے پان کھائے (خیر کھاتے تو کیا ہوں گے مگر حاضرین کو کھلائے جس کا ان کو کوئی حق نہ تھا جب کہ میزبان کو گراں ہوا) اس لئے ہم کو آپ کی ہر بات پر تعجب ہوتا ہے کہ آپ تو کرایہ بھی بہت کم بتلاتے ہیں اور دال روٹی کے سوا کسی چیز کی درخواست نہیں کرتے۔ نہ چائے کی نہ پان کی۔ میں نے کہا بھائی وہ بڑے درجہ کے آدمی تھے ان کا ویسا

ہی خرچ بھی تھا۔ میں تو گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ چھوٹے درجہ کا آدمی ہوں۔ ویسا ہی میرا مختصر خرچ ہے۔ غرض ان وجوہ سے تبلیغ کا کام رک گیا، کیونکہ جن کفار میں تبلیغ کی ضرورت ہے یا جن نومسلموں کو کفار سے بچانا ضروری ہے۔ ان کی حالت یہ ہے کہ ہم سے ان کو پرہیز ہے وہ ہم کو خود تو کیا بلاتے۔ جانے کے بعد ٹھہرنے کو جگہ بھی نہیں دیتے۔ نہ کھانے کو پوچھتے ہیں نہ پانی کو۔ بھلا وہ تم کو ڈبل کرایہ اور چائے پان کہاں دیں گے۔ پھر ایسی جگہ کون جائے اور یہ تکلیفیں کون جھیلے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام دوسری جگہ تو کیا پھیلتا۔ جہاں اسلام پہلے تھا وہاں سے بھی نکلنے لگا۔

مگر آج کل ایک قصہ کی وجہ سے لوگوں کو پھر تبلیغ پر کچھ توجہ ہوئی ہے اور اس کی ضرورت کا احساس ہوا ہے۔ گو مجھے یہ امید اپنے بھائیوں سے نہیں ہے کہ وہ اس پر دوام کریں کیونکہ ان میں نرا جوش ہی جوش ہوتا ہے استقلال نہیں ہے اور جوش کا قاعدہ ہے کہ وہ زیادہ دیرپا نہیں ہوتا کاش اگر ان میں جوش کے ساتھ استقلال بھی ہوتا تو کیا اچھا ہوتا؛ مگر ان کا جوش بھی مستقل نہیں ہوتا صرف چند روزہ ہوتا ہے مگر خیر اس جوش کا پیدا ہونا بھی خدا کی رحمت ہے اس سے ہم کو کام لینا چاہیے۔

تدبیر تبلیغ

جس کا طریقہ یہ ہے کہ اس جوش کی حالت میں ہوش سے کام لیکر ایسی تدبیریں نکالیں، جس سے تبلیغ کا کام ہمیشہ چلتا رہے اور محض زمانہ جوش تک منحصر نہ رہے جس کی صورت آسان یہ ہے کہ جس طرح مسلمانوں نے اسلامی مدارس تعلیم عربی کے لئے قائم کر رکھے ہیں جو بدون کسی جوش کے زمانہ دراز سے چلے آ رہے ہیں اسی طرح کچھ مستقل مدارس محض تبلیغ کے لئے قائم کر دیں جن میں صرف اس کام کی تعلیم دی جائے اور مبلغین تیار کئے جائیں۔ مدارس عربیہ کے ساتھ اس کام کو ملحق نہ کیا جاوے۔ اس سے تعلیم علوم دین کے کام میں نقص پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ تجربہ سے معلوم ہو جائیگا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آج کل تعلیم یافتہ مسلمانوں میں اور علماء میں دو قسم

کے لوگ ہیں ایک وہ جو فکر معاش وغیرہ سے فارغ ہیں وہ تو اس وقت سے اپنے کو تبلیغ کے لئے وقف کر دیں اور جو لوگ فکر معاش سے فارغ نہ ہوں۔ مگر اس وقت کسی اور کام میں بھی مشغول نہیں وہ بھی اس کام میں لگ جائیں اور اہل تمول ان کی اعانت کریں اور جو لوگ ملازمت وغیرہ یا درس وتدریس میں مشغول ہیں وہ اپنے کام کو ترک نہ کریں مگر تعطیل کے زمانہ میں یا کچھ رخصت بلا وضع تنخواہ مل سکے تو رخصت لے کر ان ایام میں تبلیغ کا کام کیا کریں اس طرح ہزاروں مبلغ مفت مل جائیں گے مگر اس کی ضرورت ہے کہ ہر شخص اس کام کی اہمیت کا احساس کر کے اسپر توجہ کرے۔

ایک صورت چندہ کی ہے کہ عام لوگ چندہ دیں اور خاص لوگ تبلیغ کا کام کریں مگر یہ صورت بہت بدنام ہوگئی ہے اور ہم نے خود اس کو بدنام کیا ہے کہ مخلوق کا روپیہ لے کر کام کچھ بھی نہ کیا اور روپیہ کھائی کر سب برابر کر دیا۔ ورنہ یہ صورت بہت اچھی ہے اور آسان بھی۔ تمام قومیں مذہبی کام اسی طرح سے کر رہی ہیں مگر میں اس صورت کی رائے نہیں دیتا۔

میرے نزدیک چندہ کی بہتر صورت یہ ہے کہ ہر رئیس اپنی حیثیت کے موافق ایک مبلغ کا خرچ اپنے ذمہ رکھ لے یا چند رؤسا مل کر ایک مبلغ کا خرچ اپنے ذمہ رکھ لیں اور ہر مہینہ اس کو تنخواہ خود دیدیا کریں۔ کسی انجمن وغیرہ میں چندہ بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ مگر یہ ضروری ہے کہ مبلغ کا انتخاب خود نہ کریں بلکہ علماء سے مشورہ کر کے کسی کو ملازم رکھیں۔ لیکن اس کے ساتھ ملازم کا سا برتاؤ نہ کریں بلکہ اسکو اپنا مخدوم سمجھیں۔

اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو جو انجمنیں تبلیغ کا کام کر رہی ہیں ان کی ہی اعانت مال سے کرتے رہیں۔ اگر اس کے کارکن خیانت کریں گے خدا کے یہاں بھگتیں گے مگر جب کسی خیانت کا علم ہو جائے اس کو پھر چندہ نہ دیں بلکہ اب اس کو دیں جس کی خیانت کا ہنوز علم نہیں ہوا۔ وعلی ہٰذا۔

اور جو لوگ مالی اعانت نہ کر سکیں وہ دعا کرتے رہیں یہ بھی بڑی امداد ہے سے

لا خیل عندک تھدیھا ولا مال

فلیسعد النطق ان لم یسعد الحال

اور جس سے دعا بھی نہ ہو سکے تو للہ وہ اس پر ہی عمل کریں کہ

مرا بخیر تو امید نیست بد مرساں

یعنی وہ خدا کے واسطے اس کام میں روڑے تو نہ اٹکادیں۔ آج کل ایسے بھی مسلمان ہیں جو تبلیغ کے کام میں روڑے اٹکاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ کام چھوڑ دو۔ اس سے ہندو مسلم اتحاد میں فرق آتا ہے انا للہ وانا الیہ راجعون ان کے یہاں اب بھی ہندوؤں سے اتحاد ہی چلا جارہا ہے مگر مزہ یہ ہے کہ اتحاد تو جانبین سے ہوا کرتا ہے مگر ان کا اتحاد یک طرفی ہے کہ ہندو تو ان کی ذرا بھی رعایت نہیں کرتے۔ جہاں ان کو موقع ملتا ہے مسلمانوں کو مرتد کر لیتے ہیں۔ آبروریزی یا جان و مال کے درپے ہو جاتے ہیں مگر ان حضرات کا اتحاد اب بھی باقی ہے۔ بھلا ان سے کوئی پوچھے کہ جب مسلمانوں کو ہندو مرتد بناتے ہیں تو کیا مسلمانوں کو مرتد ہونے دیا جائے؟ ان کو سنبھالنے کی کوشش نہ کیجئے۔ اگر ان کی یہی رائے ہے تو اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ چاہے ایمان جاتا ہے مگر اتحاد نہ جائے تو ایسے اتحاد پر لعنت ہے جس کے واسطے ایمان و اسلام کی بھی پرواہ نہ ہے۔ جن صاحبوں کی یہ رائے ہے وہ خود تبلیغ نہ کریں۔ مگر جو لوگ یہ کام کرنا چاہتے ہیں ان کو یہ کس لئے روکتے ہیں؟

بس مسلمانوں کو اللہ کے نام پر یہ کام شروع کرنا چاہئے اور ان لوگوں کی باتوں پر توجہ نہ کرنا چاہئے۔ تبلیغ میں بحث و مباحثہ یا مناظرہ کی ضرورت نہیں بسکون و وقار سے کام کرو۔ جہاں مباحثہ کی دوسری طرف سے تحریک ہو۔ وہاں کر دو خود چھیڑ نہ اٹھاؤ۔ بلکہ صاف کہہ دو کہ ہم اپنا کام کریں۔ تم اپنا کرو۔ جس کا مذہب حق ہو گا اس کی حقانیت

خود واضح ہوجائیگی

تعلیم اسلام کی خوبی

واللہ اسلام کی تعلیم وہ ہے کہ اس کی سادہ تعلیم کے مقابلہ میں کوئی تعلیم ٹھہر نہیں سکتی۔ اسلام کی دلربائی کی یہ شان ہے ؎

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

اسلام کے محاسن تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کا تو وقت نہیں رہا مگر اختصاراً میں چند محاسن بتلاتا ہوں، اسی سے باقی کو سمجھ لیا جائے۔ ع

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

اسلام کا ایک حسن یہ ہے کہ اس کو اپنی اشاعت کے لئے نہ زر کی ضرورت ہے نہ زور کی۔ بلکہ اسلام کی تعلیم خود قلوب کو اپنی طرف کشش کرتی ہے۔ جس کا تجربہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ جس مجمع میں ہندو مسلمان دونوں موجود ہوں۔ وہاں پہلے ایک ہندو سے کہا جائے کہ وہ اپنے مذہب کی باتیں بیان کرے۔ اس کے بعد کسی عالم سے کہا جاوے کہ وہ اسلام کی باتیں بیان کرے، دونوں حالتوں میں مجمع کی حالت دیکھ لی جائے کہ اثر کس تعلیم کا زیادہ ہوتا ہے۔ ہم نے ریل میں خود تجربہ کیا ہے کہ جب کبھی ہم چند احباب آپس میں معمولی باتیں اصلاح اعمال وغیرہ کے متعلق کرتے تھے تو ہندو غور سے ان باتوں کو سنتے اور آپس میں کہتے تھے کہ ان لوگوں کی باتوں کی طرف دل کھنچتا ہے تو دوسرا جواب دیتا تھا کہ ان کی باتیں سچی ہیں اور سچائی کی طرف دل کھنچا ہی کرتا ہے۔

ایک مرتبہ ریل میں ہم باتیں علمی کر رہے تھے۔ وہاں ہندو بھی موجود تھے جب اسٹیشن آگیا اور ہم اترنے لگے تو ایک ہندو کہنے لگا کہ آپ تو سارا نور اپنے ساتھ لے چلے جب تک آپ ریل میں رہے ایک نور ہمارے ساتھ تھا۔ آخر کیا بات تھی؟ صاحبو! کفار کو بھی اسلام کی باتوں میں نور کا احساس ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہم جب کسی کو اسلام کی دعوت دیتے ہیں تو اس کو نہ زر و سیم کا لالچ دیتے ہیں، نہ اپنی طرف کشش کرنے کے لئے جبر کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ کانپور میں

ایک عیسائی میرے پاس آیا کہ مجھے مسلمان کرو اور میرے واسطے دو سو روپیہ چندہ کرادو تاکہ میں اس سے تجارت شروع کرکے معاش پیدا کرسکوں۔ میں نے کہا کہ تم دو سو روپیہ کہتے ہو میں ایک روپیہ بھی چندہ سے جمع نہ کروں گا اور نہ ہم کو اس کی ضرورت ہے۔ اگر تم اسلام کو حق سمجھ کر اپنی نجات کے واسطے اختیار کرتے ہو تو ہمیں تم سے یہ کہنے کا حق ہے کہ تم اس دولت کا نشان بتلانے کے معاوضہ میں ہم کو کچھ دو نہ کہ الٹا تم ہم سے مانگتے ہو۔ ہم اس کا وعدہ ہرگز نہ کریں گے۔ چاہے اسلام لاؤ یا نہ لاؤ۔ چونکہ وہ سچے دل سے اسلام لانا چاہتا تھا اس لئے اس نے کہا کہ میں اپنا قول واپس لیتا ہوں اور میں آپ سے ایک پیسہ بھی نہیں مانگتا میں تو صرف مسلمان ہونا چاہتا ہوں اور روزی کا خدا مالک ہے۔ جب اس نے کہا تب میں نے اسے مسلمان کیا پھر اسلام کے بعد چونکہ وہ ہمارا بھائی ہوگیا اور بھائی کی اعانت وامداد انسانیت ومروت کا مقتضا ہے۔ تو پھر ہم نے اس کی خدمت بھی کی۔ مگر اسلام لاتے وقت صاف انکار کردیا۔

دوسرے یہ کہ اسلام میں دو چیزیں ہیں اصول و فروع عقائد کو اصول کہتے

ف یہاں سے مخالفین اسلام کے اس اعتراض کا جواب ہوگیا کہ اسلام مال کے لالچ سے پھیلایا گیا ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ مؤلفۃ القلوب کے لئے اسلام میں ایک خاص حکم وارد ہے۔ ان لوگوں نے تالیف قلب کی حقیقت نہیں سمجھی۔ اسلام میں تالیف قلب کا یہ مطلب نہیں ہے کہ لوگوں سے یوں کہا جائے کہ تم اسلام قبول کرلو ہم تم کو اتنا روپیہ دیں گے یا زمین وجائیداد دیں گے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اسلام قبول کرے یا قبول کرنا چاہتا ہو اسکے ساتھ ہمدردی اور محبت کا برتاؤ کیا جائے اور اگر وہ محض روپیہ کے لالچ سے اسلام لانا چاہتا ہو تو اس صورت میں اس سے صاف کہہ دینا چاہیے کہ ہم روپیہ دینے کا وعدہ نہیں کرتے اور نہ اس وعدہ پر تم کو مسلمان کرسکتے ہیں۔ اگر تم اسلام کو حق سمجھتے ہو تو اسلام لاؤ اور جو ہمارا حال ہے اسی حال پر تم بھی رہو۔ محنت و مزدوری کرو اور کھاؤ۔ کماؤ۔ ۱۲ جامع۔

ہیں اور اعمال کو فروع۔ اور اسپر سب عقلاء کا اتفاق ہے کہ ہر مذہب کی خوبی کا مدار اُس کے اصول کی پاکیزگی پر ہے۔ جس کے اصول پاکیزہ اور حق ہیں اُس کے فروع بھی پاکیزہ ہوں گے۔ اسلئے مخالفین کے سامنے ہم کو سب سے پہلے اصول اسلام کی پاکیزگی ثابت کرنا چاہیئے کیونکہ اصول عقلی ہوتے ہیں ان پر عقلی دلائل قائم کر کے خصم کو مجبور کر سکتے ہیں اور فروع کا عقلی ہونا لازم نہیں۔ یعنی یہ ضروری نہیں کہ اُن کا ثبوت عقل سے ہو بلکہ بہت سے فروع سمع و نقل سے ثابت ہوتے ہیں۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ فروع عقل کے خلاف نہ ہوں۔ سو بحمد اللہ اصول اسلام سب عقلی ہیں اور فروع عقل کے خلاف نہیں ہیں۔ پس سب سے پہلے کفار کے سامنے توحید و رسالت کو ثابت کیا جائے۔ جب وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو تسلیم کرلیں گے تو اُس کے بعد جس فرعی مسئلہ کی وہ دلیل مانگیں اس کے جواب میں اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ یہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے فلاں ارشاد سے ثابت ہے۔ خواہ صراحۃً یا دلالۃً اس کے بعد اگر وہ یہ کہے کہ یہ حکم عقل کے خلاف ہے تو ہمارے ذمہ اس کا اثبات ہوگا کہ یہ حکم خلاف عقل نہیں ہے کیونکہ خلاف عقل محال ہوتا ہے یا قبیح اور یہ حکم نہ مستلزم محال ہے نہ اس میں کوئی قبح ہے۔ اس طریقہ سے گفتگو مختصر اور سہل ہوجاتی ہے۔ بہرحال اصول اسلام سب عقلی ہیں جن میں توحید اصل الاصول ہے۔

توحید کی خوبی اب اسلام کی خوبی دیکھیئے کہ اس میں توحید ایسی کامل ہے کہ دنیا کے کسی مذہب کی توحید ایسی کامل نہیں چنانچہ غیر اللہ کو سجدہ کرنا اسلام میں حرام ہے۔

ایک مرتبہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے ایک صحابی نے عرض کیا کہ میں نے فارس و روم کے لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے بادشاہوں کو سجدہ کرتے ہیں تو ہم بھی آپ کو سجدہ کیا کریں حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کی حرمت کو کس عمدہ طریقہ سے بیان فرمایا۔ جس سے اس فعل کی لغویت بخوبی ظاہر ہوگئی۔ فرمایا یہ تو بتلاؤ اگر تم میرے مرنے کے بعد میری قبر پر گذرو تو کیا

میری قبر کو بھی سجدہ کرو گے۔ حضرات صحابہ کیسے سلیم العقل تھے۔ جواب دیا کہ نہیں۔ فرمایا تو پھر اب ہی کیوں سجدہ کرتے ہو۔ خوب سمجھ لو کہ غیر خدا کو سجدہ کرنا حرام ہے اور اگر میں خدا کے سوا کسی کے لئے سجدہ جائز کرتا تو عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کیا کریں حضورؐ نے اس جواب میں تبلادیا کہ جو چیز فانی ہے اور اُس کے ظہورِ فنا کے بعد تم اُس کو سجدہ کرنا گوارا نہیں کرتے۔ وہ اس وقت بھی سجدہ کے قابل نہیں۔ کیونکہ وہ اس وقت بھی فانی ہے۔ حضرات صحابہ سلیم العقل تھے۔ اور بات کو سمجھ گئے کہ مرنے کے بعد انسان سجدہ کے قابل نہیں ۱۲ جامع) اگر آج کل کے لوگ ہوتے تو کہتے حضورؐ ہم تو آپ کی قبر کو ایک بار کیا چار مرتبہ سجدہ کریں گے۔ اس واقعہ سے اسلام کی توحید کا کامل ہونا معلوم ہو گیا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا مقصود اشاعت اسلام سے اپنی تعظیم کرانا نہ تھا کیونکہ جو شخص بڑا بننا چاہتا ہے وہ تو خود اس کی کوشش کیا کرتا ہے کہ لوگ میرے سامنے جھکیں مگر حضورؐ کی یہ حالت ہے کہ لوگ از خود آپ کو سجدہ کرنا چاہتے تھے اور آپ نے ان کو اس سے منع کیا اور صرف منع ہی نہیں کیا بلکہ اپنا فانی ہونا ان پر ظاہر کر دیا۔

مگر پھر بھی بعض جہلاء کفر کا حضورؐ پر یہ اعتراض ہے کہ آپ (نعوذ باللہ) بڑا بننا چاہتے تھے اور دلیل میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ حضورؐ نے حج کے موقعہ پر ایک صحابی کو اپنے موئے مبارک دیئے تھے کہ مسلمانوں میں ان کو تقسیم کر دو۔ اس پر وہ جاہل لکھتا ہے کہ دیکھیے حضورؐ نے اپنے بال اس لئے تقسیم کرائے تاکہ لوگ ان کو تبرک سمجھ کر تعظیم سے رکھیں تو گویا آپ نے بڑا بننا چاہا۔

استغفر اللہ! یہ آج کل کی فہم و عقل ہے۔ افسوس اس شخص کو عبادت و محبت کے مقتضی میں بھی فرق معلوم نہیں۔ واقعی کفار کو محبت و عشق کا پتہ کہ نہیں لگا۔ اسی واسطے وہ ایسے واقعات کی حقیقت نہیں سمجھتے۔ جی تو یہ چاہتا ہے کہ ان لوگوں کو جواب بھی نہ دیا جاوے اور یہ کہہ دیا جاوے ؎

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی　　بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

مگر تبرعاً میں اس کا جواب دیتا ہوں تاکہ کسی مسلمان کو اگر اس اعتراض سے شبہ پڑ گیا ہو تو وہ اس جواب سے تسلی حاصل کر سکے۔

بات یہ ہے کہ سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے بال کن لوگوں میں تقسیم کرائے تھے۔ آپ نے ان لوگوں میں اپنے بال تقسیم کر دیئے تھے جن کی محبت کی یہ حالت تھی۔ جب آپ وضو کرتے تھے تو وضو کا ایک قطرہ بھی زمین پر نہ گرنے دیتے تھے بلکہ آپ کا تھوک اور سارا وضو کا پانی اپنے ہاتھوں میں لیتے تھے۔ منہ کو ملتے اور اُسے آنکھوں سے لگاتے تھے۔ اور ہر شخص اس کی کوشش کرتا تھا کہ سب سے پہلے آپ کی وضو کا پانی اور آپ کا تھوک میرے ہاتھ میں آئے۔

چنانچہ اس کوشش میں ایک دوسرے پر گرا پڑتا تھا اور ان کی محبت کا یہ حال تھا کہ ایک بار حضور نے پچھنے لگوائے اور اس کا خون ایک صحابی کو دیا کہ اس کو کسی جگہ احتیاط سے دفن کر دو۔ صحابی کی محبت نے گوارا نہ کیا کہ حضور کا خون زمین میں دفن کیا جائے۔ انہوں نے الگ جا کر اُسے خود پی لیا۔ اس پر یہ اعتراض نہ کیا جائے کہ (نعوذ باللہ) صحابہ بہت ہی بے حس تھے کہ ان کو تھوک ملتے ہوئے اور خون پیتے ہوئے گھن نہ آتی تھی۔ بات یہ ہے کہ ان امور کا تعلق عشق و محبت سے ہے اور اس کی حقیقت عاشق ہی سمجھ سکتا ہے جس کا مذاق یہ ہوتا ہے ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم
گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم

صاحبو! اگر آپ کو کبھی کسی سے عشق ہوا ہو تو آپ کو معلوم ہوگا کہ عاشق بعض دفعہ محبوب کی زبان اپنے منہ میں لے کر چوستا ہے اور مشتاق لعاب دہن محبوب کی مدح میں دفتر کے دفتر اشعار میں لکھ گئے ہیں تو کیا یہ لوگ بے حس ہیں۔ ہرگز نہیں۔ اگر یہ بے حس ہیں تو

یوں سمجھئے کہ ساری دنیا بے حس ہے کیونکہ محبت میں ہر شخص یہی کرتا ہے۔ کوئی عاشق اس سے بچا ہوا نہیں۔ اسی طرح اگر کسی کے محبوب کے بدن میں سے خون بہنے لگے تو عشاق اس جگہ منہ لگا کر خون کو چوستے ہیں تاکہ محبوب کو زخم کی تکلیف کا احساس نہ ہو یا کم ہو جائے۔ معلوم ہوا کہ محبوب کا خون چوسنا بھی کوئی گھن کی چیز نہیں۔ عاشق کو اس سے جو حظ ہوتا ہے اس کے دل سے پوچھا چاہیے۔ پھر جب ادنیٰ ادنیٰ محبوب کا لعاب دہن اور خون گھن کی چیز نہیں تو حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تھوک اور پسینہ اور خون تو کیونکر گھن کی چیز ہو سکتا ہے؟ کیونکہ حضور کی حالت یہ تھی کہ قدرتی طور پر آپ کا تمام بدن خوشبودار تھا۔ آپ کے پسینہ میں اس قدر خوشبو تھی کہ عطر کی خوشبو اس کے سامنے بے حقیقت چیز تھی۔ آپ کا لعاب دہن نہایت خوشبودار اور شیریں تھا۔ یہی حال آپ کے خون کا تھا تو ایسی چیز سے کون شخص گھن کر سکتا ہے۔ مگر کفار کو ان امور کی کیا خبر۔ نہ ان کو عشق و محبت کی ہوا لگی ہے نہ حضور کے حالات سے اطلاع ہے ۱۲ جامع۔ بہرحال صحابہ آپ کے ایسے عاشق تھے کہ وضو کا پانی بھی زمین پر نہ گرنے دیتے تھے اور اس کو ہاتھوں ہاتھ لینے کے لئے ایک دوسرے پر گرتے پڑتے تھے تو ایسی جماعت سے یہ کیا امید تھی کہ وہ آپ کے بالوں کو زمین میں دفن ہونے دیں گے کیونکہ یقیناً بال کا درجہ وضو کے پانی سے زیادہ تھا۔ اس کو محض جسم سے تلبس ہوتا ہے اور یہ تو بدن کا جزو ہے۔ پس اگر آپ اپنے بالوں کو دفن کراتے تو یقیناً صحابہ زمین میں سے ان کو نکالنے کی کوشش کرتے۔ پھر اس میں ہر شخص یہ کوشش کرتا کہ میرے ہاتھ زیادہ بال آئیں تو ایک دوسرے پر گرتا اور عجب نہیں کہ قتال کی نوبت آجاتی۔ اس لئے حضور نے اس نزاع و قتال سے صحابہ کو بچانے کے لئے اپنے بال خود ہی تقسیم کرا دیئے اور دفن نہ کرائے۔

بتلائیے اب اس میں کیا اشکال ہے۔ پس معلوم ہو گیا کہ آپ کا اپنے بال تقسیم کرانا اپنی تعظیم و عبادت کے لئے نہ تھا بلکہ صحابہ کی محبت پر نظر کرتے ہوئے ان کے نزاع و قتال کے رفع دفع کرنے کے لئے تھا۔ اگر معاذ اللہ حضور میں ذرہ برابر بھی بڑائی و تکبر کا خیال

ہوتا تو آپ عمدہ لباس پہنتے، عمدہ مکان بناتے، نفیس نفیس کھانے کھایا کرتے۔ آپ کے پاس خزانہ جمع ہوتا، مگر تاریخ شاہد ہے اور احادیث میں صحیح طریقہ سے ثابت ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا لباس موٹا جھوٹا ہوتا تھا۔ آپ کے مکانات سب کچے تھے۔ آپ اپنے پاس کچھ بھی جمع نہ رکھتے تھے۔ یہ نہیں کہ آپ کے پاس مال آتا نہ تھا، نہیں بعض جنگ میں اتنا مال آیا کہ اس کی شمار نہیں ہو سکتی تھی۔ بکریوں سے جنگل کے جنگل بھر گئے اور آپ نے سب بکریاں ایک لڑائی کو اس کے سوال پر عطا فرما دیں اور اونٹ اس قدر تھے کہ آپ نے کسی کو سو کسی کو دو سو عنایت فرمائے۔ جب بحرین کا جزیہ آیا تھا تو اتنا روپیہ تھا کہ مسجد کے اندر سونے کا ڈھیر لگ گیا مگر آپ نے تھوڑی دیر میں سب کا سب صحابہ کو تقسیم فرما دیا اور اپنے واسطے ایک درہم بھی نہ رکھا تو کیا بڑائی چاہنے والا یہ گوارا کر سکتا ہے کہ خود تو خالی ہاتھ رہے اور مخلوق کو مالا مال کر دے۔

پھر آپ کی حالت یہ تھی کہ راستہ میں جب چلتے تھے تو صحابہؓ کو اپنے سے آگے چلنے کا حکم کرتے تھے اور خود پیچھے چلتے۔ بعض دفعہ کوئی صحابی سواری پر سوار ہوتے اور آپ ان کے ساتھ ساتھ پیدل چلتے۔ وہ اترنا چاہتے اور آپ منع فرماتے۔ اکثر آپ اپنا سودا بازار سے خود لے آیا کرتے تھے۔ اگر کوئی شخص کسی کام میں آپ سے امداد لینا چاہتا تو آپ کا ہاتھ پکڑ کر جہاں چاہتا لے جاتا اور آپ اس کا کام کر دیتے تھے۔ گھر میں آکر آپ اپنے گھر کے کام بھی کرتے تھے۔ کبھی بکری کا دودھ خود نکال لیا، کبھی جوتا اپنے ہاتھ سے گانٹھ لیا۔ کبھی آٹا گوندھ دیا۔ آپ بعض دفعہ زمین پر بیٹھ جاتے۔ بوریہ پر لیٹ جاتے تھے۔ جس سے آپ کے پہلو پر نشان ہو جاتے۔ بعض دفعہ کسی یہودی کا آپ پر قرض ہوتا اور وہ تقاضا کرنے میں سختی کرتا، برا بھلا کہتا اور حضرات صحابہ کو یہودی پر غصہ آتا۔ وہ اس کو دھمکانا چاہتے تو آپ صحابہ کو منع فرماتے اور یہ ارشاد فرماتے کہ "اس کو کہنے سننے کا حق ہے۔ اس جاہل معترض سے کوئی پوچھے کہ کیا بڑائی اور عظمت چاہنے والوں کے یہی

حالات ہوا کرتے ہیں؟ افسوس اس نے ایک بال تقسیم کرنے کا واقعہ لے لیا اور ان تمام واقعات سے اندھا ہو گیا۔ سو میری تقریر سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ بال تقسیم کرنے کا واقعہ بھی بڑائی یا عظمت کے لئے نہ تھا بلکہ اس میں وہی تمدنی اور سیاسی مصلحت تھی جو میں نے ابھی ذکر کی۔

دوسرے حضورؐ نے اپنے بال تقسیم فرما کر قیامت تک کے لئے یہ بات بتلا دی کہ میں فانی ہوں اور بشر ہوں کیونکہ بال تو متغیر و حادث ہیں۔ کبھی وہ سر کے اوپر ہیں کبھی استرے سے مونڈ کر جدا کئے جاتے ہیں تو جو شخص حضورؐ کے بالوں کو دیکھے گا (چنانچہ بعض جگہ بحمد اللہ اب تک آپ کے بال محفوظ ہیں اور لوگ ان کی زیارت کرتے ہیں) تو وہ حضورؐ کے فانی و بشر ہونے پر استدلال کریگا اور سمجھ جائیگا کہ آپ انسان تھے۔ خدا نہ تھے۔ تو اس سے آپ نے مسلمانوں کی توحید کو کامل فرمایا نہ اپنی عظمت و بڑائی چاہی ؏

چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

باب توحید میں مخالفین کو استقبال قبلہ پر بھی اعتراض ہے کہ مسلمان کعبہ کی پرستش کرتے ہیں۔

شبہ معبودیت کعبہ:

جواب یہ ہے کہ ہم کعبہ کی پرستش نہیں کرتے بلکہ عبادت خدا کی کرتے ہیں اور صرف منہ قبلہ کی طرف کرتے ہیں اور اس کے لئے ہمارے پاس بہت سے دلائل ہیں ایک یہ کہ ہم خود اس کی معبودیت کی نفی کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ کوئی عابد اپنے معبود کے معبودیت کی نفی نہیں کیا کرتا۔

دوسرے یہ کہ نماز پڑھتے ہوئے اگر کسی کے دل میں کعبہ کا خیال بھی نہ آئے مگر کعبہ کی طرف منہ ہے تو نماز درست ہے۔ چنانچہ بہت لوگ ایسے ہیں کہ وہ مسجد میں آکر نماز شروع کر دیتے ہیں اور کعبہ کا کچھ بھی خیال ان کو نہیں آتا، ان کی نماز درست ہے اگر ہم کعبہ کی عبادت کرتے تو اس کی نیت کرنا شرط ہوتا مگر ایسا نہیں ہے۔

تیسرے یہ کہ اگر کسی وقت کعبہ نہ رہے جب بھی نماز فرض رہے گی اور اسی طرف منہ کیا جائیگا، جہاں کعبہ موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان کعبہ کے اینٹ پتھروں کو نہیں پوجتے، ورنہ انہدام کعبہ کے بعد نماز موقوف ہو جاتی۔

چوتھے یہ کہ اگر کوئی شخص مسقف کعبہ پہ نماز پڑھے تو اس کی نماز درست ہے اگر کعبہ مسلمانوں کا معبود ہوتا تو اس کے اوپر چڑھ کر نماز صحیح نہ ہوتی کیونکہ اب کعبہ اس کے سامنے نہیں ہے۔ دوسرے معبود کے اوپر چڑھنا گستاخی ہے۔ اس حالت میں کسی طرح نماز درست نہ ہونا چاہیئے تھی۔ مگر فقہاء نے تصریح کی ہے کہ کعبہ کی چھت پر بھی نماز صحیح ہے تو کیا معبود کے اوپر چڑھا بھی کرتے ہیں؟ ہاں معترضین نے اپنے اوپر قیاس کیا ہو گا کہ وہ گائے بیل کو دیوتا و معبود بھی سمجھتے ہیں پھر ان کے اوپر سوار بھی ہوتے ہیں مگر اس کا خلاف عقل ہونا ظاہر ہے۔

ایک اعتراض تقبیلِ حجر پہ بھی ہے کہ مسلمان اس کو بوسہ دیتے ہیں تو گویا نعوذ باللہ اس کی عبادت کرتے ہیں۔

جواب یہ ہے کہ تقبیل حجر عظمت سے نہیں بلکہ محبت سے ہے جیسے بیوی بچوں کا بوسہ لیا کرتے ہیں اگر بوسہ دینا عبادت و عظمت کی دلیل ہے تو لازم آئیگا کہ ہر شخص اپنی بیوی کی عبادت کرتا ہے اور اس کا لغو ہونا بدیہی ہے معلوم ہوا کہ تقبیل عبادت و تعظیم کو مستلزم نہیں بلکہ کبھی محبت سے بھی تقبیل ہوا کرتی ہے۔

رہا یہ سوال کہ پھر تم حجر اسود سے محبت کیوں کرتے ہو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ہمارے گھر کی بات ہے اس کے متعلق مخالف کو سوال کرنے کا حق نہیں۔ دیکھیئے اگر کوئی شخص عدالت میں یہ دعویٰ دائر کرے کہ فلاں مکان میری ملک ہے تو اس سے اس پر ثبوت طلب کیا جائیگا۔ لیکن جب وہ ثبوت پیش کر دے تو خصم کو اس سوال کا حق نہیں کہ اچھا مکان تو تمہارا ہی ہے مگر یہ بتلاؤ کہ اس گھر میں کیا کیا سامان ہے؟ یا کوئی شخص

بیوی کا بوسہ لے تو اس سے یہ سوال ہو سکتا ہے کہ تم اس کا بوسہ کیوں لیتے ہو۔ لیکن جب وہ یہ بتلادے کہ محبت کی وجہ سے میں بوسہ لیتا ہوں تو پھر اس سوال کا کسی کو حق نہیں کہ تم کو بیوی سے محبت کیوں ہے اور تم دن رات میں اس کے کتنے بوسے لیتے ہو؟ اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اس کی وجہ بتلا نہیں سکتے کہ ہم کو جحر سے محبت کیوں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ مخالفین کے اعتراضات کا جواب اسی حد تک دینا چاہئے جہاں تک ان کو سوال کا حق ہے اور جو سوال ان کے منصب سے باہر ہو اس کا جواب نہ دینا چاہیئے بلکہ صاف کہہ دینا چاہئے کہ تم کو اس سوال کا کوئی حق نہیں۔ مخالفین کا دماغ ہر بات کی حقیقت سمجھنے کے قابل نہیں۔ امور دقیقہ کو ان کے سامنے نہ بیان کرنا چاہیئے۔

بعض لوگ اس پر تعجب کرتے ہیں کہ وہ بات کون سی ہے جس کو ہم نہیں سمجھ سکتے آخر ہم بھی تو انسان ہیں۔ اگر باریک بات ہمارے سامنے بیان کی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کو نہ سمجھ سکیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یہی بات ہے تو پھر میں ایک ریاضی دان سے درخواست کرتا ہوں کہ اقلیدس کی کوئی شکل ایک گھس کھدے کو سمجھا دیں جسنے اقلیدس کے مبادی و اصول موضوعہ کو کبھی سنا بھی نہ ہو۔ یقیناً وہ اقرار کریگا کہ میں ایسے شخص کو اقلیدس کے اشکال نہیں سمجھا سکتا آخر کیوں؟ کیا وہ انسان نہیں؟ مگر بات وہی ہے کہ بعض امور کے لئے مبادی و مقدمات کا سمجھنا ضروری ہوتا ہے اس لئے ان کو وہی سمجھ سکتا ہے جس کے ذہن میں تمام مبادی و مقدمات حاضر ہوں۔ ہر شخص ان کو نہیں سمجھ سکتا۔ اور یہ بالکل موٹی بات ہے۔ مگر حیرت ہے کہ آج کل کے عقلاء کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔

میرے پاس ایک ماسٹر صاحب آئے اور انہوں نے تقدیر کے متعلق ایک دقیق سوال مجھ سے کیا۔ میں نے کہا آپ اس کا جواب سمجھ نہیں سکتے۔ بہت دقیق ہے جو آپ کی فہم سے باہر ہے۔ ان کو اس جواب پر حیرت ہوئی اور شاید وہ یہ سمجھے ہوں کہ مولوی میرے سوال کے جواب پر قادر نہیں ہیں۔ اس لئے میں نے کہا کہ اگر آپ کو اس کا جواب

سننے کا شوق ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ کسی طالب علم کو میرے پاس لایا جائے جس کے ذہن میں اس علم کے مقدمات حاضر ہوں۔ جب سے اس سوال کا تعلق ہے، وہ مجھ سے یہی سوال کرے میں اس کے سامنے جواب کی تقریر کر دوں گا۔ آپ بھی سن لیجئے گا۔ اس وقت آپ کو یہ بھی معلوم ہو جائیگا کہ آپ اس کا جواب سمجھ سکتے ہیں یا نہیں اور یہ بھی معلوم ہو جائیگا کہ ہم لوگوں کے پاس اس کا جواب ہے۔ مگر آج کل تعلیم یافتہ جماعت یہ سمجھتی ہے کہ جب ہم سیاسیات ملیہ کو بھی بخوبی سمجھ لیں گے۔ مگر میں سچ کہتا ہوں کہ سیاسیات ملیہ کے سمجھنے کی انہیں خاک بھی قابلیت نہیں۔ بس وہ یورپ ہی کی سیاسیات کو شاید سمجھ لیتے ہوں گے بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ سیاسیات ملیہ سمجھنے کی قابلیت اہل علم میں بھی سب کو نہیں، چنانچہ اب ان کی سیاسی غلطیوں کا انکشاف ہو رہا ہے۔ کل جن چیزوں کو وہ حرام کہہ رہے تھے آج ان کے جواز کا فتویٰ دیا جا رہا ہے۔ کل تک گاڑھا پہننا واجب و ضروری تھا۔ ولایتی کپڑا پہننا قابل مواخذہ تھا۔ آج کچھ بھی نہیں۔ سب خاص طرح ولایتی مال خریدنے لگے اور ساری ترک موالات ختم ہو گئی اور تماشا یہ ہے کہ آج کل جو یہ تحریک انسداد فتنۂ ارتداد چل رہی ہے اس کے متعلق ایسے بعض علماء نے ایک اشتہار میں شائع کیا ہے کہ یہ تحریک چونکہ خالص مذہبی تحریک ہے اس لئے اس میں ہر طبقہ کو شریک ہونا چاہیے۔ اس سے معلوم ہوا کہ پہلی تحریکات خالص مذہبی نہ تھیں اس میں غیر مذہب کا بھی دخل تھا اول میں تو ان تحریکات کی حقیقت کو وہ سمجھ ہی رہے تھے مگر الحمد للہ برسوں کے بعد اب زبان سے بھی اقرار کر لیا کہ پہلی تحریکات خالص مذہبی نہ تھیں پھر نہ معلوم ان میں شرکت نہ کرنے والوں کو کافر و فاسق کیوں بنایا گیا تھا۔ یقیناً جو امر مذہب و غیر مذہب سے مرکب ہو گا وہ فرض و واجب کبھی نہیں ہو سکتا مگر ستم یہ ہے کہ ان لوگوں نے تحریکات سابقہ کی شرکت کو فرض و واجب بنا رکھا تھا۔

صاحبو! مذہب میں بھی سیاسیات کا بہت بڑا حصہ ہے مگر وہ سب مذہب کے تابع ہے اور وہ سیاسیات خالص مذہبی سیاسیات ہیں ان میں غیر مذہب کا دخل ہرگز نہیں

ہوسکتا اگر ان حضرات کے نزدیک یہ بیلی تحریکات مذہبی سیاسیات میں داخل تھیں تو ان کے اس قول کا کیا مطلب ہے کہ تحریک انسداد ارتداد خالص مذہبی تحریک ہے اس میں سب کو شریک ہونا چاہیئے۔ اس سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ پہلی تحریک خالص مذہبی نہ تھیں تو پھر وہ مذہبی سیاسیات میں بھی داخل نہ تھیں۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ مخالفین کا جو سوال ان کے منصب سے باہر ہو اس کا جواب نہ دینا چاہیئے بلکہ صاف کہہ دینا چاہیئے کہ تم کو اس سوال کا حق نہیں ہے اس میں تم اپنے منصب سے آگے بڑھ رہے ہو مگر آج کل بعض لوگ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ مخالف کی ہر بات کا جواب دیں خواہ اس کا سوال بجا ہو یا بے جا۔ یہ بڑی غلطی ہے۔ اس طرح تو کبھی گفتگو کا سلسلہ ختم نہ ہوگا۔

پس اگر مخالفین ہم سے یہ کہیں کہ تم کعبہ کی طرف منہ کرتے ہو اس سے اس کی عبادت لازم آتی ہے۔ اس کا جواب دینا ہمارے ذمہ ضروری ہے۔ چنانچہ میں نے چند جوابات اس کے دیئے ہیں کہ ہماری نماز نہ کعبہ کے وجود پر موقوف ہے، نہ اس کی نیت ضروری ہے، نہ اس کی دیواروں کا ہونا ضروری ہے بلکہ اس کی چھت پر بھی نماز ہو سکتی ہے۔ اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ ہم اس کی عبادت نہیں کرتے۔ اس کے بعد اگر وہ یہ کہیں کہ اچھا پھر تم اس کی طرف منہ کیوں کرتے ہو؟

اس سوال کا جواب ان کو نہ دیا جائے گا بلکہ ہم صاف کہہ دیں گے کہ جب یہ ثابت ہو گیا کہ ہم کعبہ کی عبادت نہیں کرتے تو اس سوال کا آپ کو کوئی حق نہیں۔ یہ ہمارے گھر کی بات ہے تم گھر والے بن جاؤ اس وقت تم کو گھر کی باتیں بھی بتا دیں گے۔ ہمارے جی کی خوشی ہم نے جس طرف چاہا نماز میں منہ کر لیا۔ تم اس میں دخل دینے والے کون ہوتے ہو؟ علیٰ ہذا اگر وہ یہ کہیں کہ تم حجر کی تقبیل کر کے اس کی عبادت کرتے ہو اس کا جواب ضرور دیا جائے گا کہ ہم عبادت نہیں کرتے بلکہ محبت سے بوسہ دیتے ہیں جیسے تم اپنی بیوی کو بوسہ دیا کرتے ہو

اگر وہ یہ کہیں کہ اچھا یہ بتلا دو تم کو حجر اسود سے محبت کیوں ہے اس کا جواب نہ دیا جائیگا بلکہ صاف کہہ دیں گے کہ جس طرح ہم کو آپ سے اس سوال کا حق نہیں کہ آپ کو اپنی بیوی سے محبت کیوں ہے؟ اسی طرح آپ کو اس سوال کا بھی حق نہیں۔

حکمت استقبال قبلہ

اس پر شاید سامعین یہ کہیں کہ اچھا مخالفوں کو نہ بتلاؤ ہم کو تو بتلا دو ہم تو گھر کے آدمی ہیں۔ سو آپ کو بے شک اس کی وجہ بتلائی جائے گی۔ میں نے اس وقت خاص خاص قواعد بتلائے ہیں کہ مخالفین سے کس طرح گفتگو کرنا چاہیئے اور ان کے کس سوال کا جواب دینا چاہیئے کس کا نہیں اور کون سی بات ان سے کہنی چاہیئے اور کون سی نہیں۔

اب آپ کو بتلاتا ہوں سنیئے استقبال قبلہ کا راز یہ ہے کہ عبادت کی روح دل جمعی اور یک سوئی ہے۔ بدوں یکسوئی اور دل جمعی کے عبادت کی صورت ہی صورت ہوتی ہے روح نہیں پائی جاتی اور یہ ایسی بات ہے جس کو تمام اہل ادیان تسلیم کرتے ہیں اب سمجھئے کہ اجتماع خواطر میں اجتماع ظواہر کو بہت بڑا دخل ہے۔ اسی لئے نماز میں سکون اعضاء کا امر ہے۔ التفات وعبث سے ممانعت ہے۔ صف کے سیدھا کرنے کا امر ہے کیونکہ صف کو ٹیڑھا کرنے سے قلب پریشان ہوتا ہے۔ عام قلوب کو اس کا احساس کم ہوگا کیونکہ ان کو دل جمعی اور یک سوئی بہت کم نصیب ہے مگر جن کو دل جمعی کی دولت نماز میں نصیب ہے ان سے پوچھئے کہ صف ٹیڑھی ہونے سے قلب پر کیا اثر ہوتا ہے۔ صوفیہ قسم کھا کر کہتے ہیں کہ صف غیر منتظم سے قلب کو خلجان و پریشانی ہوتی ہے اس دل جمعی کے لئے سجدہ گاہ پر نظر جمانے کی تاکید ہے کیونکہ جگہ جگہ نظر گھمانے سے بھی قلب کو یکسوئی حاصل نہیں ہوتی۔ اور یہی اصل ہے تمام اشغال صوفیہ کی جو مراقبات واشغال تعلیم کرتے ہیں۔ ان سے محض یہی یک سوئی وجمعیت قلب پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے۔

اور یہی اصل تھی قیام مولد کی۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ صوفیہ نے (جیسے امام

نوادی تحریر آداب وجد میں لکھا ہے کہ جب کسی شخص پر وجد طاری ہو اور وہ کھڑا ہو جائے تو سب حاضرین کو اس میں اس کی موافقت کرنا اور سب کو کھڑا ہونا چاہئے تاکہ اوروں کو بیٹھا ہوا دیکھ کر صاحب وجد کو خلجان نہ ہو اور اس کے وجد میں انقباض نہ آئے۔ تو مولد میں بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی صاحب وجد نے غلبۂ وجد میں قیام کیا ہوگا۔ حاضرین نے موافق ادب مذکور کے قیام میں اس کی موافقت کی ہوگی۔ پس لوگوں نے آئندہ قیام مولد کو لازم اور ضروری ہی سمجھ لیا۔ جب سے وہ قابل منع ہوگیا۔ غرض اس کا انکار نہیں ہوسکتا کہ اجتماع خاطر میں اجتماع ظاہر کو جہت بڑا دخل ہے۔ پس نماز میں اگر ایک خاص جہت مقرر نہ ہوتی تو کوئی کسی طرف منہ کرتا کوئی کسی طرف منہ کرتا۔ اس اختلاف جہات وتباین ہیئات سے تفرق قلب ہوتا لہذا یکسوئی کے لئے ایک خاص جہت مقرر کر دی گئی۔

رہا یہ کہ وہ کعبہ ہی کی جہت کیوں مقرر ہوئی کوئی اور جہت کیوں نہ ہوئی۔ اس سوال کا کسی کو حق نہیں کیونکہ یہ سوال تو اس دوسری جہت میں بھی ہوسکتا ہے کہ یہی کیوں ہوئی دوسری کیوں نہ ہوئی۔ دیکھئے عدالت وقت مقرر کرتی ہے کہ کچہری کا وقت فلاں وقت سے فلاں وقت تک ہے۔ تو آپ یہ سوال تو کر سکتے ہیں کہ وقت مقرر کرنے کی کیا ضرورت ہے جس کا جواب یہ دیا جائے گا تاکہ کام کرنے والے سب کے سب معاً حاضر ہوسکیں اور رعایا اہل حاجت کو وقت مقرر ہونے سے اطمینان ہو جاوے کہ عدالت کا یہ وقت ہے۔ تو اس کے علاوہ اوقات میں وہ اپنے دوسرے کام کر سکیں۔ اگر وقت مقرر نہ ہو تو ہر شخص کو تمام دن عدالت میں ہی رہنا پڑتا کہ نہ معلوم حاکم کس وقت آجاوے۔ باقی اس سوال کا کسی کو حق نہیں کہ گورنمنٹ نے دس بجے سے چار بجے تک ہی کا وقت کیوں مقرر کیا؟ کوئی اور وقت مقرر کر دیا ہوتا کیونکہ وہ کوئی بھی وقت مقرر کرتی یہ سوال تو کبھی ختم نہ ہوسکتا تھا۔

علیٰ ہذا ہمکو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ جہت کعبہ ہی کو استقبال کے لئے کیوں مخصوص کیا گیا۔ ہاں اسی کا راز ہم نے بتلا دیا کہ خاص جہت کی تعیین میں کیا مصلحت

ہے یہ جواب تو ضابطہ کا ہے اور طالب کے لئے جواب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو معلوم ہے کہ انکی (یعنی حق تعالیٰ کی) توجہ کس طرف زیادہ ہے۔ جس کی طرف ان کی توجہ زیادہ تھی اس کو جہت صلوٰۃ مقرر فرما دیا رہا یہ کہ کیسے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کی توجہ کعبہ کی طرف زیادہ ہے۔ سو جن کی آنکھیں ہیں وہ جانتے ہیں کہ واقعی کعبہ پر تجلیات الٰہیہ بہت زیادہ ہیں اور توجہ سے یہی مراد ہے اور وہی تجلیات روح کعبہ اور حقیقت کعبہ ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ کعبۂ ظاہری کی چھت پر بھی نماز ہو جاتی ہے کیونکہ اس وقت گو صورت کعبہ سامنے نہیں مگر حقیقت کعبہ یعنی تجلی الٰہی تو سامنے ہے اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان دراصل تجلی الٰہی کا استقبال کرتے ہیں کعبہ کی دیواروں کا استقبال نہیں کرتے مگر چونکہ تجلی الٰہی کا احساس ہر شخص کو نہیں ہوتا اس لئے حق تعالیٰ نے اس خاص بقعہ کی حد مقرر فرمادی۔ جس پر ان کی تجلی دوسرے مکانوں سے زیادہ ہے۔ پس یہ عمارت محض اس تجلی اعظم کی جگہ دریافت کرنے کے لئے ہے ورنہ خود عمارت مقصود بالذات نہیں چنانچہ انہدام عمارت کے بعد نماز کا موقوف ہونا اور کعبہ کی چھت پر نماز کا درست ہونا اس کی دلیل ہے۔ فقہا نے اس راز کو سمجھا ہے اسی لئے وہ فرماتے ہیں کہ قبلہ وہ ہوا ہے جو کعبہ کی محاذات میں آسمان تک اور اس سے نیچے زمین کے اسفل طبقات تک ہے۔ لیکن چونکہ عمارت کعبہ کو اور اس جگہ کو تجلی الٰہی سے تلبس ہے۔ اس تلبس کی وجہ سے اس میں بھی برکت آ گئی اور یہی تجلی اہل لطائف کے نزدیک معنی ہے

ؔ اسی طرح اگر اندھیرے میں جہت کعبہ معلوم نہ ہو اور اپنے گمان پر کسی طرف منہ کر کے نماز پڑھ لی اور بعد میں معلوم ہو کہ نماز قبلہ کی طرف نہیں ہوئی بلکہ اور کسی طرف کو ہوئی ہے۔ اس صورت میں اسلام کا حکم ہے کہ نماز درست ہو گئی۔ اس سے بھی معلوم ہو گیا کہ مسلمان کعبہ کی پرستش نہیں کرتے ورنہ اس صورت میں بطلان صلوٰۃ کا حکم ہوتا بلکہ تعیین جہت کی وہی حکمت ہے جو اوپر مذکور ہوئی۔

الرحمٰن علی العرش استویٰ کے معنی عرش پر تجلی رحمانیت ہوتی ہے یہ معنی ہرگز نہیں کہ عرش پر خدا تعالےٰ بیٹھے ہیں اور وہ ان کا مکان ہے۔ کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ مکان کو مکین کے برابر یا کم از کم اُس کے متقارب ہونا چاہیئے۔ اگر کوئی شخص زمین پر بیٹھے اور اس کے نیچے رائی کا دانہ آجائے تو زمین کے خاص حصہ کو تو اس کا مکان کہا جائیگا رائی کے دانہ کو کوئی شخص اس کا مکان نہ کہے گا کیونکہ انسان سے اس کو کچھ بھی نسبت نہیں پھر وہ اس کا مکان کیونکر ہو سکتا ہے اسی طرح یہاں سمجھیئے کہ عرش حق تعالےٰ کا مکان نہیں ہو سکتا کیونکہ عرش محدود ہے اور ذات خداوندی غیر محدود ہے محدود کسی طرح غیر محدود کا مکان نہیں ہو سکتا پس استویٰ علی العرش کے معنی یہ ہیں کہ حق تعالیٰ کی تجلی صفت رحمانیت کے اعتبار سے اس پر ہوتی ہے۔ اسی واسطے الرحمٰن علی العرش استویٰ فرمایا، اللہ علی العرش استویٰ نہیں فرمایا کیونکہ اللہ علم ذات ہے اور رحمٰن اسم صفت ہے اس سے معلوم ہو گیا کہ عرش محل ذات نہیں بلکہ مظہر صفت رحمت ہے کہ وہاں تجلی رحمت اور مکانات سے زیادہ ہے تو یہ استقبال قبلہ کا راز ہوا۔

تقبیل حجر کا راز تو میں کہہ چکا ہوں کہ اس کا منشا عظمت و عبادت نہیں

تقبیل حجر بلکہ محض محبت اس کا منشا ہے چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس حقیقت کو مجمع عام میں ظاہر فرمایا ایک بار آپ طواف کر رہے تھے اس وقت کچھ لوگ دیہات کے موجود تھے۔ جب آپ نے تقبیل حجر کا ارادہ کیا تو حجر کے پاس ذرا ٹھہرے اور فرمایا انی لاعلم انک لحجر لا تضر ولا تنفع ولولا انی رأیت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قبلک ما قبلتک یعنی میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے جو نہ کچھ نفع دے سکتا ہے نہ ضرر دے سکتا ہے اور اگر میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں کبھی تجھے بوسہ نہ دیتا کیا خشک معاملہ کیا ہے حجر اسود کیساتھ۔ بھلا اگر یہ مسلمانوں کا معبود ہوتا تو کیا اس سے یہی خطاب کیا جاتا کہ نہ تو نفع دے سکتا ہے نہ ضرر پہنچا سکتا ہے؟

اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ اس تقبیل کا منشا محض محبت ہے اور محبت کی وجہ یہ ہے کہ حضورؐ نے اس کو بوسہ دیا ہے۔ حضورؐ کا فضلہ بھی کسی جگہ گرا ہو تو ہم کو اس جگہ سے محبت ہوگی۔ چہ جائیکہ وہ جگہ جہاں حضورؐ کے ہاتھ لگے ہوں اور اس سے بڑھکر یہ کہ آپ کا دہان مبارک لگا ہو ؎

در منزلیکہ جاناں روزے رسیدہ باشد
با خاک آستانش داریم مرحبائے

رہا یہ کہ حضورؐ نے اس کو کیوں بوسہ دیا اس سوال کا کسی کو حق نہیں اور نہ ہم کو اس کی وجہ بتلانا ضروری ہے۔ ہاں اتنی بات یقینی ہے کہ حضورؐ نے بطور عبادت و عظمت کے بوسہ نہیں دیا ورنہ حضرت عمرؓ اس بے باکی کے ساتھ لا تضر ولا تنفع نہ فرماتے۔ وہ حضورؐ کے مزاج شناس تھے۔ جب انہوں نے حجر کے ساتھ یہ معاملہ کیا تو یقیناً اس تقبیل کا منشاء عبادت ہرگز نہیں اور تبرعاً اس کا جواب بھی دیئے دیتا ہوں کہ ممکن ہے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو حجر کے اندر تجلیات الٰہیہ کا بنسبت دوسرے حصص بیت کے زیادہ ہونا منکشف ہوا ہو پس منشاء اس تقبیل کا تلبس زائد ہے تجلیات الٰہیہ سے اور جس چیز کو محبوب کے انوار سے زیادہ تلبس ہو اس کا بوسہ دینا اقتضائے محبت ہے (قال الشاعر)

؎ امر علی الدیار دیار لیلی   اقبل ذا الجدار وذا الجدارا
وما حب الدیار شغفن قلبی   ولکن حب من سکن الدیارا

اس جگہ شاید کسی کو یہ اشکال پیش آئے کہ جس وقت حضرت عمرؓ نے حجر اسود کے متعلق یہ فرمایا تھا انی لاعلم انک لحجر لا تضر ولا تنفع اس وقت حضرت علیؓ وہاں موجود تھے انہوں نے فرمایا بلی انہ لینفع انی سمعت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم انہ یشہد لمن قبلہ یوم القیامۃ (او کما قال) کیوں نہیں وہ نفع دیگا میں نے حضورؐ سے سنا ہے کہ جو لوگ اس کو چومتے ہیں قیامت کے دن یہ ان کے واسطے گواہی دے گا

تو اس سے حجر کا نافع ہونا معلوم ہوا اور یہ معارض ہے حضرت عمرؓ کے قول کے۔

خوب سمجھ لیجئے کہ اگر حضرت علیؓ سے یہ قول بسند صحیح ثابت ہو تو حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے قول میں تعارض کچھ نہیں بلکہ حضرت علیؓ کا قول حضرت عمرؓ کے قول کا مکمل ہے اور اس کی حقیقت کو ظاہر کرنے والا ہے۔ کیونکہ جب حضرت عمرؓ نے یہ فرمایا۔ کہ میں جانتا ہوں کہ تو نہ ضرر دے سکتا ہے نہ نفع تو اس پر یہ شبہ وارد ہوتا ہے کہ پھر یہ تقبیل محض لغو ہے۔ جس کام میں کچھ نفع بھی نہیں اُس کا کرنا فضول ہے۔ حضرت علیؓ نے اس شبہ کو رفع فرما دیا اور بتلا دیا کہ حضرت عمرؓ ایک خاص نفع وضرر کی نفی فرماتے ہیں۔ یعنی جو نفع وضرر معبود کا خاصہ ہے حجر اسود میں وہ نہیں ہے باقی مطلق نفع کی نفی مقصود نہیں۔

چنانچہ حجر میں ایک نفع ہے کہ وہ شاہد بنے گا قیامت میں اپنے بوسہ دینے والوں کے لئے اور ظاہر ہے کہ شاہد کا درجہ حاکم سے کم ہوتا ہے۔ شاہد کے قبضہ میں نفع وضرر نہیں ہوتا وہ تو صرف واقعہ بیان کر دیتا ہے اب آگے حاکم کی رائے پر فیصلہ کا مدار ہے نفع وضرر وہی دے سکتا ہے۔ حاکم اصل اور شاہد تابع ہوتا ہے پس حجر کا شاہد ہونا خود اس کی عبادت کی نفی کرتا ہے۔

چنانچہ شاہد تو انسان بھی ہو سکتا ہے چنانچہ قیامت میں بہت سے انسان بھی شاہد ہوں گے پس حضرت عمرؓ کا مطلب یہ ہے کہ وہ نفع وضرر تیرے قبضہ میں نہیں ہے اس سے تو شبہ عبادت کی نفی ہوگئی اور حضرت علیؓ کا مطلب یہ ہے کہ وہ نفع تیرے اندر ہے جو مخلوق سے مخلوق کو پہونچا کرتا ہے یعنی شاہدیت اس سے لغویت تقبیل کی نفی ہوگئی خوب سمجھ لو۔

تکمیل توحید

دوسری تکمیل توحید کی اسلام میں یہ ہے کہ تصویر کو حرام کر دیا گیا۔ تصویر کا بنانا بھی حرام ہے اور گھر میں رکھنا بھی حرام ہے حالانکہ تصویر قابل پرستش نہیں۔ نہ تو کفار تصویر کو پوجتے ہیں بلکہ وہ تو مجسم مورتوں کو پوجتے ہیں۔ اس

وقت بھی کفار کی یہی حالت ہے اور پہلے بھی یہی دستور تھا چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں اتعبدون ما تنحتون یہ نہیں فرمایا اتعبدون ما تصورون مگر باایں ہمہ اسلام نے شرک سے اتنا بچایا ہے کہ تصویر کو بھی حرام کر دیا کیونکہ گو اس کی عبادت نہیں ہوتی مگر مفضی الی العبادۃ ہونیکا احتمال اس میں ضرور ہے کیونکہ جب تصویر کی اجازت ہوتی تو لوگ حضورؐ کی، صحابہ و بزرگان دین کی تصویریں بھی اتارتے اور عادۃً تصویر کا اثر قلب پر وہی ہوتا ہے جو صاحب تصویر کا اثر ہوتا ہے تو وہ تصویروں کی تعظیم بھی کرتے۔ پھر رفتہ رفتہ جہلا شرک میں مبتلا ہو جاتے چنانچہ پہلے زمانہ میں اسی سے شرک کی بنیاد قائم ہوئی۔

اور تصویر کا اثر صاحب تصویر کے برابر ہونے کا مجھے ایک واقعہ یاد آیا جو مجھ سے کانپور میں ایک مسافر نے نقل کیا تھا کہ ایک مرتبہ مجمع غلاۃ مبتدعہ کے بطور استہزا کے ایک نقل کی جس میں ظالموں نے امام حسینؓ امام حسنؓ حضرت علیؓ حضرت فاطمہؓ اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم حتیٰ کہ اللہ میاں کی بھی تصویر بنائی تھی۔ اس مجمع میں کوئی دیہاتی سنی بھی جا بیٹھا تھا۔ سب سے پہلے امام حسینؓ کی تصویر لائی گئی، لوگوں نے مفتی مجلس سے پوچھا کہ ان کے بارہ میں کیا حکم ہے؟ اس نے کہا کہ یہ حضرت قیامت تک کے لئے ہم پر مصیبت ڈال گئے ہیں کہ اپنے ساتھ سارے خاندان اہل بیت کو مروا ڈالا جن کو ہر سال ہم روتے ہیں، اگر یہ تقیہ کر لیتے تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ لہٰذا ان کو لے جاؤ اور قتل کر ڈالو۔ اس کے بعد امام حسنؓ لائے گئے پوچھا ان کے واسطے کیا حکم ہے؟ کہا انہوں نے اپنے کو خلافت سے معزول کر کے (حضرت) معاویہؓ کو خلافت دیدی جس سے یزید کو خلافت پہنچ گئی۔ یہ سب انہی کا فساد ہے ان کو بھی قتل کرو۔ اس کے بعد حضرت علیؓ کی تصویر لائی گئی کہا سارے فتنہ کی جڑ یہی ہیں، انہوں نے خواہ مخواہ (حضرت) معاویہؓ سے لڑائی کی جس سے ان کا خاندان اہل بیت کا دشمن ہو گیا۔ تقیہ کر لیتے تو کچھ بھی نہ ہوتا ان کو بھی ختم کر دو۔ پھر حضرت فاطمہؓ کی تصویر لائی گئی۔ کہا ان کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے معلوم ہو چکا تھا کہ حسینؓ کربلا میں شہید ہوں گے۔ انہوں نے اپنے ابا جان سے دعا نہ کرائی کہ میری اولاد تباہ نہ ہو ان کو بھی صاف

کرو۔ پھر نعوذ باللہ حضور کی تصویر لائی گئی کہا ارے یہ تو سب کچھ کر سکتے تھے ایک بددعا کر دیتے تو یزید کی کیا مجال تھی جو اہل بیت پر یہ مصیبت ڈالتا۔ پھر وہ حکم اوروں کے لئے ہوا تھا آپ کی تصویر کے لئے بھی وہی ہوا۔ بے چارہ دیہاتی مسلمان یہ سب کچھ دیکھتا رہا اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا۔ آخر سب کے بعد ایک بہت بڑی تصویر لائی گئی۔ مفتی نے پوچھا کہ یہ کون ہیں کہا گیا کہ یہ اللہ میاں ہیں (نعوذ باللہ) اس نے کہا سارا فساد تو ان ہی کا ہے ان کو سب کچھ قدرت تھی مگر انہوں نے اہل بیت کا ساتھ نہ دیا یزیدیوں کا ساتھ دیا اور اہل بیت کو ان کے ہاتھ سے مروا ڈالا پھر ان کے واسطے بھی وہی حکم ہوا جو اوروں کے لئے ہوا تھا۔ اس وقت بے چارے مسلمان سے رہا نہ گیا وہ یہ سمجھا کہ اگر اللہ میاں نہ ہوئے تو بارش کون برسائیگا؟ روزی کون دیگا؟ جنت کون دیگا؟ بے چارہ غلبہ جوش میں اٹھا اور دوڑ کے اس تصویر کو اٹھا کر لے بھاگا؟ بدعتی اس کے پیچھے پیچھے لاٹھیاں لے کر دوڑے کہ یہ کون اجنبی ہماری محفل میں آ گیا مگر وہ دیہاتی مضبوط تھا۔ ایسا بھاگا کہ کسی کے ہاتھ نہ آیا۔ قریب ہی اہل حق کے دیہات تھے اس نے وہاں جا کر پکارا کہ مجھے بچاؤ لوگ جمع ہو گئے بدعتی مجمع کو دیکھ کر لوٹ گئے اب لوگوں نے اس سے کہنا شروع کیا کہ تو ان کم بختوں میں کہاں جا پھنسا تھا۔ خیر خدا کا شکر ہے کہ اس نے تجھے بچا لیا کہنے لگا واہ خدا نے مجھے کیا بچایا میں نے ہی خدا کو بچا لیا (توبہ توبہ) لوگوں نے کہا کم بخت یہ کیا بکتا ہے کہنے لگا دیکھو یہ خدا میرے ساتھ موجود ہے یہ لوگ ان کو قتل کر دیتے تھے میں اٹھا کر لے بھاگا اور ان کی جان بچائی۔ لوگ ہنسنے لگے اور اسے سمجھایا کہ بیوقوف یہ خدا نہیں ہے۔ یہ تو بنائی ہوئی تصویر ہے خدا کو بھلا کون دنیا میں دیکھ سکتا ہے اور وہ بے جان تھوڑا ہی ہے کہ نہ بولتا ہو نہ بات کرتا ہو پھر وہ کسی کے ہاتھ کیوں آنے لگا کس کی مجال ہے جو خدا تعالیٰ کو آنکھ بھر کر بھی دیکھ سکے۔ وہ دیہاتی بے چارہ جاہل تھا مگر تھا خدا کا محب۔ اس لئے وہ اس قول سے کہ میں نے خدا کو بچایا ہے کافر نہیں ہوا وہی قصہ ہو گیا جو شبان موسیٰ علیہ السلام کا قصہ تھا اخلاص و محبت کی وجہ سے اس کی یہ جہالت معاف ہو گئی۔ اس قصہ سے آپ کو معلوم ہو

گیا ہوگا کہ تصویر کا اثر قلب پر کیا ہوتا ہے اسی لئے شریعت نے اس کو حرام کر دیا۔ مگر آج کل مسلمانوں کا کچھ ایسا مذاق بدلا ہے کہ تصویر سے ذرا بھی اجتناب نہیں رہا۔ حتیٰ کہ مسائل کی کتابوں میں بھی تصویریں بننے لگیں۔ جہاں وضو کا بیان ہے وہاں ایک تصویر آدمی کی اور لوٹے کی بنا دی ہے۔ گویا وہ بیٹھا ہوا وضو کر رہا ہے وعلیٰ ہذا۔ اگر یہی مذاق رہا تو چند دنوں کے بعد قرآن میں بھی تصویر ہونے لگے گی۔ جب مسلمانوں کی یہ حالت ہو تو مخالفین اسلام کو ہم کیا جواب دیں مگر ہم تو اب بھی جواب دیں گے کیونکہ اسلام میں تو ممانعت ہی ہے۔ اسلام اپنے پیروؤں کے اعمال کا ذمہ دار تھوڑا ہی ہے۔

نماز کی خوبی: ایک خوبی اسلام کی یہ ہے کہ نماز کو کس خوبصورتی کے ساتھ شروع فرمایا ہے اس کی نظیر کوئی مذہب نہیں دکھا سکتا۔ شروع سے لے کر آخر تک خدا کی حمد و ثنا تکبیر و تعظیم ہی ہے۔ کبھی رکوع ہے۔ کبھی سجدہ، کبھی قیام ہے کبھی قعود۔ گویا عاشق اپنے محبوب کی خوشامد کر رہا ہے نہ کسی طرف دیکھتا ہے نہ کسی سے بات کرتا ہے۔ کبھی محبوب کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہے کبھی جھکتا ہے کبھی پاؤں پڑتا ہے کبھی ادب سے بیٹھ کر عرض معروض کرتا ہے۔ غرض عجیب عبادت ہے۔

زکوٰۃ کی خوبی: ایک خوبی اسلام میں یہ ہے کہ غرباء کے لئے امراء پر زکوٰۃ کو فرض فرما دیا جس میں صرف چالیسواں حصہ دینا پڑتا ہے اور کھیتی میں دسواں یا بیسواں حصہ۔ یہ ایسی مقدار ہے جس میں دینے والے پر کچھ بھی بار نہیں اور اگر پابندی سے سب ادا کریں تو اہل اسلام کے تمام فقراء و معذورین کے لئے کافی ہے۔ کوئی بھی بھوکا ننگا نہ رہے مگر افسوس لوگ پابندی سے زکوٰۃ نہیں نکالتے۔ پھر لطف یہ کہ زکوٰۃ دینے سے مال میں برکت بھی ہوتی ہے۔ کمی نہیں آتی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے پختگی کے ساتھ فرمایا ہے کہ صدقہ سے مال میں کمی نہیں آتی۔ آخرت کا ثواب تو ملے ہی گا۔ زکوٰۃ سے دنیا میں بھی مال بڑھتا ہے آفات سے محفوظ رہتا ہے چنانچہ تجربہ کر کے دیکھ لیا جائے۔

پھر ایک عبادت حج کی مقرر فرمائی جس کی بناء یہ ہے کہ چونکہ بدوں حال

حج کی خوبی کے قال بیکار ہے۔ دل پر بھی چرکہ لگانے کی ضرورت تھی اس لئے عشق و محبت کا چرکہ دل پر لگانے کے لئے یہ ایک عبادت ایسی بھی شروع ہوئی جس میں ابتداء سے انتہا تک جنون عشق کی کیفیت ہوتی ہے یعنی حج۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ سب باتیں ظاہری ہی ہیں نہیں صاحب ان کا دل پر بڑا اثر ہوتا ہے احرام کی کیفیت دیکھ کر دشمنوں پر بھی اثر ہوتا ہے کہ بادشاہ اور غلام سب کے سب ننگے سر ہیں۔ چادر لنگی پہنے ہوتے ہیں۔ ناخن بڑھے ہوئے بال پریشان ہیں۔ نہ خوشبو لگا سکتے ہیں۔ نہ ناخن کتر سکتے ہیں۔ نہ خط بنوا سکتے ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے لبیک اللھم لبیک پکارتے ہیں۔ جب حاجی لبیک کہتے ہیں تو پتھر بھی موم ہو جاتا ہے۔ پھر جب مکہ پہونچتے ہیں اور کعبۃ اللہ پر نظر پڑتی ہے تو نظر کے ساتھ ہی آنکھوں سے گھڑوں پانی بہنے لگتا ہے۔ کیا سب باتیں ہی باتیں ہیں۔ کوئی تو چیز ہے جو یوں بے تاب کر ڈالتی ہے۔ یہ رونا نہ معلوم خوشی کا ہے یا غم کا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہمارے حاجی صاحب نے ارشاد فرمایا تھا کہ یہ رونا گرم بازاری عشق کا ہے۔ جس کا ذکر ان اشعار میں ہے ؎

بلبلے برگ گلے خوش رنگ در منقار داشت
واندراں برگ و نوا خوش نالہائے زار داشت
گفتمش در عین وصل ایں نالہ و فریاد چیست
گفت ما را جلوۂ معشوق دریں کار داشت

غرض حج ایسی عجیب عبادت ہے کہ اگر اس کو طریقہ سے ادا کیا جاوے تو انسان ایک ہی حج میں واصل ہو جاتا ہے۔ مگر بعضے حاجی ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ایک مسافر مسجد میں پڑا سو رہا تھا کسی چور نے اس کا چادرہ کھینچا تو وہ کہتا ہے حاجی صاحب چادر نہ کھینچو۔ کسی نے کہا کہ تجھے اس کا حاجی ہونا کیسے معلوم ہوا۔ کہا معلوم تو نہیں ہوا مگر ایسے کام حاجی ہی

کیا کرتا ہے۔ تو بعضے حاجی ایسے بھی ہوتے ہیں کہ حج سے پہلے تو وہ کچھ ڈھکے مُندے نیک بھی تھے اور حج کے بعد کھلم کھلا بدمعاش ہو گئے۔ بات یہ ہے کہ حجر اسود کسوٹی ہے اس کو چھونے کے بعد انسان کا اصلی رنگ ظاہر ہو جاتا ہے جو حالت پہلے سے مخفی تھی وہ اب کھل جاتی ہے۔ اگر طبیعت میں نیکی تھی تو پہلے سے زیادہ نیک ہو جاتا ہے اگر بدی تھی تو اب وہ بدی کھل جاتی ہے بہت لوگ ظاہر میں نیک معلوم ہوتے ہیں مگر کسوٹی پر لگانے سے کھرا کھوٹا معلوم ہو جاتا ہے۔

نقد صوفی نہ ہمہ صافی و بے غش باشد ‍ ‍ ‍ ‍ اے بسا خرقہ کہ مستوجب آتش باشد

خوش بود گر محک تجربہ آید بمیاں ‍ ‍ ‍ ‍ تا سیہ روئی شود ہر کہ درو غش باشد

شاید تم یہ کہو کہ اچھا ہوا تم نے یہ بات ظاہر کر دی۔ اب تو ہم حج ہی کو نہ جائیں گے۔ نہیں صاحب! حج کو جاؤ مگر اکسیر بنکر جاؤ اور لو میں تم کو اکسیر بننے کا طریقہ بھی بتلاتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ کسی کیمیاگر سے تعلق پیدا کر لو۔

کیمیائیست عجب بندگی پیر مغاں ‍ ‍ ‍ ‍ خاک او گشتم و چندیں درجاتم دادند

کیمیاگر سے میری مراد یہ لنگوٹی باندھنے والے نہیں ہیں بلکہ باطن کے کیمیاگر مراد ہیں جن کو اہل اللہ کہتے ہیں ان کی شان یہ ہوتی ہے۔

آہن کہ بپارس آشنا شد ‍ ‍ ‍ ‍ فی الحال بصورت طلا شد

پارس ایک پتھر ہوتا ہے اس کی خاصیت یہ ہے کہ جہاں لوہے کو اس سے مس کیا فوراً سونا ہو جاتا ہے۔ اہل اللہ کی تو یہ خاصیت مشاہد ہے۔ پارس میں یہ بات ہو یا نہ ہو اہل اللہ کی صحبت سے توبۂ نصوح حاصل ہو جاتی ہے جس سے پہلی تمام گناہ گیاں دھل جاتی ہیں۔ پس تم کو چاہیئے کہ کسی اللہ والے سے تعلق پیدا کر کے حج کو جاؤ اس کی صحبت سے تم کو توبۂ خالص عطا ہو گی۔ توبہ کر کے جاؤ گے تو پھر حج کا اثر یہ ہو گا کہ پہلے سے زیادہ تم کو اعمال صالحہ کی توفیق ہو گی۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ مرید ہو کر جاؤ۔ اس کی ضرورت نہیں

صرف تعلق محبت اور چند روزہ صحبت کی ضرورت ہے۔

معاملات میں اسلام کا یہ حسن ہے کہ مخلوق کو دھوکہ فریب دینا حرام ہے
حسن معاملہ: چاہے مسلمان کو دھوکہ دے یا کافر کو من غشنا فلیس منا ایک مرتبہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم بازار میں گذرے تو گیہوں کے ایک ڈھیر میں آپ نے ہاتھ ڈالا تو اس میں اوپر تو سوکھے ہوئے گیہوں تھے اور اندر بھیگے ہوئے تھے اس وقت آپ نے فرمایا من غشنا فلیس منا اور اس شخص سے فرمایا کہ بھیگے ہوئے گیہوں اوپر کر دے تاکہ لوگوں کو دھوکہ نہ ہو۔ اسی طرح جن صورتوں سے معاملات میں نزاع پیدا ہو ان کو سب کو ناجائز کر دیا۔ نہی عن بیع الغرر اسی طرح سود و ربوا کو مطلقاً حرام کیا گیا کیونکہ اس سے قرض لینے والا بہت جلد تباہ ہو جاتا ہے۔

معاشرت کی خوبی یہ ہے کہ سب سے پہلے تواضع کی تعلیم
حسن معاشرت: دی گئی ہے من تواضع للہ رفعہ اللہ تواضع کے یہ معنی ہیں کہ اپنے کو سب سے کمتر سمجھے۔ حتی کہ جانوروں سے بھی کمتر سمجھے کیونکہ اگر نجات ہو گئی تب تو اپنے کو ان سے افضل کہنے کا حق ہے اور اگر خدانخواستہ نجات نہ ہوئی تو جانوروں سے بھی بدتر ہوئے کیونکہ وہ غضب الٰہی سے محفوظ ہیں کیا اس تواضع کی نظیر کوئی دکھا سکتا ہے الحمد للہ اسلام میں اس کی صدہا نظائر موجود ہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تواضع کا حال اوپر مذکور ہو چکا ہے اور جو لوگ آپ کے سچے نائب ہیں وہ بھی اسی مذاق کے ہوتے ہیں اور تواضع حسن معاشرت کی جڑ ہے۔ معاشرت میں خرابی اسی سے آتی ہے کہ میں اپنے کو بڑا سمجھتا ہوں اور تم اپنے کو اور جب دونوں اپنے کو دوسرے سے کمتر سمجھیں گے تو پھر نزاع کی نوبت ہی نہ آئے گی اور اگر آئے گی بھی تو وہ حد سے متجاوز نہ ہو گی۔ آج کل لوگ اتفاق اتفاق پکارتے پھرتے ہیں۔ ہمارے حاجی صاحب فرماتے تھے کہ اتفاق کی جڑ تو ان لوگوں میں ہے نہیں محض باتوں سے اتفاق پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اتفاق کی جڑ

تواضع ہے۔ جو لوگ متواضع ہوں گے۔ ان میں آپس میں نزاع ہو ہی نہیں سکتا اور بدوں تواضع کے کبھی اتفاق پیدا نہیں ہو سکتا۔ واقعی عجیب گر کی بات ہے۔

ایک خوبی معاشرت کی یہ ہے کہ استیذان کا مسئلہ مشروع کیا گیا ہے کہ بدوں اجازت واطلاع کے اپنے گھر میں بھی نہ آئے۔ شاید کوئی پردہ دار ہو۔ اس کی پردہ دری ہوگی جب اپنے گھر کا یہ حکم ہے تو دوسروں کا تو کیا پوچھنا اور زنانہ تو زنانہ مردانہ میں بھی جب قرائن سے معلوم ہو کہ مجلس خاص ہے مثلاً کوئی شخص پردے چھوڑ کر بیٹھا ہو تو بدوں اس کی اجازت کے اندر نہ جاوے۔ گو مکان مردانہ ہی ہو۔

اخلاق کی خوبی یہ ہے کہ اصلاح نفس کا جس قدر اہتمام اسلام میں ہے کسی مذہب میں بھی نہیں۔ جاہ طلبی نام آوری ریاکاری سے سخت ممانعت ہے۔ حسد بغض وغیرہ پر سخت سخت وعیدیں وارد ہیں۔ معاشرت میں ایک حکم یہ ہے کہ اپنے غلاموں کی ستر خطائیں روزانہ معاف کیا کرو اس سے زیادہ خطائیں ہوں تو کچھ سزا دو۔ بھلا غلاموں کے ساتھ یہ برتاؤ کوئی غیر مسلم کر سکتا ہے۔ غلام تو کیا اولاد کے ساتھ بھی کوئی ایسا برتاؤ نہیں کر سکتا۔ مگر افسوس باوجود اس قدر رعایت کے پھر بھی مخالفوں کو اسلام کے مسئلہ غلامی پر اعتراض ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اسلام نے تو غلاموں سے وہ برتاؤ کیا ہے کہ ان کے باپ بھی ان کے ساتھ دنیا نہیں کر سکتے تھے۔ مسئلہ غلامی کی اصل یہ ہے کہ اس میں مخلوق کی جان بچائی گئی ہے کیونکہ جب ایک دشمن مسلمانوں کے مقابلہ میں فوج کشی کرتا ہو اور اس کے ہزاروں لاکھوں آدمی مسلمانوں کے ہاتھ میں قید ہوں تو اب کوئی ہمیں بتلائے کہ ان قیدیوں کو کیا کرنا چاہیے ایک صورت تو یہ ہے کہ ان سب کو رہا کر دیا جائے۔ اس کا حماقت ہونا ظاہر ہے کہ دشمن کی ہزاروں لاکھوں کی تعداد کو اپنے مقابلہ کے لیے مستعد کر دیا۔ ایک صورت یہ ہے کہ سب کو فوراً قتل کر دیا جائے اگر اسلام میں ایسا کیا جاتا تو مخالفین جتنا شور وغل مسئلہ غلامی پر کرتے ہیں اس سے کہیں زیادہ اس وقت کرتے کہ دیکھئے کیسا سخت حکم ہے کہ قیدیوں کو فوراً قتل کر دیا جاوے

ایک صورت یہ ہے کہ سب کو کسی جیل خانہ میں بند کر دیا جائے اور وہاں رکھ کر ان کو روٹی کپڑا دیا جائے۔ یہ صورت آج کل کی گو بعض متمدن سلطنتوں میں پسندیدہ ہے مگر اس میں چند خرابیاں ہیں ایک یہ کہ اس سے سلطنت پر بڑا بار عظیم پڑتا ہے اور ان سے کمائی کرانا خود غرضی کی صورت ہے۔ پھر جیل خانہ کی حفاظت کے لئے ایک خاص فوج مقرر کرنا پڑتی ہے۔ قیدیوں کی ضروریات کے لئے بہت سے آدمی ملازم رکھے جاتے ہیں۔ یہ سارا عملہ بیکار محض ہوتا ہے۔ سلطنت کے کسی اور کام میں نہیں آسکتا۔ قیدیوں ہی کی حفاظت کا ہو رہتا ہے۔ پھر تجربہ شاہد ہے کہ جیلخانہ میں رکھ کر چاہے آپ قیدیوں کو کتنی ہی راحت پہنچائیں اس کی ان کو کچھ قدر نہیں ہوتی۔ کیونکہ آزادی سلب ہونے کا غیظ ان کو اس قدر ہوتا ہے کہ وہ آپ کی ساری خاطر مدارات کو بیکار سمجھتے ہیں۔ تو سلطنت کا اتنا خرچ بھی ہوا اور سب بے سود کہ اس سے دشمن کی دشمنی میں کمی نہ آئی۔ پھر قیدخانہ میں ہزاروں لاکھوں قیدی ہوتے ہیں وہ سب کے سب علمی و تمدنی ترقی سے بالکل محروم رہتے ہیں اور یہ سب سے بڑا ظلم ہے۔ اسلام نے اس کے بجائے یہ حکم دیا کہ جتنے قیدی گرفتار ہوں سب لشکر والوں کو تقسیم کر دو ایک گھر میں ایک غلام کا خرچ معلوم بھی نہ ہوگا اور سلطنت بار عظیم سے بچ جائے گی پھر چونکہ ہر شخص کو اپنے قیدی سے خدمت لینے کا بھی حق ہے اس لئے وہ اس کو روٹی کپڑا جو کچھ دیگا اسے گراں نہ ہوگا۔ وہ سمجھے گا کہ میں تنخواہ دے کر نوکر رکھتا جب بھی خرچ ہوتا۔ ایک سے خدمت لوں گا اور اس کے معاوضے میں روٹی کپڑا دوں گا۔ پھر چونکہ غلام کو چلنے پھرنے سیر و تفریح کرنے کی آزادی ہوتی ہے۔ قیدخانہ میں بند نہیں ہوتا۔ اس لئے اس کو اپنے آقا پر وہ غیظ نہیں ہوتا جو جیلخانہ کے قیدی کو ہوتا ہے۔ اس حالت میں اگر آقا نے اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا تو اس کا احسان غلام کے دل میں گھر کر لیتا ہے اور وہ اس کے گھر کو اپنا گھر اس کے گھر والوں کو اپنا عزیز سمجھنے لگتا ہے۔ یہ سب باتیں ہی نہیں بلکہ واقعات ہیں پھر اس صورت میں غلام علمی و تمدنی ترقی بھی کر سکتا ہے کیونکہ جب آقا و غلام میں

اتحاد ہو جاتا ہے تو آقا خود چاہتا ہے کہ میرا غلام معزز و شائستہ ہو۔ وہ اس کو تعلیم بھی دلاتا ہے صنعت و حرفت بھی سکھلاتا ہے۔

چنانچہ اسلام میں صدہا علماء و زہاد و عباد ایسے ہوئے ہیں جو اصل میں موالی تھے۔ غلاموں کے طبقہ نے تمام علوم میں ترقی حاصل کی بلکہ غلاموں کو بعض دفعہ بادشاہت بھی نصیب ہوئی ہے سلطان محمود کو مخالفین بہت بدنام کرتے ہیں کہ انہوں نے تلوار سے اسلام پھیلایا مگر تاریخ میں ان کا ایک واقعہ لکھا ہے اس سے ان کی رحمدلی اور شفقت کا اندازہ ہو جائیگا اور یہ کہ غلاموں کیساتھ ان کا کیا برتاؤ تھا ایک بار سلطان محمود نے ہندوستان پر حملہ کیا اور بہت سے ہندو جنگ میں قید ہوئے جن کو وہ اپنے ساتھ غزنی لے گئے۔ ان میں ایک غلام بہت ہونہار ہوشیار تھا اس کو آزاد کر کے سلطان نے ہر قسم کے علوم و فنون کی تعلیم دی جب وہ تعلیم سے فارغ ہوا تو اس کو حکومت کے عہدے دیئے گئے حتیٰ کہ رفتہ رفتہ اسکو ایک بڑے ملک کا صوبہ بنا دیا۔ صوبہ کی حیثیت اس وقت وہ تھی جو آجکل کسی بڑے والئی ریاست کی ہوتی ہے

جس وقت سلطان نے اس کو تخت پر بٹھلایا اور تاج سر پر رکھا تو وہ غلام رونے لگا۔ سلطان نے فرمایا کہ یہ وقت خوشی کا ہے یا غم کا۔ اس نے عرض کیا جہاں پناہ! اس وقت مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد آ کر پھر اپنی یہ قدر و منزلت دیکھ کر رونا آگیا حضور جس وقت میں ہندوستان میں بچہ سا تھا تو آپ کے حملات کی خبریں سن سن کر ہندو کانپتے تھے اور ان کی عورتیں اپنے بچوں کو آپ کا نام لے کر ڈرایا کرتی تھیں۔ جیسا ہوا سے ڈرایا کرتی ہیں۔ میری ماں بھی مجھے اسی طرح آپ کے نام سے ڈرایا کرتی تھی۔ تو میں سمجھتا تھا کہ نہ معلوم محمود کیسا جابر و ظالم ہوگا حتیٰ کہ آپ نے خود ہمارے ملک پر حملہ کیا اور اس فوج سے آپ کا مقابلہ ہوا جس میں یہ غلام موجود تھا۔ اس وقت تک میں آپ کے نام سے ڈرتا تھا۔ پھر میں آپ کے ہاتھوں قید ہوا تو میری جان ہی نکل گئی کہ بس اب خیر نہیں مگر حضور نے دشمنوں کی روایات کے خلاف میرے ساتھ ایسا برتاؤ فرمایا کہ آج میرے سر پر تاج سلطنت رکھا

جا رہا ہے تو اس وقت مجھے یہ خیال کر کے رونا آگیا کہ کاش آج میری ماں ہوتی تو میں اس سے کہتا کہ دیکھ یہ وہی عمر ہے جس کو تو ہوا تیلایا کرتی تھی۔

صاحبو! ایسے واقعات اسلام میں بکثرت ہیں اور یہ اسی مسئلہ غلامی کا نتیجہ ہے اگر یہ لوگ جیل خانہ میں قید کر دیے جاتے تو نہ ان کو مسلمانوں سے انس ہوتا نہ مسلمانوں کو ان سے تعلق ہوتا۔ غلام بن کر یہ لوگ مسلمانوں میں مل جل گئے۔ علمی ترقی حاصل کرتے رہے آخرکار اپنی حیثیت کے موافق درجات و مناصب پر فائز ہوتے رہے۔ کوئی محدث بنا کوئی فقیہ کوئی قاری بنا کوئی مفسر کوئی نحوی بنا کوئی ادیب کوئی قاضی ہوا کوئی حاکم۔

پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے غلاموں کی یہاں تک رعایت فرمائی ہے کہ آپ کا حکم ہے کہ جو خود کھاؤ وہی غلاموں کو کھلاؤ۔ جو خود پہنو وہی پہناؤ اور جب وہ کھانا پکا کر لائے تو اس کو اپنے ساتھ بٹھلا کر کھلاؤ۔ عین وصال کے وقت کے آپ کی یہ حالت تھی الصلوٰۃ وما ملکت ایمانکم یعنی نماز کا خیال رکھو اور ان غلاموں کا بھی جو تمہارے ہاتھوں کے نیچے ہیں اس سے زیادہ اور کیا رعایت ہو سکتی ہے؟ اور بحمد اللہ حضرات صحابہ و تابعین اور اکثر سلاطین اسلام نے غلاموں کے ساتھ یہی برتاؤ کیا اگر کسی ایک نے دو نے اس کے خلاف عمل درآمد کیا تو وہ اپنے فعل کا خود ذمہ دار ہے اسلام پر اس سے اعتراض نہیں ہو سکتا۔

جرأت اعتراض دراصل بات یہ ہے کہ آج کل مخالفوں کو اعتراض کرنے کی جرأت زیادہ تر ہمارے افعال کو دیکھ کر ہوتی ہے وہ ہمارے افعال کو دیکھ کر محض تحکم سے یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ یہ اسلامی تعلیم کا اثر ہوگا حالانکہ ہمارے اندر آجکل جو کچھ خرابی نمایاں آ رہی ہے وہ کفار کے اختلاط کا یا ان کے اتباع کا نتیجہ ہے کہ بہت مسلمانوں نے کفار کے طرز عمل اختیار کر لیے ہیں اگر ہم اپنی حالت کی اصلاح کر لیں اور اسلام کی تعلیم کے موافق اپنا طرز عمل بنا لیں تو کسی کو اسلام پر اعتراض کی جرأت نہ ہو بلکہ کفار خود بخود

اسلام اور غلام

ہ منجذب ہونے لگیں۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ کا قصہ ایک یہودی کے ساتھ پیش آیا۔ یہودی کے پاس ایک زرہ تھی۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ یہ زرہ میری ہے یہودی نے کہا میری ہے حضرت علیؓ اس وقت خلیفہ تھے۔ آپ نے اپنے ماتحت قاضی کے یہاں جن کا نام شریح ہے، دعویٰ دائر کیا۔ قاضی کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا جس کی شان یہ ہے کہ سلطان وقت مدعی ہے اور رعایا کا ایک یہودی مدعی علیہ ہے۔ قاضی نے حضرت علیؓ سے کہا کہ آپ ثبوت پیش کیجئے۔ حضرت علیؓ نے گواہی میں اپنا ایک آزاد شدہ غلام قنبر پیش کیا اور دوسرا گواہ امام حسنؓ پیش کئے۔ قاضی نے فرمایا کہ قنبر کی گواہی تو معتبر ہے کیونکہ وہ آزاد شدہ غلام ہے مگر امام حسنؓ کی گواہی قبول نہیں ہے کیونکہ وہ آپ کے بیٹے ہیں اور باپ کی طرفداری میں بیٹے کی گواہی قبول نہیں ہو سکتی۔ اس مسئلہ میں حضرت علیؓ اور قاضی شریح کی رائے میں اختلاف تھا۔ حضرت علیؓ بیٹے کی گواہی کو جبکہ وہ دیندار ثقہ ہو جائز سمجھتے تھے اور حضرت شریح کسی حال میں جائز نہ سمجھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے امام حسنؓ کی گواہی قبول نہیں کی اور یہودی کی ڈگری کر دی۔

حضرت علیؓ کو یہ فیصلہ ذرا بھی ناگوار نہ ہوا، خوش خوش عدالت سے باہر چلے آئے مگر یہودی کو اس فیصلہ پر ایسا تعجب ہوا کہ وہ بدول اسلام قبول کئے نہ رہ سکا۔ وہ بار بار کہتا تھا کہ خلیفہ کا قاضی خلیفہ کو ہرا دے اور رعایا کے یہودی کو اس کے مقابلہ میں جتا دے۔

حقانیت اسلام

عجیب بات ہے۔ آخر حقانیت اسلام نے اس کے دل پر اثر کیا فوراً مسلمان ہو گیا بھلا معترضین سے کوئی پوچھے کہ اس یہودی کو کس تلوار نے مسلمان کیا تھا؟ کچھ نہیں صرف صحابہ کا طرز عمل دیکھ کر اسلام کی طرف اسے کشش ہوئی۔ واللہ اگر ہم لوگ اپنی اصلاح کر لیں تو کفار کی خود بخود اصلاح ہو جائیگی۔ حضرات صحابہ کی تو بڑی شان ہے ہم لوگ جو ان کے سامنے محض نقال ہیں بلکہ نقل بھی پوری نہیں ہوتی۔ ہم ریل کے سفر میں بارہا اس کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ ہندوؤں پر ہماری باتوں کا اور طرز عمل کا بڑا اثر ہوتا ہے اور وہ خود بھی چپکے چپکے اقرار کرتے ہیں کہ ان

کیطرف دل کو کشش ہوتی ہے۔ یہ لوگ سچے معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ چند واقعات اس قسم کے اوپر مذکور ہو چکے ہیں۔

لوگ اسلام کو بدنام کرتے ہیں کہ وہ تلوار سے پھیلا ہے واللہ بالکل غلط ہے۔ اگر مسلمان تلوار کے زور سے لوگوں کو مسلمان کیا کرتے تو آج ہندوستان میں جہاں اسلامی سلطنت چھ سو برس تک رہی ہے ایک بھی ہندو باقی نہ رہتا۔ مولنا محمد قاسم صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا جواب اس اعتراض کے متعلق یہ ہے کہ اگر اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے تو یہ بتلاؤ کہ وہ شمشیر زن کہاں سے آتے تھے؟ کیونکہ تلوار خود تو نہیں چل سکتی تو جن لوگوں نے سب سے پہلے تلوار چلائی ہے یقیناً وہ تو تلوار سے مسلمان نہیں ہوئے تھے کیونکہ ان سے پہلے تلوار کا چلانے والا کوئی تھا ہی نہیں۔ تو ثابت ہو گیا کہ اسلام تلوار سے نہیں پھیلا۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ جہاد مدینہ میں آکر شروع ہوا اور اہل مدینہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے ہی زیادہ تر مسلمان ہو چکے تھے۔ آخر ان کو کس تلوار نے مسلمان کیا تھا اور مکہ میں جو کئی سو آدمی مسلمان ہوئے اور کفار کے ہاتھ سے اذیتیں برداشت کرتے رہے وہ کس تلوار سے مسلمان ہوئے تھے۔

پھر ہجرت مدینہ سے پہلے بعض صحابہ نے حبشہ کی طرف ہجرت کی ہے اور وہاں کفار قریش کے ساتھ مسلمانوں کا مناظرہ ہوا اور نجاشی شاہ حبشہ نے حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کی زبان سے قرآن سنکر بے تحاشا رونا شروع کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور قرآن کی حقانیت کی گواہی دی اور اسلام قبول کیا۔ اس پر کس کی تلوار چلی تھی۔ اسی طرح صدہا واقعات تاریخ میں موجود ہیں جن سے ثابت ہے کہ اسلام محض اپنی حقانیت سے پھیلا ہے۔ خصوصاً عرب کی قوم جو جنگ جوئی میں شہرۂ آفاق ہے وہ کبھی اور کسی طرح تلوار کے خوف سے اسلام قبول نہ کر سکتی تھی۔ ان کے نزدیک مرنا معمولی بات تھی مگر دب کر دین کا بدلنا سخت عیب تھا اور وہ ہرگز تلوار کے خوف سے اسلام نہیں لا سکتے تھے ۱۲ (جامع)

سببِ مشروعیتِ جہاد اس پر شاید یہ سوال ہو کہ پھر جہاد کس لیے مشروع ہوا؟ تو خوب سمجھ لو کہ جہاد حفاظت اسلام کے لیے مشروع ہوا ہے نہ کہ اشاعت اسلام کے لیے۔ اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ لوگ اس فرق کے نہ سمجھنے کی وجہ سے غلطی میں پڑے ہوئے ہیں۔ جہاد کی مثال آپریشن جیسی ہے کیونکہ مادے دو قسم کے ہوتے ہیں ایک متعدی ایک غیر متعدی۔ جو مادہ غیر متعدی ہوتا ہے اس کو تو محللات اور مرہم کے ذریعہ سے دبا دیا جاتا ہے۔ کبھی مرہم لگا دیا۔ مالش کر دی جس سے وہ دب گیا اور متعدی مادہ کے لیے آپریشن کیا جاتا ہے۔ اس کو چیر کر نکال دیا جاتا ہے۔ اسی طرح دشمنان اسلام دو طرح کے ہیں بعض تو وہ جن سے صلح کر لینی مناسب ہوتی ہے۔ وہ صلح کر کے مسلمانوں کو ستانا چھوڑ دیتے ہیں۔ ان سے تو صلح و مصالحت کر لی جاتی ہے۔ بعض ایسے موذی و مفسد ہوتے ہیں کہ صلح پر آمادہ نہیں ہوتے۔ یہ مادہ متعدیہ ہے۔ ان کے واسطے آپریشن کی ضرورت ہے اسی کا نام جہاد ہے۔ پس جہاد سے لوگوں کو مسلمان بنانا مقصود نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی حفاظت مقصود ہے۔

لوگ عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کو بدنام کرتے ہیں کہ انہوں نے ہندوؤں کو زبردستی مسلمان کیا ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ عالمگیر پابند شرع تھے۔ بارہ ہزار متن احادیث کے حافظ تھے۔ قرآن لکھ لکھ کر ہدیہ کر کے گذارا کرتے تھے اپنے خرچ میں خزانہ کا ایک پیسہ نہ لاتے تھے۔ ان کے سامنے لا اکراہ فی الدین کا حکم موجود تھا وہ اس کے خلاف[1]

[1] اوران کے متعلق ان تاریخوں کا بیان ہم پر حجت نہیں ہو سکتا جو بعض متعصب انگریزوں نے لکھی ہیں کیونکہ ہم تو مسلمانوں میں بھی ہر مورخ کو معتبر نہیں سمجھتے جب تک کہ وہ شرعی قواعد کے موافق ثقہ نہ ہو پھر مخالفین کی تاریخوں کو ہم کیسے حجت تسلیم کر سکتے ہیں۔ ایسی تاریخوں کا رد بعض مستقل رسالوں میں شائع بھی ہو گیا ہے ۱۲ جامع۔

کیونکر کر سکتے تھے۔ یہ تو پہلے واقعات تھے اُن سے قطع نظر کر کے میں پوچھتا ہوں کہ اچھا اسوقت جو لوگ ہندوستان میں اسلام لاتے ہیں وہ کیوں مسلمان ہوتے ہیں۔ ان پر کون سی تلوار کا زور ہے؟ یقیناً اس وقت کسی طرح بھی اُن پر زور نہیں ہے بلکہ ہر طرح آزادی ہے۔ نہ ہم ان کو کسی طرح کی طمع دلاتے ہیں۔ مسلمانوں کے پاس اتنا مال ہی نہیں جو وہ طمع دلا کر کسی کو مسلمان کریں بلکہ حالت یہ ہے کہ آج کل کوئی نو مسلم اسلام لایا تو کل کو اس سے بھی دینی کاموں میں چندہ مانگتے ہیں اور اگر کوئی شخص اسلام لاتے وقت ہم سے روپیہ کی درخواست کرے تو ہم صاف کہہ دیتے ہیں کہ تم اپنی نجات کے واسطے اسلام لاتے ہو تو لاؤ ورنہ ہم کو لالچ کے ساتھ مسلمان کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ جو دولت ہم تم کو دے رہے ہیں اس کے مقابلہ میں تو اگر تم خود ہی کو نذرانہ دو تو بجا ہے۔ لیکن باوجود اس آزادی اور استغناء کے پھر بھی بہت لوگ اسلام لاتے ہیں اور لا رہے ہیں اور اسلام لاتے ہی ان کی ایسی حالت ہوتی ہے کہ گویا بچھڑا ہوا محبوب ان کو مل گیا۔

ایک ہندو اسلام لانے کے بعد خدا کی محبت اور اس کی یاد میں اس قدر روتا تھا جس کا بیان نہیں اور کہتا تھا کہ مجھ کو تو اب معلوم ہوا کہ خدا کسے کہتے ہیں۔

غرض اس کی عجیب حالت تھی یہ ہیں محاسن اسلام جن کو میں نے مختصراً بیان

اختتام کر دیا ہے۔ یہ موٹی موٹی باتیں ہیں۔ ان کو تبلیغ کے وقت بیان کرو اور اگر کوئی فلسفی زیادہ الجھے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس بات کی ہم کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے یا حکم دیا ہے اور آپ خدا کے رسول ہیں اور آپ کی رسالت وصدق دلائل سے ثابت ہے۔ اگر تم کو حضور کی رسالت میں شبہ ہے تو ہم اس کو دلائل سے ثابت کر سکتے ہیں۔ جب آپ کی رسالت ثابت ہو جائے گی تو آپ کے سارے احکام کو تسلیم کرنا لازم ہوگا اور منجملہ اُن کے ایک یہ حکم ہے کہ حضور فرماتے ہیں کہ میرے دین سے سب ادیان منسوخ ہو گئے ہیں اب اسلام کے بغیر نجات نہیں ہو سکتی۔ پس فلسفیوں کو اس

سے زیادہ کچھ نہ کہا جائے ہاں اگر کوئی منصف ہو تو اس کے سامنے یہ محاسن بھی بیان کر دیئے جائیں۔ ایک بات آثار محاسن اسلام میں سے یہ ہے کہ ہر مذہب کا پورا اثر اس کے خواص متبعین میں ہوا کرتا ہے پس خواص اہل اسلام اہل اللہ اور علماء متقین کا موازنہ دوسرے مذاہب کے خواص سے کر لیا جائے اور ان کے پاس ایک دو ہفتہ رہ کر ان کی حالت کو دیکھا جائے۔ وثوق سے کہا جاتا ہے کہ انشاء اللہ خواص اہل اسلام تمام دنیا کے مذاہب کے خواص سے افضل ہوں گے۔ عبادت خداوندی، محبت الٰہی، ذکر و فکر خشیت و رغبت آخرت کا جو اثر ان میں نمایاں ہوگا کسی مذہب کے خواص میں ان کا پتہ بھی نہ ملے گا۔ اس وقت ظلمت و نور میں کھلا ہوا فرق نظر آئیگا۔ لو میں نے ایسی آسان صورت بتلادی جس سے ہر شخص حق و باطل میں امتیاز کر سکتا ہے۔ یہ ہیں محاسن اسلام ان کی تبلیغ کرو اور اس وعظ کا نام بھی مضامین کی مناسبت سے محاسن اسلام ہی رکھتا ہوں۔ اب ختم کرتا ہوں دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم عطا فرمائے اور مسلمانوں کو تبلیغ اسلام کی توفیق دے اور جو مسلمان فتنہ ارتداد میں گمراہ ہو گئے ہیں ان کو دوبارہ اسلام کی طرف ہدایت کر دے اور جن پر خطرہ ہو خدا ان کو اس بلا سے محفوظ رکھے۔ آمین وصلی اللہ علی سیدنا ومولٰنا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین ط۔

احسانُ الاِسلام

سے موسُوم

اِسلام کے منافع

یہ وعظ حضرت حکیم الاُمت تھانوی صاحبؒ نے جامع مسجد کانپور میں ۱۰ محرم الحرام سنہ ۱۳۳۳ھ بروز جمعہ کھڑے ہوکر بیان فرمایا جو دو ۲ گھنٹے پچاس منٹ تک جاری رہا۔ سامعین کی تعداد ایک ہزار تھی۔

مولوی احمد عبدالحلیم صاحب مرحوم نے قلمبند فرمایا۔

خُدا کی قسم، جس پہلو سے لو، نہایت راحت بخش اور مصالح کی رعایت کرنے والا مذہب ہے۔ میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں اس کی تعریف کر سکوں ۔

قلم بشکن، سیاہی ریز و کاغذ سوز و دم درکش
حسن ایں قصۂ عشق ست در دفتر نمی گنجد،

(از حکیم الامت حضرت تھانویؒ صاحب)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ و نؤمن بہ
و نتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا
و من سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل
لہ و من یضللہ فلا ھادی لہ و نشھد ان لا الہ
الا اللہ وحدہ لا شریک لہ و نشھد ان سیدنا
و مولانا محمدا عبدہ و رسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ
و علیٰ الہٖ و اصحابہٖ و بارک وسلم اما بعد فاعوذ
باللہ من الشیطن الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم٥
بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ
رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ٥

ہاں جو کوئی شخص بھی اپنا رُخ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا دے
اور وہ مخلص بھی ہو تو ایسے شخص کو اس کا عوض ملتا ہے، پروردگار
کے پاس پہنچ کر اور نہ ایسے لوگوں پر کوئی اندیشہ ہے اور
نہ ایسے لوگ مغموم ہونے والے ہیں۔

تمہید یہ ایک آیت ہے کہ جس کے اول میں رد ہے بعض مدعین کے ایک غلط دعوے کا اور بعد میں دلیل رد کے مقام پر ایک قاعدہ کلیہ کا ذکر کیا گیا ہے کہ اس میں حق تعالیٰ نے ایک نہایت ضروری مضمون ذکر فرمایا ہے جو جامع ہے۔ تمام مشرب و مسلک حق کا کہ جس کے بہت سے فروع (شاخیں شعبے) ہیں اور وہ ایسا ہے جس کے اہمال (مطلب چھوڑنا) سے ہم لوگوں کی تمام حالتیں تباہ و برباد ہو رہی ہیں جس کے اسباب مختلف عنوانوں سے بیان کیے جاتے ہیں مگر حقیقت میں اس تباہی و بربادی کا اصلی سبب اس قاعدہ کلیہ کا چھوڑ دینا ہے اس آیت میں اسی کا ذکر ہے ہر چند کہ رد اور قاعدہ کلیہ دونوں میں یہاں زیادہ فائدہ رد ہے مگر وہ قاعدہ کلیہ جو کہ رد کے لیے بھی کافی ہے اور نیز ہماری حالتوں کی اصلاح بھی اس سے وابستہ ہے چونکہ وہ متضمن (ضمن میں لینے والا) دو فائدہ کو ہے اس لیے اس وقت بیان میں وہ ہی زیادہ مقصود ہے اور وہ قاعدہ کلیہ کہ جس پر مدار ہے ہماری فلاح کا اور جس سے غافل رہنے کی وجہ سے ہماری خرابی اور تباہی بڑھتی جاتی ہے اور نہایت ضروری ہے وہ تعبیر میں تو بہت چھوٹی سی بات ہے مگر حقیقت میں بہت بڑی بات ہے اور اس امر ضروری کا نام جس کا تکفل رد مدلل اس قاعدہ نے کیا ہے حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق رکھنا ہے۔

اب ان لفظوں کی حقیقت پر جب تک زیادہ غور نہ کیا جاوے یہ سمجھ میں نہ آوے گا کہ ہم نے اس قاعدہ کو چھوڑ رکھا ہے اس واسطے کہ ہر شخص یہی جانتا ہے کہ ہمارا خدا سے تعلق ہے یہ تو ٹھیک ہے کہ ہمارا خدا سے تعلق ہے مگر یہ امر غور طلب ہے کہ آیا آپ کو خدا سے تعلق ہے یا خدا کو آپ سے تعلق ہے بس یہ ہے سمجھ لینے کی بات، سو اگر غور سے دیکھا جاتے تو معلوم ہو گا کہ خدا کو تو

ہم سے تعلق ہے اور ہمیں خدا سے تعلق نہیں ہے اور اس نے باوجودیکہ اس کے ذمہ واجب نہیں لازم نہیں مگر اتنے حقوق ادا کیے ہیں کہ ہم ان کا شمار و اندازہ بھی نہیں کر سکتے یہ محض تعلق اور رحمت ہے ورنہ ہمارا کیا حق اور کیا لزوم؟

مسلکِ اہلسنت: اہلسنت نے اس مسئلہ کی حقیقت کو خوب سمجھ لیا ہے کہ ہمارا کوئی حق خدا پر واجب نہیں جو کچھ وہ عطا فرمائے محض رحمت اور خالص عنایت ہے۔ معتزلہ نے اس مسئلہ میں اہل سنت کا خلاف کیا ہے خدا جانے کیا سمجھے کہ ہمارا حق خدا پر واجب ہے وجوب کا کوئی سبب کوئی علت ہونا چاہیے یہ بلا علت واجب کیسے ہو گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معتزلہ نے کچھ نہیں سمجھا اگر کوئی سبب یا علت ہو تو وہ بھی انہیں کی سے ہے پھر بھی ہم مستحق نہیں ہو سکتے وہ کہتے ہیں عبادت سے خدا پر جنت دینا واجب ہے اور وجوب عقلی کے قائل ہیں مگر انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ یہ سبب جو تراشا گیا ہے قطع نظر اس کے کہ یہ سبب بھی انہیں کا عطا کیا ہوا ہے اگر اس میں کچھ ظاہری سبب ہے تو اُس کا یہ اثر موقوف ہے اس کے مقبول ہونے پر سو مقبول ہونا تو درکنار غنیمت ہے کہ ان اعمال پر مواخذہ نہ ہو۔ لطیف المزاج شخص اندازہ کر لے کہ ایک بدسلیقہ خدمت گار ہے۔ پنکھا جھلتے وقت کبھی مار دیتا ہے کبھی کسی کاغذ کو پریشان کر دیتا ہے غرض ایک ادھم مچا رہا ہے اور آقا حلم و کرم سے معاف کر دیتا ہے تو کیا اس خدمت گار کا اپنی اس بیہودہ کارگذاری کو قابلِ انعام سمجھنا صحیح ہو گا ؎

خواجہ پندارد کہ دارد حاصلے | حاصلِ خواجہ بجز پندار نیست

(خواجہ سمجھتا ہے کہ اس کو کچھ حاصل ہے اس کو بجز پندار کے کچھ حاصل نہیں) وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں نے بڑی خدمت کی۔ ارے کمبخت کیا خدمت کی؟ یہ آقا

کا احسان ہے کہ وہ کرم کرتا ہے اور بڑی عنایت ہے کہ جرمانہ نہیں کرتا، اسی طرح ہماری عبادت ہے کہ ہم اس کا پورا پورا حق تو کیا ادا کرتے کہ محال ہے مگر جتنا سنوار کر ہم کر سکتے ہیں وہ بھی تو نہیں کرتے۔

حضورِ قلب کی حقیقت

کیوں صاحبو! کیا اپنی نماز کی حالت آپ درست نہیں کر سکتے؟ کیا آپ قادر نہیں خشوع وحضور قلب پر؟ اگر کوئی کہے کہ ہم تو قادر نہیں تو ہم کہیں گے تم حضورِ قلب کی حقیقت ہی نہیں جانتے۔ حضورِ قلب کی حقیقت یہ ہے کہ نماز پڑھتے وقت بارادہ خیال رہے کہ میں نماز پڑھ رہا ہوں کیا صاحبو! یہ آپ سے نہیں ہو سکتا باقی خیالات اور وساوس کا بند کرنا حضورِ قلب نہیں ہے بلکہ یہ سمجھنا ہی غلطی ہے کیونکہ یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ خیالات کو روکنا اختیار سے باہر ہے اگر حضورِ قلب کی یہ حقیقت ہوتی اس سے ایک عقیدہ کی خرابی ہوگی کہ یہ تو ہمارے اختیار سے باہر اور پھر ہم اس کے مکلف تو گویا ہم کو ایسی چیز کی تکلیف دی گئی کہ ہمارے قدرت سے باہر ہے اور یہ سراسر خلاف ہے۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا کے کسی ایسی بات کا خدا نے حکم نہیں کیا جو قدرت سے خارج ہو، سو اگر حضور قلب کے ایسے معنی ہیں جو قدرت سے خارج ہے تو اس کا مامور بہ ہونا اس آیت کے معارض ہوگا پس حضور قلب کی حقیقت اتنی ہے کہ اس قدر متوجہ رہو کہ میں کیا کر رہا ہوں، پھر اگر اس خیال کے ساتھ اور خیال بھی آویں تو آنے دو آپ کا کام یہ ہے کہ کشتی کی سیدھ باندھیے باقی موجوں کا روکنا کشتی بان کا کام نہیں بلکہ اگر وہ اس کی کوشش بھی کرے تو کشتی کا ساحل پر پہنچنا تو درکنار سلامتی بھی دشوار ہے اس طرح خیالات و وساوس امواج ہیں یہ قیامت تک بند نہیں ہو سکتے آتے ہیں آنے دیجئے امواج کشتی کی رفتار کو روکتی ہیں مگر کھڑا

نہیں کر سکتیں۔ اسی طرح خیالات و وساوس آتے ہیں آنے دیجئے یہ حضورِ قلب کے منافی نہیں۔ بس آپ کا کام اتنا ہی ہے کہ آپ برابر یہ خیال رکھئے کہ نماز پڑھ رہا ہوں اب سبحان ربی العظیم کہہ رہا ہوں۔ اب سُبحانَ ربی الاعلیٰ کہہ رہا ہوں غرض جو فعل کیجئے اپنے قصد اور اپنے ارادہ سے کیجئے اس طرح نہیں کہ گھڑی میں ایک دفعہ کوک دیدی اب وہ برابر چل رہی ہے ہماری کوک تکبیر تحریمہ ہے ادھر تکبیر تحریمہ کہی اور بس بے فکر ہو گئے اب تمام حساب و کتاب اور تمام معاملات نماز ہی میں طے ہو رہے ہیں ان حرکات کی عادت اور مشق ہو گئی ہے اس لیے جب رکوع کا وقت آتا ہے خود بخود رکوع ہو جاتا ہے۔ جب سجدہ کا وقت آتا ہے تو خود بخود سجدہ ہو جاتا ہے اس میں ہمارے قصد کو دخل ہی نہیں ہوتا۔

حضورِ قلب کی ایک نہایت آسان مثال ہے وہ یہ ہے کہ کسی حافظ صاحب کو کوئی سورت کچی ہو اور تراویح میں سنانا ہو تو وہ کیا کریں گے یہ کریں گے کہ دن بھر دیکھنے کے بعد رات کو جس وقت وہ سورت آئے گی برابر سوچتا رہے گا کہ ان ان مقام پر قال فرعون آیا ہے اور ان ان مقام پر قال موسیٰ آیا ہے غرض برابر دھیان اپنے پڑھنے کی طرف رہے گا اور خیالات بھی آتے رہیں گے یہاں تک کہ اول سے آخر تک وہ سورت سنا دے گا۔ تو جیسی توجہ حافظ صاحب کو اس کچی سورت سنانے کے وقت ہوتی ہے بس یہی حضورِ قلب ہے۔ اگر حضورِ قلب قدرت سے خارج ہے تو حافظ صاحب کو کیونکر ہوا؟ اس سے معلوم ہوا کہ قدرت سے خارج نہیں۔ اور یہ سخت غلطی ہے کہ قدرت سے خارج سمجھ لیا ہے اور عوام کیا بہت سے اہلِ علم بھی ایسا ہی سمجھ رہے ہیں۔ ان حضرات کو ساری وجہ غلطی کی یہ ہے کہ ہمارے درس میں کوئی کتاب

ایسی نہیں جس میں یہ حقائق مذکور ہوں۔ بس حکایتیں دیکھ لیں سُن لیں کہ نماز میں تیر لگا اور خبر نہ ہوئی اور اسی کو حضور قلب سمجھ گئے حالانکہ یہ ایک طرح کی حالت ہے وہبی اور حضورِ قلب وہی ہے جو میں نے بیان کیا۔

حضورِ قلب اختیاری ہے

اس تقریر سے حضورِ قلب کی حقیقت اچھی طرح سمجھ میں آگئی ہوگی خصوصاً اس مثال سے تو کوئی شبہ باقی نہ رہا ہوگا جو بات دفتر سے حل نہ ہوتی وُہ اس مثال سے واضح ہوگئی۔ جب حقیقت اس کی یہ ہے تو اختیاری ہے چنانچہ قرآن میں جہاں بھولنے کا شبہ ہو ہر شخص سوچ سوچ کر پڑھتا ہے چنانچہ حافظ جی رات کو غوطہ کھاکے سورۃ ختم کرتے ہیں تو ان کو حضورِ قلب کیسے حاصل ہوتا ہے، معلوم ہوتا ہے اختیار میں ہے جب تو حاصل ہوجاتا ہے اب بتائیے کہ آپ نماز میں کتنا حضور قلب کرتے ہیں پورا تو کیا جتنا کر سکتے ہیں اتنا بھی نہیں کرتے اور اگر پورا پورا کر بھی لیا تو بھی خدا پر کوئی حق ہمارا نہیں ہوا۔ اس واسطے کہ یہ کیفیت جو میسر ہوئی کدھر سے میسر ہوئی یہ بھی تو انہیں کا عطیہ ہے۔

نیاوردم از خانہ چیزے نخست تو دادی ہمہ چیز دمن چیز تست

(میں اپنے گھر سے کوئی چیز نہیں لایا یہ سب آپ کا عطیہ ہے میری کیا حقیقت ہے) تو جب نماز بھی خدا کی پھر اس سے ہمارا حق جنت میں کدھر سے ہوگیا۔ اس کی تو ایسی مثال ہے کہ کسی نے کسی کو ایک برتن دے دیا اب وہ شخص یہ سمجھے کہ برتن دینے والا قرضدار ہوگیا کیونکہ اس نے برتن دیا ہے تو کھانا بھی اس کے ذمہ قرض ہوگیا اور اس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی کہے کہ کُرتے کا بھی میں ہی مستحق ہوں کہ آپ کا دیا ہوا پاجامہ پہنے ہوں۔ بہر حال یہ سب انہیں

کا ہے پھر ہمارا کیا استحقاق ہے جو نماز ہم پڑھتے ہیں وہ بھی خدا ہی نے ہمیں دی ہے تو بس کیا اس سے خدا ہمارا قرضدار ہو گیا۔ خدا تعالیٰ نے اہلسنت کو اس غلطی سے محفوظ رکھا ہے اس واسطے کہ جن اسباب میں استحقاق کی صلاحیت ہے وہ سب بھی تو انہیں کے ہیں کوئی شخص اپنے غلام کو سرمایہ دیتا ہے کہ یہ لے کر تجارت کرو اس میں جو نفع ہو آدھا ہمارا آدھا تمہارا اور سرمایہ سب ہمارا یہ محض لیاقت و سلیقہ سکھلانے کے لیے ایسا کرتا ہے کہ کسی طرح غلام کو اس لالچ میں تجارت آ جاوے ورنہ سارا نفع و سرمایہ آقا ہی کا ہے۔ اسی طرح ہم نے جو نماز روزہ کیا اس کی توفیق ہمیں انہیں نے دی' نفع بھی اُن کا 'سرمایہ بھی اُن کا مگر ہمارے خوش کرنے کو کہہ دیا کہ تمہارا ہے۔

حق تعالیٰ کی رعایتیں

بہرحال خدا پر کسی کا حق نہیں مگر اس پر بھی کیا رعایتیں کی ہیں کہ آپ اہل حقوق کی بھی اتنی رعایت نہیں کر سکتے غرض ان کے ذمہ تو کوئی حق نہ تھا اور وہ دے رہے ہیں۔ اور آپ پر ان کے بیشمار حقوق ہیں اور پھر بھی آپ ان کی عظمت کے موافق تو کیا اتنا بھی نہیں کرتے جتنا اپنے مجازی آقا کا کرتے ہیں۔ خدا کی طرف سے جو تنخواہ ہم کو ملتی ہے وہ اس قدر ہے کہ اندازہ نہیں ہو سکتا اور وہ تنخواہ کیا ہے ایک مثال سے سمجھئے۔ ایک شخص کے آنکھ نہیں ڈاکٹر کہتا ہے کہ کسی کی آنکھ نکال کر لگا دی جائے گی کسی غریب فاقہ زدہ سے کہا کہ پانچسو روپیہ لے لو ایک آنکھ بیچ ڈالو وہ کہتا ہے آنکھ بھلا اتنی کم قیمت میں بیچ ڈالوں بھلا کم از کم ایک لاکھ تو ایک کی قیمت ہو اگر ضرورت ہے تو ایک لاکھ میں اُس کی آنکھ لی جاتے گی اسی طرح تمام اعضائے بدن کی قیمت جوڑ لو تو کروڑوں روپیہ ہر وقت ہمارے پاس ہے تو یہ دولت تو ظاہری ہمارے پاس ہے۔

اور اگر دولت باطنی کو دیکھا جائے تو اس کی قیمت کی تو انتہا ہی نہیں ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ کسی نئے شہر میں گذر ہوا دن میں دیکھا کہ شہر پناہ کا پھاٹک بند ہے لوگوں سے دریافت کیا کیوں بند ہے معلوم ہوا کہ بادشاہ کا شکاری باز اُڑ گیا ہے تو بادشاہ نے شہر پناہ کے پھاٹک بند کرا دیئے ہیں تاکہ وہ باز شہر سے باہر نہ نکل جاوے۔ انھوں نے اپنے دل میں کہا کہ بھلا وہ پھاٹک سے کیوں جانے لگا اوپر سے اُڑ کر جا سکتا ہے بادشاہ بڑا ہی احمق ہے حق تعالیٰ سے ناز میں عرض کیا کہ ایسے احمق کو تو سلطنت دے دی اور ہم ایسے عاقل جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں یہ مقام ادلال و ناز کا ہوتا ہے اہلِ حال کو زیبا ہے اگر کوئی دوسرا اجرحں کرنے لگے تو دیکھو کبھی جوتیاں نہ لگ جائیں۔

جواب میں ارشاد ہوا کہ تمہاری عقل و تمیز اور فقر اس کو اور اس کی حماقت و سلطنت تم کو دے دوں تم راضی ہو پھر تو معذرت کرنے لگے کہ میں قیامت تک بھی اس کو گوارا نہ کروں گا۔

قیمت خود ہر دو عالم گفتہ | نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

تو اپنی قیمت دونوں جہان بیان کی ہے نرخ بڑھا کہ ابھی تک ارزانی ہے یہ انسان کی قیمت ہے پھر کہتا ہے میں مفلس ہوں۔ افسوس تم نے اپنی قدر و قیمت خود نہیں سمجھی اُدھر سے تو اس قدر عطا ہے کہ جس کا حد و حساب نہیں ان تنخواہوں کے بعد اگر اوسط لگاتے تو ادنیٰ درجہ ایک لاکھ ماہوار تو ضرور پڑتا ہے تو جب حق تعالیٰ ایک لاکھ ماہوار دیتے ہیں اور دوسرا پچاس روپے ماہوار دیتا ہے تو جو نسبت تنخواہ دل میں ہے وہی نسبت حقوق کے ادا کرنے میں ہونا چاہیئے اب آپ ہی دیکھ لیجئے کہ آپ آقا کے مقابلہ میں خدا تعالیٰ کے حقوق کتنے ادا کرتے ہیں آقا کے برابر تو کیا اس سے دسواں بیسواں حصہ بھی تو ادا نہیں کرتے اور حقوق

جانے دیجیے ذرا سا فرض یہ نماز ہے ایک منٹ میں ایک رکعت بخوبی ہو جاتی ہے شب و روز کے فرض و واجب کی بیس رکعتیں ہوتی ہیں اور سنن کی بارہ رکعتیں ہیں سب ملا کر بتیس ہوتی ہیں جن میں بتیس منٹ صرف ہوتے ہیں وضو کرنے میں جو وقت صرف ہوتا ہے وہ قابلِ شمار نہیں حضرت منہ ہاتھ دھونا اس میں اللہ میاں پر کیا احسان؟ وہ تو بے نمازی بھی دھوتے ہیں۔

اگر کوئی کہے کہ ہم یوں منہ ہاتھ نہ دھوتے محض وضو کی وجہ سے دھو لیتے ہیں تو ایسے منحوس سے ہمارا خطاب نہیں ہم نے ایسے بھی دیکھے کہ مہینوں منہ ہاتھ نہیں دھوتے کسی روز حاکم آگیا تو منہ ہاتھ دھو لیا تو ایسے منحوسوں سے خطاب کون کرے بہر حال وضو میں تو اپنی بشاشت ہے صفائی اور تبرید اعضا کے خیال سے یوں بھی منہ ہاتھ پاؤں دھوتے ہیں تو وضو میں تو کوئی کلفت ہی نہیں جو اس کو شمار کیا جاوے ہاں اگر مصیبت ہے تو نماز میں خود حق تعالیٰ بھی فرماتے ہیں وَ اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (اور بیشک نماز دشوار ضرور ہے مگر جن کے قلوب میں خشوع ہے ان پر کچھ دشوار نہیں وہ خاشعین وہ لوگ ہیں جو خیال رکھتے ہیں اس کا کہ بیشک ملنے والے ہیں اپنے رب سے اور بیشک وہ اپنے رب کی طرف جانے والے ہیں۔) یعنی نماز گراں ہے کہ ہفتوں نہیں لو لو نہیں یہ نہیں کہ کدھر چاہو منہ کر کے کھڑے ہو گئے ایک ہی طرف منہ کیے کھڑے رہو ان کی وجہ سے کلفت ہے تو بہر حال شب و روز میں بتیس منٹ یعنی چوبیس گھنٹہ میں تقریباً آدھ گھنٹہ کیا بہت ہے اور اگر کوئی بڑا ہی خاشع خاضع ہوا تو خیر بہت سے بہت ایک گھنٹہ صرف ہو گا۔ ہاں اگر امامت کریں گے تو بیشک بغیر سورۃ بقر کے نماز ہی نہ ہو گی ورنہ اپنی نماز تو اِنَّا اَعْطَيْنَا اور قُلْ هُوَ اللّٰهُ ہی سے ہمیشہ ہوا کرتی ہے

اگر کہیں یہ حکم ہوتا کہ بغیر سورۂ بقرہ کے نماز ہی نہیں ہوگی شاید یہ لوگ تو نماز ہی نہ پڑھتے مگر ایسا حکم تو ہوا نہیں بلکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا تو یہاں تک مذہب ہے کہ ایک آیت سے فرض اور ایک آیت طویل یا تین آیت قصیر اور سورۂ فاتحہ سے واجب ادا ہو جاتا ہے، مثلاً سورۂ فاتحہ کے بعد مُدْهَامَّتَانِ پڑھ لیا فرض نماز ہوگئی ممکن ہے کہ کوئی صاحب ہمت ایسا ہی کرنے لگیں کہ بس مُدْهَامَّتَانِ پڑھ لیا نماز تو ہو ہی جاوے گی ایک منٹ میں آٹھ رکعتیں پڑھ ڈالیں تو حضرت فرض تو ادا ہو جاوے گا لیکن واجب تو رہ جاوے گا اسی طرح تعدیل بھی واجب ہے اور آئمہ تو فرض کہتے ہیں یہ امام صاحب ہی کا مذہب ہے اور امام صاحبؒ نے اس قدر سہولت اپنے لیے نہیں کی یہ ساری سہولت ہمارے آپ کے لیے کی تھی وہ خود تو اس قدر نماز پڑھتے تھے کہ مدتوں عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھی ہے تو یہ سہولت ہمارے واسطے ہے تاکہ کوئی بے نمازی نمازی بننا چاہے تو اسے تنگی نہ ہو تو یہی ہماری نماز جو آدھ گھنٹہ میں سب فرض سنتیں ہو جاتی ہیں اور جو ہم میں خاشع خاضع ہیں ان کو ایک گھنٹہ کافی ہے خیال تو کیجئے اتنی بڑی تنخواہ اور کارگذاری کتنی مختصر کہ چوبیس گھنٹہ میں آدھ گھنٹہ اور ساڑھے تیئس گھنٹہ میں عام اجازت ہے بجز گناہ کے جو چاہے کیجئے اور اس پر بھی بعضے وہ ہیں جو کچھ نہیں کرتے اور بعضے ان سے بڑھ کر ہیں کہ خود بھی نہیں کرتے اور اوروں کو بھی نہیں کرنے دیتے۔

اس پر ایک حکایت یاد آگئی بلوہ کے زمانہ کا قصہ ہے کہ جہاں لاشیں پڑی تھیں ایک شخص زخمی تھا زخم اتنا کاری تھا کہ اٹھ کر جا نہیں سکتا تھا۔، اتفاقاً کسی ضرورت سے ایک بنیے کا ادھر گذر ہوا اس شخص نے آہٹ پاکر ضعیف آواز سے پکارا بنیا اس آواز سے ڈرا کہ مردہ کہاں بولنے لگا اس نے کہا

ڈرو نہیں میں زخمی ہو گیا ہوں چل نہیں سکتا ہوں تم ذرا ادھر آؤ بنئے نے کہا ہم نہیں آتے اس نے پھر کہا بھائی ذرا ادھر تو آؤ میری کمر میں ایک ہمیانی بندھی ہوتی ہے ایک ہزار روپیہ ہے میں مر جاؤں گا یہ ضائع ہو جاوے گا تم اسے کھول لے جاؤ تمہارے ہی کام آوے گا اب تو لالہ کے منہ میں پانی بھر آیا اس کی طرف بڑھے ڈرتے ڈرتے جب قریب پہنچے تو اس نے ٹانگ پر ایک تلوار رسید کی اور کہا کہ میاں روپیہ کہاں یہاں رات بھر اکیلے جی گھبراتا ہے میں نے خیال کیا کہ کسی آدمی کو پاس رکھنا چاہئے اس لیے تو کون رہتا، اس ترکیب سے تم کو پاس رکھوں گا بنیا گر پڑا اور بڑا ناخوش ہوا اور غصہ میں کہنے لگا کہ مسخرا نہ آپ چلے نہ اوروں کو چلنے دے تو آج کل بھی یہی حالت ہے کہ دین پر نہ آپ چلیں نہ اور کو چلنے دیں۔

دین اور معاش، اگر کوئی بندۂ خدا تمام مصلحت پر خاک ڈال کر اس شعر کے مضمون کا حامل ہو بھی گیا ہے

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار بگذارند وہمہ طرۂ یارے گیرند

(یعنی بڑی مصلحت یہی ہے کہ سب کو چھوڑ کر بس ایک ہی کو سب دوست لے لیں)

اور خدا کی راہ پر لگ گیا تو وہ ان کے زعم میں پاگل ہو گیا وہ ان کے نزدیک، معاش سے محروم ہو گیا حالانکہ دیندار لوگ باوجود کم ہنری کے بھی کھانے پہننے میں ان ہنر مند دنیا داروں سے اچھے پڑے رہتے ہیں۔ ہمارے یہاں ایک بزرگ تھے انہوں نے ایک عجیب لطیفہ کہا تھا کہ علم دنیا تو جب تک خاص مقدار پر نہ ہو کام نہیں آتا مثلاً بی اے ایف اے ہو تو نوکری ملے یا اس سے گھٹیا ہو تو انٹرنس ہو اور مڈل کا بالکل ذلیل درجہ ہے پھر اس مقدار تک پہنچنا موہوم خصوصاً آج کل کی عمریں تھوڑی ہوتی ہیں پھر یہ بھی احتمال ہے خدا جانے برابر

پاس ہوتے رہیں گے یا فیل ہوں گے مگر یہ اپنے فعل سے باز نہیں آتے خواہ نیک فعل ہو یا بد فعل سب اسی میں مبتلا ہیں اور نوکری کو بزبان حال کہہ رہے ہیں۔ تا توسن می رسی من بخدا می رسم (جب تک تو میرے پاس پہنچتی ہے میں خدا کے پاس پہنچتا ہوں) یہ تو علم معاش کی حالت ہے اور علم دین وہ چیز ہے کہ اس کی کوئی مقدار بھی بیکار نہیں آخرت میں بھی اور دنیا میں بھی چنانچہ اس کے حاصل کرنے والے کے لیے کھانا کپڑا سب ہی کچھ مہیا ہو جاتا ہے علم دین اگرچہ معاش کے لیے ہے ہی نہیں لیکن اگر کسی کو اس سے معاش ہی حاصل کرنا ہو تو اس میں جو بالکل ادنیٰ درجہ کی مقدار ہے کہ اذان یاد کرلے جو کہ پانچ منٹ میں یاد ہوتی ہے تو اس میں بھی تو روٹیوں کی کمی نہیں گو کانپور میں نہیں ملیں گی مگر کسی گاؤں میں چلا جاوے وہاں کسی مسجد میں اذان کہنا اور جھاڑو دینا شروع کر دے دو چار دن میں روٹیاں ضرور ہی مقرر ہو جاویں گی اور علم معاش میں اوّل تو ادنیٰ درجہ کے لیے بھی کئی برس چاہئیں اور پھر بھی نوکری ملنا موہوم ہے۔

علاوہ اس کے ایک تفاوت اور ہے وہ یہ کہ ظاہر ہے کہ ہر مسلمان مخاطب ہے ایمان بالتقدیر کا تو اب میں پوچھتا ہوں کہ آیا تقدیر کے مسئلہ پر ایمان ہے یا نہیں اگر نہیں ہے تو تجدید لا نے سے کام کرنا اسلام کی ضرورت ہے کہ ایسا شخص خارج از اسلام ہے اور اگر ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ بی اے ایم اے پاس کرنے پر بھی قسمت سے زیادہ نہیں ملے گا پھر کس خرافات میں مبتلا ہوتے ہو۔

اور اگر یہ کہا جاتے کہ بیشک تقدیر پر ایمان ہے مگر تقدیر کے ساتھ تدبیر بھی تو شرط ہے تو ہم کہیں گے کہ ہاں شرط ہونا مسلم مگر علت تو نہیں ہے

باقی شرط اور علت میں کیا فرق ہے سو فرق یہ ہے کہ علت پر تو معلول (علت کیا گیا جس کا کوئی سبب نہ ہو) کا مرتب ہونا واجب ہے اور شرط پر مشروط (شرط کیا گیا) کا مرتب ہونا واجب نہیں ہاں مشروط کے لیے شرط کا ہونا واجب ہے تو اگر تدبیر علت ہوتی تو ہم ہر تدبیر کرنے والے کو ضرور کامیاب پاتے ہم ایک شخص کو دیکھتے ہیں اپنی معمولی لیاقت سے بہت کچھ کمارہا ہے اور ایک دوسرا شخص ہے کہ اس کی دونی لیاقت ہے مگر کماتا اس سے آدھا بھی نہیں اس سے صاف معلوم ہوا کہ علت نہیں ورنہ معلول کا اس سے انفکاک نہ ہوتا۔

اب میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ شرط بھی نہیں اگر شرط ہے تو مطلق تدبیر ہے نہ کہ خاص بی اے اور ایم اے بنا بس اتنا ضروری ہے کہ کوئی بہانہ ہو البتہ اس کا ہم انکار نہیں کرتے کہ کسی بہانہ میں کم ملے گا کسی میں زیادہ، لیکن یہ کمی بیشی ذرائع میں ہے باقی مقصود ممکن ہے کہ کم ذرائع والا مقصود میں زیادہ کامیاب ہو اور زیادہ ذرائع والا مقصود میں کم رہے۔ ایک نواب صاحب کی حکایت ہے کہ صرف دو تولہ گوشت کا قلیا بجائے غذا کے کپڑے میں پوٹلی بنا کر چوسا کرتے تھے انہوں نے ایک بار ایک لکڑہارے کو دیکھا کہ وہ دوپہر کے وقت سایہ میں پہنچ کر بوجھ پھینکا ایک روٹ کپڑے میں سے کھولا اور ایک گٹھی پیاز کے ساتھ کھا کر وہیں لیٹ کر خراٹے لینے لگا نواب صاحب کہتے تھے کہ میں راضی ہوں کہ میری نوابی لے لے اور اس کی صحت مجھے دے دی جائے تو دیکھئے کثیر الذرائع شخص ان ذرائع کو مقصود سے بدلنے پر رضامند ہو رہا ہے اور اگر یہ باتیں سمجھ میں نہیں آتیں تو خیر خود ہی مبتلا رہو مگر دوسروں کی کیوں راہ مارتے ہو یہی غنیمت سمجھو کہ ہم تمہیں عربی پڑھنے کو نہیں کہتے آپ کو

عربی خوانوں کی ہمدردی کا بڑا جوش ہے کہ یہ بھی انگریزی پڑھیں اور تعجب ہے کہ کیوں انگریزی نہیں پڑھتے اور اس کا سبب کم ہمتی قرار دیتے ہیں میں کہتا ہوں آج کل عربی پڑھنا بڑی عالی ہمتی کی بات ہے کیوں کہ عربی کی آج کل سخت ناقدری ہے اور بظاہر کوئی دنیوی غرض بھی اس سے پوری نہیں ہو سکتی پھر بھی جو لوگ یہ کام کرتے ہیں وہ اعلیٰ درجہ کے عالی ہمت اور ولی ہیں کہ رضا اور قرب حق کے لیے وہ اپنی دنیا چھوڑے ہوتے اور ہر قسم کے طعن و تشنیع سننے کے لیے آمادہ ہیں تو ان کی قدر کرنا چاہیے نہ کہ تحقیر۔

ضرورتِ علما

"علاوہ اس کے میں ان حضرات مصلحین سے حیثیت اسلام سے پوچھتا ہوں کہ آیا علمائ کا قوم کے لیے ہونا ضروری ہے یا نہیں، اگر نہیں ہے تو اس کا قائل ہونا پڑے گا پھر اسلام کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ بدون علمائ کے اسلام قائم نہیں رہ سکتا کیونکہ کوئی پیشہ بدون اس کے ماہرین کے چل نہیں سکتا یہ اور بات ہے کہ تھوڑی بہت معلومات دینی سب کو ہو جائیں اور اس سے وہ محدود وقت تک کچھ ضرورت رفع کر لیا کریں مگر اس سے اس مقدارِ ضرورت کا بھی بقا نہیں ہو سکتا بقا کسی شے کا ہمیشہ اس کے ماہرین سے ہوتا ہے تو ماہرین علما کی ضرورت ٹھہری۔

پھر یہ ماہرین کیسے پیدا ہوں ؟ سو تجربہ سے اس کی صرف یہی صورت ہے کہ ساری قوم پر واجب ہے کہ چندہ سے کچھ سرمایہ جمع کر کے علما کی خدمت کر کے آئندہ نسل کو علوم دینیہ پڑھائیں اور برابر یہی سلسلہ جاری رکھیں سو عقلاً تو یہ بات واجب تھی کہ ساری قوم اس کی کفیل ہوتی مگر ایک طالب علم بیچارہ نے

اپنا ذہن آپ پر سے معاف کیا اور اپنے ہی اوپر مصیبت جھیل کے تحصیل علوم دینیہ میں مشغول ہوا تو چاہیے تو یہ تھا کہ آپ اس کی قدر کرتے بجائے اس کے اور رہزنی کرتے ہیں کہ عربی پڑھو گے تو کھاؤ گے کیا؟ کیا مسجد کے مینڈھے بنو گے ہاں صاحب دنیا کا کتا بننے سے اچھا ہے۔

ریاست رامپور میں ایک نے دوسرے کے بچہ کو انگریزی پڑھانے کی رائے دی اس نے کہا کہ قرآن شریف ختم ہو جاوے تو پڑھاؤں گا اور معلوم ہوا کہ دو سال میں نصف ہو چکا ہے نصف باقی ہے تو وہ صاحب کیا فرماتے ہیں کہ دو سال تو ضائع گئے اور دو سال کیوں ضائع کرتے ہو؟ یہ حالت رہ گئی ہے مسلمانوں کی یہ کیا اسلام ہے إِنَّا لله چاہیے تو یہ تھا کہ اگر کوئی تحصیل علوم دینیہ کی طرف توجہ نہ کرتا تو تمام قوم کا فرض تھا کہ خوشامد کر کے کچھ لوگ اس کے لیے تیار کرتے افسوس اب تو کیفیت یہ ہے کہ خود تو کیا تیار کرتے دوسروں کو تیار ہونے سے روکتے ہیں یہ سب علامات اس کی ہیں کہ آپ کو خدا سے تعلق نہیں رہا۔

خدا کو بندہ سے تعلق

ہاں خدا کو البتہ تم سے تعلق ہے اپنے دلوں کو ٹٹول لو تمہیں خود معلوم ہو جاوے گا کہ خدا سے تعلق نہیں رہا۔ خدا کو آپ سے تعلق ہونے کی دلیل ایک تو ان کے انعامات ہی ہیں۔

دوسرے ایک جگہ ارشاد بھی ہے وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (میں اس کی طرف شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہوں) اور خدا کا قرب بھی قرب علمی و قرب رحمت ہے اور اَنْتُمْ اَقْرَبُ اِلَيْنَا (تم ہماری طرف زیادہ قریب ہو) نہیں فرمایا۔ اگر کوئی کہے کہ قرب و بعد تو امور نسبیہ متکررہ

مشترکہ میں سے ہیں یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ انہیں ہم سے قرب ہو اور ہمیں ان سے بُعد ہو۔

جواب یہ ہے کہ قرب حسی بالمعنے اللغوی بیشک ایسا ہی ہے اور یہاں تو قرب بمعنے توجہ کے ہے سو خدا کا قرب الی العبد من حیث التوجہ قرب عبد الی اللہ من حیث خدا کا قرب بندہ کی طرف باعتبار توجہ کے بندہ کا قرب اللہ تعالیٰ کیطرف باعتبار توجہ کے التوجہ کو مستلزم نہیں بس وہ اشکال مرتفع ہو گیا خلاصہ یہ ہوا کہ وہ تو ہم سے قریب ہیں یعنی متوجہ ہیں اور ہم ان سے بعید ہیں یعنی ہمیں انکی طرف توجہ نہیں۔ بالکل قلب موضوع ہے جوان کو حق پہنچتا تھا ہم نے کر رکھا ہے جو ہمیں زیبا بلکہ ضروری اور فرض تھا وہ انہوں نے کر رکھا ہے اور اگر ہم میں سے کسی کو توجہ بھی ہے تب بھی اگر بے تعلقی نہیں تو کم تعلقی تو ضرور ہے پس مسلمانوں کی ساری خرابیوں کا حاصل یہ ہے اگر یہ دور ہو جاوے تو ہماری تمام حالتیں درست ہو جاویں اس واسطے کہ خدا تعالیٰ کی عادت مسلمانوں کے لیے یہ جاری ہے کہ ان کی دنیا ان کے دین کے ساتھ وابستہ ہے۔

رُوحِ دنیا

شاید کسی کو شبہ ہو کہ دیندار مسلمانوں کے پاس دنیا کم دیکھتے ہیں اور غیر دیندار مسلمانوں کے پاس زیادہ تو سمجھ لو کہ دنیا مال و دولت کا نام نہیں روح دنیا کچھ اور ہی ہے اور وہی دنیا سے مقصود ہے۔ پس دنیا درحقیقت وہ ہے اور وہ راحت قلب ہے چنانچہ اگر ایک شخص کے پاس ایک لاکھ روپیہ بھی ہو اور جائداد بھی ہو ہر طرح کا سامانِ عشرت بھی مہیا ہو اور اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی معلوم ہو کہ آج کے چوتھے روز مجھے پھانسی دے دی جاتے گی اب فرمایئے کہ کیا اسے اس دولت سے خوشی ہو گی؟ کیا اُسے اس سامانِ عشرت سے لُطف

میسّر ہوگا ؟ کیا اسے لذیذ کھانوں میں حظ آئے گا ؟ کیا اسے عالیشان کوٹھی میں راحت ملے گی ؟ کیا خاک راحت ملے گی کیا خاک لطف وحظ آئے گا اس وقت دنیا اس کی آنکھوں میں اندھیر ہوگی یہ سب کیوں محض اس لیے کہ اس کے قلب کو راحت میسّر نہیں اس سے معلوم ہوا کہ اصل اور روح دنیا کی راحت ہے محض مال و دولت سے کچھ نہیں ہوتا اور میں بقسم کہتا ہوں کہ حقیقی راحت اہل اللہ کو میسّر ہے اگر آپ کو یقین نہ آئے تو ان کے پاس رہ کر دیکھ لیجئے جس پر آپ کو رحم آرہا ہے کہ ہائے اس کے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں جوتا ٹوٹا ہوا ہے اگر یہ شخص دیندار ہے . . . . تو واللہ یہ شخص راحت میں ہے اور نافرمان امیر اس کے مقابلہ میں مصیبت میں ہے اور واقعی خدا کے نافرمانوں کو کسی وقت چین نہیں

معرفت و محبت

اور اس میں ایک راز ہے وہ یہ کہ حوادث انسان کے اختیار میں نہیں ہوتے ایک مقدمہ یہ ہوا دوسرا مقدمہ یہ کہ زیادہ حوادث طبیعت کے خلاف ہوتے ہیں پس جب ناگوار خلاف طبیعت امور پیش آتے رہیں گے تو چین کیوں کر میسّر ہوگا روپیہ بہت سے ہے مگر کیا کریں کہ کہیں نیند نہ آنے کی شکایت ہے کہیں معدہ کمزور ہے عمدہ غذا نہیں کھا سکتے کبھی زکام ہے کبھی پیچش ہے کبھی بخار ہے عالت غور کر کے دیکھئے تو آرام سے بیٹھنا میسّر نہیں ہوتا بیٹھے میں خبر آئی کہ بھانجا بیمار ہے یا بیٹے کو بخار ہے غرض زیادہ حوادث ایسے ہی ہوتے رہتے ہیں جو پریشان کرنے والے ہیں، تیسرا مقدمہ یہ کہ یہ نہیں ہوسکتا کہ واقعات رک جائیں یا خلاف طبع نہ رہیں اگر اس کی تدبیر کی کوئی صورت ہے تو صرف یہ ہے کہ مزاج کو ایسا کرلے کہ کوئی واقعہ خلافِ مزاج نہ ہے اور مزاج ایسا کس طرح ہوسکتا ہے . سو وہ ٹوٹے پھوٹے بوریوں میں اور تنگ و تاریک حجروں میں ہوسکتا ہے اللہ وہ کیا چیز ہے جو ان حجروں میں بیٹھنے سے ملتی ہے وہ محبت و معرفت ہے۔

اس کو ایک مثال سے سمجھئے اگر کوئی شخص کسی کو پیچھے سے ایک دھول مارے تو کتنا غصہ آوے گا۔ اتفاق سے یہی شخص کسی عورت پر فریفتہ ہوگیا۔ اس نے بھی ایسا ہی کیا جب تک اس کو دیکھا نہ تھا تغیر ہوا تھا مگر دیکھا تو محبوبہ ہے بس اس دھول پر نثار ہو جاوے گا کہ ایسی کہاں میری قسمت اور بزبان، حال کہے گا ؎

ناخوش تو خوش بود بر جان من — دل فدائے یار دل رنجان من

(تیری یعنی محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو وہ طبیعت کو ناگوار ہی کیوں نہ ہو مگر وہ میری جان پر خوش اور پسندیدہ ہے میں اپنے یار پر جو میری جان کو رنج دینے والا ہے اپنے دل کو قربان کرتا ہوں) بھلا اس کے ہاتھ سے تو بڑی بات ہے محبوب کے معاملہ میں جو تکلیف پیش آتی ہے وہ تک ناگوار نہیں ہوتی ایک شخص کو کسی کے عشق میں اسکے ورثہ نے سو کوڑے مارے ننانوے میں تو ہنستا رہا اور اخیر کے ایک کوڑے میں رو دیا لوگوں نے پوچھا کہ کیا بات ہے اس نے کہا کہ ننانوے میں تو میرا محبوب بھی شریک تماشہ تھا اور اخیر کے چابک میں وہ چلا گیا تھا ؎

بجرم عشق توام میکشند غوغائیست — تو نیز بر سر بام آکہ خوش تماشائے است

(تیرے عشق کے جرم میں تکلیف اٹھا رہے ہیں اور شور مچا رہے ہیں تو بھی کوٹھے پر آ بہت اچھا تماشا ہے۔)
یہ درخواست کہ تو نیز بر سر بام آ اسی واسطے ہے کہ خیال محبوب کے دیکھنے سے بھی تکلیف کی ناگواری جاتی رہتی ہے اسکی تائید قرآن مجید سے بھی ہوتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کیلئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا کہ آپ قضا و قدر کے حکم پر صبر کیجئے کیونکہ آپ ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ ہم آپ کو دیکھ رہے ہیں ؎

ہمینم بس کہ داند ماہرویم — کہ من نیز از خریداران اویم

(مجھ کو یہی کافی ہے کہ میرا محبوب جانتا ہے کہ میں بھی اس کے خریداروں میں ہوں) بس عشق اور معرفت درد کو کھو دیتے ہیں، محبت و معرفت عجیب چیز ہے جو واقعہ محبوب کیطرف سے پیش آئے وہ ناگوار ہی نہیں ہوتا ع از محبت تلخہا شیریں شود (محبت سے تلخیاں بھی گوارا ہیں) غرض مزاج کو ایسا بنانیوالی چیز محبت و معرفت ہے، اسکا خاصہ ہے کہ قلب کے اندر نور پیدا ہو جاتا ہے کہ جس سے بجز محبوب کوئی چیز نظر ہی نہیں آتی اور یہ دو چیزیں ہیں ایک محبت ایک معرفت دونوں کی حقیقت الگ الگ ہے معرفت سے تو یہ بات پیدا ہو جاتی ہے کہ جو کچھ

ہوتا ہے اُدھر سے ہوتا ہے اور محبت لے سے خوشگوار بنا دیتی ہے معرفت کے باب میں شیخ فرماتے ہیں گلستان میں ہے

از خدا دان خلاف دشمن و دوست | کہ دل ہر دو در تصرف اوست

(دوست کی مہربانی اور دشمن کی دشمنی کو خدا کی طرف سے سمجھو کہ دونوں کے دل پر اسی کا تصرف ہے)

وریں نوعے از شرک پوشیدہ ہست | کہ زیدم بیازرد عمروم بخست

(اس میں بھی ایک قسم کا شرک ہے کہ زید نے مجھ کو آزردہ کیا اور عمرو نے زخمی کیا) یعنی زید و عمرو کی طرف منسوب کرنا بھی ایک قسم کا شرک ہے جب حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا پوچھا گیا ہمارے دربار میں کیا لائے اس سوال سے بہت شرم آئی کہ کیا عمل بتادوں کہ کیا لایا ہوں اپنے نزدیک بے غبار جواب سمجھ کے عرض کیا کہ توحید لایا ہوں کیوں کہ یہ تو ادنیٰ شرط اسلام ہے اس کے عرض کرنے میں کوئی دعویٰ نہیں ارشاد ہوا کہ اَمَا تَذکُرُ لَیْلَۃَ اللَّبَنِ وہ رات بھی یاد ہے جب کہا تھا کہ دودھ سے درد ہو گیا کیا منہ لیکر دعوے توحید کا کرتے ہو دودھ کو فاعل ٹھہرا چکے ہو کانپ اٹھے عرض کیا یا الٰہی سوائے اعتراف خطا و قصور کے اور کچھ نہیں لایا بس اس جرح میں رہ گئے یہی توحید ہے جو معرفت کے کامل ہونے سے کامل ہو جاتی ہے پھر تو یہ حالت ہو جاتی ہے

موحد چہ بر پائے ریزی زرش | چہ فولاد ہندی نہی بر سرش

امید و ہراسش نباشد ز کس | ہمیں ست بنیاد توحید و بس

(موحد اور عارف کے قدموں پر خواہ زر بکھیر دیا اس کے سر پر تلوار رکھو امید و خوف اس کو بجز خدا کے کسی سے نہیں ہوتا توحید کی بنیاد بس اسی پر ہے)

وجہ یہ کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ لوگ کر رہے ہیں کوئی اور ہی ان سے کرا رہا ہے

میں نے ایک صندوق دیکھا ایک دیہاتی بڑھئی بنا کر لایا تھا اس کے ڈھکنے کے اوپر لکڑی کی پتلیاں تھیں صندوق کے اندر اس کی مشین تھی ایک تار ہر پتلی میں لگا ہوا تھا جب کوک دی جاتی تھی تو سب پتلیاں حرکت کرنے لگتی، تھیں کوئی موسل سے کوٹتی تھی کوئی چھاج سے پھٹکتی تھی کوئی عورت چکی چلاتی تھی کوئی چرخہ کاتتی تھی ایک آرا چلا رہا تھا غرض جتنی پتلیاں اتنی حرکتیں اور ایک کنجی سے ساری حرکتیں ہوتی تھیں اسی طرح دنیا میں جو کچھ کرتے ہیں ان کی حرکت خود بخود نہیں ہے کسی اور نے وہ حرکت دے رکھی ہے جب عارف کی نظر تیز ہو جاتی ہے تو اسی تحریک کے مشاہدہ کے سبب زید و عمرو پر نظر نہیں پڑتی۔

اثرِ معرفت و محبّت

یہی وجہ ہے کہ بجائے اس کے کہ کسی پر غیظ آوے وہ حق تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ دوسرا تصرف فرما دے۔ حضرت سلطان ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ تارکِ سلطنت ہیں ایک مرتبہ جہاز میں سوار ہو گئے جہاز پر کسی امیر کے یہاں روزانہ نقلیں ہوا کرتی تھیں نقالوں نے ایک روز درخواست کی کہ اگر کوئی غریب آدمی میسر ہو جاوے تو اس سے دھول دھپا کریں اور نقل کا لطف بڑھے تمام جہاز میں کسی اور پر تو دست اندازی کی جرأت نہ ہوئی مگر حضرت ابراہیم بن ادھمؒ کو غریب سمجھ کر اس کام کے لیے منتخب کر کے لے گئے

ایں چنیں شیخے گدائے کو بکو　　　عشق آمد لا اُبالی فا تقوا

(ایسا فقیر صفت شیخ عشق میں بڑا لااُبالی ہے پس ڈرتے ہی رہو۔) غرض انہیں مجلس میں لے گئے ان پر یہ مشاہدہ غالب ہے کہ یہ لوگ خود نہیں کھینچ رہے ہیں ان سے کوئی اور ہی کھنچوا رہا ہے ہم انہیں کے ہیں وہ جس حالت میں رکھیں راضی ہیں

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو　　　دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(زندہ کریں آپ کی عطا ہے قتل کریں آپ پر فدا ہوں دل آپ پر مبتلا ہو گیا ہے جو تصرف کریں آپ سے راضی ہوں)

اب کوئی ڈھول لگا رہا ہے کوئی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ رہا ہے یہ اس طرح خاموش کہ گویا جس ہی نہیں جب دیر ہو گئی تو عادۃ اللہ ہے کہ

حلم حق با تو مواسا کند چونکہ از حد بگذری رسوا کند

(اللہ تعالیٰ کی بردباری تمہارے ساتھ مواسات یعنی رعایت کرتی ہے جب تمہاری گستاخیاں حد سے بڑھ جاتی ہیں تو رسوا کرتے ہیں۔) ایک دفعہ غیرت باری کو جوش آیا ارشاد ہوا اے ابراہیم ان کی گستاخی حد سے بڑھ گئی کہو تو سب کو غرق کر دوں یہ عرض کرتے ہیں کہ اے اللہ غرق کرنے کی جگہ ان کو آنکھیں ہی نہ دے دیجئے اور اس خرافات سے نکال ہی نہ لیجئے سبحان اللہ یہ ہے اتباعِ سُنّت۔ جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دندانِ مبارک شہید ہوا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم جناب باری میں عرض کرتے ہیں اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ اے اللہ میری قوم کو ہدایت کر دے کہ یہ جانتے نہیں۔ ملا دوپیازہ نے ایک الٰنامہ لکھا ہے اس میں لکھا ہے کہ الرسول خیر خواہِ دشمناں (رسول دشمنوں کا بھی خیر خواہ ہے) تو واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم خیر خواہ دشمناں ہی ہیں بہر حال حضرت ابراہیم بن ادھمؒ نے ان کا غرق ہونا گوارا نہ کیا تو یہ کیا بات ہے کیوں نہیں غیظ ہوتا یہ اثر معرفت کا ہے اسی پر شیخ شیرازی فرماتے ہیں

چہ خوش گفت بہلول فرخندہ خوئے چو بگذشت بر عارفِ جنگجوئے

گر ایں مدعی دوست بشناختے بہ پیکار دشمن نہ پرداختے

(بہلول مبارک خصلت نے کیا اچھی بات کہی جبکہ وہ لڑنے والے عارف پر گذرے اگر اس مدعی کو اللہ تعالیٰ کی معرفت ہوتی تو دشمن کے ساتھ لڑائی میں مشغول نہ ہوتا)

یعنی اگر اس کو دوست کی معرفت ہوتی تو دشمن سے لڑنے کی فرصت ہی نہ ہوتی اب معلوم ہوتا ہے کہ فرصت ہے یہ لڑائی اسے ہی زیبا ہے جسے دوست کا مشغلہ نہ ہو ورنہ ؎

دیدہ از دیدنش نگشتے سیر ۔۔۔ ہمچناں کز فرات مستسقی

(آنکھ اس (محبوب) کے دیکھنے سے سیر نہیں ہوتی جیسے جلندھر کا مریض نہر فرات کے پانی سے سیر نہیں ہوتا) کیا یہ تھوڑا کام ہے اسے فرصت کہاں مل سکتی ہے غرض یہ اثر تو معرفت کا ہے کہ یہ حادث واحد حقیقی کے تصرف سے ظاہر ہوا ہے اور زید و عمرو واسطہ محضہ ہیں۔

اور محبت سے یہ ہوتا ہے کہ اس واقعہ کی ناگواری اڑ جاتی ہے سو دونوں کی ضرورت ہے کیونکہ نری معرفت ہو اور محبت نہ ہو تو سب سے زیادہ دریائے ہلاکت میں ایسا عارف ہی ڈوبے گا مثلاً کوئی مر گیا تو عارف صاحب جانتے ہیں کہ خدا نے مارا طاعون نے نہیں مارا پس اگر محبت نہ ہونے کے سبب یہ واقعہ ناگوار ہو تو یہ عارف بجائے طاعون کے خدا کی شکایت کرے گا تو نری معرفت ہلاکت ہے یہ خدا کی رحمت ہے کہ اہل اللہ کی صحبت میں دونوں باتیں میسر ہو جاتی ہیں تو صحبت کے بعد جبکہ معرفت و محبت دونوں دولتیں عطا ہو گئیں تو اب جو واقعہ پیش آئے گا معرفت کے سبب خلق سے ناگواری نہ ہو گی اور محبت کے سبب خالق سے ناگواری نہ ہو گی چاہے کتنا ہی عظیم حادثہ ہو مگر یہ خوش ہیں کہ ؎

ہر چہ از دوست می رسد نیکوست

(جو کچھ دوست کی طرف سے پیش آئے وہ خیر ہی ہے) حقیقی آسائش اسے کہتے ہیں مصیبت سے اور لوگ گھبراتے ہیں اور یہ ہنستا ہے خوش ہوتا ہے

عارفین کے نزدیک حقیقتِ موت

ابھی اور رتو اور موت جو کہ تمام مصیبتوں کا میزان کل ہے اور جس سے سب لوگ گھبراتے ہیں حتیٰ کہ بعض سلاطین نے اپنے قلعہ میں مختصر دروازہ ایک لیے دروازہ کا نام رکھا تھا جس میں سے خاندانِ شاہی کے جنازوں کو نکالا جاتا تھا تو موت کا نام لینے سے گھبراتے تھے کسی لڑکی نے ایک بڑھیا کو کہا کہ مرتی بھی نہیں تو اس بڑھیا نے اپنی ایک ساتھن سے جا کر بطور شکایت کہا کہ سنا بھی کہ فلاں مجھ کو یوں کہتی تھی کہ لے بڑھیا تو یوں ہو جا پھر وہ بڑھیا کیا کہتی ہے اے اللہ میاں سنیو مت - کمبخت احمق اگر اللہ میاں یہ تیری سنیں گے تو وہ اس کی بھی سنیں گے ورنہ یہ کہاں سے سنیں گے تو موت سے بڑھیاں بھی گھبراتی ہیں غالباً مولانا جامیؒ نے لکھا ہے کہ ایک بڑھیا کی لڑکی جس کا نام مہستی تھا بہت بیمار تھی جب اس کی حالت زیادہ غیر ہوئی تو بڑھیا نے زور زور کے دعا کی کہ اے اللہ اسے اچھا کر دے اور اس کے بدلے مجھے موت دیدے - ایک دن شام کے وقت اس کی گائے کسی امیر کے باورچی خانہ میں جا گھسی اور ایک پتیلہ میں منہ ڈال دیا پھر نکال نہ سکی اسی ہیئت سے وہ اپنے گھر آگئی بڑھیا نے اس ہیئت سے کبھی اسکو دیکھا نہ تھا سمجھی کہ میری دعا قبول ہو گئی اب یہ عزرائیل آگئے بس گھبرا کے لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہتی ہے اے موت یہ ہے اسے لے جاؤ ؎

گفت اے موت من نہ مہستی ام پیر زال غریب محنتی ام ،

(کہا اے موت میں مہستی نہیں ہوں میں ایک غریب محنتی بڑھیا ہوں)

غرض لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگی دیکھ یہ ہے میں نہیں ہوں - موت کا نام آتے ہی بس بیٹی کی محبت فنا ہو گئی ، یہیں کانپور میں ایک عجیب و غریب واقعہ ہوا - ایک لڑکے کو سرسام ہو گیا تدبیریں کی گئیں کچھ افاقہ نہ ہوا لوگ یہ سمجھے کہ مر گیا -

تھوڑی دیر کے بعد ہوش آ گیا ماں سمجھی کہ یہ بھوت ہو گیا تو اب اس کے لیے تعویذ گنڈے کراتی پھرتی ہے کہ کسی طرح مرجاوے اگر کسی موقع پر مردہ اہل مجلس کو مخاطب کر کے السلام علیکم کہہ دے تو سب ڈر کے مارے بھاگ جاویں تو یہ موت جو کہ لوگوں کے نزدیک اتنی بڑی مصیبت ہے کہ رأس الکل ہے تمام مصائب کی مگر اس کی حقیقت ان عارفین محبین کے نزدیک کیا ہے یہ ہے کہ اس کے شوق و تمنا میں عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم | راحت جاں طلبم وز پے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر ایں غم بسر آید روزے | تا در میکدہ شاداں و غزلخواں بروم

(وہ دن مبارک ہے جس روز میں اس دنیائے فانی سے کوچ کروں راحت جاں طلب کروں اور محبوب کے لیے جاؤں میں نے نذر کی ہے کہ جس دن یہ غم تمام ہو جائے یعنی موت کا وقت آئے تو محبوب کے دربار تک خوش و خرم اور غزل پڑھتا ہوا جاؤں)

فقط خرم ہی نہیں منت بھی مانتے ہیں کیا ٹھکانا ہے ان کے نزدیک یہ موت کی حقیقت ہے کہ تمنا کرتے ہیں شاید کوئی کہے کہ یہ فرصت کی باتیں ہیں مرتے وقت یہ حالت رہے تو جانیں، اس وقت تو نانی یاد آتی ہو گی تو لیجیے ایک بزرگ عین حالت نزع میں مسرور ہو کر فرماتے تھے ؎

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم | جسم بگذارم سراسر جاں شوم

(اب وہ وقت آ رہا ہے کہ میں عریاں ہوں جسم کو چھوڑ کر سراسر جان بنوں)

خوش ہو رہے ہیں کہ الحمد للہ اس جیلخانہ سے چھوٹنے کا وقت آ گیا بلکہ ان کی مسرت کی تو یہ کیفیت ہے کہ بعض بعض سے بطور خرق عادت خود بعد موت بھی مسرت کے آثار ظاہر ہوتے ہیں یا قرائن سے مسرت بعد الموت کا پتہ لگتا ہے چنانچہ ایک بزرگ نے وصیت کی تھی کہ میرے جنازہ کے ساتھ ساتھ یہ شعر پڑھتے چلیں۔

مفلسانیم آمدہ در کوئے تو شیئاً للہ از جمال روئے تو
دست بکشا جانب زنبیل ما آفریں بر دست و بر بازوئے تو

(آپ کے دربار میں ہم مفلس ہو کر آتے ہیں اپنے جمال کے صدقہ میں کچھ عنایت کیجئے ہماری زنبیل کی طرف ہاتھ بڑھائیے آپ کے دست و بازو پر آفرین ہے۔) آخر کیا بات ہے اور میں نے ایک کتاب میں دیکھا کہ جب سلطان نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کا جنازہ لے کر چلے تو ان کے ایک عاشق زار کی زبان سے شدتِ غم میں بے ساختہ نکلا

سروِ سیمینا بصحرا می روی سخت بے مہری کہ بے ما میروی
اے تماشا گاہ عالم روئے تو تو کجا بہر تماشا میروی

(اے محبوب آپ جنگل میں جا رہے ہیں سخت بے مہری کہ بغیر ہمارے جا رہے ہیں اے محبوب آپ کا رخ انور جہان کا تماشا گاہ ہے آپ تماشا کے لیے کہاں جا رہے ہیں) تو لکھا ہے کہ کفن میں سے آپ کا ہاتھ اونچا ہوا جیسے وجد میں ہوتا ہے۔ لوگوں نے انہیں پڑھنے سے روکا۔ تو مرنے کے بعد بھی یہ حالت ہوتی ہے اس کی وجہ کیا ہے حرف یہ ہے کہ مرنے کے وقت کو وہ زمان وصال سمجھتے ہیں اس لیے اس کی تمنا کرتے ہیں جیسے جامی فرماتے ہیں ؎

چہ خوش وقتے و خرم روزگارے کہ یارے برخورد از وصل یارے

(کیا اچھا وقت اور کیا اچھا زمانہ ہے کہ اس میں کوئی محب اپنے محبوب کے وصال سے متمتع ہو۔) ایک بزرگ طاعون کو خطاب فرماتے ہیں خُذْ بِیْ اِلَیْکَ (مجھ کو پکڑ لے) اس موقع پر مجھے عراقی کا شعر یاد آتا ہے ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی ؎

(دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ تیری تلوار سے ہلاک ہو دوستوں کا سر سلامت رہے کہ تو خنجر آزمائی کرے۔)

پس موت کے سامنے ان کی یہ حالت ہے معرفت و محبت یہ چیز ہے۔

کمالِ نظرِ معرفت

خلاصہ یہ ہے کہ جس کو حق تعالیٰ سے تعلق ہے اس کو دنیا میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی اور آخرت میں وعدۂ صادقہ ہے جنت کا اور اگر جنت بھی چند روز گناہوں کے سبب نہ ملے تب بھی آخرت کی تکلیف مؤمن کے لیے دنیا کی راحت سے افضل ہے کیونکہ اس تکلیف کے انقطاع کی ہر وقت یقینی امید اور یہاں کی راحت کے زوال کا ہر وقت یقینی خوف۔ اور ان مضامین کا اکثر حصہ حال سے سمجھ میں آسکتا ہے نرے قال سے نہیں یوں تو طوطا بھی نبی جی بھیجو سیکھ لیتا ہے مگر جب بلی آکر دباتے تو ٹاں ٹاں ٹاں۔ اور حال میسر ہوتا ہے اہلِ حال کی صحبت میں پس اس کا بھی اہتمام کرو لوگ کہتے ہیں اب اس شان کے بزرگ نہیں رہے تو کس کی صحبت اختیار کریں سو یہ خیال بالکل غلط ہے ایسے بندگانِ خدا اب بھی موجود ہیں لیکن ایک دن میں نظر نہیں آسکتے اگر کسی کی آنکھ آج بنی ہو تو نظر ضعیف ہو گی۔ تھوڑی دور کی چیزیں دکھائی دیں گی۔ چار دن کے بعد اور آگے نظر آئے گا۔ تو نظر تو ہے مگر اول دن اس لیے نظر نہیں آتا کہ ضعیف ہے۔ ہاں سُرمہ ہو تو نظر آوے وہ سرمہ بھی انہیں کی صحبت میں ہے کہ جس سے نظر آجاوے گا مگر مشکل تو یہ ہے کہ لوگ دیکھتے ہیں رسوم کو اور محققین کے یہاں ننگے کپڑے ہوں گے نہ ایسی موٹی تسبیح ہو گی کہ ہتھیار کا کام دے جیسا ایک شاہ صاحب کہتے تھے کہ تسبیح ایسی تو ہو کہ لاٹھی کا کام دے غرض ان کے یہاں نہ کوئی گنبد دار مزار ہے نہ رسوم ہیں کہ نیاز ہو رہی ہے عرس ہو رہا ہے یہ کچھ بھی نہیں بس ایک چیز ہے ہیچ کے دان دیکھے خوان دیکھے ہیں (ایک کو جان ایک پڑھ اور ایک ہی کو دیکھ) ان کا یہ مذہب ہے ؎ خلیل آسا در ملک یقیں زن نوائے لا احب الآفلین زن

(ابراہیم علیہ السلام کی طرح یقین حاصل کر کے لا احب الآفلین (میں غروب ہو جانے والوں سے

محبت نہیں رکھتا۔) کی صدا لگاؤ) ان کے یہاں اور تو کوئی کیا چیز ہوتی وہ خود بھی نہیں رہے

؎ بحالِ تہی دست باید گریستن　　　　کہ نا نقد ول ہم بہ چنگے ندارد

(تنگدستی کی حالت میں رونا چاہیے کہ نقد دل چنگل میں نہیں رکھتا ہے۔)

اور وہ اپنی ہستی کیسے نہ مٹاتے جبکہ ان پر محو کرنے والی تجلی ہو رہی ہے جس کی خاصیت ہی یہ ہے

چو سلطانِ عزت علم بر کشد　　　　جہاں سر بجیب عدم در کشد

(جب محبوب حقیقی کی تجلی قلب پر وارد ہوتی ہے سب چیزیں فنا ہو جاتی ہیں)

اگر آفتاب ست یک ذرہ نیست　　　　وگر ہفت دریاست یک قطرہ نیست

(اگر آفتاب ہے ایک ذرہ نہیں اور سات دریا ہیں۔ تو ایک قطرہ نہیں ہے۔)

تو اگر صحیح شناخت ہو تو اللہ کے بندے ایسے ایسے نظر آویں گے کہ ان کی صحبت میں تمہاری نگاہ تیز ہو جاوے گی ان کی صحبت اختیار کرو تو کھلی آنکھوں نظر آجائے گا کہ معرفت و محبت کیا چیز ہے اور یہ کہ حقیقی آسائش اہل معرفت و محبت ہی کو حاصل ہے انہیں کی شان میں ہے ؎

مبیں حقیر گدایانِ عشق را کایں قوم　　　　شہانِ بے کمر و خسروانِ بے کلہ اند

(گدایانِ عشق کو حقیر نہ سمجھو کیوں کہ یہ لوگ شاہان بے تخت و تاج ہیں۔)

اور یہ امر واقعی ہے نری شاعری نہیں ہے یہ ان کی حالت ہے مشاہدہ کر لو ان کے اقوال و افعال میں واقعات کے وقت غور کرو کہ ان کی کیا کیفیت ہے ہر وقت ان کا مذہب یہ ہے ؎

سوئے نومیدی مرو کامید ہاست　　　　سوئے تاریکی مرو خورشید ہاست

(نا امیدی کی راہ نہ جاؤ بہت سی امیدیں ہیں تاریکی کی طرف نہ چلو بہت سے آفتاب ہیں یعنی اللہ تعالیٰ سے نا امید نہ ہو امیدیں رکھو۔)

دنیادار کا ایک ذراسا بچہ بیمار ہو جاتا ہے تو تیماردار بدحواس ہو جاتے ہیں وہاں سب کے سب اگر فدا ہو جائیں تو بھی کچھ پروا نہیں۔

ایک غزوہ میں ایک بی بی کے شوہر اور بچے باپ سب کام آگئے، کسی نے کہا کہ تمہارا باپ بھائی بچے سب مارے گئے تو وہ کہتی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی سلامت ہیں کہا ہاں کہنے لگی جب آپ سلامت ہیں تو مجھے کسی کے کام آنے کی کچھ پروا نہیں ہے

فَاِنَّ اَبِیْ وَوَالِدَتِیْ وَعِرْضِیْ ؛ لِعِرْضِ مُحَمَّدٍ مِّنْکُمْ وِقَاءٌ ،

(یعنی میرے ماں باپ کی عزت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آبرو کے لیے تم سے وقایہ یعنی ڈھال ہے) مولانا فرماتے ہیں ہے

روزہا گر رفت گو رو باک نیست ‍ ‍ ‍ ‍ تو بماں اے آنکہ جز تو پاک نیست

(ایام تلف ہونے پر حسرت نہ کرنا چاہیے اگر گئے بلا سے عشق جو اصلی دولت ہے اور سب خرابیوں سے۔ پاک صاف اس کا رہنا کافی ہے) جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صحابہ کرام کو کس قدر قلق ہوا کہ ہم میں سے اگر کسی کو اس درجہ کا قلق ہو تو دیوانہ ہو جاتے مگر خدا کے زندہ رہنے کے مضمون سے تسلی ہو گئی۔ جب آپ کی وفات ہوتی ہے تو حضرت عمرؓ کمالِ حزن میں فرماتے تھے کہ اگر کوئی کہے گا کہ وفات ہو گئی تو قتل کر دوں گا۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے یہ آیت پڑھ کر سنائی وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاْئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ، (محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسول ہی تو ہیں اور آپ سے پہلے بہت سے رسول گذر گئے پس اگر مر جائیں یا قتل ہو جائیں تو تم ایڑیوں کے بل پلٹ جاؤ گے؟) تو حضرت عمرؓ کی تسلی ہو گئی اور فرمایا کہ میں اس قدر اس آیت کو بھولا ہوا تھا کہ معلوم ہوتا ہے کہ آج ہی نازل ہوئی ہے اور حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی

مگر خدا زندہ ہے۔

مجھے صحابہ کی اس حالت پر ایک حکایت یاد آئی میرے ایک دوست ہیں ہم وطن بھی ہیں بہت ہی خوف زدہ ہو کر اپنی حالت بیان کرنے لگے کہ مجھے جتنی حق تعالیٰ سے محبت ہے اتنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں میں نے کہا کچھ پریشانی کی بات نہیں کہ تمہاری یہ حالت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ ہے۔ تم بالکل متبع سنت ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنی محبت نہ تھی جتنی خدا سے تھی بشگفتہ ہو کر دعائیں دینے لگے۔ صحابہ کی بھی یہی کیفیت تھی تو حضرت اتنے بڑے واقعہ پر صحابہ کا صبر کرنا محض اس وجہ سے تھا کہ حی لایموت تو ہے اسی سے انہیں غم مہلک نہیں ہوا رنج قاتل نہیں ہوا۔

خدا تعالیٰ نے اسباب مصیبت کا ایک معالجہ یہ بھی کیا ہے یعنی جب کوئی حادثہ پیش آتے تو صبر و سکون کا علاج بتلاتے ہیں اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (اور جب ان کو مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں) دو تعلیمیں فرمائی ہیں ایک خواص کے لیے اور ایک عوام کے لیے اِنَّا لِلّٰهِ ہم خدا کے ہیں یہ خواص کے لئے ہے کہ جب اپنے کو خدا کا سمجھیں گے تو اس کے ہر تصرف کو خوشی سے گوارا کریں گے وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ اور ہم اسی کی طرف لوٹیں گے یہ دوسروں کے لیے ہے اس طرح سے کہ جب سب وہاں جاتے ہیں تو سب جمع ہو کر مل جاویں گے وہ شخص مفقود بھی مل جاوے گا جیسا اگر کسی کا کوئی عزیز حیدر آباد میں وزیر اعظم ہو جاوے تو تم آیا یہ چاہو گے کہ تمہارے پاس چلا آتے یا یہ چاہو گے کہ ہم بھی وہاں پہنچ جائیں بس یوں سمجھو کہ جو مرا وہ حیدر آباد پہنچا۔

ہمارے حضرتؒ کے پاس ایک بڈھا آیا کہ حضرت دعا فرما دیجئے۔ بیوی بہت

بیمار ہے جاں بلب ہے تندرست ہو جاوے۔ فرمایا کہ بھائی مرتی ہے مرنے دو خدا کا شکر کرو کہ ایک مسلمان جیلی نہ سے چھوٹتا ہے۔ جہاں وہ جاتی ہے تم بھی پہنچ جاؤ گے میں نے کہا لو! بڑے میاں آئے تھے بیوی کو بچانے اپنے مرنے کی بھی بشارت لے چلے۔ لاؤ دعا کرانے۔ پھر کہنے لگا حضرتؒ اگر وہ مرجائے گی تو میری روٹی کون پکائے گا فرمایا حاجی وہ ماں کے پیٹ سے روٹی ہی پکاتی تو آئی تھی۔ اللہ اکبر ہر امر میں حقیقت پر نظر تھی غرض جب نظر معرفت کی کامل ہو جائے گی پھر پریشان ہو اس کی بلا بہرحال یہ آثار تھے تعلق کے اور بے تعلقی کے کہ بے تعلقی سے دونوں جہان کی مصیبتیں وابستہ ہیں افسوس ہے کہ اس کے بعد بھی ہم کو فکر نہ ہو۔

غلط دعویٰ پر رد:

اور اگر فکر ہے تو سنو حق تعالیٰ اسی کا طریق بتلاتے ہیں بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ بلیٰ میں رد ہے اہل باطل کے ایک غلط دعویٰ کا کہ جس کے متعلق رد سے پہلے ارشاد ہے تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ یہ ان کی آرزوئیں ہیں دعویٰ یہ تھا کہ ہم ہی جنت میں جاویں گے پہلے اس کو اس طرح رد فرمایا کہ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ یہ ان کی آرزوئیں ہیں کہ بجز ان کے اور لوگ جنت میں نہیں جاویں گے آگے ارشاد ہوا بلیٰ یعنی کیوں نہیں جاویں گے پھر اس کی دلیل قاعدۂ کلیہ کے ضمن میں بیان فرماتے ہیں مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ الخ جو شخص سپرد کر دے اپنی وجہ یعنی ذات کو خداوند تعالیٰ کے لیے اس حال میں کہ وہ محسن ہو اُن کا۔ اجر اللہ کے پاس ہے نہ ان پر خوف ہو گا نہ وہ غمگین ہوں گے یہ ترجمہ ہوا۔

یہاں پر حق تعالیٰ نے اس عمل منجی کو اسلام سے تعبیر فرمایا اس کی تفصیل سمجھنے کے بعد معلوم ہو گا کہ وہ کیا چیز ہے سو ہمارے روشن خیال حضرات کے نزدیک اس کی حقیقت ایسی چیز ہے کہ نہ اس میں کچھ مامورات ہیں نہ منہیات ان کی کیفیت یہ ہے کہ ان کو کسی

منہی عنہ سے منع کرو تو کہتے ہیں کیا اس سے ایمان جاتا رہا مولویوں نے خواہ مخواہ تنگی کر دی ہے اجی اسلام بہت وسیع چیز ہے وہاں ایسے ایسے افعال کا کیا اثر بس لَا اِلٰهَ اِلَّا اللہ کے قائل ہو گئے اور اسلام کامل ہو گیا نہ کسی فعل سے اس میں نقصان آتا ہے نہ کسی عقیدہ سے اس میں خلل آتا ہے اس کے لیے ایک حدیث یاد کر رکھی ہے مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہُ فَقَدْ دَخَلَ الْجَنَّةَ (جس نے لا الہ الا اللہ کہہ لیا یقیناً وہ جنت میں داخل ہو گا) سبحان اللہ اچھا سَت نکالا کہ لا الہ الا اللہ کہہ لیا بس کافی ہے اب اور اعمال کی کیا ضرورت۔ بیشک حدیث صحیح ہے مگر جو مطلب آپ سمجھے وہ اس کا مطلب ہی نہیں اس کا مطلب ایک دیہاتی مثال میں سمجھئے۔ ایک شخص ایک عورت سے نکاح کرلے قاضی پوچھے تم نے قبول کی وہ کہے قبول کی لیجئے نکاح ہو گیا، یہ میاں یوں سمجھے کہ عورت ہاتھ آئی خوب چین کریں گے یہ خبر نہ تھی کہ تھوڑے دن میں لدنا پڑے گا جس کی حقیقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کسی کے پوچھنے پر خوب فرمایا ہے سُرُوْرُ شَهْرٍ ایک مہینہ کی خوشی پھر پوچھا ثُمَّ مَاذَا یعنی پھر کیا ہوتا ہے فرمایا لُزُوْمُ مَهْرٍ یعنی مہر لازم آجاتا ہے، پوچھا ثُمَّ مَاذَا (پھر کیا) فرمایا غُمُوْمُ دَهْرٍ یعنی تمام زمانہ کے رنج و غم۔ پھر پوچھا ثُمَّ مَاذَا (پھر کیا) فرمایا كَسْرُ ظَهْرٍ یعنی کمر ٹوٹ جاتی ہے غرض میاں ایک ماہ نوشہ رہے خوب عزت رہی دعوتیں ہوا کیں اس کے بعد ماں باپ نے الگ کر دیا اب گھر کرنے بیٹھے اب وہ غموم دھر میں مبتلا ہو گئے الگ ہوتے وقت ماں باپ نے ایک ماہ کا غلہ وغیرہ دے دیا تھا مہینہ بھر تک وہ کھاتے رہے جب ختم ہو گیا اب بیوی نے کہنا شروع کیا کہ غلہ لاؤ گھی لاؤ کپڑا بناؤ وغیرہ وغیرہ یہ لاؤ وہ لاؤ تو آپ کہتے ہیں کیا تو پاگل ہو گئی ہے کیسی لکڑی کیسا غلہ کیسا گھی۔ میں نے ان چیزوں کی کہاں ذمہ داری کی ہے اس نے کہا آخر تم نے ایجاب قاضی پر کہا نہ تھا کہ میں نے قبول کی وہ کہتے ہیں کہ پھر میں نے یہ تو نہ کہا تھا کہ میں نے غلہ وغیرہ بھی

قبول کیا میں نے تو فقط تجھے قبول کیا تھا میں نے آٹا قبول کیا نہ لکڑی قبول کی، غرض جھگڑا اس قدر بڑھا کہ محلہ کے عقلا فیصلہ کرنے کے لیے جمع کئے گئے ان میں آپ بھی ہوں اب آپ بتائیے کہ کیا فیصلہ کریں گے کیا یہ فیصلہ نہ کریں گے کہ روٹی کپڑا سب اس سے دلائیں گے اور کہیں گے کہ ارے احمق بیوی کا قبول کرنا اس کی تمام ضروریات کا قبول کرلینا ہے اس کے لیے کسی مستقل معاہدہ کی ضرورت نہیں۔

بس لا الہ الا اللہ کے بھی یہی معنی ہیں اب ذرا سنبھل کر کہئے گا بس اسی مختصر کلمہ نے تمام باتوں کو لے لیا ہے لہذا جب وضع خلاف شرع ہوگی تو ایک جزء لا الہ الا اللہ کا چھوٹا تو مولوی اہل محلہ کے مثل ہیں اور یہ اسی نادان کے مثل ہے جو کہتا ہے کہ میں نے تو لا الہ الا اللہ کہا تھا یہ کہاں کا جھگڑا نکالا کہ وضع خلاف شرع نہ رکھو داڑھی مت منڈواؤ یامت کٹاؤ مونچھیں مت بڑھاؤ نماز پڑھو روزہ رکھو۔

اب تمہارے ہی اجلاس میں فیصلہ کراتا ہوں کہ کیا مثال مذکور کی طرح اس شخص کا فقط لا الہ الا اللہ کو کافی سمجھنا صحیح ہے ذرا بھی عقل سلیم ہوگی تو کون کہے گا کہ صحیح ہے یہ تو اسلام کا ست نکالا کہ لا الہ الا اللہ کہہ لو بس کافی ہے۔ بس یہ اسلام کی حقیقت بنا دی اسی سے کہتے ہیں کہ اسلام بہت وسیع ہے۔

یہ تو امت جدیدہ کا مذاق تھا اب قدیم مذاق والوں کو لیجئے ان میں جو بڑے دیندار کہلاتے ہیں انہوں نے یہ کہا کہ نماز روزہ کرلو حور و قصور کا اعتقاد کرلو بس اسلام اس میں منحصر ہوگیا آگے رہے معاملات۔ جذبات۔ اخلاق۔ تہذیب۔ معاشرت تمدن اس کو سمجھا کہ اسلام میں تو ہے نہیں پھر یا تو ان کو مطروح کر دیا اور اگر کسی نے ان کا اہتمام کرنا چاہا تھا تو بس غیر قوموں سے لینا شروع کر دیا افسوس ہمارے گھر کیا نہ تھا جو دوسروں سے دریوزہ گری کی گئی ہماری، آپ کی بس یہ مثال ہے

یک سبد پر نان ترا بر فرق سر   تو ہمی جوئی لب نان در بدر

ایک ٹوکرا روٹیوں کا سر پر ہے مگر بھیک مانگتے پھرتے ہیں اجی اتنی روٹیاں ہیں کہ اوروں کو بھی دے سکتے ہو آج جو متمدن قومیں ہیں ان کا اعتراف ہے کہ ہم نے سب اسلام سے سیکھا ہے مگر مسلمان ایسے بے خبر ہیں کہ اپنا گھر چھوڑ کر پرائے در پر جاتے ہیں اسی مثال مذکور کا تتمہ ہے ۔

تا بزانوئی میان جوئے آب   وز عطش وز جوع گشتستی خراب

گھٹنے تک پانی ہے مگر اس سے غافل ہیں اور پیاس کے مارے غل مچا رکھا ہے ، بس یہ حالت ہے اسلام کی حقیقت سمجھنے والوں کی سو اس آیت میں حق تعالیٰ نے اسلام کی حقیقت بیان فرمائی ہے کہ اسلام کیا چیز ہے اپنے کو خدا کے سپرد کر دینا اس کا حاصل وہی تعلق مع اللہ نکلتا ہے جو تمہید میں بیان کیا گیا ہے ہاں ایک غلطی اوران نئے محققین کی حقیقت اسلام کے متعلق یاد آئی ۔ ایک صاحب کہنے لگے کہ مسلمان ہونے کے لیے صرف توحید کافی ہے اعتقاد رسالت کی ضرورت نہیں ۔ یہ زہر آلود عقیدہ ایک قریب کے ضلع سے نکلا ہے میں نے کہا اگر توحید کا عقیدہ کافی بھی تسلیم کر لیا جاوے تب بھی وہ عقیدہ توحید کا بدون اعتقاد رسالت متحقق نہیں ہوتا وجہ یہ کہ توحید کی حقیقت خدا کو ذات وصفات میں کامل سمجھنا ہے اور منجملہ صفات باری تعالیٰ صدق بھی ہے اگر کوئی (معاذ اللہ منہا) خدا کو جھوٹا سمجھے تو وہ بوجہ انکار صفت کمال صدق کے توحید کا منکر ہے ایک مقدمہ تو یہ ہوا اور دوسرا مقدمہ یہ کہ خدا نے ہمیں خبر دی ہے کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) تو جس نے دل سے اس کا یقین نہ کیا اس نے خدا کو جھوٹا جانا تو وہ توحید کا بھی منکر ہوا ۔ جواب کے واسطے دس برس کی مہلت ہے اس کے بعد ان صاحب کی حالت اچھی ہو گئی الحمد للہ بات یہ ہے کہ اونٹ جب تک پہاڑ تلے سے نہ نکلے اپنے کو بہت بڑا سمجھتا ہے تو اصل میں انہیں کوئی ان کے مذاق کا جواب دینے والا نہیں ملا تھا اس لیے ان کے دماغ میں

یہ سمائی تھی کہ میں بڑا ہوں گو ایسے بڑے پیسے کے آٹھ آٹھ بکتے ہوں بس اتنا فرق ہے کہ وہ تر بڑے ہیں یہ خشک بڑے ہیں بلکہ ایک شخص کا قول ہے کہ آج کل کے بڑے بڑیاں ہیں بڑے نہیں، خیر یہ تو لطیفے تھے۔

دنیوی بڑائی کی خرابی

اصل میں بڑائی میں بڑی خرابی ہے مگر افسوس آج کل کے محقق اس کی تعلیم دیتے ہیں خودداری جس کا نام ہے یہ بھی وہی بڑائی ہے افسوس یہ اسی شاخ کو تازہ کر رہے ہیں جس کی جڑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کاٹی ہے، جانتے ہو خودداری کا بانی کون ہے شیطان ہے جس نے آٹھ لاکھ برس تک عبادت کر کے جب اس کو ارشاد ہوا اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ آدم کو سجدہ کرو تو یہ قصہ ہوا کہ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ (بجز ابلیس کے سب نے سجدہ کیا اس نے انکار کیا اور اپنے آپ کو بڑا سمجھا) سب نے تو سجدہ کر لیا اور یہ کہتا ہے میں نہیں کرتا اس واسطے کہ مجھے عنصر اعلیٰ یعنی آگ سے بنایا ہے اور آدم کو عنصر ادنیٰ یعنی خاک سے بنایا ہے غرض یہ اصول خودداری اسی نے ایجاد کیے ہیں جو اس کے وارثوں کو میراث میں پہنچتے ہیں اور انبیاء علیہم السلام کے وارثوں میں یہ بات کہاں سے آتی ان کی یہ میراث ہے مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ رَفَعَہُ اللّٰہُ (جو شخص اللہ کے لیے تواضع کرے تو اللہ تعالیٰ اس کا مرتبہ بلند کرتے ہیں) اپنے کو بلند نہیں سمجھتے اور واقعی اگر کوئی بڑائی کرنے بھی لگے تو ہماری بڑائی ہی کیا ہے

ز خاک آفریدت خداوند پاک — پس اے بندہ افتادگی کن چو خاک

ترا با چنیں تندی و سرکشی — نہ پندارم از خاکی یا آتشی

(اللہ تعالیٰ نے تجھ کو خاک سے پیدا کیا ہے پس اے بندہ خاکساری اختیار کر تجھ کو ایسی تندی و سرکشی کے ساتھ میں نہیں سمجھتا کہ تو خاکی ہے یا آتشی۔)

دنیا میں تین چیزیں ایسی ہیں جن پر آدمی بڑائی کر سکتا ہے ایک مال۔ دوسرے جمال تیسرے کمال۔ بس یہ تین چیزیں ہیں بڑائی کی۔ سو مال پر تو کیا بڑائی کسی چور کو ذرا ہمت ہو جاوے ایک دن میں ساری بڑائی چھکڑوں پر لاد کر لے کر چل دیئے۔ اب رہا جمال خدا بھلا کرے بخار کا کہ دو ہفتہ میں چڑیل بھوت کی شکل بنا دیتا ہے پھر اپنی صورت سے آپ ہی شرم آنے لگتی ہے۔ رہا کمال تو تمام کمالات کا مدار ایک دماغ پر ہے دماغ پر کوئی آفت آجاوے لیجئے وہ بھی گیا' یہ حشر ہے بڑائی کا' یہ بڑائی عقل کے بھی تو خلاف ہے یہ تو دنیا کی بڑائی تھی۔

دین کی بڑائی کی خرابی

بعض کو دین کی بڑائی کا زعم ہو جاتا ہے تو یہ حالت ہوتی ہے کہ قرآن و حدیث کا ترجمہ دیکھا اور اجتہاد شروع کر دیا ترجمہ سے بدون حقیقت شناسی کے اجتہاد کرنا ایسا ہی ہے' جیسا کسی شخص نے گلستان کا لفظی ترجمہ دیکھ کر اجتہاد کیا تھا اس میں یہ شعر دیکھا تھا کہ ؎

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست ۔۔۔ در پریشاں حالی و در ماندگی

(دوست وہ ہے جو پریشانی اور بدحالی میں دوست کی مدد کرے۔) ان کو ایک جگہ ان کے دوست پٹتے ہوئے مل گئے مگر وہ بھی کچھ کچھ ہاتھ پاؤں چلا رہے تھے آپ نے اس دوست کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے بس خوب پٹے اس نے بعد میں پوچھا یہ کیا حرکت تھی ؟ تو آپ فرماتے ہیں ع دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست؟ دست کا ترجمہ دیکھ لیا غنیمت ہے ورنہ دوست کے پاخانہ کا دست اٹھا کر لاتا ایسے ہی اجتہاد سے ان لوگوں نے دین کی گت بنائی ہے۔

ایک دوسرے مجتہد صاحب نے فخراً بیان کیا کہ جب روزہ پر چھے آئے تھے امتحان کے ہم نے تو نماز میں قصر کیا تھا کہ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ اِنْ خِفْتُمْ تم پر گناہ نہیں اگر تم نماز میں قصر کرو جب کہ تمہیں خوف ہو ہم کو جواب کے

صحیح نہ لکھے جانے کا بڑا خوف تھا اس لیے ہم نے قصر کیا۔ ایک دوست وہاں موجود تھے انہوں نے پوچھا کہ کیوں صاحب جو معاہدہ مشروط ہو دو شرطوں کے ساتھ وہ کیا ایک شرط کے تحقق سے مکمل ہو جاتا ہے انہوں نے کہا نہیں انہوں نے کہا کہ آپ نے قرآن کی آیت پوری نہیں پڑھی لَیْسَ عَلَیْکُمْ سے پہلے اِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ بھی ہے کہ جب تم زمین میں سفر کرو۔ خیر خوف تھا مگر آپ نے سفر کون سا کیا تھا۔ بس ہو چکا اجتہاد آپ نے نماز کھوئی اس کی قضا کیجیے تھے بھلے مانس اقرار غلطی کا کیا تو یہ حالت ہے مجتہدوں کی۔ ایک صاحب نے کہدیا کہ سود حرام ہی نہیں اور لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوا میں یہ لفظ ربٰو بکسر را نہیں ہے بلکہ رُبا بالضم را ہے جس کے معنی لوٹ مار کرنے اور اچک لینے کے ہیں پس جو مال لوٹ کر لیا جاتے گا وہ حرام ہوگا ان مجتہد صاحب کو بھی خبر نہیں کہ کہاں رُبا جو ربودن فارسی سے مشتق ہے اور کہاں عربی قرآن اگر ایسے ہی مجتہدین ہوں گے تو پھر دین کا خدا حافظ ہے ؎

گر بہ میرو سگ وزیر و موش را دیواں کنند
ایں چنیں ارکان دولت ملک را ویراں کنند

(یعنی اگر نا اہلوں کے ہاتھ میں حکومت آجاتے تو ملک ویران ہو جاتے) اگر ان کے قبضہ میں اسلام ہوتا تو خدا جانے یہ کیا گت بناتے مگر وہاں تو ارشاد ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (ہم نے ہی قرآن کو نازل کیا اور ہم ہی اسکی حفاظت کرنے والے ہیں) خدا تعالیٰ نے خود حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے اور واقعی عجیب طرح حفاظت فرمائی ہے کہ ایسی بے سروسامانی کی حالت میں علماء تیار ہوتے ہیں کہ آج کوئی چیز علم دین کی طرف رغبت دلانے والی نہیں ہے یہ ادھر ہی کی حفاظت ہے کہ باوجود اس ناقدری کے پھر بھی اللہ کے نیک بندے اس طرف متوجہ ہوتے ہیں پس جب وہ خود محافظ ہیں تو پھر بھلا کون دین کو مٹا سکتا ہے ؎

چراغے کہ ایزد برفروزد
ہر آنکس تف زند ریشش بسوزد

(جس چراغ کو حق تعالیٰ روشن کریں جو شخص اس پر پھونک مارے اس کی ڈاڑھی جل جاتے) اگر کوئی کہے کہ ہمارے پاس ریش ہی نہیں تو ہم اس کے لیے کہیں گے ع ہر آنکس تف زند ریش بسوزد (جو اس پر پھونک مارے اس کا چہرہ جھلس جاتے) یہ خرابیاں ہیں اپنے کو دین میں بڑا سمجھنے کی۔ اور کسی اخبار میں چھپا تھا کہ زمانہ مقتضی ہے کہ مذہب سب روئے زمین کے لوگوں کا ایک ہو۔ یہ مختلف فرقے آریہ، عیسائی، شیعہ، سنی کچھ نہ رہیں پھر وہ کونسا مذہب ہو سو اگر مذاہب موجودہ میں سے کوئی مذہب تجویز کیا جاتے تب تو ترجیح بلا مرجح لازم آتی ہے اس لیے نہ تو سب مسلمان ہو سکتے ہیں، نہ ہندو، نہ عیسائی کیونکہ اس میں تو پھر وہی اختلاف ہوگا پس اس کی یہ صورت ہو سکتی ہے کہ تھوڑا تھوڑا رعایت تمام مذاہب کی رکھو اس طرح سے کہ اصل مذہب تو توحید کو قرار دو اور باقی سب مذاہب کے اجزاء کو فروع قرار دے کر ہر ایک کو اس کی حالت پر رہنے دو اور کسی سے تعرض نہ کرو اگر ایسا ہو جاتے تو اچھا ہے بس پھر سب مل کر رہو یہ رائیں ہیں۔

میں کہتا ہوں گورنمنٹ کے قوانین میں کیوں دست اندازی نہیں کرتے۔ بس یہ اللہ میاں ہی کا قانون ہے تختہ مشق بنانے کے لیے اور یہ تو ان کی حالت ہے جو بددین ہیں اور جو دیندار ہیں ان میں بعضوں کو یہ خبط ہو گیا کہ دو چار کتابوں کے ترجمے دیکھ لیے مجتہد ہو گئے تصوف کے رسالے دیکھ لیے اور شیخ کامل بن گئے۔ طب احسانی دیکھ لی مطب کرنے لگے، طبیب حاذق بن گئے۔ اب شیخ کی کلیات بھی لغویات اور واہیات ہو گئیں مسہل کا ایک نسخہ یاد کر لیا چاہے جس خلط کا غلبہ ہو وہی ایک نسخہ دیا مریض چاہے مرے چاہے جئے۔ جیسے ایک سیاح کا قصہ سنا ہے کہ اس نے ایک میم کو دوا دی تھی۔ پولیس کمشنر بمبئی کی میم تھی آدھے سر کے درد کی شکایت تھی کسی طرح اچھا نہ ہوتا تھا ان سیاح صاحب نے انعام کے لالچ میں اسے اپنے

پاس سے بوٹی دی خدا کی شان کہ وہ اچھی ہو گئی اب یہ گئے انعام مانگنے اس نے پوچھا کہ یہ کیا بوٹی تھی جو تم نے دی تھی اس کی کیا خاصیت ہے اور کیا مزاج ہے اور اس کا کیا کیا نفع ہے اور اگر نقصان کرے تو کیا تدارک ہے انہوں نے کہا کہ یہ تو مجھے معلوم نہیں اس نے کہا ایسی نامعلوم چیز سے تم نے ہمارا علاج کیوں کیا۔ اگر ہم مرجاتے یا ہمارا مرض بڑھ جاتا تو کیا ہوتا اس کا چالان کرادیا مقدمہ چلا اور وہ جیل خانہ گیا۔ بس ایسے مجتہدوں کو بھی اگر ایسی سزا ملا کرے تو آنکھیں کھل جائیں۔ مولویوں کے قال یقال سے یہ باز نہیں رہ سکتے اگر مولوی کہیں کبھی تو گالیاں کھائیں غرض اس بڑائی کی بدولت ان اجتہادات کی نوبت پہنچی اور ان اجتہادات کی بدولت ان لوگوں نے اسلام کی حقیقت سمجھنے میں غلطی کی بعض جو مدعی اجتہاد بھی نہیں انہوں نے اسلام کے احکام و ضوابط اور ان کا اغراض و رسوم کے ساتھ مزاحم ہونا دیکھ کر اس کی حقیقت کا عجیب خلاصہ نکالا چنانچہ ایک شخص مجھ سے کہتے تھے کہ اسلام کی تعلیم کا یہ خلاصہ ہے کہ نہ خوشی میں ہنسو نہ رنج میں رو۔ تو یہ معنی اسلام کے سمجھے اور ان کو اسلام بڑا سخت اور خونخوار نظر آنے لگا۔

حقیقتِ اسلام

غرض افسوس اسلام کو ان میں سے کسی نے بھی نہ سمجھا سو سمجھ لو کہ اسلام تعلق مع اللہ کا نام ہے اور مَنْ اَسْلَمَ سے یہی مقصود ہے پس اس حقیقت پر اگر مفصل نظر کرو تو اب معلوم ہوگا کہ اسلام کیسی حسین چیز ہے اسلام وہ چیز ہے کہ ؂

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم ۔۔۔ کرشمہ دامنِ دل میکشد کہ جا اینجاست

(سر سے پیر تک جس جگہ نظر کرتا ہوں کرشمہ دامن دل کو کھینچتا ہے کہ یہی جگہ محبوبیت کی ہے۔) خدا کی قسم جس پہلو سے لو نہایت راحت بخش اور مصالح کی رعایت کرنے والا مذہب ہے میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں اس کی تعریف کرسکوں ؂

قلم بشکن سیاہی ریز و کاغذ سوز و دم درکش — حسن ایں قصہ عشق است در دفتر نمی گنجد

(قلم توڑ سیاہی کو پھینک کاغذ کو جلا اور خاموش رہ اے حسن یہ عشق کا قصہ ہے دفتر میں نہیں سما سکتا) کسی محقق کے پاس چند روز رہ لو اس وقت آنکھیں کھلیں کہ اسلام کیا چیز ہے اسلام وہ مذہب ہے جس نے ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں تک کی تعلیم دی ہے کہ جب تین آدمی کسی مجلس میں بیٹھے ہوں تو دو آدمی آپس میں سرگوشی نہ کریں کہ تیسرے کی دلشکنی ہوگی وہ سمجھے گا کہ بس مجھ سے مخفی رکھتا ہے ہاں جب چار ہو جائیں تو کچھ حرج نہیں کہ وہ دونوں بھی سرگوشی کر سکتے ہیں اور ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ شاید دوسرے سے مخفی رکھتا ہو اور لیجیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک صحابی حاضر ہوتے آواز دی آپ نے پوچھا مَنْ کون ہے انہوں نے کہا أَنَا میں ہوں آپ نے فرمایا أَنَا أَنَا میں میں یہ بھی کوئی جواب ہوا۔ کتنی معقول بات فرمائی پہلی آواز سے آپ نے نہیں پہچانا اس لیے پوچھا کہ کون ہے اس کے جواب میں میں ہوں کہنا غلطی ہے اس واسطے کہ اس سے مزید پتہ نہ معلوم ہوا جو آواز پہلے معلوم ہوئی تھی وہی اب بھی معلوم ہوئی اگر آواز سے پہچانتے تو پہلے ہی پہچان لیتے اور یہاں تک تعلیم فرمائی کہ قانون بتلا دیا جب کسی کے گھر جاؤ تو پہلے دروازہ پر اجازت لے لو کہ السلام علیکم فلاں حاضر ہوا اگر جواب نہ آوے پھر اجازت مانگو پھر کہو تیسری بار اجازت مانگو تین دفعہ کے بعد بھی اگر کوئی نہ آوے نہ جواب دے تو لوٹ جاؤ شکایت مت کرو بُرا مت مانو کتنی اچھی تعلیم فرمائی ہے باب اخلاق کا خلاصہ یہ ہے

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد — کسے را با کسے کارے نباشد

(وہ جگہ بہشت ہے جہاں کوئی تکلیف نہ ہو کسی کو کسی سے تنگی ہو۔)

مصرعہ ثانی کا یہ مطلب نہیں کہ ایک کو دوسرے سے ہمدردی نہ ہو بلکہ مقصود یہ ہے کہ ایک کو دوسرے سے ایذا نہ ہو۔ اسباب ایذا کو نہایت اہتمام سے رفع کیا گیا ہے

اس کا نہایت اہتمام کیا ہے کہ کسی کو کسی سے تنگی نہ ہو اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کر کے بھی دکھلا دیا حالانکہ آپ پر کسی کو جان تصدق کرنے میں بھی دریغ نہ تھا مگر پھر بھی آپ نے معاملات میں خدام کو کس قدر آزاد رکھا تھا کہ حضرت بریرہ رضی پہلے ایک باندی تھیں حالت رق میں ان کا نکاح کر دیا گیا تھا اس کے بعد یہ آزاد کی گئیں تو قانون شرعی یہ ہے کہ جو کوئی باندی آزاد ہو جائے تو اسے اپنے شوہر کے ساتھ رہنے نہ رہنے میں اختیار ہوتا ہے تو بریرہؓ نے آزاد ہوتے ہی ان شوہر کے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا ان کے شوہر انہیں بہت چاہتے تھے انہیں ان کی جدائی ناگوار ہوئی بیچارے روتے پھرتے تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی حالت جب خراب دیکھی حضرت بریرہؓ سے فرمایا کہ تم مغیث کے ساتھ نکاح کر لو تو اچھا ہے تو حضرت بریرہؓ سوال کرتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ حکم ہے یا سفارش؟ آپؐ نے فرمایا کہ سفارش ہے تو بریرہؓ کہتی ہیں تب میں نہیں قبول کرتی آپ خاموش ہو رہے ناخوش نہیں ہوئے۔

ذرا بڑے لوگ غور سے دیکھیں کہ سفارش کا کیا درجہ ہے آج کسی پیر صاحب کسی مولوی صاحب سے بریرہؓ کی سی گفتگو کر کے دیکھ لیجئے کتنا ناخوش ہوں گے افسوس کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بڑھ گئے کہاں کی مولویت کہاں کی پیری؟

آزادی کے غلط معنی، اب تو ہر امر میں اپنا اثر ڈال کر دوسرے کو مجبور کرنا چاہتے ہیں ہم نے ریل میں ایک مدعی آزادی کو دیکھا کہ گھسی ہوئی دونی قلی کو دی اس نے کہا کہ بدل دیجئے انکار کر دیا اس نے کہا کہ یہ نہیں چلے گی کہا کہ چلا دینا اس نے کہا کیوں کر چلا دوں کہا جس طرح ہم نے چلا دی ہے۔ ارے تم تو ظالم تھے اس واسطے تم نے چلا لی وہ غریب تمہاری طرح کیسے چلا سکتا ہے، وہ بیچارہ روتا ہوا چلا گیا۔ یہ کیا تعلیم ہے کیا تہذیب ہے

تم معاشرت میں جن کی حرص کرتے ہو وہ تو ایسا نہیں کرتے کہ خواہ مخواہ کسی غریب
پر اس طرح ظلم کریں۔ کیا یہی معنی ہیں آزادی کے کہ ہم پر تو کسی کا بوجھ نہ پڑے
اصل آزادی وہی ہے جو اسلام نے تعلیم فرمائی ہے جس کا خلاصہ ہے

ع بہشت آنجا کہ آزارے نباشد ؏

ان واقعات سے بڑھ کر ایک اور قصہ مسلم شریف میں ہے کہ ایک صحابی
نے شوربا پکایا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی آپ نے فرمایا کہ بھئی عائشہؓ
بھی چلیں گی انہوں نے کہا نہیں فقط آپ۔ آپؐ نے فرمایا کہ پھر میں بھی نہیں چلتا انہوں
نے کہا نہ سہی وہ چلے گئے دوبارہ پھر آئے پھر یہی گفتگو ہوئی پھر چلے گئے۔ تیسری
مرتبہ میں انہوں نے حضرت عائشہؓ کی بھی دعوت منظور کی، سبحان اللہ کیا آزادی ہے
کیسا بے تکلف کہہ دیا کہ نہ سہی اور جب وہ اس قدر آزاد تھے تو بعد میں جو انہوں
نے حضرت عائشہؓ کی دعوت بھی کر دی تو وہ اُسوقت ان کی رائے بدل گئی تھی
جبر کی کوئی بات نہ تھی اللہ اکبر۔ یہ ہے آزادی کوئی ایسا کر کے تو دکھلا دے۔ ہمارے استاد زادہ
ہیں حکیم معین الدین صاحب ان کے یہاں مولانا گنگوہیؒ تشریف لاتے اس روز ان
کے گھر میں سناٹا تھا عرض کیا میرے یہاں تو آج کچھ ہے نہیں اگر آپ فرمائیں تو
کسی اور کو دعوت کی ترغیب دوں۔ مولانا نے فرمایا کہ میں تمہارا مہمان ہوں۔ تمہارے
گھر فاقہ ہے تو میں بھی فاقہ کروں گا یہ ہیں متبع سنت وہ تھوڑا ہی کہ دو چار اختلافی
مسئلوں میں شور کر دیا بس متبع سنت ہو گئے مولانا کی برکت سے شام کے وقت
ایک شخص آیا حکیم صاحب کو کچھ روپے نذر دے گیا اب کیا تھا مولانا
نے فرمایا بکھیڑا نہ کرنا حکیم صاحب نے عرض کیا واہ فاقہ کے بعد بھی بکھیڑا نہ ہو
تکلف کا کھانا تیار کرایا۔ حضرت! کیا بے آزار زندگی ہے گاڑھے کے کپڑے ہیں
اس میں بھی راضی ہیں دو شالہ ہے تو اس میں بھی خوش ہیں اور اصل آزادی تو

اہل اللہ میں ہے مگر دنیا داروں میں بھی پورانی وضع میں بہ نسبت نئی وضع کے پھر کسی قدر آزادی ہے جو جی چاہے پہن لیجئے آج کل اگر کوٹ پہنیں تو لنگی فیشن کے خلاف، لنگی باندھیں تو کوٹ فیشن کے بالکل خلاف بخلاف پورانی وضع کے کہ بلا تکلف زیر و لنگے بالا (ایک نہ بند اوپر اور ایک نیچے) سب کھپتا ہے پس آزادی تو یہ ہے اور یہ وہ تو جکڑ بندی ہے خدا جانے اس کا نام آزادی کس نے رکھا ہے جب فیشن ہے تو آزادی کہاں وہ تو اچھی خاصی قید ہے۔

خود بینی و خود رائی

غرض سلام کی حقیقت اور اس کی تعلیمات کو دیکھئے تو پھر اس کا حسن و جمال معلوم ہو اور جو لوگ اس سے کورے ہیں انہوں نے حقیقت ہی نہیں سمجھی سو اسلام کے معنی ہیں اپنے کو خدا کے سپرد کر دینا اور جب سپردگی ٹھہری تو ایک ذرہ برابر جز میں بھی اگر خود رائی ہوگی تو سپردگی کہاں رہے گی۔ اب بالکل سمجھ میں آجائے گا کہ پاجامہ ٹخنوں سے نیچے پہننا اسلام کے خلاف کیوں ہے اور ڈاڑھی کٹانا یا منڈانا اسلام کے خلاف کیوں ہے نہ پاجامہ کرتا ٹوپی کی خاص اوضاع اسلام کے خلاف کیوں ہے۔

اور اس سپردگی کی ایک مثال ہے کہ کوئی مقدمہ ایک وکیل کے سپرد کر دیتے ہیں یا پنچ کے سپرد کر دیتے ہیں اس عارضی سپردگی کا یہ اثر ہے کہ پھر اس میں کوئی رائے نہیں دیتا جو وہ کہے مانتا ہے جو وہ کرے کرتا ہے اسی طرح خدا کے سپرد کرنے کے بعد بھی رائے زنی ترک کرنا چاہیے یہ ہے تفویض الی اللہ اسی کو عارف شیرازی کہتے ہیں ؂

فکر خود و رائے خود در عالم رندی نیست   کفر ست دریں مذہب خود بینی و خود رائی

(عالم عاشقی میں اپنی فکر اور اپنی رائے بالکل بے کار ہے اس طریق میں خود بینی اور خود رائی کفر ہے)

اس زمانہ میں دونوں مرض عام ہیں عام طور سے اسلامی مسائل میں رائے دیتے ہیں کہ

ہمارے خیال میں یوں ہونا چاہیئے ارے تم ہو کیا چیز؟ تمہاری ایسی ہی مثال ہے کہ ایک کارخانہ ہے اس میں سیکڑوں آدمی نوکر ہیں اس میں حوض بھی ہوتے ہیں اور حوض میں پانی بھی ہوتا ہے جدید تحقیقات سے یہ ثابت ہوا ہے کہ پانی کے ایک قطرہ میں لاکھوں کیڑے ہوتے ہیں جو خوردبین سے نظر آتے ہیں ان کیڑوں میں سے ایک کیڑا آپ سے یہ کہے کہ میری رائے میں آپ اس کلرک کے بجائے فلاں کلرک کو رکھ لیجئے آپ بہت ہنسیں گے کہ وہ کیڑا جو کہ پانی کے ایک قطرہ سے بھی لاکھوں حصہ چھوٹا ہے ہمیں رائے دیتا ہے اسے کیا خبر کہ کیا ہونا چاہیئے جو اس کیڑے کی رائے آپ کے کارخانہ میں وقعت رکھتی ہے۔ واللہ خدا کے کارخانہ میں آپ کی رائے کا بھی وہی درجہ ہے بلکہ اس سے بھی بدرجہا زیادہ ذلیل وخوار ہے واللہ بغاوت عظیمہ ہے کہ ہمارے خیال میں۔ ہمارا خیال ہی کیا چیز ہے شرم نہیں آتی کہ خدا کو رائے دیتے ہو حالانکہ تم خدا کے مقابلہ میں اتنے بھی نہیں جتنا تمہارے مقابلہ میں وہ کیڑا ہے، کیونکہ کمالات باری غیر متناہی ہیں اور تم متناہی اور وہ کیڑا بھی مثل تمہارے متناہی۔ تو رائے ہماری کیا ہے؟

لطائف آیت

حاصل یہ کہ سپرد کر دینے کے بعد پھر رائے نہیں دی جایا کرتی جس طرح مقدمہ وکیل کے سپرد کر دینے کے بعد کوئی رائے نہیں دیتا اسی کو فرماتے ہیں اَسْلَمَ وَجْهَهٗ (جس نے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا) باقی ذات کو وجہہ سے کیوں تعبیر کیا۔

سو وجہ کہتے ہیں منہ کو عموماً مفسرین نے تو یہ لکھا ہے کہ یہاں تَسْمِيَةُ الْكُلِّ بِاِسْمِ الْجُزْءِ ہے یعنی جز بول کر کل مراد لیا ہے۔

اور وجہ تخصیص یہ کہ وجہ تمام اعضاء میں اشرف تھا جب اشرف کو سپرد کر دیا تو کل کو سپرد کر دیا مگر ایک اس سے زیادہ بات لطیف ہے وہ یہ کہ پہچان چہرے سے ہوتی ہے

تو گویا تشخص میں زیادہ دخل چہرہ کو ہے پس وجہ سے تعبیر کرنا ذوات مشخصہ کو نہایت برمحل ہے یہ تو پرانے طالب علموں کے کام کی بات تھی۔

ایک بات تو تعلیم یافتہ لوگوں کے کام کی بھی سمجھ میں آئی کہ آج کل جو رائے دی جاتی ہے اس کی قوت دماغ کے اندر ہے اور وجہ کو دماغ سے خاص تلبس ہے گویا دونوں متلازم ہیں پس وجہ کو سپرد کرنا گویا دماغ کو سپرد کرنا ہے اور دماغ کے سپرد کرنے کے بعد جب دماغ ہی آپ کا نہ رہا تو رائے اور خیال آپ کا کہاں سے آیا تو یہ تعبیر مشیر ہے خود رائے کے قطع کر دینے کی طرف۔

اگر کوئی کہے کہ کیا دماغ سے کام نہ لیں اسلام کے احکام تو سب دماغ ہی کے متعلق ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر مقدمہ کسی بیرسٹر کے سپرد کر دو تو اگر وہ گواہوں کی شناخت کے واسطے کہے تو کیا اس کو یہ جواب دو گے کہ ہم نے تو آپ کے سپرد کر دیا جس چیز کو سپرد کر دیا ہے اس میں اپنی رائے کا دخل مت دو باقی جتنے میں وہ خود دخل دینے کو کہے اس میں دخل دو بس اسی طرح یہاں بھی دماغ سے اتنا کام لو جتنا حکم ہے۔

اور یہ توجیہیں تو جب ہیں کہ وجہہ کو ظاہری وجہ پر رکھا جائے اور اگر وجہ کو وجہ باطن پر محمول کیا جائے تو یہاں پر وجہ کے معنے قلب کے ہوں گے جیسے اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ فِیْ (میں اپنے قلب کو اس ذات کی طرف متوجہ کرتا ہوں جس نے مجھے پیدا کیا ہے) میں کہا گیا ہے کہ یہاں وجہ سے مراد چہرہ نہیں ہے کیوں کہ اس کو خدا کی طرف کرنے کے کیا معنے بلکہ یہاں مراد قلب ہے کہ میں نے پھیر دیا رخ قلب اپنا خدا کی طرف جس نے مجھے پیدا کیا تو یہ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ کا بطن اور باطن تھا خلاصہ مجموعہ توجیہیں کا یہ ہوا کہ اپنی ہر چیز کو خدا کے سپرد کر دیا۔ اب سمجھئے کہ کبھی سپرد کرنا غرض کی وجہ سے ہوتا ہے اور کبھی خوف سے اور کبھی

محبت سے محققین کا مذہب یہ ہے کہ اگر کسی نے غرض کی وجہ سے سپرد کیا کہ کام خوب نکلیں گے تو یہ شرک خفی ہے کہ کام بنانے کے لیے اطاعت کرتا ہے خدا کے لئے نہیں کرتا پس یہ تسلیم اس لئے کرو کہ اس کا حق ہے اسی لئے وَھُوَ مُحْسِنٌ بھی فرمایا کہ سپرد کرنے میں اخلاص ہو اپنی کوئی غرض وابستہ نہ ہو۔ چنانچہ سلام جب ہی مقبول ہے کہ اس میں ریا نہ ہو کیوں کہ یہ خلاف اخلاص ہے، اس تفسیر کے بعد معلوم ہو گیا ہو گا کہ اسلام مطلوب کی یہی حقیقت ہے کہ خالصًا اللہ کے ہو جاؤ۔ آگے احسان کے متعلق بھی بہت مضمون تھا مگر اب وقت نہیں رہا انشاء اللہ پھر کسی موقعہ پر مستقلاً بیان کر دیا جائے گا۔

اس کے بعد اب وعدہ ہے کہ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ اس کے لئے اس کا اجر ہے اس کے پروردگار کے نزدیک فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ پر کفایت نہیں کی بلکہ عِنْدَ رَبِّهٖ بھی بڑھایا اس میں بڑا راز ہے ایک تو کسی مزدور سے کہتے کہ کام کرو ہم تمہیں کھانا کھلائیں گے اور ایک یہ کہ اپنے پاس بٹھا کر کھانا کھلائیں گے اور وہ مزدور عاشق بھی ہو تو کس قدر شوق سے کام کرے گا اور کھانے سے کس قدر مسرور ہو گا عِنْدَ رَبِّهٖ اس لئے بڑھایا ہے ؎

ہر کجا یوسف رخے باشد چو ماہ　　جنت ست آں گرچہ باشد قعر چاہ
ہر کجا دلبر بود خرم نشیں　　فوق گردوں است نے قعر زمیں

(جہاں محبوب ہو وہ جگہ جنت ہے اگرچہ کنواں ہی کیوں نہ ہو جس جگہ محبوب ہو خوش وخرم بیٹھ وہ جگہ مرتبہ میں آسمان سے بلند تر ہے نہ پست زمین)

سبحان اللہ کیا قرآن کی بلاغت ہے بس یہ شعر صادق آتا ہے ؎

بہار عالم حسنش دل وجاں تازہ میدارد　　برنگ اصحاب صورت را ببو ارباب معنی را

(اس کی عالم حسن کی بہار ظاہر پرستوں کے دل وجان کو رنگ سے اور حقیقت پرستوں

کے دل و جان کو بوسے تازہ رکھتی ہے) یعنی دو مذاق کے لوگ ہیں ایک تو روٹ کھونے جیسے ہم ہیں ان کو فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ سے خوش کر دیا کہ گھبراؤ نہیں روٹیاں مل جائیں گی۔ ایک وہ ہیں جو دیدار کے مشتاق ہیں ان کے واسطے عِنْدَ رَبِّهِمْ فرمایا کہ دعوت ہوگی اور ہمارے پاس ہوگی اور یہ سب انعام ہوا انعام کا کمال یہ ہے کہ منفعت عطا ہو اور مضرت سے بچایا جاوے منفعت کا مذکور تو ہو چکا آگے مضرت سے بچانے کا وعدہ ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ ان پر کوئی خوف نہیں، کوئی قید نہیں لگائی کہ کہاں خوف نہیں گو بعض جگہ سے آخرت کی قید معلوم ہوتی ہے کہ آخرت میں کوئی خوف نہیں لیکن یہاں کا اطلاق اگر بحالہ رکھا جاوے تو دنیا و آخرت دونوں کو عام ہے گا رہا یہ کہ دوسری آیات میں یَخَافُوْنَ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کو خوف ہے سو محققین نے جواب دیا ہے کہ لَا خوف علیھم فرمایا لا خوف بھم یا لھم نہیں فرمایا یعنی ان پر خوف کی چیز واقع نہ ہوگی گو خود وہ خوف کیا کریں اس کے بعد ارشاد ہے وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ اور نہ وہ غمگین ہوں گے خوف آئندہ کا اندیشہ ہے اور حزن واقعہ ماضیہ کے متعلق ہوتا ہے۔

تو حاصل یہ ہوا کہ نہ تو مستقبل میں کسی مضرت کا احتمال ہے نہ کسی ماضی کی فوت سے ان پر حزن ہے کہ ہائے یہ نہ ہوا، ہائے وہ نہ ہوا نہ دنیا میں نہ آخرت میں۔ خلاصہ یہ کہ ہر قسم کی مضرتوں سے محفوظ ہوں گے، یہ اسلام پر انعام ہوا۔

اے صاحبو! اس تقریر سے اسلام کی حقیقت یا بلفظ دیگر تعلق مع اللہ کے برکات ظاہر ہو گئے پھر کوئی وجہ نہیں کہ آپ اسے نہ اختیار کریں یہ بہت بڑی دولت ہے، یا تو مجھے کوئی دولت اس کے مقابلہ میں ایسی بتا دیجئے جو اس سے بڑھ کر ہو تا کہ میں بھی آئندہ اسی کی ترغیب دیا کروں اور اگر ایسی کوئی دولت نہیں تو آپ بھی اس کے حاصل کرنے کی کوشش کیجئے ورنہ حجت تمام ہو چکی اب آپ کے پاس قیامت میں کوئی جواب نہیں ہے اب حق تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ ہمیں توفیق عمل کی عطا فرمائے۔ آمین فقط

الدوام علی الاسلام والاعتصام بالانعام

کے بارے میں

مرتے دم تک اسلام پر قائم رہنا ضروری ہے

یہ وعظ ۶ رشوال المکرم ۱۳۳۵ھ بروز شنبہ بوقت صبح مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں ۳ رگھنٹے ۴۵ منٹ تک ہُوا۔
شرکائے وعظ کی تعداد تقریباً پچاس تھی۔
مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے قلمبند فرمایا۔

اس وقت آپکو ایسی چیز بتلانا چاہتا ہوں جو پریشانی کو لذیذ کر دے کیونکہ میں کہہ چکا کہ پریشانی تو جنت سے ورے ختم نہیں ہو سکتی۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ پریشانی کو لذیذ کر دیا جائے ــــ اور یہ بھی ایک طرح پریشانی کا خاتمہ ہی ہے ــــ

تو میں ایسی بات بیان کرنا چاہتا ہوں جو تمام اعمال میں کام آئے اور غفلت سے روکتی ہے اور پریشانی کے وقت ہمت بندھائے اور وہ نئی بات نہیں بلکہ وہ وہی ہے جس کا نام قرآن میں کہیں تقویٰ ہے کہیں اعتصام بحبل اللہ ہے اور اسی کا نام ذکر نعمت بھی ہے

عبارا تنا شتیٰ وحسنک واحدٌ
وکل الیٰ ذاک الجمال یشیرُ ،

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ و نؤمن بہ و نتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہ و نشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ و نشھد ان سیدنا و مولانا محمدا عبدہ و رسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ و علیٰ آلہ و اصحابہ و بارک و سلم اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ وَ لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا وَ اذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖٓ اِخْوَانًا وَ کُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَۃٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَکُمْ مِّنْھَا کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمْ اٰیٰتِہٖ لَعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ۔

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو جیسے ڈرنے کا حق ہے اور بجز اسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دینا اور مضبوطی سے پکڑے رہو اللہ تعالیٰ کے سلسلہ کو اس طور پر کہ باہم متفق بھی رہو اور باہم نا اتفاقی مت کرو اور تم پر جو اللہ کا انعام ہے اس کو یاد کرو جب کہ تم دشمن تھے پس اللہ تعالیٰ نے تمہارے قلوب میں الفت ڈال دی سو تم خدا تعالیٰ کے انعام سے آپس میں بھائی بھائی ہو گئے اور تم دوزخ کے گڑھے کے کنارہ پر تھے سو اس سے خدا تعالیٰ نے تمہاری جان بچائی اسی طرح اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو اپنے احکام بیان کر کے بتلاتے رہتے ہیں تاکہ تم لوگ راہ پر رہو۔

یہ آیتیں ہر چند کہ ایک خاص قصہ میں نازل ہوئی ہیں مگر [illegible] اسی قصہ کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ [illegible] ایک دستور العمل [illegible]

ہے، تاکہ پھر ویسے قصے رونما نہ ہوں اور دیگر آفات سے بھی محفوظ رہیں۔

قصہ یہ ہے کہ سیدنا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے پہلے آپ کے دو خاندانوں میں جن کا نام اوس و خزرج ہے، سخت عداوت تھی۔ جب مدینہ والے مسلمان ہو گئے تو یہ عداوت اتحاد سے اور وہ بغض و نفرت دوستی اور محبت سے مبدل ہو گئی اور جب سیدنا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ میں رونق افروز ہوئے، اس وقت تو یہ اتحاد اور بھی زیادہ مستحکم ہو گیا اور یہ اتحاد یہود کو بہت ناگوار گذرا، اور ایک یہودی نے جو اوس و خزرج دونوں قبیلوں کے آدمیوں کو ایک جلسہ میں باہم شیر و شکر دیکھا تو حسد سے جل مرا اور اُس نے ایک شخص کو اس کام پر مقرر کیا کہ اوس و خزرج میں جو وقائع و حروب ہوئے ہیں اور ان کے متعلق ہر قبیلے کے شعراء نے اشعار کہے ہیں، وہ اشعار انصار کی مجلسوں میں پڑھ دے چنانچہ اس میں وہ کسی قدر کامیاب ہو گیا کہ اشعار کا پڑھنا تھا۔ فوراً ایک آگ سی بھڑک اٹھی اور آپس میں تو تو میں میں ہونے لگی یہانتک کہ لڑائی کا موقعہ اور وقت بھی مقرر ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو اطلاع ہوئی آپ انکے پاس تشریف لائے اور فرمایا کیا اندھیر ہے کہ میرے سامنے ہی کہ میں تمہارے اندر زندہ موجود ہوں، پھر مسلمان ہو جانے اور باہم متفق و متحد ہو جانے کے بعد یہ واہیات حرکت؟ کیا تم اسلام کے بعد پھر اسی حالت کفر کی طرف عود کرنا چاہتے ہو؟

حضورؐ صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے سب کو تنبہ ہوا اور سمجھے کہ یہ شیطانی حرکت تھی اور ایک دوسرے کے گلے لگ کر بہت روئے اور توبہ کی جس سے حاسدین کی کوشش اکارت گئی وَاَرَادُوا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ان لوگوں نے ان کیساتھ برائی کرنا چاہا تھا، سو ہم نے ان ہی لوگوں کو ناکام کر دیا۔ کیونکہ اب پہلے سے بھی زیادہ اتحاد ہو گیا اور صحابہ کو معلوم ہو گیا کہ نفسانیت کی بناء پر باہم قتال و جدال عملی کفر ہے۔ اس لئے ہمیشہ کے واسطے اس کا دروازہ بند ہو گیا۔

ف اور حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد جو حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ میں جنگ ہوئی اس کا منشا

جس سے دشمنوں کی تدبیریں الٹی ہوگئیں، اور صحابہ میں پہلے سے بھی زیادہ محبت و الفت قائم ہوگئی۔ مضلین کو بھی بعض دفعہ دھوکہ ہوجاتا ہے کہ وہ ایک کام کرتے ہیں اہل حق کو ضرر پہنچانے کے لئے اور اس کا انجام خیر ہوتا ہے، بلکہ بعض دفعہ شیطان کو بھی جو رئیس المضلین ہے، دھوکہ ہوجاتا ہے کہ وہ بندہ سے ایک معصیت کرانا چاہتا ہے تاکہ خدائے تعالے سے اس کو بعد ہوجائے، مگر اس کو پہلے سے بھی زیادہ قرب بڑھ جاتا ہے۔ بعض دفعہ تو اس طرح کہ وہ گناہ کا ارادہ کر کے پھر خدا کے خوف سے رُک جاتا ہے اور بعض دفعہ گناہ کا ارتکاب بھی ہوجاتا ہے مگر اس کے بعد ندامت اس درجہ غالب ہوتی ہے کہ بندہ روتے روتے ہلاکت کے قریب ہوجاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو یہ عجز و نیاز پسند ہے وہ اس کو پہلے سے بھی زیادہ مقرب بنا لیتے ہیں پھر یہ شخص آئندہ کو اس گناہ کے وہ دروازے بالکل بند کر دیتا ہے، جن کی وجہ سے شیطان کے دھوکہ میں آیا تھا۔ غرض شیاطین الانس والجن دونوں کو بعض دفعہ دھوکہ ہوجاتا ہے جیسا کہ اس یہودی کو ہوا۔ جس نے اوس و خزرج میں نفاق و شقاق ڈالنا چاہا تھا۔ اگر اُسے یہ معلوم ہوجاتا کہ میری سعی کا یہ انجام ہوگا، تو وہ کبھی ایسا نہ کرتا۔ کیونکہ اللہ تعالے نے اس کی کوشش کو صرف اسی واقعہ میں ناکام نہیں کیا بلکہ آئندہ کا بھی انتظام فرمادیا اور جدال و قتال کے دروازے بالکل بند کر دیئے۔

کفر عملی چنانچہ اس سے پہلے جو آیات ہیں ان میں اول تو اہل کتاب پر ملامت ہے۔ جنہوں نے یہ کارروائی کی تھی اور یہ ملامت بڑی بلاغت سے کی گئی ہے،

بقیہ حاشیہ از صہ جاہلیت کی عداوت نہ تھی بلکہ اس کا منشا بعض دین تھا کہ ایک فریق دوسرے کو دین کے خلاف عمل کرنے والا سمجھتا تھا۔ اس لئے ہر ایک اپنے زعم میں دوسرے کو دین پر لانے کے لئے جنگ کررہا تھا۔ گو ان میں ایک فریق واقع میں غلطی پر تھا مگر اپنے اجتہاد میں ہر ایک حق پر تھا اور خطا اجتہادی معصیت نہیں بلکہ اس پر بھی اجر کا وعدہ ہے ۱۲ جامع

کہ اس فعل پر ملامت کرنے سے پہلے ان کو کفر پر ملامت کی گئی۔ جس کا حاصل یہ ہوا کہ چاہیئے تو یہ تھا کہ تم خود بھی مسلمان ہو جاتے، نہ یہ کہ اللہ و رسول کے گمراہ کرنے کی فکر میں لگ رہے ہو۔ پھر مسلمانوں کو خطاب اور فہمائش ہے کہ اہل کتاب کو تمہارا اتحاد و اتفاق، جو ذریعہ ہے دین و دنیا کی ترقی کا، سخت ناگوار ہے وہ تم کو آپس میں لڑانا چاہتے ہیں۔ اور اگر تم ان کا کہنا مانو گے تو وہ تم کو ایمان کے بعد کافر بنا دیں گے اور دشمنوں کے فریب میں آکر اپنا نقصان کرنا اور ان کا دل خوش کرنا سخت جہالت و حماقت ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہے وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنتُمْ تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ آيَاتُ اللَّهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُ ۗ وَمَن يَعْتَصِم بِاللَّهِ فَقَدْ هُدِيَ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝ اور بھلا تم کیسے کفر کر سکتے ہو حالانکہ اسباب مانعہ عن الکفر (کفر سے روکنے والے اسباب) پورے طور پر جمع ہیں کہ تم کو اللہ تعالیٰ کے احکام پڑھ کر سنائے جاتے ہیں اور پھر تم میں اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی موجود ہیں اور یہ دونوں قوی ذرائع ہیں ایمان پر قائم رہنے کے۔ پس تم کو چاہیئے کہ کتاب اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے موافق ایمان پر اور ایمان کی باتوں پر قائم رہو (اور یاد رکھو کہ) جو شخص اللہ تعالیٰ کو مضبوط پکڑتا ہے۔ (یعنی اس کی اطاعت کرتا اور اس کے مخالف کی اطاعت نہیں کرتا ہے) تو ایسا شخص ضرور راہِ راست کی طرف ہدایت کیا جاتا ہے۔

اس آیت میں کفر سے مراد معنی عام ہیں، جو کفر اعتقادی و عملی دونوں کو شامل ہے اور قتال و جدال کفر عملی ہے۔ کیونکہ فعل قریب کفر ہے۔ اس سے نااتفاقی پیدا ہوتی ہے جو گناہ بھی ہے اور قوت و ترقی کی زائل کرنے والی بھی۔ پھر ان بکھیڑوں میں پڑ کر دین حق سے بُعد ہو جاتا ہے۔ نااتفاقی میں ہر شخص دوسرے کو زک دینے کے لئے ہر ممکن سے ممکن تدبیر کو کام میں لاتا ہے۔ خواہ جائز ہو یا ناجائز۔ انسانیت سے قریب ہو یا بعید

اسی واسطے حدیث میں فساد ذات البین کو حالقہ فرمایا ہے کہ یہ مونڈنے والی چیز ہے۔ پھر حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفسیر بھی خود ہی فرمائی ہے لَا أَقُولُ تَحْلِقُ الشَّعْرَ بَلْ تَحْلِقُ الدِّيْنَ

میں یہ نہیں کہتا کہ بالوں کو مونڈتی ہے بلکہ دین کو مونڈتی ہے اور ظاہر ہے کہ جب مسلمان کو دین سے بعد ہوگا تو کفر سے قرب ہوگا۔ (اور قاعدہ عقلیہ ہے اَلْقَرِیْبُ مِنَ الشَّیْئِ یَاْخُذُ حُکْمَہٗ کہ جو جس سے قریب ہو اسی کا حکم لے لیتا ہے اسی وجہ سے فقہاء نے اَقْرَبُ اِلَی الْقُعُوْدِ (بیٹھنے کی طرف قریب تر) کو قاعد اور اَقْرَبُ اِلَی الْقِیَامِ (کھڑے ہونے کے قریب) کو قائم اور غالب الغش (کھوٹ غالب) کو مغشوش اور غالب الفضۃ (چاندی غالب) کو فضہ (چاندی) قرار دیا ہے۔ اس قاعدہ سے عمل قَرِیْبٌ مِّنَ الْکُفْرِ (قریب کفر کے) کو کفر کہنا اور اس کے مرتکب کو عملاً کافر کہنا صحیح ہے ۱۲)

صاحبو! قرآن محاورات میں نازل ہوا ہے اور محاورات میں اس کی نظیر موجود ہے کہ جو شخص جس قوم کے افعال کرتا ہے۔ اس پر اسی قوم کا اطلاق کرتے ہیں جیسے کمینہ حرکت کرنے والے کو کہتے ہیں کہ تو تو چمار ہے۔ یعنی چماروں کی سی حرکت کرتا ہے۔ اس سے ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ تنفر کے لئے یہ عنوان اختیار کیا گیا ہے یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ شخص اگر شیخ و سید تھا تو شیخ و سید نہیں رہا بلکہ مراد صرف یہ ہے کہ عملاً چمار ہو گیا گو واقع میں سید ہے۔ اسی طرح یہاں یہ مراد ہے کہ قتال و جدال کرنے والا عملاً کافر ہے گو واقع میں مومن ہے۔ پس جیسا کہ چمار کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حقیقی چمار جس کی ذات بھی چمار ہو ایک عملی چمار جو چماروں جیسے کام کرے۔ اسی طرح کافر کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک حقیقی کافر جو اعتقاداً کفر کے مرتکب ہیں۔ دوسرے عملی کافر جو کافروں جیسے کام کرتے ہیں۔ اور یہ تقسیم محاورات کے بالکل موافق ہے۔ کوئی دقیق بات

ضرورت علم کلام

نہیں۔ مگر خوارج و معتزلہ کی عقل ماری گئی کہ انہوں نے اس محاورہ کو نہیں سمجھا اور محاورہ کے موافق مستعمل لفظ میں تدقیق کرنے لگے۔ کفر کو حقیقی معنی پر محمول کر کے حکم لگا دیا کہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کفر ہے۔ اور مرتکب کبیرہ سچ مچ کافر یا خارج عن الایمان ہے۔ جب ان لوگوں نے قرآن کے معانی کو بدلنا شروع کیا تو اہل حق کو جواب دینے کی ضرورت

ہوئی اور انہوں نے ہیئت ایمان کی تحقیق کی۔ صحابہ کو اس کی ضرورت نہ تھی کیونکہ وہ سب کے سب محاورات کے جاننے والے اور کلام الٰہی کو سب سے زیادہ سمجھنے والے تھے۔ انہیں باہم ایسے اختلافات کم ہوتے تھے۔ اس لئے ان کو ایسے مسائل میں گفتگو کی ضرورت نہ تھی اور جس قدر ضرورت تھی اس کے موافق انہوں نے بھی گفتگو کی مگر اس وقت علم کلام کی تدوین کی ضرورت نہ ہوئی تھی۔ اور ایک علم کلام ہی کیا۔ صحابہ کے زمانہ میں تو فقہ کی بھی تدوین نہ تھی کیونکہ ان میں اتباع کا مذاق غالب تھا۔ تدقیق عمل کا مذاق نہ تھا تو ان کو اس سے بحث نہ تھی کہ فرض کون ہے اور واجب کون۔ بس حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو وضو کرتے ہوئے دیکھا تھا اور اسباغ وضو کے فضائل سنے تھے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر وضو کرنے لگے۔ آپ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تھا بس اسی طرح پڑھنے لگے جیسے آپ پڑھتے تھے۔ ان کو اس کھود کرید کی حاجت نہ تھی کہ نماز میں کیا تو فرض ہے اور کیا واجب اور کون مستحب؟ کیونکہ جس کو نسخہ پینا ہے وہ نسخہ کی تحقیق نہیں کیا کرتا کہ اس کا جزو اعظم کیا ہے۔ مزاج کیسا ہے۔ مگر جب کسی کو پورا نسخہ پینا منظور نہ ہو اور وہ تحقیق کے درپے ہو جائے۔ تو طبیب شفیق جزو اعظم وغیرہ کی تحقیق بھی بیان کر دیگا اور اس کو مدون بھی کر دے گا تاکہ کوئی پورا نسخہ نہ استعمال کرے تو بالکل محروم بھی نہ رہے۔ وہ جزو اعظم ہی استعمال کرے کہ وہ بھی حصول مقصود کیلئے کسی درجہ میں تو کافی ہے گو اثر دیر میں ہوگا اور پورے نسخے کے برابر نہ ہوگا۔ تو اگر مسلمان حضرات صحابہ ہی کے طرز پر رہتے اور عبادات کو ناقص نہ کرتے تو فقہاء کو تدوین فقہ اور تحقیق فرائض و واجبات و شرائط و ارکان کی ضرورت نہ ہوتی۔ اسی طرح اگر سب مسلمان مذاہب اصلیہ پر جتے اور تدقیق شروع نہ کرتے تو متکلمین کو بھی یَکْفُرُوْنَ اَثم کفر کرتے ہو کی تحقیق کی ضرورت نہ ہوتی کہ یہاں کفر عملی مراد ہے نہ کفر حقیقی۔ نہ ان کو اَسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ کی تاویل بیان کرنا پڑتی۔ متکلمین کو بھی اس کی ضرورت جب ہی ہوئی جب کہ اہل بدعت نے تلبیس شروع کر دی۔

اور یہ یقینی ہے کہ اگر علوم قرآن اپنی سند اصلیہ پر رہتے تو اس سے نفع

زیادہ ہوتا اور فضول ابحاث میں عوام کا اور علماء کا وقت صرف نہ ہوتا۔ بلکہ تمام علماء ضروری علوم کی تدوین و تحقیق میں مصروف ہوتے مگر اس کو کیا کیا جائے کہ صحابہ کے بعد مسلمانوں کی طبائع میں اتباع کا مادہ کم ہو گیا۔ عقول میں سلامتی کم ہو گئی اور تحقیق و تدقیق کے در پے ہونے لگے۔ اہل بدعت و ہوا نے تلبیس و تحریف شروع کر دی تو اب علماء میں تقسیم خدمات ہونے لگی۔ کسی نے بلاغت کو لے لیا۔ کسی نے نحو و صرف کو کسی نے علم کلام کو، کسی نے حدیث کو کسی نے فقہ کو کسی نے تفسیر کو اور ایک جماعت نے علوم عقلیہ کی خدمت اختیار کی اور اب علوم عقلیہ کی بھی ضرورت ہے۔

کیونکہ آج کل عقول میں سلامتی نہیں رہی وہ بدوں علوم عقلیہ کی مدد کے دقیق علوم کو نہیں سمجھ سکتے۔ اگر عقول میں سلامتی ہو تو پھر عقول میزانیہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ چنانچہ حضرات صحابہ و مجتہدین کو اس کی ضرورت نہ تھی مگر با وجود اس کے ان کے تمام دلائل قوانین عقلیہ پر منطبق ہیں۔ لیکن اب بدوں علوم عقلیہ کے فہم اس لئے مشکل ہو گیا کہ جو اشکالات شریعت پر کئے جاتے ہیں خود ان میں علوم عقلیہ و فلسفہ کی بہت آمیزش ہے۔ خصوصاً معتزلہ کے اشکالات میں اور گو علوم عقلیہ کے ذریعہ سے معتزلہ کے اشکالات رفع کر دیئے گئے مگر یہ ضرور ہے کہ متاخرین کے کلام میں علوم قرآن بہت کم ہیں اور سلف کے کلام میں علوم قرآن زیادہ ہیں۔ اور سلف کی باتیں دل کو لگتی ہیں کیونکہ سند کا خاصہ ہے کہ دل کو کشش کرتی ہے۔ سادگی سے جو بات بیان کی جاوے، وہ دل میں پیوستہ ہو جاتی ہے۔ متاخرین کے کلام میں یہ رنگ نہیں ان کی باتیں اس قدر دل کو نہیں لگتیں مگر وہ کیا کریں وہ اس رنگ کے اختیار کرنے پر مجبور تھے کیونکہ معترضین نے اسی رنگ سے اعتراضات پیش کئے تھے۔

اور یہ بھی خدا کی رحمت ہے کہ ہم سے پہلے یہ شبہات

تدقیقات سے احتراز

پیدا ہو چکے اور متقدمین متکلمین نے ان کے جواب میں قیامت تک کا انتظام کر دیا کہ علم کلام کی بنیاد ڈال کر قیامت تک کے شبہات کا ازالہ کر دیا۔ اگر ہم جیسے کم ہمتوں کے سامنے معتزلہ کے شبہات پیش ہوتے تو ہم سے یہ کام دشوار تھا بزرگوں نے اس

میں تو شک نہیں کہ متکلمین نے جو کچھ تحقیق و تدقیق کی وہ ایک ضروری کام تھا جس پر مخالفین اہل بدعت و ملاحدہ کی تلبیس نے ان کو مجبور کیا اگر اس مجبوری کے بعد بعض ابحاث انہوں نے ایسی بھی چھیڑ دیں جن کے چھیڑنے پر وہ مجبور نہ تھے اور ایسی ابحاث کی شمار بہت قلیل ہے ۱۲ لیکن متکلمین کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ مسلمانوں کو قرآن پر ایسی تحقیق و تدقیق کے ساتھ ایمان لانا چاہیے۔ بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ اگر کوئی مخالف اسلام پر اعتراض کرے اور اس کی فہم میں سلامتی نہ ہو اور سذاجت کیساتھ وہ قائل نہ ہو سکے تو اس کے مقابلہ میں اس سے کام لیا جائے اور خود اپنے اعتقاد رکھنے کے واسطے سذاجت ہی کا رنگ اختیار کرنا چاہیے۔ خصوصاً عوام کو تو یہی لازم ہے کہ قرآن پر سذاجت کیساتھ ایمان لائیں۔ کیونکہ تدقیقات سے شبہات دفع نہیں ہوتے بلکہ اس سے شبہات اور بڑھتے ہیں جن سے بعض دفعہ نجات مشکل ہو جاتی ہے اور اخیر میں جب کبھی نجات ہوتی ہے سذاجت ہی سے ہوتی ہے کہ اللہ و رسول صلے اللہ علیہ وسلم سچے ہیں اُن کا حکم سر آنکھوں پر ہے خواہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے اس میں پھر کہتا ہوں کہ متکلمین کا تدقیقات سے یہ مطلب نہ تھا کہ تم اپنے شبہات ان کے ذریعہ سے زائل کرو بلکہ صرف یہ مقصود تھا کہ اگر مخالف ان تدقیقات کے پیرایہ میں اعتراض کرے تو تم اس کو اُسی کے طرز سے خاموش کر سکو ۱۲ جامع اور سادہ تعلیم کے بعد بہ نسبت فلسفیات کے تصوف کی تحصیل سے بھی شبہات سے نجات جلد ہو جاتی ہے مگر اسی شرط کیساتھ کہ تصوف بھی سذاجت اصلیہ پر ہو جس میں علوم فلسفہ کا رنگ نہ ہو یعنی علوم کشفیہ کی تحقیق نہ ہو۔ جو واقع میں تو علوم فلسفیہ نہیں۔ لیکن ان کی تعبیر فلسفہ کے رنگ میں ہوتی ہے اس لئے وہ علوم فلسفہ معلوم ہوتے ہیں۔ گو اصل مفہوم کے اعتبار سے تو فلسفہ علم حکمت کو کہتے ہیں جو تمام علوم کشفیہ کو شامل ہے۔ مگر میں علوم فلسفیہ یعنی علوم دقیقہ زائدہ سے منع کرتا ہوں کہ محاورہ میں انہیں کو علوم فلسفیہ کہتے ہیں۔ غرض تصوف سے بھی اسی وقت شبہات کا مادہ منقطع ہوگا جب کہ کشفیات سے الگ رہے اور ان کی

تحقیق میں نہ پڑے۔ ورنہ شبہات سے نجات دشوار ہے۔

چنانچہ خود اہل کشف کا ارشاد ہے اَنْتُمْ تَخَافُوْنَ الْمَعَاصِیْ وَنَحْنُ نَخَافُ الْکُفْرَ کہ علمائے ظاہر کو تو معاصی ہی میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے مگر ہم کو کفر کا اندیشہ لگا رہتا ہے کیونکہ علوم کشفیہ کی فہم میں جب غلطی ہوتی ہے تو وہ کفر سے ادھر نہیں رہتی۔ اس لئے ان کے درپے ہونا بہت مضر ہے اس کے ساتھ ہی مشائخ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ علوم کشفیہ کی تحقیق و تدقیق تو نہ کرے لیکن اجمالاً ان کی تصدیق کرے تاکہ صاحب کشف کے گمراہ سمجھنے کا عقیدہ پیدا نہ ہو کیونکہ یہ عقیدہ سخت مضر ہوگا۔ وہ مقبولان الٰہی ہیں۔ جن کی شان میں یہ ارشاد وارد ہے۔ مَنْ اٰذٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُہٗ بِالْحَرْبِ (جو میرے ولی کو ایذا دے اس کو میری طرف سے اعلان جنگ ہے) اور تصدیق اجمالی کے معنے یہ ہیں کہ یوں سمجھے کہ یہ قول محتمل حق و صواب ہے ممکن ہے صحیح ہو۔ احتمال و امکان کی قید اس لئے میں نے بڑھا دی تاکہ الہام کے قطعی ہونے کا اعتقاد نہ ہو۔ گو بعض صوفیہ کے کلام میں یہ بھی وارد ہے کہ اہل کشف صحیح تلبیس ابلیس سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ میں بھی بہت دنوں اس کے اندر چکر میں رہا کہ اس قول کا مطلب کیا ہے کیونکہ ہمارا عقیدہ تو ظنیت الہام کا ہے اور اس کو تلبیس ابلیس سے محفوظ اور بالکل صحیح فرماتے ہیں جس سے متبادر یہ ہے کہ ان کے نزدیک الہام قطعی ہے۔ میں عرصہ دراز تک اس اشکال کی وجہ سے پریشان رہا اور جو بات اس پریشانی کے متعلق مجھے معلوم ہوئی ہے وہ عرض کرتا ہوں۔

اور میں محقق ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا بلکہ محض شفقت

علوم کشفیہ کا مطالعہ

کی بناء پر کہتا ہوں کہ میری عمر بھر کا تجربہ یہ ہے کہ علوم کشفیہ کا مطالعہ مضر ہے ان کا مطالعہ کبھی نہ کرے نہ ان کی تحقیق کے درپے ہو۔ ہاں اجمالاً اہل کشف کی بزرگی کا معتقد رہے اور اجمالاً ان کی تصدیق بھی کرے۔ مگر تفصیل کی فکر میں نہ پڑے۔ حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ تو بڑے رتبہ کے ہیں وہ تو بے دھڑک فرماتے ہیں کہ شیخ اکبر مقبول الٰہی

نظر ہی آید مگر علوم اونا مقبول اندازشیخ اکبر مقبولان الٰہی میں سے معلوم ہوتے ہیں مگر ان کے علوم نا مقبول ہیں۔ اگر اشکال ہماری ہے کہ ہم شیخ کی باتوں کو نامقبول کیسے کہیں ہمارا تو یہ پتہ نہیں۔ سو الحمد للہ کچھ دن ہوئے ہیں کہ اس اشکال کا جواب سمجھ میں آگیا۔ مگر ایک مسئلہ سمجھ میں آجانے کے بھروسہ دوسرے مسائل کا مطالعہ یہ سمجھ کر نہ کرنا چاہیئے کہ ہم کو تو اس جھگڑا آتا ہے کیونکہ بعض دفعہ ایسا رخار لگتا ہے کہ سمجھا جھگڑا مشکل ہو جاتا ہے وہ دامن کو بھی پھاڑ کے رکھ دیتا ہے اور خود نہیں نکلتا۔ دیکھو اگر ایک شخص کو نگاہ نیچی کر لینے کی مشق ہے تو اس کو یہ تو مناسب نہیں کہ اس کے بھروسہ خود قصد کر کے بازار میں ایسی جگہ کو نکلا کرے جہاں بازاری عورتوں کا مجمع رہتا ہے۔

صاحبو! بہتر تو یہی ہے کہ بازار ہی میں نہ جایئے تاکہ کوئی عورت نظر ہی نہ پڑے ورنہ کبھی تو ایسی نظر پڑے گی کہ یہ ساری مشق رکھی رہ جائے گی۔ تم ہزار نگاہ نیچی کرنا چاہو گے وہ پھر اوپر کو آنکھ اٹھا دے گی اور نگاہ نیچی کر بھی لی تو ایک بار کی نظر سے بعض دفعہ دل پر ایسا تیر لگتا ہے کہ عمر بھر دل سے نہیں نکلتا۔ پھر یوں کہو گے ؎

درون سینۂ من زخم بے نشان زدہٴ بحیرتم چہ عجیب تیر بے کمان زدہٴ

(تو نے میرے سینہ میں بے نشان زخم مارا ہے۔ حیرت ہے کہ کیا عجیب تیر بلا کمان کے مارا ہے)

اس لئے اہل تجربہ کا قول ہے "راہ راست رو اگرچہ دور است" (سیدھے راستہ پر چلو اگرچہ دور ہو۔)

اس قول پر اہل اقلیدس کو شبہ ہوا ہے کہ خط مستقیم تو بوجہ اقصر الخطوط الواصلہ بین النقطتین (دو نقطوں کے درمیان جو خطوط ہیں ان سب سے چھوٹے خط کو خط مستقیم کہتے ہیں) ہونے کے اقرب الطرق (راستوں میں قریب تر) ہوگا۔ وہ دور کیونکر ہو سکتا ہے؟ اسی خرابی کا نتیجہ ہے کہ محاورات کو تدقیقات پر محمول کرنے لگے۔ محاورہ میں راہ راست کہتے

ہیں راہ بے خطر کو۔ مطلب یہ ہے کہ جس راستہ میں خطرہ نہ ہو اس کو اختیار کرو اگرچہ وہ دوری کیوں نہ ہو۔ اب کچھ شبہ نہیں پس علوم کشفیہ کا مطالعہ ہرگز نہ کرنا چاہئے کیونکہ وہ خطرہ سے خالی نہیں۔ بلکہ صرف علوم معاملہ کا مطالعہ کرے کہ وہ بے خطر ہیں۔ اور میں نے وہ قول کشف صحیح کے مامون عن التلبیس ہونے کا قصداً نہیں دیکھا تھا بلکہ بلا قصد نظر سے گذر گیا اور آفت آ گئی اور کہیں حاشیہ یا شرح میں اس کا حل بھی نہ تھا لیکن خدا کا شکر ہے کہ باوجود کسی شخص کی عدم اعانت کے اشکال حل ہو گیا۔

وہ حل یہ ہے کہ ہم نے مانا کہ صاحب کشف صحیح تلبیس ابلیس سے مامون ہو جاتا ہے لیکن باوجود امن عن التلبیس کے حجیت شرعیہ اس کو لازم نہیں۔ کیونکہ ایسی نظائر موجود ہیں جہاں باوجود امن عن التلبیس کے شرعاً ایک شے حجت نہیں۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے ابصار بالنظر گو اکثر اوقات مامون عن التلبیس ہے۔ جس کی نگاہ درست ہو اس کا ابصار عموماً غلطی نہیں کرتا۔ مگر پھر بھی وہ شرعاً حجت نہیں۔ نہ اس کے مقتضاء پر اعتقاد واجب ہے نہ اس کے خلاف کا احتمال گناہ ہے۔ مثلاً ہم کو چاند سورج سے چھوٹا نظر آتا ہے مگر اس پر اعتقاد لازم نہیں۔ ممکن ہے کہ واقع میں بڑا ہو اور ہم کو چھوٹا نظر آتا ہو۔ ہاں وہ مواقع مستثنیٰ ہیں جن میں شریعت نے ابصار کو حجت مانا ہے۔ جیسے رویت ہلال وغیرہ اس نظیر کا ذہن میں آنا تھا کہ بادل سا پھٹا اور اشکال کی ظلمت رفع ہو کر دل میں نور چمکا اور حق تعالیٰ کا بار بار شکر ادا کیا ورنہ دل پر پہاڑ سا رکھا تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ اگر پہاڑ پر یہ ثقل ہوتا تو پھٹ جاتا۔ بس خطرات میں قصداً پڑ کر پھر نکلنا یہ عقلمندی نہیں، بلکہ سلامتی اسی میں ہے کہ خطرات کے پاس ہی نہ جاؤ کہ

ہرگز بگندمی گوں لاتقربوا کہ زہر است

حال پدر بیاد آر ام الکتاب وارم

(گندمی رنگ کے ہرگز قریب مت جاؤ کہ زہر ہے ام الکتاب حال پدر کی یاد رکھا ہوا) وہ تو شیخ اکبر تھے۔ مگر کہیں تم ان کے علوم کشفیہ کو دیکھ کر شیخ اکفر نہ ہو جاؤ جیسے

عالمگیر رحمتہ اللہ علیہ اکبر شاہ کے متعلق کہا کرتے تھے۔ "جدما اکفر بود" (ہمارا دادا اکفر تھا) وہاں تو خود اکبر کو اکفر کہہ رہے ہیں۔ یہاں اکبر تو اکبر ہی رہیں گے۔ ہاں ان کے کلام کو دیکھنے والا اکفر ہو جائے گا۔

اکبر کے درباری کچھ ایسے بے دین واقع ہوئے تھے کہ ہمیشہ اس تزیب کو نئے نئے طریقے سے کافر بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ سب نے مل کر اس کو نبی بنایا اور ایک شخص ابوبکر بنا اور ایک عمر بنا۔ ملا دو پیازے بھی اس مجلس میں موجود تھے۔ جب ان کی باری آئی اور ان سے پوچھا گیا کہ ملا جی آپ کیا بننا چاہتے ہیں؟ تو بولے میں اس جماعت کا ابوجہل ہوں۔ میں تم سب کی تکذیب کرتا ہوں کہ تمہارا نبی بھی جھوٹا اور اس کے ساتھی بھی جھوٹے۔ کیونکہ نبی کے واسطے اس کی بھی ضرورت ہے کہ کوئی اس کا مکذب بھی ہو تو مؤکذٰلِکَ جَعَلْنَا لِکُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ یُوْحِیْ بَعْضُھُمْ اِلٰی بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا۔ (اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن بہت سے شیاطین پیدا کئے تھے کچھ آدمی اور کچھ جن، جن میں سے بعضے دوسرے بعض کو چکنی چپڑی باتوں کا وسوسہ ڈالتے رہتے تھے تاکہ ان کو دھوکہ میں ڈال دیں۔)

ملا جی کی اس بات پر دربار میں قہقہہ پڑ گیا۔ وہ نبوت درہم برہم ہو گئی اور یہ حکایات افواہی ہیں۔ ابوالفضل ہی اکبر نے ایک مکتوب میں ان سب خرافات سے اپنا تبریہ بھی کیا ہے جو اس کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ پس خلاصہ جواب کا یہ ہوا کہ ہم نے مانا کہ صاحب کشف صحیح کو تلبیس نہیں ہوئی مگر پھر بھی کشف شرعاً حجت نہیں۔ نہ خود صاحب کشف پر، نہ دوسروں پر۔ جیسے میں نے ابھی کہا کہ چاند کو ہم آفتاب سے چھوٹا دیکھتے ہیں مگر شرعاً یہ ابصار حجت نہیں۔ نہ اس پر اعتقاد رکھنا واجب، نہ اس کے خلاف کا اعتقاد حرام۔ بہرحال میں اپنے دوستوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ شیخ اکبر کی تصانیف کا ہرگز مطالعہ نہ کریں۔ نہ معلوم کس چکر میں پڑ جائیں۔ تمہارے لئے شیخ اکبر سے شیخ اصغر ہی اچھا۔ یہ بات میں تجربہ کے بعد کہہ رہا

ہوں اور مشہور تعلیم ہے سَلِ الْمُجَرِّبَ وَلَا تَسْئَلِ الْحَكِيمَ (تجربہ کار سے دریافت کرو حکیم سے مت پوچھو۔)

علوم کشفیہ اور تصوف: یاد رکھو کہ علوم کشفیہ کو تصوف سے کچھ تعلق نہیں مگر چونکہ بعض صوفیہ اہل کشف تھے اور انہوں نے اپنی کشفیات کو تقریراً و تحریراً ظاہر کیا جس سے ناقص الفہم گمراہ ہونے لگے۔ اس لئے محققین صوفیہ نے ان کی حقیقت ظاہر کر کے اشکالات کو رفع کرنا چاہا۔ اس لئے علوم کشفیہ تصوف سمجھے جانے لگے۔ اگر یہ حضرات اہل کشف اپنے علوم کو ظاہر نہ کرتے تو محققین کو ان سے بحث کرنے کی ضرورت نہ ہوتی بلکہ وہ اصل مقصود ہی کی تحقیق میں رہتے۔ یعنی علوم معاملہ کی تفصیل میں کیونکہ قرب حق کا مدار معاملہ پر ہے نہ کہ علوم کشفیہ پر خوب سمجھ لو۔ اب یہاں سے سمجھ میں آگیا ہوگا کہ متکلمین پر جو بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ انہوں نے علوم قرآن کو چھوڑ کر خواہ مخواہ تدقیق سے کام لیا۔ یہ ان کی کوتاہ نظری ہے۔ کیونکہ متکلمین نے ضرورت سے مجبور ہو کر ایسا کیا ہے جب کہ لوگ خود تدقیق کرنے لگے اور شبہات میں پڑ گئے تھے۔ اگر لوگ شبہات میں نہ پڑتے تو ان کو ضرورت نہ تھی۔ پس تم بھی شبہات میں نہ پڑو اور سند اصلیہ پر رہو تو واقعی اس سے بہتر کوئی راستہ نہیں۔

علماء کی احتیاط: امام ابوالحسن اشعریؒ کی حکایت ایک ثقہ سے سنی ہے کہ ایک عالم ان سے ملنے گئے مگر چونکہ صورت سے ناآشنا تھے اسلئے خود آپ ہی سے پوچھا کہ شیخ ابوالحسن اشعری کون سے ہیں؟ فرمایا تم میرے ساتھ دربار شاہی میں چلو، وہاں بتلاؤں گا۔ چنانچہ دونوں دربار شاہی میں پہنچے۔ وہاں ہر قسم کے علماء مجتمع تھے محدثین بھی، فقہاء بھی، فلاسفہ بھی، متکلمین بھی، معتزلہ بھی اور اہل سنت بھی، امام ابوالحسن اشعریؒ کے پہنچنے کے بعد ایک شخص نے ذات و صفات کے کسی مسئلہ میں گفتگو شروع کی۔ اس کے بعد دوسرے علماء نے اس کے متعلق اپنی اپنی تحقیقات بیان کیں۔ معتزلہ نے اہل سنت کے مسلک پر اعتراضات

گئے۔ اہل سنت نے ان کو جواب دیئے۔ یہ سب کچھ ہوتا رہا مگر امام ابوالحسن خاموش بیٹھے رہے جب سب علماء اپنی اپنی کہہ چکے تو اخیر میں شیخ نے کھڑے ہو کر معتزلہ و فلاسفہ کو خطاب کر کے ان کی سب باتوں کا جواب دیا اور ان مسائل کی ایسی تحقیق کی کہ جس پر فلاسفہ کو بولنے کا موقع نہ رہا۔ اس سے فارغ ہو کر بیٹھے تو اپنے رفیق سے کہا کہ ابوالحسن میں ہی ہوں۔ یہ بزرگ بہت خوش ہوئے اور کہا واقعی جیسا سنا تھا اس سے بڑھ کر پایا۔ پھر ان بزرگ نے اپنی کتاب میں امام کی بہت تعریف لکھی اور اخیر میں یہ لکھا ہے کہ جب امام ابوالحسنؒ سب کو جواب دے چکے تو میں نے عرض کیا کہ حضرت آپ نے اول ہی ان مسائل کی تحقیق کیوں نہ بیان کر دی جو اخیر میں بیان فرمائی ہے تاکہ مخالفین کو اعتراض کا موقع ہی نہ ملتا۔ امام نے جو اس سوال کا جواب دیا وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ فرمایا کہ ان مسائل میں خود تکلم کرنا بدعت ہے کیونکہ ان میں تکلم کرنا خلاف سنت ہے۔ تو میں نے ابتداءً ان میں تکلم کو جائز نہ سمجھا مگر جب اہل بدعت نے مذہب حق پر اعتراض کیا۔ تو اب جواب کی غرض سے تکلم کی ضرورت ہوئی۔ اس لئے میں ابتداء میں خاموش رہا اور اخیر میں مجبور ہو کر بولا جب کہ حق پر اعتراضات ہونے لگے کہ اب سکوت کی گنجائش نہ رہی اب ایسے محتاط علماء کہاں ہیں۔ اب تو ہر شخص ذرا سے سوال پر اپنی تحقیقات بیان کرنے لگتا ہے۔

چنانچہ آج کل لوگوں کو یہ سبق مل گیا ہے کہ جو ملتا ہے سلطان ابن سعود کے متعلق سوال کرتا ہے کہ ان کے بارے میں آپ کا کیا اعتقاد ہے؟ اب لگے مولوی صاحب اپنی تحقیق بیان کرنے۔ جس میں خواہ مخواہ فضول وقت ضائع ہوتا ہے۔ صاحبو! صاف یوں ہی کیوں نہ کہہ دو کہ ہم کو کچھ خبر نہیں۔ اور یہ کہہ کر اپنے کام میں لگو اور واقعی ہندوستان کے رہنے والوں کو کیا خبر ہمارے پاس بجز اخباروں کے تحقیق کا ذریعہ ہی کیا ہے اور اخباروں کی دیانت کا جو حال ہے سب کو معلوم ہے۔

رہا حجاج کے بیان سے استدلال کرنا سو اس کی یہ حقیقت ہے کہ ہر شخص اپنے مذاق کے موافق حالت بیان کرتا ہے۔ بعض لوگ اول اول ابن سعود کی تعریف کرتے ہوئے

اٹھے تھے کیونکہ اس وقت تک ابن سعود کا طرز عمل بظاہر ان کے مذاق کے موافق تھا اور ان کو یہ اُمید تھی کہ وہ شخصی سلطنت قائم نہ کریں گے بلکہ جمہوری قائم کریں گے۔ پھر دوبارہ جو یہ رنگ دیکھ کر آئے کہ سلطان نے اپنی ملوکیت کا اعلان کر دیا اور شخصی سلطنت قائم کرلی تو وہی تعریف کرنے والے جو سلطان کو امام وقت اور فرشتہ خصلت کہتے تھے، اب اس کو شیطان سے بدتر کہنے لگے۔ اس حالت میں کسی کے بیان پر کیا خاک اعتماد کیا جائے۔ پس اسلم یہی ہے کہ سکوت کیا جائے اور کہہ دیا جائے کہ ہم کو تحقیق نہیں مگر اس جواب سے شرماتے ہیں کیونکہ اس میں جہل کا اقرار ہے۔ حالانکہ صاحب علم ہونے کے لئے ہر بات کا جاننا ضروری نہیں تو کسی ایک بات کے نہ جاننے سے آپ کا جاہل ہونا کیونکر لازم آیا۔

معلومات اور مجہولات: بزرجمہر کا قصہ ہے جو نوشیرواں کا وزیر اعظم تھا کہ اس سے ایک بڑھیا نے کسی بات کے متعلق سوال کیا بزرجمہر نے کہا کہ مجھے اس کی تحقیق نہیں۔ بڑھیا نے حیرت سے کہا کہ تم کو وزیر ہو کر اس بات کی خبر نہیں ہے۔ پھر تم اتنی بڑی تنخواہ کس بات کی پاتے ہو؟ بزرجمہر نے کہا کہ اتنی تنخواہ تو میں اپنی معلومات کے عوض میں پاتا ہوں۔ اگر مجہولات کی تنخواہ پاتا تو خزائن ہفت اقلیم بھی کافی نہ ہوتے۔ دوسرے آپ کو معلوم بھی ہے کہ "میں نہیں جانتا" کہنا جہل کی دلیل نہیں بلکہ علم کی دلیل ہے چنانچہ ایک بار مولانا محمد اسمٰعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ نے وعظ فرمایا کسی نے کہا سبحان اللہ کیا علوم ہیں۔ مولانا نے فرمایا میں تو کچھ بھی نہیں جانتا۔ اس شخص نے کہا یہ حضرت کی تواضع ہے۔ فرمایا یہ تواضع نہیں بلکہ تکبر کا قول ہے کیونکہ لا اعلم (میں نہیں جانتا) بڑا عالم ہی کہہ سکتا ہے جس پر علم کی وسعت منکشف ہو چکی ہو ورنہ جس پر وسعت علم منکشف نہیں ہوئی وہ ہر بات میں علم کا دعویٰ کرتا ہے۔

تیسرے لا اعلم کہہ دینا بڑی راحت کی بات ہے اور اعلم (میں جانتا ہوں) کہنا مصیبت کو اپنے سر لینا ہے۔ اس لئے ایک عاقل کی رائے ہے کہ حتی الامکان جواب نفی میں دیا کرو کیونکہ نفی میں جواب دینا اہون ہے اور اثبات میں جواب دینا اشد ہے مثلاً اگر تم سے کسی نے سوال

کیا کہ آپ نے کلکتہ دیکھا ہے۔ اس کے جواب میں اگر یہ کہہ دیا کہ ہاں دیکھا تو بس سوالات شروع ہو جائیں گے کہ بتلاؤ وہاں کیا کیا عجائبات ہیں۔ چڑیا گھر کتنا بڑا ہے اور قلعہ کیسا ہے وغیرہ وغیرہ اگر یہ کہہ دیا کہ میں نے کلکتہ دیکھا نہیں۔ تو اس پر کوئی سوال نہیں ہو سکتا۔ پس راحت اسی میں ہے کہ جب کوئی فضول سوال کرے تو اس کے جواب میں یا تو اپنے جاہل ہونے کا اقرار کرے یا سائل کو جاہل بناوے۔ اگر لڑائی کا اندیشہ نہ ہو۔ اور یہ کہہ دے کہ اس سوال کا جواب سمجھنے کے لئے تمہارا فہم کافی نہیں۔

جیسے علی گڑھ میں میرے پاس ایک صاحب آئے جو کالج میں عربی یا انگریزی کے پروفیسر تھے اور وہاں دونوں زبانوں میں یکتا مشہور تھے۔ انہوں نے ایک حدیث کا متن پڑھا جس کا مفہوم یہ ہے کہ جہاں زنا کی کثرت ہوتی ہے۔ وہاں طاعون پھیلتا ہے۔ اور یہ کہا کہ یہ سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے کہا کہ حدیث کا مدلول سمجھ میں نہیں آیا یا جنایت اور عقوبت میں ارتباط سمجھ میں نہیں آیا؟ کہا ارتباط سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے کہا۔ ارتباط نہ سمجھنے سے ضرر کیا ہوا؟ کہنے لگے کہ ضرر تو کچھ نہیں ہوا لیکن معلوم ہونے میں نفع تھا۔ میں نے کہا وہ نفع کیا تھا؟ کہنے لگے اطمینان ہو جاتا۔ میں نے کہا کہ خود اطمینان کے مطلوب ہونے کی کیا دلیل ہے؟ کہنے لگے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ (لیکن اس لئے تاکہ میرا قلب مطمئن ہو جائے) میں نے کہا اور اس کی کیا دلیل کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اطمینان مفید تھا تو آپ کو بھی ہوگا؟ کیونکہ ممکن ہے ایک شئے کسی کو مفید ہو اور کسی کو مفید نہ ہو جیسا کہ ادویہ میں مشاہدہ ہے کہ ایک دوا ایک شخص کو موافق ہوتی ہے دوسرے کو موافق نہیں ہوتی۔ اس پر وہ خاموش ہو گئے۔ بعد میں میں نے کہا کہ آپ یہ نہ سمجھئے گا کہ مولویوں کو احکام کی حکمتیں معلوم نہیں الحمد للہ ہمارے پاس اسرار و حکم کا خزانہ موجود ہے مگر ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

مصلحت نہیں ہے کہ راز فاش ہو جائے ورنہ عارفین کی مجلس میں کوئی ایسی خبر نہیں کہ

معلوم نہ ہو)

اور گو یہ ظاہر میں تکبر تھا مگر صوفیہ کا ارشاد ہے اَلتَّکَبُّرُ مَعَ الْمُتَکَبِّرِیْنَ عِبَادَۃٌ۔ متکبرین سے تکبر کرنا عبادت ہے۔ یہ بات میں نے اس لئے کہہ دی تاکہ وہ نہ سمجھیں کہ علماء کورے ہیں ان کو کچھ معلوم نہیں کیونکہ آج کل تو تعلیم یافتہ جماعت کو اپنی عقل وفہم پر بہت ناز ہے ان کے چلے جانے کے بعد میں نے دوستوں کے سامنے اس حدیث کے متعلق ایک تحقیق بیان کی جو میرے ذہن میں تھی۔ جس سے زنا و طاعون کے درمیان ارتباط ظاہر ہوتا ہے۔ احباب کہنے لگے کہ تم نے یہ تحقیق ان پروفیسر صاحب کے سامنے بیان نہ کر دی، وہ بہت خوش ہوتے۔ میں نے کہا تم نہیں جانتے یہ لوگ حکم کو بناء احکام قرار دیتے ہیں ان کو حکمت بتلانا ان کے مرض کو بڑھانا ہے۔ ان کے لئے اسی جواب کی ضرورت ہے کہ حکمت کا جاننا کیا ضرور ہے؟ اور آپ لوگ حکمت کو بناء احکام نہیں سمجھتے

دوسرے یہ کہ وہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ سے اطمینان کے مطلوب ہونے پر استدلال کرتے ہیں تو اول تو یہ استدلال اس لئے صحیح نہیں کہ وہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حق تعالیٰ سے طلب اطمینان کا اظہار کیا تھا مخلوق سے انہوں نے اطمینان نہیں چاہا تھا پھر تم مخلوق سے اطمینان کے طالب کیوں ہو۔ دوسرے وہاں حق تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اطمینان مشاہدہ سے کر دیا تھا کہ مردہ کو زندہ کرکے دکھلا دیا تھا جس میں شبہ کی گنجائش نہ تھی اور میں اگر ان پروفیسر صاحب کا اطمینان کرتا تو مقدمات ظنیہ سے کرتا جو ممکن ہے کسی وقت ٹوٹ جاتے یا کم از کم ان کے نزدیک مخدوش ہو جاتے تو پھر ان کا اطمینان بھی رخصت ہو جاتا اور اطمینان سے زائل ہونے کے بعد وہ حدیث کی بھی تصدیق نہ کرتے۔ کیونکہ ان کے ذہن میں حدیث کی صحت ان ہی مقدمات پر مبنی تھی۔ اس لئے ان کے سامنے یہ تقریر مناسب نہ تھی۔ جواب میں سائل کے مزاج کا اتباع نہیں کرتا بلکہ اس کے مرض کا علاج کرتا ہوں تاکہ اس کو اپنی غلطی پر تنبیہ ہو۔

میرے پاس ایک صاحب جو ایک اردو کے اسکول میں مدرس تھے آئے کہ مجھے تقدیر کا مسئلہ سمجھا دو۔ میں نے کہا کہ آپ کی غرض سمجھنے کی کون؟ کہنے لگے میں سمجھوں گا میں نے

کہا تم نہیں سمجھ سکتے اور میں ایسے شخص سے خطاب نہیں کر سکتا جس کو میں جانتا ہوں کہ اس مسئلہ کو نہیں سمجھ سکتا۔ تم کسی طالب علم کو لے آؤ میں اس کے سامنے تقریر کر دوں گا تم بھی سن لینا۔ اس سے تم کو یہ بھی معلوم ہو جائیگا کہ تم نہیں سمجھ سکتے اور یہ معلوم ہو جائے گا کہ مولویوں کے پاس تمہارے سوالوں کے جوابات ہیں۔

میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ یہ صاحب اسکول کے معلم تھے۔ جن کی لیاقت کا یہ حال ہے کہ ایک صاحب نے اعتراض کو اعتراز لکھا تھا کسی نے ٹوکا تو کہا جی ہاں غلطی ہو گئی ظاد سے لکھنا چاہیے تھا۔ انگریزی میں تو بی اے، ایم اے ہو جاتے ہیں اور علوم عربیہ سے اتنی اجنبیت کہ اعتراض کا املا بھی صحیح نہیں۔ میں تو کہا کرتا ہوں کہ انگریزی خواں ترقی معکوس کرتے ہیں بے سے بی بنتے ہیں یعنی عزت جو بی اے کا جزو اول ہے پھر میم بن جاتے ہیں کہ ایم اے اور میمیں ہیں قریب ہیں اور اس پر دعویٰ یہ ہے کہ ہم ہر بات کو سمجھتے ہیں اور ہمارے علماء ایسے خوش اخلاق ہیں کہ ان لوگوں کے ہر سوال پر جواب کی تقریر کرنے لگتے ہیں اور احکام شرعیہ کی حکمتیں بیان کرنے لگتے ہیں: یہ خوش اخلاقی نہیں بچہ کے ہاتھ میں سانپ دینا ہے۔ تم کو تو سانپ کا پکڑنا جائز ہے کیونکہ تمہارے پاس منتر اور تریاق موجود ہے۔ بچہ کو سانپ دینا اسے ہلاک کرنا ہے اسی طرح علوم غامضہ کی تقریر جاہلوں کے سامنے کرنا ان کو ہلاک کرنا ہے۔ کیونکہ اس سے جو ان کو شبہات پیدا ہوں گے ان کا علاج ان کے پاس نہیں۔ بس ان کو تو صاف جواب دو کہ قرآن و حدیث میں یہی آیا ہے تم کو ماننا پڑے گا اور جو اس جواب کو نہ مانے اس کو منہ نہ لگاؤ۔

آنکس کہ بقرآن و خبر زو نہ رہی ۔۔۔۔۔ آنست جوابش کہ جوابش ندہی

(جس شخص سے قرآن و حدیث سے تو نہ چھوٹے۔ اس کا جواب یہی ہے کہ اس کو جواب نہ دو)

بحث اور تسلی

اور میں بقسم کہتا ہوں کہ اطمینان اور تسلی اسی سے ہوتی ہے کہ میں اللہ و رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم کو بلا دلیل مانتا ہوں۔ اسرار اور حکم کے دریے ہونے سے پوری تسلی نہیں ہوتی۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ جو بہت بڑے معقولی اور فلسفی ہیں۔ متکلم بھی بڑے

دیے کے ہیں۔ اخیر عمر میں اپنی عمر بھر کا تجربہ بیان کرتے ہیں ؎

نِهَايَةُ اِقْدَامِ الْعُقُوْلِ عِقَالٌ — وَغَايَةُ سَعْيِ الْعَالَمِيْنَ ضَلَالٌ

وَلَمْ نَسْتَفِدْ مِنْ بَحْثِنَا طُوْلَ عُمْرِنَا — سِوٰى اَنْ جَمَعْنَا فِيْهِ قِيْلَ يُقَالُ

(دنیا والوں کی کوشش کا خلاصہ ضلال ثابت ہوا بجز بک بک اور قیل قیل کے کچھ حاصل نہ ہوا عمر یوں ہی ضائع کی)

کہ ہم کو عمر بھر کی بحث سے سوائے قیل وقال کے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ ان ہی امام رازی کا قصہ سنا گیا ہے کہ یہ شیخ نجم الدین کبری رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہونے گئے تھے۔ شیخ نے بیعت کیا۔ اور ذکر وشغل تعلیم کر کے ایک حجرہ میں رہنے کا امر کیا۔ یہ ذکر وشغل میں مصروف ہو گئے تو چند روز کے بعد یہ محسوس ہوا کہ دل میں سے کوئی چیز نکل کر بھاگی جا رہی ہے شیخ سے عرض کیا فرمایا یہ آپ کا منطق وفلسفہ ہے جو قلب سے نکل رہا ہے۔ انہوں نے کہا حضرت میں نے تو اس کو بڑی محنت سے حاصل کیا تھا اس کا قلب سے محو ہونا تو مجھے گوارا نہیں۔ فرمایا اس کے عوض تم کو حق تعالیٰ دوسرے علوم عطا فرمائیں گے جو حقیقی علوم ہیں اور یہ تو کتابی علم ہے وہ وہبی علم ہوگا ؎

بینی اندر خود علوم انبیاء — بے کتاب وبے معید واستا

(بے کتاب وبے مددگار واستاد کے اپنے اندر — انبیاء جیسے علوم پاؤ گے)

مگر امام رازی کو گوارا نہ ہوا۔ شیخ نے کہا خیر تمہیں اختیار ہے۔ چنانچہ یہ ذکر وشغل چھوڑ کر درس وتدریس میں مشغول ہو گئے۔ اتفاق سے شیخ کی زندگی ہی میں امام کی وفات کا وقت آ گیا اور نزع کی حالت میں شیطان ان کے پاس آیا اور کہا تم دنیا سے جا رہے ہو توحید بھی سالم لے چلے ہو کہا ہاں الحمد للہ میری توحید سالم ہے۔ شیطان نے کہا ذرا مجھے تو بتلاؤ تمہارے پاس توحید کی کیا دلیل ہے۔ امام رازی نے کتاب التوحید میں توحید کے سو دلائل لکھے تھے وہ بیان کرنا شروع کئے اور شیطان کم بخت نے ایک ایک دلیل کو توڑنا شروع کیا یہاں تک کہ ان

کے تمام دلائل کو توڑ دیا۔ اب تو امام رازی کا رنگ فق ہو گیا۔ شیطان نے کہا کہ یہ تو آپ کی توحید کا حال تھا جو رکن اعظم اسلام ہے جس میں آپ جہل مرکب کے اندر مبتلا تھے۔ اس پر دوسرے مسائل کو بھی قیاس کر لو۔ یہ واقعہ شیخ نجم الدین کبریٰ کو منکشف ہو گیا۔ اس وقت شیخ وضو کر رہے تھے۔ امام رازی کی پریشانی دیکھ کر شیخ گھبرا گئے اور فرمایا کہ اس وقت ایک بہت بڑے عالم کا ایمان خطرہ میں ہے۔ ایک خادم جو حضرت کو وضو کرا رہا تھا بولا کہ حضرت پھر آپ دستگیری فرمایئے شیخ رحمتہ اللہ علیہ نے اسی جگہ سے ایک چلو پانی امام رازی کی طرف پھینکا۔ حالانکہ وہ بہت دور دراز فاصلہ پر تھے مگر شیخ کی کرامت تھی کہ حق تعالےٰ نے وہ چلو بھر پانی امام رازی کے منہ پر پہنچا دیا جس سے ان کے حواس بجا ہوئے۔ پھر شیخ نے کہا کہ شیطان سے یہ کیوں نہیں کہہ دیتے کہ "نا معقول میں بلا دلیل خدا کو واحد اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو سچا رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) مانتا ہوں" بطور کرامت ہی کے یہ آواز بھی ان کے کان میں پہنچی۔ جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جمعہ کا خطبہ پڑھتے ہوئے منکشف ہوا کہ لشکر اسلام دشمن کے نرغہ میں ہے اور دشمن غالب ہوا چاہتا ہے، تو آپ نے خطبہ ہی میں جوش سے فرمایا یَا سَارِیَۃُ الْجَبَلَ یَا سَارِیَۃُ الْجَبَلَ کہ اے ساریہ (یہ سردار لشکر کا نام ہے) پہاڑ کی پناہ لو اور حق تعالےٰ نے یہ آواز مدینہ سے لشکر اسلام میں پہنچا دی جو اس وقت شام یا عراق میں تھا اور حضرت ساریہؓ نے حضرت عمرؓ کی آواز سنکر پہاڑی مورچہ پر قبضہ کر لیا جس کے بعد دشمن کی فوج کے حوصلے پست ہو گئے اور لشکر اسلام کو فتح ہوئی۔ ایسا ہی یہاں ہوا اور امام رازی نے شیطان کو بھی جواب دیا کہ "نا معقول میں بلا دلیل کے خدا کو واحد اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو سچا رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) مانتا ہوں" یہ جواب دینا تھا کہ شیطان دم دبا کر بھاگا اور حضرت شیخ نے خادم کو بشارت دی کہ الحمد للہ امام رازی شیطان کے جال سے نکل گئے۔

دست پیر از غائباں کوتاہ نیست

دست او جز قبضۂ اللہ نیست،

(پیر کا ہاتھ (توجہ) غائبوں سے کوتاہ نہیں ہے۔ اس کا سوائے اللہ کے دوسرے کے قبضہ میں نہیں ہے)

اس میں علم غیب کا دعویٰ نہیں ہے کہ پیروں کو (معاذ اللہ) مریدوں کا حال ہمیشہ معلوم ہو جاتا ہے بلکہ بات یہ ہے کہ حضرات مقبولانِ الٰہی ہیں تو جو ان سے وابستہ ہوتا ہے اللہ تعالےٰ اس کو محروم نہیں رکھنا چاہتے۔ جس کے طرق مختلف ہوتے ہیں اور ان میں سے ایک طریق یہ بھی ہے کہ بعض اوقات اللہ تعالےٰ ان مشائخ کو کشف کے ذریعے سے اطلاع دے دیتے ہیں اور ان کو حکم دیتے ہیں کہ اس شخص کی امداد کرو اور کبھی شیخ کو اطلاع بھی نہیں ہوتی۔ کوئی لطیفہ غیبی شیخ کی صورت میں آکر مدد کر جاتا ہے۔ بس اصل یہ ہے کہ اگر ابتلاءً اللہ کی طرف سے وارد ہے تو لطفاً انہی کی طرف سے درمان بھی ہے ؎

درد از یار است و درماں نیز ہم　　دل فدائے او شد و جاں نیز ہم

(بیماری دوست کی طرف سے اور علاج بھی۔ اس پر میرا دل فدا ہے اور جان بھی)

بیماری بھی وہی دیتے ہیں نسخہ بھی وہی پلاتے ہیں یہ ہر وقت کا مشاہدہ ہے کہ اس طریق میں جال بھی ہیں اور ان کے کاٹنے کی قینچیاں بھی ہیں۔ اسی کو مولانا نہایت جوش سے فرماتے ہیں ؎

صد ہزاراں دام و دانہ است اے خدا　　ما چو مرغانِ حریص و بے نوا
دمبدم پابستہ دام تو ایم　　گر ہمہ شہباز و سیمرغے شویم
می رہانی ہر دمے مارا و باز　　سوئے دامے می رویم اے بے نیاز

(اے خدا سینکڑوں جال اور دانہ ہیں ہم پرندوں کی طرح حریص و بے نوا ہیں ہر دم آپکے جال کے پابستہ ہیں اگرچہ شہباز اور سیمرغ کیوں نہ ہوں ایک جال سے آپ ہم کو رہائی دیتے اور ہم دوسرے جال میں پھنس جاتے ہیں)

ایک جال سے نکلتے ہیں دوسرے میں پھنستے ہیں پھر حق تعالیٰ نے اس کے

کاٹنے کو بھی قینچی تیار کر رکھی ہے۔ بس یہی قصہ ہے کہ ہر وقت کا مرنا اور ہر وقت کا جینا ہے۔

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را　　　ہر زمان از غیب جانِ دیگر است

(خنجرِ تسلیم کے کشتوں کو ہر زمانہ میں ایک اور جان عطا ہوتی ہے۔)

چنانچہ امام رازیؒ کو اللہ تعالےٰ نے ایک بیماری دی کہ شیطان نے ان کو پریشان کر دیا تو اس کے ساتھ دوا بھی نازل کی کہ شیخ کو کشف ہو گیا۔ شیخ نے خادم کو اس حال پر مطلع کیا اس نے امام کی سفارش کی کہ دستگیری فرمائیے شیخ کو جوش ہوا کیونکہ وہ ماذون من اللہ تھے اور انہوں نے باطناً بھی توجہ کی جس سے امام رازی کے قلب سے وساوس و خطرات رفع ہو گئے اور ظاہری اعانت بھی کی کہ وہ جواب تعلیم کیا جس نے شیطان کے جال کو تار تار کر کے توڑ دیا۔ اسی لئے تو حدیث میں ہے فَقِیۡهٌ وَاحِدٌ اَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ اَلْفِ عَابِدٍ ایک فقیہہ ہزار عابدوں سے زیادہ شیطان پر بھاری ہے۔ یہاں فقیہہ سے مراد عارف ہے جو مکائد شیطان سے واقف ہو، جزئیات فقہ کا حافظ مراد نہیں۔ کیونکہ جزئیات فقہ تو امام رازیؒ کو شیخ نجم الدین کبریؒ سے زیادہ یاد تھے۔ مگر دیکھ لیجئے کہ شیطان کے جال کو کس نے توڑا۔

اسی لئے میں کہتا ہوں کہ اسرار اور حکم اور ابحاث سے تسلی حاصل نہیں ہو سکتی، اور نہ ان سے شیطان بھاگتا ہے۔ تسلی اسی سے ہوتی ہے کہ خدا کا حکم یوں ہی ہے بس ہم بے دلیل کے مانتے ہیں اسرار و حکم کے یا علوم کشفیہ کے درپے نہ ہو یہ خطرات سے خالی نہیں۔ بس طریق تصوف سے اتنا حصہ لے لو کہ اخلاص و احسان حاصل کر لو جس کو نسبت کہتے ہیں بس اس سے زیادہ اور کچھ نہ لو۔ صوفیہ کی تحقیقات اور کشفیات کا مطالعہ یہ سانپ ہیں ان سے دور رہو۔

نکتہ ہا چوں تیغ پولاد ست تیز　　　چوں نداری تو سپر واپس گریز

پیش ایں الماس بے اسپر میا　　　کز بریدن تیغ را نبود حیا

(تصوف کی باریکیاں فولادی تلوار سے بھی زیادہ تیز ہیں جب تمہارے پاس ڈھال نہیں ہے واپس آؤ۔ اس تلوار کے سامنے بغیر ڈھال نہ آؤ۔ اس لئے تلوار کو کاٹنے سے

حیا نہیں آتی۔

اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ علل اور اسباب سے تسلی نہیں ہوتی بلکہ اطمینان اسی سے ہوتا ہے کہ اللہ و رسول صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ حکم ہے۔ اس کی تائید اس قصہ سے تو ہوتی ہی ہے جو ابھی بیان کیا گیا ہے۔ حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے وسوسہ کا علاج یہ بتلایا ہے کہ وسوسے کے وقت اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَرُسُوْلِہٖ کہیں اللہ اور اس کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا کیا حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو دلائل معلوم نہ تھے یقیناً معلوم تھے مگر دلائل میں غور کرنے کی تعلیم اسی لئے نہیں فرمائی کہ یہ سلسلہ غیر متناہی ہے۔ اس سلسلہ میں شبہات پر شبہات نکلتے چلے آئیں گے۔

اس لئے وہ بوٹی بتلائی جو ہزار جواہرات سے بھی انفع ہے مگر افسوس اس کی قدر نہیں کی جاتی کیونکہ بوٹی بہ نسبت جواہر کے ارزاں اور سہل الحصول ہے اور

جواب جاہلاں

قاعدہ ہے ؎

ہر کہ او ارزاں خرد ارزاں دہد　　گوہرے طفلے بقرص ناں دہد

(جو شخص کسی چیز کو ارزاں لیتا ہے، ارزاں دے بھی دیتا ہے۔ چنانچہ بچہ نادان قیمتی موتی کو روٹی کے عوض دیدیتا ہے)

لوگ لمبے لمبے جوابوں کی قدر کرتے ہیں۔ مختصر اور سہل جواب کی قدر نہیں کرتے آج کل ہی میں شاملی سے ایک پان فروش کا خط آیا تھا جس میں اسی قسم کا سوال تھا۔ میں نے اس کا مختصر جواب دیا تو وہ لکھتے ہیں کہ خشک جواب سے تسلی نہیں ہوتی۔ چونکہ وہ پان فروش ہے اور پان پانی کا نرم تو اس نے پانوں کی طرح جواب کے لئے بھی تری لازمی سمجھی۔

مگر یہ ایسا قیاس ہے جیسا شیخ سعدیؒ کی باندی نے قیاس کیا تھا کہ ایک شخص شیخ سے ملنے آیا۔ باندی دروازہ پر نام پوچھنے گئی اور کچھ دیر تک اس سے باتیں کر کے واپس آئی تو شیخ نے پوچھا کون تھا؟ کہا عبداللہ دغین معجمہ سے۔ شیخ نے فرمایا غین عبداللہ کی کیا ہے؟ کہا

اس کی عین یعنی آنکھ میں نقطہ یعنی بھولا ہے اس لئے میں نے بجائے عبداللہ کے غبداللہ کہا پوچھا وہ کیا کہتا تھا؟ کہا کچھ نہیں ایک معمولی بات تھی۔ میں نے خود ہی جواب دیا وہ یہ پوچھتا تھا کہ استنجا میں پاکی کب ہوتی ہے۔ کتنا دھویا جائے؟ میں نے کہا اتنا دھویا جائے کہ کھال چوں چوں بولنے لگے۔ جیسے برتن کو رگڑتے ہیں تو وہ چوں چوں کرتا ہے اس نے موضع استنجاء کو برتن پر قیاس کیا، ایسے ہی اس پان فروش نے جواب سوال کو پانوں پر قیاس کیا کہ جواب بھی تر ہونا چاہئے۔ حالانکہ یہ قیاس غلط ہے۔ جواب کے لئے تری کی ضرورت نہیں۔ بعض دفعہ خشکی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ بلکہ بعض دفعہ ضرب یضرب یعنی سختی کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور ضرب یضرب میں ایسی برکت ہے کہ اس سے بہت جلد تمام مشتبہات حل ہو جاتے ہیں۔ ہمارے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ؎

اَلْوَعْظُ یَنْفَعُ لَوْ بِالْعِلْمِ وَالْحِکَمِ وَالسَّیْفُ اَبْلَغُ وُعَّاظٍ عَلَی الْقِمَمِ

(نصیحت اگر علم و حکمت کے ساتھ ہو تو نفع پہنچاتی ہے اور تلوار سروں پر پڑنی نصیحت گروں میں سب سے بلیغ نصیحت گر ہے)

اور کئی مرتبہ فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانچ کتابیں نازل فرمائی ہیں چار تو مشہور ہیں تورات و زبور و انجیل و قرآن اور ایک پانچویں کتاب بھی آسمان ہی سے نازل ہوئی ہے چنانچہ ارشاد ہے وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ (اور ہم نے لوہے کو پیدا کیا جس میں شدید ہیبت ہے) جب چاروں کتابوں سے کسی کی اصلاح نہ ہو تو اس کے لئے پانچویں کتاب کی ضرورت ہے وہ حدید ہے یعنی لٹھ دار جوتا۔

ایک شخص وساوس میں مبتلا تھے اور میں ان کا علاج کرتا تھا ایک دن وہ کہنے لگے کہ اب تو یہ وسوسہ ہوتا ہے کہ عیسائی ہو جاؤں میں نے اس کے جواب

میں نے زور سے ایک دھول رسید کیا اور کہا نالائق جا دور ہو ابھی عیسائی ہو جا! اسلام کو ایسے نالایقوں کی ضرورت نہیں! اس دھول کی ایسی برکت ہوئی کہ دس برس سے زیادہ زمانہ ہوا آج تک ان کو ایک دو شبہات بھی تو نہ ہوئے۔

اسی طرح ایک ذاکر کی عادت تھی کہ وہ ذکر میں اٹھ اٹھ کر بھاگتے تھے میں نے اس کا یہ علاج کیا کہ اپنے پاس بٹھلا کر ان سے ذکر کرایا اور جب بھاگنے لگے زور سے ہاتھ پکڑ کر بٹھلا دیا اور دو دھپ رسید کئے۔ پھر عمر بھر ان کو یہ جوش نہ آیا خیر یہ طرزِ عمل تو سب کے ساتھ نہیں ہو سکتا کیونکہ ہماری حکومت نہیں لیکن یہ تو ہو سکتا ہے کہ جاہلوں کو منہ نہ لگایا جائے اور ان کے لایعنی سوالات کا خشک جواب دیا جائے اس سے بھی ان کا دماغ درست ہو جاتا ہے۔

چنانچہ ایک بار میں سہارنپور گیا تو وہاں ایک صاحب بہشتی زیور بغل میں دبائے ہوئے لائے اور ایک مسئلہ دکھا کر مجھ سے کہنے لگے کہ یہ مسئلہ دیکھ لیجئے میں نے کہا کہ میری تو ساری کتاب بار بار کی دیکھی ہوئی ہے۔ مجھے آپ کیا دکھلاتے ہیں؟ کہنے لگے یہ مسئلہ سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے کہا کہ اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا یا اس کی دلیل سمجھ میں نہیں آئی؟ اگر مطلب سمجھ میں نہیں آیا تو میں اس سے زیادہ آسان عبارت میں بیان کرنے پر قادر نہیں میرے نزدیک بہشتی زیور نہایت آسان اُردو میں ہے۔ کہنے لگے کہ مطلب تو سمجھ لیا دلیل سمجھ میں نہیں آئی میں نے کہا کہ کیا اس مسئلہ کے سوا بہشتی زیور کے تمام مسائل کی دلیلیں آپ نے سمجھ لی ہیں؟ یا اور بھی کچھ ایسے مسائل ہیں جن کی دلیلیں معلوم نہیں ہوئیں؟ اور اگر سب کی دلیلیں معلوم ہو چکی ہیں تو مجھے سوال کی اجازت دیجئے کہ میں کسی مسئلہ کی دلیل آپ سے دریافت کر لوں؟ کہنے لگے کہ نہیں اور بھی بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کی دلیل مجھے معلوم نہیں۔ میں نے کہا پھر اس کو بھی اسی فہرست میں داخل کر لیجئے اسی کی دلیل جاننے کی کیا

ضرورت ہے۔ بس اب ان کی منطق ختم ہوگئی اور کتاب بغل میں دبا کر رخصت ہو گئے بعد میں معلوم ہوا کہ اس شخص نے تین روز سے حضرات علمائے سہارنپور کو تنگ کر رکھا تھا اور وہ حضرات خوش اخلاقی سے اس کو دلیل سمجھا رہے تھے لیکن میں نے چار منٹ میں اس کو لاجواب کر کے اٹھا دیا۔

ان کے جانے کے بعد ایک صاحب جنٹلمین تشریف لائے اور تہذیب و خیر خواہی کے لہجے میں فرمانے لگے کہ بعض جہلاء اس مسئلہ پر طعن کرتے ہیں جس سے ہمارا دل دکھتا ہے کہ ہمارے سامنے ہمارے بزرگوں کو برا بھلا کہا جائے اس لئے مناسب ہے کہ بہشتی زیور کے اس مسئلہ کے متعلق جو مخالفین کا اعتراض ہے اس کے جواب کے لئے ایک جلسہ منعقد کر کے حق کو واضح کر دیا جائے۔ میں نے کہا کہ آپ کی خیر خواہی میں شک نہیں مگر یہ بتلایئے دنیا میں ایک جماعت یعنی دہریہ خدا تعالیٰ کو اور ایک جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ایک جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم کو اور ائمہ مجتہدین کو برا بھلا کہتی ہے اور یقیناً اس سے بھی آپ کا دل مجروح ہوتا ہے آپ نے اس کا کیا انتظام کیا ہے؟ ہر کام ترتیب سے اچھا ہوتا ہے آپ پہلے ان جماعتوں کا انتظام کر دیجئے اخیر میں اس جماعت کا میں انتظام کر دوں گا جو بہشتی زیور پر طعن کرتے ہیں بس اس کا کچھ جواب نہ تھا میں کہتا ہوں کہ جاہلوں کا جواب علمی جوابوں سے نہیں ہو سکتا بس ان کے لئے تو پانچویں کتاب ہو یا کہ ان کو جواب مت دو بلکہ دھتکار دو یا خشک جواب دے دو جیسا میں نے سہارنپور میں دیا تھا۔

ہاں اگر کوئی استفادہ کی غرض سے سوال کرے اور اس میں استفادہ کی قابلیت بھی ہو تو اس کے لئے ہم ہر وقت علمی جواب دینے کو تیار ہیں اور اگر استفادہ مطلوب نہ ہو یا اس میں اس تحقیق کی استعداد نہ ہو تو اس کو علمی جواب ہرگز نہ دو کیونکہ اس سے اس کی اصلاح نہ ہوگی بلکہ اور زیادہ ہلاک ہوگا اور شبہات کا سلسلہ بڑھتا چلا جائیگا دیکھو اگر ایک

بوڑا سا آدمی آئے اور یہ کہے کہ میرے سر پر یہ دو من کا بورا اٹھوا دو تبلائیے ہم کیونکر دو من کا بورا اس کو اٹھوا دیں یقیناً اس کا تو گوہ نکل جائیگا۔

جیسے ایک شخص کا قصہ ہے کہ وہ رات کو بستر پر پیشاب کر لیا کرتا تھا بیوی نے ملامت کی کمبخت یہ کیا حرکت ہے کہ تو بڑی عمر کا آدمی ہو کر رات کو بستر پر موتتا ہے کہنے لگا کیا بتلاؤں رات کو ہر روز شیطان خواب میں آتا ہے کہ چلو سیر کو چلیں میں ساتھ ہو لیتا ہوں راستہ میں پیشاب کی ضرورت ہوتی ہے اس وقت میں اپنے نزدیک قدمچہ پر بیٹھ کر پیشاب کرتا ہوں اور وہ بستر پر نکل جاتا ہے۔ بیوی بھی اس کی بے وقوف تھی کہنے لگی کہ جب شیطان جو جنات کا بادشاہ ہے تمہارا ایسا دوست ہے تو اس سے یوں کہنا کہ ہم غریب آدمی ہیں کہیں سے بہت سا روپیہ ہم کو لا دے۔ مرد نے کہا آج کی رات آیا تو ضرور کہوں گا چنانچہ رات کو خواب میں شیطان آیا اور اس نے بیوی کی فرمائش اس سے ظاہر کی۔ شیطان نے کہا یہ کون سی بڑی بات ہے دونوں چلے اور خزانہ میں لے جا کر شیطان نے اس کے اوپر روپیہ لادنا شروع کیا اتنا لادا کہ میاں کا گوہ نکل گیا۔ صبح کو آنکھ کھلی تو خزانہ تو غائب، البتہ بستر پر پیشاب کے ساتھ گوہ کا ڈھیر موجود تھا۔

بیوی نے کہا کیا واہیات ہے؟ اس نے سارا قصہ کہا وہ کہنے لگی کہ میں ایسے خزانہ سے باز آئی تم پیشاب ہی کر لیا کرو تو صاحبو! تحمل سے زیادہ کسی پر بوجھ لادنے کا انجام یہی ہے کہ اس کو حاصل تو کچھ نہ ہوگا ہاں ہلاکت میں پڑ جائے گا۔ اس لئے ہمارے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو مناظرہ سے بہت نفرت تھی۔ فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی تم سے کسی مسئلہ میں اُلجھے تو تم بحث کبھی نہ کرو بلکہ سب رطب و یابس اس کے سامنے رکھ کر خود الگ ہو جاؤ اور کہہ دو کہ تم اس میں حق و باطل کو خود ہی انتخاب کر لو جیسے ایک شخص نے حجام سے کہا تھا کہ میری ڈاڑھی میں سے سفید سفید بال چن کر الگ کر دو۔ حجام نے استرہ سے ساری ڈاڑھی جدا کر کے اس کے سامنے رکھ دی کہ مجھ کو اتنی فرصت نہیں آپ خود سفید و سیاہ کو الگ کر لیجئے۔

مولانا رومیؒ نے مثنوی میں حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص بانسری بجا رہا تھا کہ رفعۃً

رنج صادر ہوئی تو اس نے بانسری منہ سے ہٹا کر دبر میں لگا دی اور کہا کہ ب اگر تو مجھ سے اچھا بجانا جانتی ہے تو تو ہی بجائے۔ حکایت تو فحش ہے مگر مولانا نے اس سے نتیجہ بہت عمدہ نکالا ہے۔

فرماتے ہیں کہ جب تم کوئی مضمون بیان کر رہے ہو اور کوئی مدعی نا اہل بک بک کرنے لگے تو تم چپ ہو جاؤ اور اس سے کہہ دو کہ اچھا بھائی تو ہی بول لے ہم خاموش ہوتے ہیں مولانا نے اس جگہ مدعی کو دبر سے تشبیہ دی ہے واقعی بلیغ تشبیہ ہے کیونکہ مدعی بھی اپنی خرافات سے عالم کو متعفن کرتا ہے مگر آج کل طلبہ میں یہ مرض ہو گیا ہے کہ وہ ہر شخص کے جواب دینے کو تیار ہو جاتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو کچھ کام نہیں اس لئے ذرا ذرا سی بات میں بحث کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ ایک دفعہ میں ریل میں سوار تھا اپنے احباب میں تصویر کے مسئلہ پر گفتگو ہو رہی تھی وہاں ایک پادری بھی بیٹھا ہوا تھا وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ہمارے پاس آیا اور کہا میں بھی پوچھ سکتا ہوں (یہ آج کل محاورہ ہو گیا ہے کہ وقوع سے صیغہ امکان میں سوال کرتے ہیں) میں نے کہا آئیے جناب پوچھئے (میں کفار کو جناب سے جناب کہا کرتا ہوں کیونکہ وہ غسل جنابت نہیں کرتے) کہنے لگا کہ اسلام میں تصویر کیوں حرام ہے؟ اگر یہ سوال کسی نئے مولوی سے کیا جاتا تو دو گھنٹہ تک اس سے بحث کرتے مگر میں اس روگ کو نہیں پالتا میں نے جواب دیا کہ مسئلہ فروع میں سے ہے اور فروع سے اصول مقدم ہیں آپ کو ابھی تک ہمارے اصول ہی مسلم نہیں اس لئے فروع کے سوال کا آپ کو حق نہیں کہنے لگا یہ تو صحیح ہے کہ مجھے اس سوال کا حق نہیں مگر میں نے چاہا تھا کہ سفر میں علمی گفتگو سے مشغلہ ہو جاتا میں نے کہا کہ مذہبی مسائل کو مشغلہ بنانا آپ کو مبارک ہو۔ ہمارا مذہب ایسا نہیں کہ ہم اس کو مشغلہ بنائیں۔ بس اب وہ خاموش تھا اور اپنے اس جواب پر سخت شرمندہ تھا۔

اسی طرح ایک بار ایک ہندو آریہ نے ریل میں مجھ سے پوچھا کہ اگر کوئی مسلمان ایک نیک کام کرے اور وہی کام کافر بھی کرے تو دونوں کا اجر برابر ہوگا یا کم زیادہ۔ میں نے کہا افسوس ہے آپ مجھ سے ایسا سوال کر رہے ہیں جس کا جواب خود آپ کے ذہن میں موجود ہے کہنے لگا

یہ کیوں کر؟ میں نے کہا اس لئے کہ اُس جواب کے مقدمات سب آپ کے ذہن میں ہیں۔ کہنے لگا یہ کیونکر معلوم ہوا؟ میں نے کہا ابھی آپ اقرار کئے لیتے ہیں۔ سنئے کیا آپ نہیں جانتے کہ ہر مذہب والا اپنے مذہب کو حق اور دوسرے مذاہب کو باطل سمجھتا ہے ایک مقدمہ تو یہ ہے دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ مذہب حق والا مثل مطیع سلطنت کے اور مذہب باطل والا مثل باغی سلطنت کے ہے۔ اور تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ بغاوت ایسا جرم ہے جو انسان کے تمام کمالات کو بیکار اور ضائع کر دیتا ہے چنانچہ اگر کسی جامع الکمالات باغی کو پھانسی ہونے لگے کوئی عاقل یہ شبہ نہیں کرتا کہ اس کے کمالات کو مانع سزا نہیں سمجھا گیا اور یہ سب مقدمات بدیہی ہیں جو آپ کو پہلے سے معلوم ہیں اب ان سب کو ملا کر دیکھئے آپ کے سوال کا جواب خود نکل آئے گا اور ان مقدمات کو جان کر مجھ سے سوال کرنے کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہے کہ میرے منہ سے اپنی نسبت کافر کا لفظ سننا چاہتے ہیں تو وہ اس تقریر پر فریفتہ ہو کر کہنے لگا کہ واقعی میری نیت یہی تھی کہ آپ مجھے کافر کہیں کیونکہ ایسے منہ سے کافر کا لفظ سننا بھی موجب لذت ہے میں نے کہا یہ آپ کی لیاقت ہے لیکن میری اسلامی تہذیب مجھے اس سے منع کرتی ہے کہ میں بلا ضرورت کسی کا دل دکھاؤں۔ ریل میں سفر کرتے ہوئے اکثر ایسا اتفاق ہوا ہے کہ ہم لوگ آپس میں مسائل شرعیہ کی تحقیق میں گفتگو کرتے تو کفار ان کو غور سے سنتے اور ان پر اثر ہوتا تھا کیونکہ حق میں ایک خاص کشش ہے جو باطل میں کبھی نہیں ہوگی۔

چنانچہ ایک دفعہ ہم لوگ باتیں کر رہے تھے تو چند ہندو آپس میں کہنے لگے کہ ان کی باتوں کی طرف دل کھنچتا ہے دوسرے نے کہا یہ سچے ہونے کی علامت ہے۔ ایک دفعہ ہم باتیں کر رہے تھے جب اسٹیشن آگیا اور اترنے لگے تو ایک ہندو نے حاضرین سے کہا کہ گیا نور برس رہا تھا اب سارا نور یہ اپنے ساتھ لے چلے۔ تو صاحبو! آپ بحث و مباحثہ نہ کریں۔ آپس میں مسلمانوں ہی سے اسلام کی تعلیم پر گفتگو کرتے رہیں اسی کا کفار پر اثر ہوگا بحث کا اثر نہیں ہوتا کیونکہ اس میں مخالف ضد پر آجاتا ہے اور سچے طالب تحقیق آج کل کہاں ہیں؟ یہ سب گفتگو

اس پر علی تھی کہ اس جگہ حق تعالیٰ نے قتال و شقاق کو کفر دون سے تعبیر فرمایا ہے اور میں نے کہا تھا کہ یہ استعمال محاورات کے موافق ہے حقیقت پر محمول نہیں۔ خوارج و معتزلہ کی جہالت ہے کہ انہوں نے محاورات کو تدقیق پر محمول کرنا شروع کر دیا اس لئے متکلمین کو علم کلام مدون کرنے کی ضرورت ہوئی اس پر یہ تقریر طویل ہو گئی اور یہاں سے یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ آج کل جو ہم لوگوں میں یعنی مسلمانوں میں نا اتفاقی ہے دیکھ لیا جائے کہ یہ کیسی سخت حالت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کفر سے تعبیر فرمایا ہے چنانچہ حضرات صحابہ اس کو سنکر چونکے اور اپنی غلطی پر متنبہ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے آئندہ کے لئے ان کو دستور العمل بتلایا کہ خیر جو ہو چکا ہو چکا گذشتہ تو گذشتہ ہوا آئندہ کا بندوبست کرو تاکہ پھر اس معصیت کا خطرہ نہ ہے۔ چنانچہ اول تقویٰ اور اسلام پر ملازمت کا امر ہے پھر اعتصام بحبل اللہ کا امر ہے پھر ارشاد ہے وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا اور تم پر جو اللہ کا انعام ہے اس کو یاد کرو جب کہ تم دشمن تھے پس اللہ تعالیٰ نے تمہارے قلوب میں الفت ڈال دی سو تم خدا کے انعام سے آپس میں بھائی بھائی ہو گئے۔ اس میں نعمت اتفاق کے یاد کرنے کا حکم ہے کہ اس نعمت کو اور اس کی برکات کو یاد کرو اور موازنہ کرو کہ تمہاری پہلے کیا حالت تھی اور اس کا نتیجہ کیسا وخیم تھا اور اتفاق کے بعد کیا حالت ہو گئی اور اس کا انجام نعیم مقیم ہے۔

تسہیل و تکمیل عمل شاید بعض لوگوں کو اس وقت یہ خیال ہوا ہو گا کہ میں آج اتفاق و اتحاد کا مضمون بیان کروں گا کیونکہ بظاہر یہاں یہی مضمون مذکور ہے لیکن مجھے دوسری بات بیان کرنا ہے جو اتفاق و اتحاد کی بھی جڑ ہے اور وہ ایسی بات ہے جو راستہ طے کرنیوالوں کو پیش آتی ہے اور ان کے ضرورت کی ہے کیونکہ مسلمانوں میں دو قسم کے آدمی ہیں ایک تو وہ جنہوں نے دین کا

لہ یہ تفسیر اس لئے کی گئی کہ بعض جاہلوں نے ایک جلسہ میں نفظ ہم کی تفسیر ہندو و مسلمان سے کی ہے اس طرح سے کہ ہ سے مراد ہندو اور م سے مراد مسلمان ۱۲ جامع

کام شروع ہی نہیں کیا دوسرے وہ جو کام شروع کر چکے ہیں اور راستہ میں ہیں۔ پہلی جماعت کا علاج تو یہ ہے کہ ان کو کام میں لگا دیا جائے اور جو لوگ راستہ طے کر رہے ہیں ان کے لئے ایصال کی ضرورت ہے تو یہ مضمون ایصال کی قبیل سے ہے ارائۃ طریق کی قبیل سے نہیں اور گو مضمون نیا نہیں لیکن عنوان نیا ہے چنانچہ معلوم ہو جائیگا کہ اس آیت کا مطلب اس عنوان سے بہت کم لوگوں نے سمجھا ہوگا۔ اب میں مقصود کو شروع کرتا ہوں اور ان شاء اللہ تعالیٰ مختصر ہی بیان کروں گا کیونکہ اول تو وہ بات ہی مختصر ہے دوسرے اس وقت کچھ طبیعت بھی مضمحل ہے جن بزرگوں کی وجہ سے یہ بیان ہو رہا ہے ان کی درخواست تو کل گذشتہ کے متعلق تھی مگر کل طبیعت زیادہ مضمحل تھی کیونکہ کل رات ایک کھٹملے نے بے وقت ٹر ٹر لگائی جس سے نیند اچاٹ ہوگئی پھر دیر تک نیند نہ آئی جب کچھ نیند آئی تو اس نے پھر بولنا شروع کیا آخر اس کو عالم بالا میں پہنچایا (یعنی بالاخانہ) تب کچھ نیند آئی بھری نہیں آج بھی طبیعت پر قدرے اضمحلال کا اثر ہے مگر کل جیسا نہیں اس لئے مختصر ہی بیان کروں گا۔ حضرات صحابہ نے بھی بعض دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مختصر بات کا سوال کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو رد نہیں فرمایا بلکہ درخواست کو قبول کر کے مختصر بات بتلا دی چنانچہ ایک صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احکام شرعیہ بہت زیادہ ہو گئے ہیں۔ مجھے ایک مختصر بات بتلائیے جس کو میں دستور العمل بنالوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ (ایمان لایا میں اللہ پر اور اس پر استقامت کر)

صحابی کے اس سوال سے یہ مراد نہ تھی کہ فرائض میں اختصار ہو جائے یا ایسی بات بتلا دی جائے جس سے سب مسائل مستنبط ہو جائیں کیونکہ اس جواب سے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے سب مسائل کیسے مستنبط ہوں گے، بھلا سجدہ سہو کا وجوب اس سے کیونکر مستنبط اور اگر کھینچ تان کر کے نکالا بھی گیا تو وہ استنباط نہ ہوگا بلکہ جیکاٹ ہوگا جیسے آج کل ایک فرقہ قرآنیہ نکلا ہے جو حدیث کو نہیں مانتا پہلے ایک فرقہ غیر مقلدین نکلا تھا جس نے فقہ کو اڑا دیا تھا اب یہ فرقہ نکلا ہے جس نے حدیث کو بھی اڑا دیا۔ اندیشہ ہے کوئی کم بخت ایسا نہ نکلے

جو قرآن ہی کو اڑا دے (معلوم ہوا ہے کہ پٹیالہ میں ایک مدعی نبوت نکلا ہے وہ قرآن کی بھی نفی کرتا ہے۔
قاتلہ اللہ من لعین مارد) (۱۲)

آج کل یہ حالت ہے کہ ایک فتنہ دبنے نہیں پاتا کہ دوسرا کھڑا ہو جاتا ہے ؎

اِذَا سُدَّ مِنْهَا مَنْخِرٌ جَاشَ مَنْخِرُ

(ایک فتنہ دباؤ تو دوسرا فتنہ کھڑا ہو جاتا ہے)

اس فرقہ کے بانی سے کسی نے پوچھا کہ تم حدیث کی تو نفی کرتے ہو اور سارے مسائل قرآن ہی سے مستنبط کرتے ہو تو بتلاؤ کہ عدد رکعات نماز کی دلیل قرآن میں کہاں ہے تو وہ کہتا ہے کہ اس کا جواب کل دوں گا بھلا یہ حماقت تو دیکھئے کہ استدلال تو کل ہوگا اور عمل پہلے ہی سے شروع کر دیا اگر یہ عمل قرآن پر مبنی تھا تو اس میں سوچ کیوں ہوئی اور قرآن پر مبنی نہ تھا تو کس پر مبنی تھا۔ اگر حدیث و فقہ پر مبنی تھا تو اس نے عمل ثابت کر دیا کہ قرآن کے سوا بھی کوئی چیز حجت ہے غرض اگلے دن آپ تشریف لائے اور دعویٰ کیا کہ میں قرآن سے رکعت صلوٰۃ کا ثبوت دوں گا سنئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو پیام رساں بنایا ہے جن میں کسی کے دو بازو ہیں کسی کے تین کسی کے چار بس ایسی ہی نمازوں کی رکعات کا عدد مختلف ہے بھلا کوئی پوچھے کہ یہاں تو فرشتوں کی بازوؤں کا ذکر ہے اس کو رکعت صلوٰۃ سے کیا تعلق؟ اور اگر محض عدد کا ذکر ہی استنباط کے لئے کافی ہے تو پھر ایک رکعت کی بھی نماز ہونا چاہیے کیونکہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ میں ایک کا ذکر ہے یہ تو وہی مثل ہوئی کہ کسی طالب علم سے کسی نے کہا تھا کہ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں وہ جواب دیتا ہے کہ چار روٹیاں تو جیسے دو اور دو کی دلالت روٹیوں پر ہے ایسے ہی مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ کی دلالت رکعات پر ہوگی اس کو اثبات بالقرآن نہیں کہہ سکتے اثبات تو وہ ہے جو خود مفید مطلوب ہو بدون ضم ضمیمہ کے۔ اگر حدیث سے پانچ وقت کی نمازیں اور ان کی رکعتیں کی شمار معلوم نہ ہوتی تو کوئی شخص مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ سے رکعات نماز سمجھ

سکتا تھا ہرگز نہیں تو اگر اس طرح اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ ثُمَّ اسْتَقِمْ اللہ پر ایمان لا اور اس پر مستقیم رہ ۔ اس سے سب مسائل مستنبط کیے جائیں تو اس کا تو کچھ علاج نہیں ورنہ خود یہ کلام استنباط مسائل کے لئے ہرگز کافی نہیں اور نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مطلب ہے کہ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ ثُمَّ اسْتَقِمْ ایمان لائے اللہ پر پھر اس پر مستقیم رہو اسے مسائل کے استنباط کو کافی ہے اب یہ سوال ہوگا کہ پھر صحابی کے سوال اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کا کیا مطلب ہے تو اس کو حضرات صوفیہ نے سمجھا ۔ وہ فرماتے ہیں کہ صحابی نے ایسا دستور العمل پوچھنا چاہا تھا جو تمام اعمال میں کام آئے اور سب کو سمیٹ دے جیسا کہ صوفیہ مریدین کو مراقبہ رؤیت وغیرہ بتلایا کرتے ہیں جو تمام اخلاق رذیلہ غضب و حرص و کبر وغیرہ میں کام آتا ہے اور تنہا سب کے علاج کو کافی ہو جاتا ہے اگر ہر مرض کا جدا جدا علاج کیا جائے تو بڑی مدت چاہیے اب انہوں نے ایسی بات بتلائی جس کے رسوخ سے ایک دم سارے امراض اور معاصی کی جڑ اکھڑ جائے گی کیونکہ جو شخص ہر وقت اس بات کو پیش نظر رکھے گا کہ حق تعالیٰ مجھ کو دیکھ رہے ہیں وہ نہ تکبر کر سکیگا نہ غصہ بے جا نہ گناہ صغیرہ کر سکے گا نہ کبیرہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابی نے ایسی ہی بات دریافت کرنا چاہی تھی جس کے جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ ثُمَّ اسْتَقِمْ کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا استحضار رکھو اور اس کے بعد ہر عمل میں استقامت کا لحاظ کرو کہ نہ تسویف ہو ۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ہر وقت اس کا استحضار رکھے گا کہ میں خدا پر ایمان لا چکا ہوں تو وہ تمام احکام کو خوشی سے بجا لائے گا اور کسی حکم میں چون و چرا نہ کرے گا یہ تو تسہیل عمل کا طریق تھا اس کے بعد تکمیل عمل کا طریقہ بتلا دیا کہ استقامت کا لحاظ رکھو یہاں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بلاغت کا اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے دو جملوں میں تمام طریق کو سمیٹ دیا جس میں تسہیل عمل بھی ہے اور تکمیل بھی ہے ۔ تو اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مقربات کا دریافت کرنا اور بتلانا بھی سنت ہے اسی لئے مجھے طریق میں اس کا بہت خیال رہتا ہے کہ ایسی مقربات بتلائی جائیں جو سب باتوں پر حاوی ہوں ۔

چنانچہ ایک دفعہ میں نے اخلاق رذیلہ کا علاج دو لفظوں میں تجویز کیا تھا تامل و تحمل کہ جو کام کرے سوچ کے کرے کہ شرعاً جائز ہے یا نہیں اور جلدی نہ کرے بلکہ تحمل سے کام

کیا کرے۔ مجھے اختصار کے ساتھ قافیہ کا بھی خبط ہے۔ اس سے یاد میں سہولت ہوتی ہے۔ اس لئے ایک دوست کا فیصلہ ہے کہ یہ نثر میں شاعر ہے۔ ابھی کچھ دن ہوئے ہیں انہوں نے ایک زمین لی ہے جب اس کے لینے کا ارادہ ہوا تو میں نے اس کے متعلق یہ دعا تجویز کی تھی۔ اَللّٰھُمَّ حَصِّلْ اَللّٰھُمَّ کَمِّلْ اَللّٰھُمَّ عَجِّلْ اَللّٰھُمَّ سَھِّلْ اے اللہ حاصل کرا دے اے اللہ پورا کرا دے اے اللہ جلدی کرا دے اے اللہ آسان کرا دے۔ جس میں چاروں جملے مقفیٰ ہیں اسی طرح طریق میں طالبین کے لئے ایک بار یہ دستور العمل تجویز کیا اطلاع واتباع۔ کہ اپنے احوال واعمال سے شیخ کو مطلع کرتے رہیں اور اس کی تجویز پر عمل کریں۔ ایک دفعہ یہ تجویز کیا تھا کہ انقیاد واعتماد۔ اس وقت پہلی مقفیٰ عبارت ذہن سے نکل گئی تھی تو جب ایک قافیہ دار عبارت بھول جاتا ہوں دوسری قافیہ دار عبارت تجویز کر لیتا ہوں۔ ممکن ہے کسی وقت یہ بھی ذہن سے نکل جائے تو تیسری قافیہ دار تجویز کروں گا یہ تو جنم روگ ہے۔ جیسا ایک آزاد مزاج بزرگ نے حفظ قرآن کو جنم روگ یعنی دائم الرعایت فرمایا تھا کیونکہ حفظ قرآن کے لئے بھی ہر وقت فکر کی ضرورت ہے۔ جہاں ذرا غافل ہوا اور ذہن سے نکلا چنانچہ جو لوگ ہمیشہ نہیں پڑھتے۔ ان کو اس سے اجنبیت ہو جاتی ہے۔ جیسے مولوی احمد حسن صاحب کانپوری فرماتے تھے کہ رمضان میں جو میں قرآن تراویح کے اندر پڑھتا ہوں تو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ قرآن پڑھ رہا ہوں یا توراۃ وانجیل۔ کیونکہ ان کو سال کے اندر کثرت تدریس کے سبب تلاوت کی نوبت کم آتی تھی مگر بعض لوگوں کا حافظہ اچھا ہوتا ہے وہ باوجود عدم مشغولی کے اور بےفکری کے بھی نہیں بھولتے حالی شاعر کا واقعہ میں نے پانی پت میں مولوی عبدالسلام صاحب انصاری مرحوم سے سنا ہے کہ ان کو قرآن حفظ تھا مگر حفظ کے بعد ابتدائے جوانی میں کبھی محراب سنائی ہوگی پھر شاعری اور لیڈری کے قصہ میں پڑ گئے تو برسوں محراب نہیں سنائی نہ تلاوت

کا شغل رہا مگر حافظہ ایسا اچھا تھا کہ بڑھاپے میں بھی قرآن خوب یاد تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ ان کے بڑھاپے میں پانی پت کے چند لڑکوں نے شبینہ کرنا چاہا اور یہ شوخی سوجھی کہ حالی سے اس شبینہ میں شرکت کی درخواست کرو۔ چنانچہ سب مل کر ان کے پاس گئے کہ حضور آج ہم سب نے شبینہ کا قصد کیا ہے آپ ہماری سرپرستی فرمائیں اور ایک منزل آپ بھی سنائیں۔ حالی نے کہا کہ بھائی میں نے تو بہت زمانہ سے قرآن نہیں سنایا جو کچھ یاد تھا سب بھول بھال گیا۔ مجھے معاف کرو۔ مگر لڑکوں نے نہ مانا اور اصرار کیا مجبور ہو کر درخواست منظور کی اور کہا کہ اچھا تو بتا دو کہ میرے ذمہ کونسی منزل ہوگی چنانچہ سب سے زیادہ مشکل منزل جس میں متشابہات زیادہ ہیں ان کے لیے تجویز کی گئی اور نوجوان حافظ اپنے دل میں خوش ہو رہے تھے کہ آج بڈھے کو خوب رسوائی ہوگی یقیناً خوب غوطے کھاویں گے۔ مگر جب رات ہوئی اور حالی کے پڑھنے کی باری آئی تو ظالم نے ایسا اچھا سنایا کہ ایک جگہ بھی تو نہ اٹکا اس وقت سب کو معلوم ہوا کہ ان کو قرآن واقعی یاد ہے۔ بھولے نہیں سو ایسے لوگ بہت کم ہیں جن کو باوجود عدم مزاولت کے بھی ایسا یاد رہے ورنہ عام حالت یہی ہے کہ قرآن بدون دائمی مزاولت کے یاد نہیں رہتا۔ اسی قیاس پر ایک اور تفریع کرتا ہوں کہ اسی طرح اس طریق میں بھی قلب کی نگہداشت عمر بھر کا روگ ہے کسی وقت غفلت کی اجازت نہیں ؎

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی
شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

(ایک پلک مارنے کی مقدار بھی محبوب حقیقی سے غافل مت ہو شاید کہ تم پر لطف کی نگاہ کریں اور تم آگاہ نہ ہو)

اور ؎
اندریں رہ می تراش و می خراش
تادم آخر دمے فارغ مباش
تادم آخر دمے آخر بود
کہ عنایت با تو صاحب سر بود

(تم کو چاہیے کہ طریق وصول الی اللہ میں ہمیشہ دھیڑ بن میں لگے رہو اور آخری

وقت تک ایک لحظہ بھی فارغ مت ہو کیونکہ آخری وقت تک کوئی گھڑی ایسی تو ضرور ہو گی جس میں عنایتِ ربانی تمہاری ہمراز اور رفیق بن جائے گی

لذت پریشانی

اور ایک اور لطف صنع ہے کہ اگر کسی وقت سالک غافل ہونا بھی چاہے تو حضرت حق غافل نہیں ہونے دیتے۔ ایک سپاہی ایسا مسلط کر دیا ہے جو کان پکڑ کر کھڑا کر دیتا ہے بے فکر نہیں ہونے دیتا اور اس سپاہی کا حلیہ میں بیان نہیں کر سکتا کہیں سننے والے بے چین نہ ہو جائیں جو لوگ آرام میں ہیں ان کو کیوں بے چین کیا تو وہ سپاہی آکر کہتا ہے کہ ایک دن پچاس ہزار سال کے برابر آنے والا ہے اس سے غافل ہو کر کہاں جا رہا ہے۔ بس جہاں غفلت ہوئی اور یہ دن پیشِ نظر ہو جاتا ہے اس لئے سالک غافل نہیں رہ سکتا کبھی تجلی جلال منکشف ہوتی ہے وہ دل کو تھرا دیتی ہے لوگ سمجھتے ہیں کہ اہل اللہ بڑی چین میں ہیں ان کو کچھ فکر نہیں بے شک دنیا کی تو ان کو فکر نہیں مگر دنیا کی فکر نہ ہونے کا منشا بے فکری نہیں بلکہ ایسی عظیم الشان فکر ہے جس نے عصائے موسوی کی طرح سب فکروں کو نگل لیا ہے واللہ جو فکر ان کو ہے اگر آپ کو ہو جائے تو رات کا سونا بھول جائیں ؎

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست
حال شیرانے کہ شمشیر بلا بر سر خورند

(تمہارے پاؤں میں کانٹا بھی نہیں لگا ہے تم ان لوگوں کی حالت کو کیا سمجھ سکتے ہو جن کے سروں پر بلا اور مصیبت کی تلواریں چل رہی ہیں)

سعدی علیہ الرحمۃ نے اس کو بہت وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے ؎

خوشا وقت شوریدگانِ غمش | اگر ریش بینند و گر مرہمش
گدایانِ از بادشاہی نفور | بامیدش اندر گدائی صبور

دمادم شراب الم درکشند ۔۔۔ وگر تلخ بینند دم درکشند

(اس کے غم سے پریشان لوگوں کا کیا اچھا وقت ہے اگر زخم دیکھتے ہیں اور اگر اس پر مرہم رکھتے ہیں۔ ایسے فقیر بادشاہی سے نفرت کرنے والے اس کی امید پر فقیری میں قناعت کرنے والے ہر دم رنج کی شراب پیتے ہیں اور جب اس میں رنج کی کڑواہٹ دیکھتے ہیں خاموش رہتے ہیں)

غرض سالک کے لئے نئے نئے سبق ہمیشہ تازہ ہوتے رہتے ہیں جو کسی وقت اس کو غفلت نہیں ہونے دیتے اور وہ سب تقویٰ ہی کی افراد ہے ہیں جس کا یا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَ لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو ڈرنے کا حق سوائے اسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دو) میں امر ہے اس وقت اسی مضمون کو دوسرے عنوان سے بیان کرنا چاہتا ہوں کیونکہ تقویٰ کا عنوان بہت وسیع ہے اور ضرورت اس کی ہے کہ مختصر بات تبلائی جائے جس سے تمام اعمال سہل ہو جائیں اور تمام مقامات طریق حل ہو جائیں میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ اس مضمون کے بعد آپ کو پریشانی ہی نہیں ہوگی بلکہ یہ کہتا ہوں کہ اگر پریشانی ہوگی تو لذیذ ہوگی کہ آپ اس پریشانی کے بدلہ ہفت اقلیم کا لینا بھی منظور نہ کریں گے۔ باقی پریشانی کے رفع ہونے سے تو امید ہی قطع کر دیجئے کیونکہ آپ تو پریشانی ہی کے لئے پیدا ہوئے ہیں یہ تو جنت ہی میں پہنچکر ختم ہوگی خدا تعالیٰ وہاں سرخرو کر کے ہم کو پہنچا دیں (آمین ثم آمین)

اور بعض کوتاہ نظر عاشقوں نے تو جنت میں بھی پریشانی کو ختم نہیں مانا چنانچہ ایک عاشق کا قول ہے اِنَّ فِی الْجِنَانِ لَجَنَّةً لَیْسَ فِیْهَا حُوْرٌ وَّ لَا قُصُوْرٌ وَّ لٰكِنْ فِیْهَا اَرِنِیْ اَرِنِیْ (جنتوں میں ایک جنت ایسی ہے جس میں نہ حور ہیں نہ محلات ارنی ارنی ہے مجھ کو اپنا دیدار دکھا مجھ کو اپنا دیدار دکھا)

یہ قول واقع میں صحیح نہیں اور کشف حجت نہیں مگر اس صاحب کشف نے جو دلیل بیان کی ہے اس دلیل سے مجھے بھی بہت دنوں شبہ رہا وہ یہ کہ حسن و جمال حق حقیقتہً بے نہایت ہے اور عاشق کا عشق و طلب بمعنے لا تقف عند حد بے نہایت پھر چین کیونکر ہو وہاں تو یہ حال ہے ؎

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

(نہ اُس کے حسن کی انتہا ہے نہ سعدی کے کلام کی کوئی انتہا ہے جیسے جلندھر والا پیاسا مرجاتا ہے اور دریا باقی رہ جاتا ہے۔ اسی طرح محبوب کا بیان باقی رہ گیا)

اور یہ کیفیت ہے ؎

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گلچیں بہار تو ز داماں گلہ دارد

(داماں نگاہ تنگ ہے اور تیرے حسن کے پھول بے حد ہیں گل چین تنگیٔ دامن کا گلہ رکھتا ہے۔)

اور ایک عاشق کہتا ہے ؎

ے قلت ویحتمل ان یکون الکشف صحیحا ولکنہ ای صاحب الکشف اخطاء فی قولہ ان اھل ھذہ الجنۃ لا راحۃ لھم وانھم فی کرب واضطراب بل لیکن ان یکون لھم فی ارنی ارنی راحۃ لیس بغیرھم فی الحور والقصور ولا یکون منشاء قولھم ارنی ارنی کربھم واضطرابھم ولا قلقھم ھل منشاءُ الادلال علی اللہ وطلب رویۃ اظہاراً للمحبۃ واھذا فانھم لا ادب لھم فی غیرہ جل وعلا واللہ سبحانہ

(جتنی زیادہ تیرے چہرہ پر نظر ڈالتا اتنا تیرے چہرے پر حسن زیادہ معلوم ہوتا ہے۔)

یہ ہے ان کی دلیل اس دلیل سے میں بہت روز تک چکر میں رہا اسی واسطے کہتا ہوں کہ بس نماز روزہ میں لگے رہو اور ان کشفیات و اسرار کے پیچھے نہ پڑو یہ بلائے بے درماں ہے مگر بحمد اللہ اس کا جواب سمجھ میں آگیا وہ یہ کہ یہاں تو شوق لاتقف عند حد اس لئے ہے کہ ہمارے اندر وصال حق کی جتنی استعداد پیدا کی گئی ہے یہاں کے مشاہدہ سے اس استعداد کا تقاضا پورا نہیں ہوتا۔ یہاں ہم کو حق تعالیٰ کا نا تمام وصال حاصل ہوتا ہے کہ بعض افراد میں استعداد اس سے زیادہ ہے وہ تقاضا کرتے ہیں کہ ہمارا حق بھی ادا ہو اور جنت میں تمام افراد کی استعداد کا تقاضا بھی پورا کر دیا جائے گا پھر چین ہو جائے گا اور اس سے حسن حق کا محدود ہونا لازم نہیں آتا بلکہ استعداد طالب کا متناہی ہونا لازم آیا مگر اس عاشق نے استعداد طالب کو بھی غیر متناہی بمعنی لاتقف عند حد سمجھ لیا اس لئے اشکال پیش آیا۔

اور منشا اس دھوکہ کا یہ ہوا کہ دنیا میں عاشق کا شوق لاتقف عند حد ہی ہے اس سے وہ یہ سمجھا کہ عشق فی نفسہ لاتقف عند حد ہے حالانکہ ایسا نہیں بلکہ فی نفسہ محدود و متناہی ہے اور دنیا میں اس لئے لاتقف عند حد ہے کہ یہاں اس کی استعداد کے تمام افراد کا تقاضا پورا نہیں کیا گیا اور جنت میں ہر فرد کی استعداد کا تقاضا پورا ہو جائیگا جس سے سکون کامل ہو جائے گا اور یہ میں کسی طبعی قاعدہ پر مبنی کر کے نہیں کہتا بلکہ نقل کی بناء پر کہتا ہوں حق تعالےٰ فرماتے ہیں۔ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ۭ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُۨ الَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّلَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ (اور کہیں گے کہ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے ہم سے غم دور کیا بے شک ہمارا

قلم بشکن سیاہی ریز و کاغذ سوز و دم درکش
حسن ایں قصہ عشق ست در دفتر نمی گنجد
(قلم توڑ دو روشنائی بکھیر دو کاغذ جلا دو خاموش رہو حسن یہ عشق کا قصہ ہے
جو دفتر میں نہیں سما سکتا)

اور ایک شاعر کہتا ہے ؎

نگردد قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدنہا
کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا
(عشق کا راستہ دوڑنے سے ہرگز قطع نہیں ہوتا جس طرح انگور
کو جتنا زیادہ قطع کرو اور بڑھتا ہے یہی حال اس راستہ کا ہے)

اور مولنا فرماتے ہیں ؎

اے برادر بے نہایت درگہیست
ہر چہ بروے می رسی بروے مایست
(اے برادر بے نہایت درگاہ ہے جس درجہ پر پہنچو اس پر مت
ٹھیرو بلکہ آگے کو ترقی کرو)

اور گو عاشق کا عشق بالفعل متناہی ہے مگر چونکہ اس کا منشا حسن وجمال حق ہے اور وہ بے غایت ہے تو اس کا عشق بھی لاتقف عند حد ضرور ہوگا پھر چین کیونکر آئے عاشقان مجازی کو تو وصال محبوب سے اس لئے چین آجاتا ہے کہ ان کے محبوب کا حسن متناہی ہے وصال کے بعد جی بھر کر اس سے متمتع ہو گئے اور سکون ہو گیا اور جس کے محبوب کا حسن بے غایت ہو اس سے تو جتنا متمتع ہوگا اور نیا درجہ حسن کا ظاہر ہوگا جیسے ایک شاعر کہتا ہے ؎

یَزِیْدُکَ وَجْہُہٗ حُسْنًا   اِذَا مَا زِدْتَہٗ نَظَرًا

پروردگار بڑا بخشنے والا بڑا قدردان ہے جس نے ہم کو اپنے فضل سے ہمیشہ رہنے کے مقام میں لا اتارا جہاں ہم کو کوئی کلفت نہیں اور نہ کوئی ہم کو خستگی پہنچے گی۔

اگر جنت میں بھی پریشانی رہی تو پھر عشق کو لے کر کیا کریں گے اس صاحب کشف کی نظر سے یہ مقدمہ نکل گیا کہ دنیا میں عشق اس لئے لا تتقف عندحد ہے کہ یہاں استعداد عاشق کے جملہ افراد کا تقاضا پورا نہیں کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہم جیسے ناکاروں کو اس مقدمہ پر اطلاع کر دی اور یہ بھی ان بزرگوں کی برکت ہے جیسے کبھی کمزور باپ کے قوی لڑکا پیدا ہوتا ہے لیکن وہ قوی ہو کر بھی ہے بیٹا ہی اور وہ کمزور اس کا باپ ہے بہرحال جنت میں تو چین ہوگا مگر دنیا میں چین نہیں بعض لوگ یہاں طالب راحت ہیں یہ ان کی غلطی ہے بھلا عشق اور چین ؎

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن | دل بدست دگرے دادن و حیراں بودن
سوئے زلفش نظرے کردن و در رویش دید | گاہ کافر شدن و گاہ مسلماں بودن

(عاشقی کیا ہے محبوب کا بندہ بن جانا دل دوسرے (محبوب) کے قبضہ میں دے دینا اور حیران رہنا محبوب کی زلف کی طرف نظر کرنا اور اس کے چہرہ انور کو دیکھنا کبھی فانی ہونا اور کبھی باقی ہونا ہے)

کافر شدن سے پریشان نہ ہونا یہ ان صوفیوں کی اصطلاح ہے ان کے یہاں فانی کو کافر اور صاحب بقا کو مسلمان کہتے ہیں اور ایسی وحشت ناک اصطلاحیں انہوں نے گالیاں کھانے کو مقرر کی ہیں مگر اعتراض کا کسی کو حق نہیں کیونکہ قرآن میں بھی تو ہے۔ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ (سو جو شخص شیطان سے بد اعتقاد ہو)

اور ابراہیم علیہ السلام کا مقولہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا تھا كَفَرْنَا بِكُمْ (ہم تمہارے منکر ہیں) بس اتنا فرق ہے کہ قرآن میں صلہ بھی مذکور ہے اس لئے وحشت نہیں ہوتی اور صوفیہ کو صلہ رحمی نہیں آتی ان کی بات سے لوگ متوحش ہوتے ہیں

مگر حقیقت واضح ہو جانے کے بعد الفاظ سے متوحش نہ ہونا چاہئے اسی اصطلاح کے موافق حضرت خسروؒ فرماتے ہیں ؎

کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست
ہر رگ من تار گشتہ حاجت زنار نیست

(میں عشق میں فانی ہوں بقا مجھے درکار نہیں ہے میری رگ تار ہو گئی ہے زنار کی ضرورت نہیں)

مگر تم ان اشعار کو نقل کے طور پر بھی نہ پڑھنا کیونکہ وہ تو مغلوب تھے اس لئے معذور تھے اور تم ان کو پڑھ کر مسلوب ہی ہو جاؤ گے اور اگر کوئی نجدی آ گیا تو مصلوب بھی ہو جاؤ گے اور جو عاشق ہو گا وہ تو خود ہی بک بک لگائے گا۔ وہ میرا اور تمہارا کسی کا کہنا نہ مانے گا لیکن وہ نقل کے طور پر نہ پڑھے گا بلکہ مغلوب ہو کر پڑھے گا۔ سو وہ بھی امیر خسروؒ کی طرح معذور ہے۔ غرض تم آرام کے طالب نہ ہو جیسا بعض سالکین دفع خطرات کے طالب ہیں کہ ایسی حالت ہو جائے کہ وساوس و خطرات پاس ہی نہ آئیں یہ بھی راحت کے طالب ہیں۔ میں اس وقت آپ کو ایسی چیز بتلانا چاہتا ہوں جو پریشانی کو لذیذ کر دے کیونکہ میں کہہ چکا کہ پریشانی تو جنت سے ورے ختم نہیں ہو سکتی ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ پریشانی کو لذیذ کر دیا جائے اور یہ بھی ایک طرح پریشانی کا خاتمہ ہی ہے۔ تو میں ایسی بات بیان کرنا چاہتا ہوں جو تمام اعمال میں کام آئے۔ اور غفلت سے روکتی رہے اور پریشانی کے وقت ہمت بندھ جائے اور وہ نئی بات نہیں بلکہ وہ وہی ہے جس کا نام قرآن میں کہیں تقویٰ ہے کہیں اعتصام بحبل اللہ ہے اور اسی کا نام ذکر نعمت بھی ہے ؎

عِبَارَاتُنَا شَتّٰى وَحُسْنُكَ وَاحِدٌ
وَكُلٌّ اِلٰى ذَاكَ الْجَمَالِ يُشِيْرُ

(عنوانات مختلف ہیں معنون ایک ہی جمال محبوب ہے ہر ایک

عنوان اسی جمال کی طرف اشارہ کرتا ہے!

یہ سب عنوانات ایک ہی مضمون کے ہیں جاننے والا ہر لباس میں اس کو پہچان لیتا ہے

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

(خواہ کسی رنگ کا لباس پہن لو قد کے انداز سے میں پہچان لیتا ہوں)

تفویض پر مداومت

صاحبو! اس وقت میں جس چیز کا پتہ دینا چاہتا ہوں وہ اسلام ہے جو ظاہر ہے کہ ان سب عنوانات میں موجود ہے مگر میں اس وقت اسلام کو دوسرے عنوان سے بیان کروں گا کہ اس عنوان سے بہت کم لوگوں نے اس کو دیکھا ہے اسی لئے اسلام کے لفظ سے ادھر ذہن نہیں جاتا اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اسلام کا لفظ زبانوں پر اس درجہ شائع ہوگیا ہے کہ اب اس سے اس کا مصداق تو متبادر ہوتا ہے مگر مفہوم کی طرف کسی کو التفات نہیں ہوتا اگر لوگ اسلام کے لغوی معنی پر بھی نظر کر لیا کرتے تو اس حقیقت سے قریب ہو جاتے جس کو میں اس وقت بیان کروں گا۔ تو سنیے اسلام کے معنے لغت میں سپرد کرنے کے ہیں جس کو تسلیم بھی کہتے ہیں میں اسی کو اس وقت بیان کرنا چاہتا ہوں جس کو صوفیہ نے تفویض سے تعبیر کیا ہے یہی اسلام کی حقیقت ہے مگر اب لفظ اسلام سے اس کی طرف ذہن ہی نہیں جاتا قرآن میں کہیں اسلام کا ذکر مجملاً ہے کہیں مفصل ہے اور مفصل بمعنے تفویض ہی ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ الآیہ (جو شخص بھی اپنا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا دے اور وہ مخلص بھی ہو) دوسری جگہ ہے وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا (اور ایسے شخص سے اچھا زیادہ کس کا دین ہوگا جو کہ اپنا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا دے اور وہ شخص مخلص بھی ہو اور ملت ابراہیم کا اتباع کرے جس میں کجی کا نام نہیں)

اور ایک جگہ ہے وَمَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗٓ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى (اور جو شخص اپنا رُخ اللہ کی طرف جھکا دے اور وہ مخلص بھی ہو تو اس نے بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا) یہاں اسلام وجہ کے ساتھ اتباع ملت ابراہیم کا بھی ذکر ہے اور اس کو دوسری جگہ اس طرح بیان فرمایا ہے۔ وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ۭ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (اور ملت ابراہیمی سے وہی روگردانی کرے گا جو اپنی ذات سے احمق ہو اور ہم نے ان کو دنیا میں منتخب کیا اور وہ آخرت میں بڑے لوگوں میں شمار کئے جاتے ہیں جبکہ ان کے پروردگار نے ان سے فرمایا کہ تم اطاعت اختیار کرو انہوں نے عرض کیا کہ میں نے اطاعت اختیار کی رب العالمین کی) جس سے معلوم ہوا کہ ملۃ ابراہیم بھی اسلام وجہ رب العالمین ہے کہ اپنے کو خدا کے سپرد کر دے جس کو ایک مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اِنِّىْ وَجَّهْتُ وَجْهِىَ لِلَّذِىْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا (میں یکسو ہو کر اپنا رخ اس کی طرف کرتا ہوں جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں) سے بیان فرمایا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ قرآن میں اسلام کی تفسیر اسلام وجہ ہے جس کے پورے معنے نماز روزہ کے نہیں ہیں بلکہ اسلام وجہ بمعنے تفویض ہے یعنی اپنی ذات کو خدا کے سپرد کر دینا اور اپنے کو ہر تصرف الٰہی کیلئے آمادہ کر دینا کہ وہ جو چاہیں کریں جو چاہیں حکم دیں سب منظور ہے نماز روزہ بھی اس تفویض کا ایک فرد ہے لیکن عین نہیں اگر قرآن میں اسلام کا استعمال اطلاق ہی کے ساتھ ہوتا اور اس کے ساتھ وجہ اللہ یا وجہ الی اللہ مذکور نہ ہوتا تو یہ بھی احتمال تھا کہ اسلام بمعنے اطاعت ہے مگر ان قیود کے ساتھ اطاعت کے معنے نہیں بنتے بلکہ تفویض ہی کے معنے مستقیم ہوتے ہیں اور قاعدہ ہے کہ آیات میں بعض بعض کی مفسر ہوتی

ہوتی ہیں تو اب جہاں اسلام بلا قید مذکور ہے، وہاں بھی مقید ہی مراد ہے۔ جیسے احادیث میں علم کے فضائل بلا قید مذکور ہیں حالانکہ علم مصدر ہے جس کے لئے قید کی ضرورت ہے خواہ بصورت مفعول ہو یا مضاف الیہ اس لئے لفظ کے اطلاق سے یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ فضائل مطلق علم کے ہیں بلکہ یقینی بات ہے کہ علم سے علم دین مراد ہے ایسے ہی نصوص میں اسلام سے اسلام وجہ مراد ہے یعنی تفویض یہی وہ چیز ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کمالات و فضائل ہیں جا بجا حق تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔

پس ان آیات میں اصل مقصود لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (بجز اسلام کے اور کسی حالت میں جان مت دو) ہے اور اِتَّقُوا اللّٰهَ (اللہ سے ڈرو) وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ (اللہ کے انعام کو یاد کرو) وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ (اللہ تعالیٰ کے سلسلہ کو مضبوط پکڑو) یہ سب اسی کے لقب ہیں۔ اسی لئے میں نے اس بیان کا نام "الدوام علی الاسلام والاعتصام بالانعام" تجویز کیا ہے جس میں اصل مقصود کے ساتھ اس کے دوسرے عنوانات پر بھی دلالت ہے جیسے مولنا محمد اسحاق صاحب بردوانی کا سجع میں نے کہا تھا "ثاقب از لطف محمد اسحاق" جس کا ترجمہ تو یہ ہے کہ اسحاق علیہ السلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لطف سے روشن ہوئے ہیں مگر اس میں لطیفہ یہ بھی ہے کہ اس مصرعہ میں مولوی محمد اسحق صاحب اور ان کے والد کا اور دادا کا نام بھی آ گیا ہے کیونکہ ان کے والد کا نام لطف اللہ یا لطف الہدیٰ تھا اور دادا کا محمد ثاقب ایسے ہی اس وعظ کے نام میں اسلام بھی ہے اور اعتصام بھی ہے اور نعمت پر بھی دلالت ہے جس سے وہ تمام عنوانات جمع ہو گئے جو اس آیت میں اختیار کئے گئے ہیں بہر حال اس جگہ اول تو اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ (تم اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے) فرمایا گیا ہے جس میں تفویض کی کسی قدر تفصیل ہے پھر وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (اور تم اسلام کے سوا کسی حالت میں جان مت دو) میں مجملاً تفویض کا ذکر ہے اس کے بعد پھر تفصیل ہے وَاعْتَصِمُوْا

بِحَبْلِ اللّٰہِ وَاذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ (اللہ کے سلسلہ کو مضبوط پکڑو اور اللہ کے انعام کو یاد کرو) میں کیونکہ مقصود کی علامت یہی ہے کہ اس کا ذکر شروع میں بھی ہو۔ درمیان میں بھی ہو تو یہاں اول ترکیب ہے پھر جمع ہے۔ پھر تحلیل ہے جس کا لطف اہل علم کو خاص طور سے حاصل ہوگا۔ اب میں مقصود کو عرض کرتا ہوں۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَ لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ اے ایمان والو اللہ تعالیٰ سے ڈرو جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تم بجز اسلام کے کسی حالت پر جان نہ دینا۔

یہاں ایک اشکال ہوتا ہے کہ اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ (اللہ تعالیٰ سے ڈرو جیسے اس سے ڈرنے کا حق ہے) تو مشکل ہے۔ خدا کی شان کے لائق تقویٰ کس سے ہوسکتا ہے؟ تو آیت میں تکلیف مالایطاق ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حَقَّ تُقٰتِهٖ سے مراد غایۃ ما تقدرون علیہ (جس قدر تم اس پر قادر ہو) ہے کہ جتنا تم کرسکتے ہو اتنا تقویٰ کرو۔ چنانچہ دوسری جگہ ارشاد ہے اور یہی حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ دوسری جگہ اس مضمون کو دوسرے سہل عنوان سے بیان فرمایا کیونکہ ہم سے اپنی اطاعت کے موافق بھی تو نہیں ہوتا تو فرماتے ہیں فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (اللہ تعالیٰ سے ڈرو جتنی تم استطاعت رکھتے ہو) جس میں بجائے قدرت کے استطاعت کا لفظ وارد ہے اور استطاعت کہتے ہیں قدرۃ میسرہ کو نہ قدرت ممکنہ کو۔ بعض صحابہ نے دوسری آیت کو پہلے کے لئے ناسخ فرمایا ہے اس سے بعض طلبہ خوش ہوتے ہوں گے کہ اتقوا اللہ حق تقاتہ (اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے) منسوخ ہوگیا۔ چلو چھٹی ہوئی ارے منسوخ تو وہ ہو جس میں نسخ کی قابلیت بھی ہو۔ بھلا ایمان بھی کہیں منسوخ ہوا ہے؟ اور اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ (اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے) میں اسی شان کا امر ہے

جیسے اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ (ایمان لاؤ اللہ پر) میں ہے کیونکہ حق تعالیٰ کی عظمت کا مقتضیٰ یہی ہے کہ تقویٰ حق تقاتہ کیا جائے اور مقتضائے عظمت بدل نہیں سکتا بلکہ بات یہ ہے کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عرف میں لفظ نسخ بیان تبدیل ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ وہ بیان تفسیر کو بھی نسخ کہتے ہیں۔ پس قواعد شرعیہ سے اِتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ کا مطلب ہی یہ تھا کہ اپنی استطاعت کے موافق تقویٰ اختیار کرو یہ تو طالب علمانہ اشکال کا جواب تھا۔ مگر افسوس یہ ہے کہ طلبہ تو صرف تفسیر میں پڑ گئے اشکالات اور شبہات حل کرنے کے در پے ہو گئے۔ اصل مقصود پر نظر ہی نہیں کہ یہاں امر کس چیز کا ہے اور ہم کو کیا کرنا چاہیے۔

صاحبو! ضرورت اس کی ہے کہ تمام مضامین کو سمیٹ کر مقصود کا پتہ لگایا جائے جیسے ایک کابلی طالب علم نے جس نے ابتدا ہی سے شرح جامی شروع کی اور جب لوگوں نے کہا کہ یہ طریقہ ٹھیک نہیں پہلے میزان و منشعب اور ہدایۃ النحو و کافیہ پڑھو پھر شرح جامی پڑھنا کہا کہ شرح جامی ان سب کتابوں کی ماں ہے اور وہ سب اس کے بچے ہیں اور ہم نے اپنی والدہ کو دیکھا تھا کہ جب وہ مرغی کے بچوں کو کھڈے میں بند کرنا چاہتیں تو بچے بہت پریشان کرتے کوئی ادھر بھاگتا کوئی اُدھر آخر وہ مرغی کو پکڑ لیتیں تو سب بچے ساتھ ساتھ ہو لیتے۔ اسی طرح ہم نے شرح جامی کو پکڑ لیا ہے یہ آ جائیگی تو سب کتابیں آ جائیں گی۔ تو مضامین منتشرہ کے سمیٹنے کا بھی یہی طریقہ ہے کہ اصل مقصود کا پتہ لگاؤ تو غور کرنے سے معلوم ہوا ہے کہ ان آیات میں اصل مقصود ایک ہی ہے باقی سب اس کے عنوانات ہیں اب اگر تقویٰ کو اصل مقصود کہا جائے تو یہ بھی صحیح ہے کیونکہ مقصود کا یہ بھی ایک عنوان ہے مگر اس کا مصداق یہ تو بہت وسیع ہے جس کی تفصیل پر ہم کو قدرت نہیں اور ضرورت سمٹنے کی ہے جس کے لئے مختصر حقیقت چاہیے سو وہ حقیقت اسلام ہے یعنی یہاں حق تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ اسلام یعنی تفویض پر مداومت رکھو کسی وقت اس کو ہاتھ سے نہ دو یہ ہے وہ

چیز جس کو میں نے کہا تھا کہ وہ پریشانی کو بھی لذیذ کر دیتی ہے مگر وہ لذت مٹھائی اور حلوے جیسی نہیں بلکہ مرچوں بھرے کباب جیسی جس کی لذت وہی جانتے ہیں جو مرچ کھانے کے عادی ہیں چنانچہ عارفین کو بھی ہر طرح کی مشقت و مصائب و آلام پیش آتے ہیں مگر ان کو اس میں بھی لذت آتی ہے اور وہ یوں کہتے ہیں ؎

ناخوش تو خوش بود بر جان من — دل فدائے یار دل رنجائے من

(محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو وہ اپنی طبیعت کے خلاف اور ناخوش ہی کیوں نہ ہو مگر وہ میری جان پر خوش اور پسندیدہ ہے۔ میں اپنے یار پر جو میری جان کو رنج دینے والا ہے اپنے دل کو قربان کرتا ہوں)

پس یہ مت سمجھنا کہ تفویض کے بعد پریشانیاں یا پریشان کن واقعات پیش نہ آئیں گے ہاں یہ ضرور ہے کہ پہلے وہ ناگوار تھے اب خوشگوار ہو جائیں گے جیسے مرچ کھانے والے کو مرچوں بھرا کباب خوشگوار و لذیذ ہوتا ہے کہ روتا بھی جاتا ہے اور کھاتا بھی جاتا ہے یہاں ایک اشکال طالب علمی اور ہے اس کو بھی حل کر دوں۔ وہ یہ کہ اصولی قاعدہ ہے کہ امر و نہی کا تعلق امور اختیاریہ سے ہوتا ہے اور یہاں موت پر نہی وارد ہے جو غیر اختیاری ہے جواب یہ ہے کہ یہ کلام محاورہ کے موافق ہے۔ محاورہ میں بھی کہا جاتا ہے کہ بے وفا بن کر جان مت دینا اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ عمر بھر وفادار رہنا اور اسی پر جان نکل جائے پس یہاں بھی گو ظاہر میں موت پر نہی وارد ہے مگر موت سے منع کرنا مراد نہیں بلکہ بے وفائی سے منع کرنا مقصود ہے۔ اسی طرح آیت میں دوام اسلام کا امر مقصود ہے جس کو محاورہ کے موافق اس عنوان سے بیان کیا گیا ہے تقدیر یہ ہے دَاوِمُوْا عَلَى الْاِسْلَامِ حَتّٰى لَا تَمُوْتُوْا اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (دوام کرو اسلام پر اور تم اسلام کے سوا اور کسی حالت میں جان نہ

دنیا)

اب یہاں سے ایک خام صوفی کی غلطی ظاہر ہوگئی جس نے اس آیت سے موت نفس کو ثابت کیا ہے جو صوفیہ کی اصطلاح ہے اور استدلال میں یہی کہا ہے کہ یہاں موت پر نہی وارد ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہاں وہ موت مراد نہیں جو غیر اختیاری ہے بلکہ اختیاری موت مراد ہے تو اس سے مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا (مر جاؤ تم مرنے سے پہلے) کا مسئلہ ثابت ہوا تو سمجھو کہ یہ استدلال صحیح نہیں کیونکہ یہاں موت پر نہی وارد ہی نہیں جیسا ابھی بیان کیا گیا ہے بلکہ وہ مسئلہ ایک حدیث سے ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی سے فرمایا تھا یَا عَبْدَ اللّٰہِ اِذَا اَصْبَحْتَ فَلَا تُحَدِّثْ نَفْسَکَ بِالْمَسَاءِ وَاِذَا اَمْسَیْتَ فَلَا تُحَدِّثْ نَفْسَکَ بِالصَّبَاحِ عِدْ نَفْسَکَ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ۔ بہرحال یہاں مراد دَاوِمُوْا عَلَی الْاِسْلَامِ (اسلام پر مداومت کرو) ہے مگر اس کو لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ (اسلام کے علاوہ اور کسی حالت میں جان مت دو) کے عنوان سے اس لئے ظاہر کیا گیا کہ دَاوِمُوْا عَلَی الْاِسْلَامِ (اسلام پر مداومت کرو) کو سن کر عشاق پر مصیبت آجاتی کہ حکم تو دوام علی التفویض کا ہے اور ہم سے اس میں کوتاہی ہوتی ہے تو اس عنوان میں ان کی تسلی کردی گئی کہ اگر موت کے وقت بھی تفویض کامل ہو جائے تو کافی ہے۔ عوام تو اس کو سنکر بے فکر ہوگئے ہوں گے کہ بس مرتے ہوئے تفویض کلی حاصل کرلیں گے۔ ارے اس کے ساتھ یہ مقدمہ بھی تو ملاؤ کہ مرتے وقت تفویض کلی عادۃً اسی کو حاصل ہوتی ہے جو زندگی بھر اسی میں مشغول رہا ہو۔ ورنہ موت کا وقت تو سخت نازک ہے۔ وہ تحصیل نسبت وطے مقامات وتکمیل تفویض کا وقت تھوڑا ہی ہے کہ اسی وقت کام شروع کرو اور اسی وقت حاصل بھی کرلو اور یوں خلاف عادت حق تعالیٰ جو چاہیں کردیں جیسے عیسیٰ علیہ السلام وآدم علیہ السلام وحوا علیہا السلام کو بدون ماں باپ کے بنادیا، ورنہ

عادت یہی ہے کہ بدون مرد و عورت کے مباشرت کے بچہ پیدا نہیں ہوتا اسی طرح عادۃً مرتے ہوئے اہنی کو مقامات حاصل ہوتے ہیں جو زندگی بھر انہی کی فکر میں لگے رہتے تھے۔

عوام کی بے فکری پس عوام کی بے فکری بے معنی ہے اور یہ شیطان نے ان کا راہ مار رکھا ہے کہ عمر بھر یہی پٹی پڑھاتا رہتا ہے کہ ابھی زندگی بہت ہے۔ ذرا دنیا کے لطف اٹھا لو پھر خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کریں گے۔ غرض تفویض وہ چیز ہے کہ ہر کام میں اس کی ضرورت ہے خواہ دنیا کا ہو یا دین کا، اہل باطن تو اس سے ابتدا ہی میں کام لیتے ہیں اور اہل دنیا بعد میں اس سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً کسی پر مقدمہ قائم ہو جائے اگر وہ صاحب باطن ہے تو اسی وقت سے معاملہ خدا کے سپرد کر دے گا اور جو نتیجہ ہو اس پر اول ہی سے راضی ہوگا اس کا یہ مطلب نہیں کہ تدبیر کو چھوڑ دیگا کیونکہ تدبیر تفویض کے منافی نہیں یہ بھی اسی کا حکم ہے جس کا حق وہ تفویض ہے پس یہ تدبیر بھی کریگا مگر اپنی طرف سے کوئی نتیجہ تجویز نہ کریگا بلکہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیگا کہ جو انکی رضا ہے میں اس پر راضی ہوں۔ دنیا دار بھی اخیر میں یہی کرتا ہے مگر وہ اول اول اپنی تدبیر پر نظر کرتا ہے اور اپنی طرف سے نتیجہ کی ایک شق متعین کر لیتا ہے کہ نتیجہ یوں ہونا چاہیے پھر جب ہار جاتا ہے تو کہتا ہے کہ تقدیر میں یوں ہی تھا میں خدا کی مرضی پر راضی ہوں۔

تفویض معتبر اسی طرح ایک فرع اس کی مثلاً مدرسہ ہے جس کے چلانے کیلئے تدبیر کی بے شک ضرورت ہے مگر صاحب تفویض تو ابتدا ہی سے تفویض کرتا ہے اور تدبیر جو کچھ کرتا ہے محض سنت و اطاعت سمجھ کر کرتا ہے اس کی نیت یہ نہیں ہوتی کہ تدبیر ضرور کامیاب ہی ہو بلکہ وہ کامیابی اور ناکامی کو حق تعالیٰ کے سپرد کر کے کوشش کرتا ہے۔ اگر کامیابی ہو گئی تو اور ناکامی ہوئی تو وہ ہر حال میں خوش ہے اور جو شخص اس ارادہ سے تدبیر کرتا ہے کہ مجھے کامیابی ہی ہو اور جس طرح میں چاہتا

ہوں، مدرسہ اسی طرح چلے اس کی پریشانیوں کی کوئی حد نہیں رہتی کیونکہ جہاں کوئی بات ناگوارِ طبع پیش آئے گی اس کو اپنی ناکامی کا رنج ہوگا تو بتلاؤ کہ تفویض سے زیادہ راحت کا آلہ دنیا میں کیا ہے۔ حضرت تلاش کرتے کرتے تھک جائیے گا اس سے بڑھ کر راحت کا آلہ کوئی نہ ملے گا مگر راحت کی نیت سے تفویض کرنا دین نہیں بلکہ دنیا ہے حقیقی تفویض وہ ہے جس میں یہ بھی قصد نہ ہو کہ اس سے چین ملے گا بلکہ محض رضائے حق کا قصد ہو ورنہ وہ مثال ہوگی۔

جیسے ایک دیہاتی نے مولوی صاحب کی ترغیب سے نماز شروع کی مولوی صاحب کا جو پھر وہاں گذر ہوا نماز کی نسبت پوچھا کہنے لگا کہ نماز سے بڑا مجائیدہ (فائدہ) ہے جب ہی مُونڈھا ٹروں (یعنی سجدہ کروں) جبھی بادی (ریح) خوب نکڑے (نکلے) آپ کو ریح کا مرض تھا اور سجدہ میں گوز اڑایا کرتے تھے ظاہر ہے کہ یہ فائدہ کس درجہ کا ہے۔ یوں ہی تفویض بقصد راحت سے بھی گو راحت حاصل ہوگی مگر یہ نفع قابلِ اعتبار نہیں۔ تفویض معتبر وہی ہے جس سے صرف اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہو اور کچھ مقصود نہ ہو۔ چنانچہ شیخ ابن عطاء اسکندری رحمتہ اللہ علیہ نے کسی کی حکایت لکھی ہے۔

کہ میں ایک بزرگ سے ملنے گیا تو وہ یہ دعا کر رہے تھے کہ اے اللہ میں لذت تفویض سے پناہ مانگتا ہوں واقعی تفویض میں بڑی لذت ہے مگر اہل اللہ اس سے پناہ مانگتے ہیں کہ مبادا ہم لذت کی وجہ سے تفویض کر رہے ہوں لیکن یہ ان بزرگ کا حال تھا تم یہ بھی دعا نہ کرو کیونکہ تم لوگ بدون لذت کے تفویض نہیں کر سکتے بس تم نہ لذت کا قصد کرو نہ اُسکی نفی کی دعا کرو بلکہ یہ مذاق رکھو۔

ہر چہ از دوست می رسد نیکوست

(جو کچھ محبوب کی جانب سے پہونچے وہ بہتر ہے)

اب اگر لذت عطا ہو جائے تو یہ نعمت حق ہے اس سے گھبراتے کیوں ہو اس سے پناہ نہ مانگو نہ اس کے دفع کی دعا کرو اور لذت حاصل نہ ہو جب بھی راضی رہو اصحاب مقام یوں فرماتے ہیں کہ اگر وہ چپت ماریں چپت کھالو اور پیار کریں تو پیار کرالو اور اس کی لذت حاصل ہو تو اس کو نعمت سمجھو شاید کسی کو اس مقام پر حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ کی ایک حکایت سے شبہ ہو کہ ایک دفعہ ان کی نماز تہجد ناغہ ہوگئی اس کا ان کو رنج ہوا اور اگلی صبح جاگنے کا زیادہ اہتمام کیا تو اس رات ایسی نیند آئی کہ صبح کی نماز بھی قضا ہوگئی اب تو وہ سخت پریشان ہوئے الہام ہوا کہ اے ابراہیم تم نے اپنی تدبیر کو دیکھ لیا اب تفویض کرو۔

(نَمْ اِذَا اَنَمْنَا وَقُمْ اِذَا اَقَمْنَا) (جب ہم سلائیں سو رہو جب اٹھائیں اٹھ جاؤ ۱۲)

حضرت ابراہیم فرماتے ہیں فَوَّضْتُ فَاسْتَرَحْتُ کہ میں نے تفویض کردی اور راحت میں ہوگیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے راحت کے لئے تفویض اختیار کی تھی جواب یہ ہے کہ اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا بلکہ اس میں تو صرف ترتب راحت کا ذکر ہے قصد استراحت پر کوئی لفظ دال نہیں مگر اس حکایت سے جاہل لوگ خوش ہوئے ہوں گے کہ بڑا مزہ آیا۔ اب سے ہم بھی نماز روزہ کے لئے اہتمام و تدبیر نہ کیا کریں گے بلکہ تفویض کردیں گے اس کا جواب یہ ہے کہ بہت اچھا پھر اللہ تعالیٰ تم کو سزا دیں گے اس وقت بھی تفویض کرنا۔

جیسے مثنوی میں ایک جبری کی حکایت مولانا نے لکھی ہے کہ وہ اختیار کا قائل نہ تھا۔ ایک دن وہ کسی شخص کے باغ میں جاکر انگور توڑ توڑ کے کھانے لگا مالک باغ نے جو دیکھا تو اس نے دھمکایا کہ یہ کیا کر رہا ہے، میرے انگور کیوں کھاتا ہے۔ کہا چپ رہو۔ زمین بھی خدا کی، درخت بھی خدا کا، انگور بھی خدا کے میں بھی خدا کا تو منع کرنے والا کون ہے۔ وہ

باغ والا بھی ذہین تھا اس نے اپنے نوکر کو آواز دی کہ ایک خنکا اور ایک رستا لاوہ لے آیا تو اس نے اس جبری کو رسے سے باندھ کر خوب مارا وہ چلانے لگا کہ اللہ کیواسطے چھوڑ دے کہا چپ رہ ہیں بھی خدا کا تو بھی خدا کا رستا بھی خدا کا خنکا بھی خدا کا پھر کیوں چلاتا ہے۔ وہ کہنے لگا ؎

گفت توبہ کردم از جبر اے عیار
اختیار است اختیار است اختیار

(اس نے کہا کہ میں نے جبر سے توبہ کی اور اختیار کا قائل ہوا)

معنی تفویض یاد رکھو تفویض کے معنی ترک تدبیر نہیں بلکہ تفویض کے معنی صرف یہ ہیں کہ خدا کے سوا کسی پر نظر نہ رکھے۔ تدبیر کرے اور تدبیر کے نتیجہ کو خدا کے سپرد کر دے اور حضرت ابراہیم نے تدبیر فرض سے زیادہ تدبیر کی تھی اس لئے ان کو تنبیہ کی گئی کیونکہ خواص کو تدبیر فرض سے زیادہ کی اجازت نہیں ہوتی اور ہم کو تدبیر فرض سے زیادہ کی بھی اجازت ہے کیونکہ ہم گنوار ہیں اور گنواروں کے لئے وہ قواعد نہیں ہوتے جو خواص کے لئے ہیں جیسے ایک حکیم کا قصہ ہے کہ اس نے ایک گنوار کو دیکھا کہ چنے کی چار پانچ روٹیاں کھا کر اوپر سے چھاچھ کا بٹھا پی رہا ہے۔ حکیم نے کہا کہ چھاچھ کو کھانے کے درمیان میں پینا چاہیے۔ اخیر میں پینا مضر ہے۔ گنوار نے اپنے بیٹے کو آواز دی کہ ارے فلانے ایک جا ٹکڑ (یعنی روٹی) اور لیا لے چھاچھ کو بیچ میں کروں یو دیہ حکیم کہہ رہا ہے۔ چنانچہ وہ چار ٹکڑ اور کھا گیا۔ حکیم صاحب نے یہ منظر دیکھ کر کہا چودھری! جی تمہارے واسطے کوئی قاعدہ قانون نہیں تم چاہے بیچ میں پیئو یا اخیر میں اسی طرح ہمارے واسطے یہ قاعدہ نہیں کہ تدبیر فرض سے زیادہ تدبیر نہ کریں بلکہ ہم تو جب فرض سے زیادہ کرینگے جب فرض تک پہونچیں گے۔ غرض اس میں شک نہیں کہ تفویض سے دنیا کے کاموں میں بھی راحت ہے اور دین کے کاموں میں بھی۔ دنیا میں مقدمہ اور مدرسہ کی مثال تو گذر چکی۔ ایک اور

مثال لو۔

مثلاً تم اپنے لڑکے کا رشتہ کر رہے ہو اور کامیابی نہیں ہوتی اس سے رنج ہوگا کیونکہ تفویض نہیں تھی۔ تم نے اپنی طرف سے ایک شق تجویز کرلی تھی کہ یوں ہونا چاہیے اور اگر ابتداہی سے تجویز نہ کرتے بلکہ تفویض کرتے تو ہرگز ناکامی سے رنج نہ ہوتا یا کوئی عزیز مریض تھا تم اس کے لئے تعویذ لے گئے اور نفع نہ ہوا تو اس وقت بھی رنج ہوگا کیونکہ تفویض نہ تھی بلکہ اس اعتقاد سے تعویذ لیا گیا تھا کہ بس اس کے باندھتے ہی آرام ہوجائیگا۔ اگر تفویض ہوتی تو اول ہی سے ہر شق پر راضی ہوتے اور وہ تعویذ تفویض ہوجاتا۔

آج کل مدرسہ دیوبند میں ایک شور برپا ہے۔ سخت شورش ہو رہی ہے کہ وہ لوگ جن کو مولوی حبیب الرحمٰن صاحب نے باپ بنکر پالا پرورش کیا پڑھایا لکھایا اور تدبیر سے ان کو بڑا بنایا آج وہ انہی کے مقابلہ میں بڑائی جتلا رہے ہیں اور ان کے ہاتھ سے مدرسہ کا اہتمام لینا چاہ رہے ہیں اور مولوی حبیب الرحمٰن صاحب ایسے بے نفس ہیں کہ مدرسہ کے اہتمام سے استعفیٰ دینے کو آمادہ ہوگئے کہ جب میری خدمت لوگوں کو پسند نہیں تو میں ہی الگ ہوجاؤں لیکن اراکین مدرسہ نے ان کو اس خیال سے روک رکھا ہے ۱۲ جامع، اور اس شورش کے رفع کرنے میں مہتم مدرسہ اراکین سب کوشاں ہیں مگر میں نے مہتمم صاحب کو لکھ دیا ہے کہ تم اسی وقت سے ہر نتیجہ کے لئے آمادہ ہوجاؤ یہ تجویز ذہن میں نہ کرو کہ مدرسہ رہے یا تمہارے ہاتھ میں رہے بلکہ اگر مدرسہ ٹوٹ جائے یا بند ہوجائے تو تم ابھی سے اس پر راضی ہوجاؤ اور خدا پر نظر کر کے قوت کے ساتھ اپنے اصول پر قائم رہو اور یہ قوت بدوں تفویض کے پیدا نہیں ہوسکتی اس کا یہ مطلب نہیں کہ تدبیر نہ کرو کیونکہ تفویض ترک تدبیر کا نام نہیں چنانچہ میں کہہ چکا ہوں کہ تدبیر بھی اسی کا حکم ہے جس کے لئے تم تفویض کر رہے ہو فلیکلمُ الکَریمُ وَ اَعِدُّوا

لہم ما استطعتم من قوۃ و من رباط الخیل ترھبون بہ عدو اللہ و عدوکم (اس کی صریح دلیل یہ ہے واعدوا یعنی اور ان کافروں کے لئے جس قدر تم سے ہوسکے ہتھیار سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے سامان درست رکھو کہ اس کے ذریعہ سے تم رعب جمائے رکھو ان پر جو اللہ کے دشمن ہیں اور تمہارے دشمن ہیں) بس تفویض یہ ہے کہ تدبیر کرو مگر اس پر نظر نہ کرو اور اپنی تجویز سے کوئی شق نتیجہ کی متعین نہ کرو کہ یوں ہونا چاہیے۔

میرے اس لکھنے کا یہ اثر ہوا کہ مہتمم صاحب بڑے مضبوط ہو گئے اور لکھتے ہیں کہ تیری وجہ سے مجھے بہت قوت ہو گئی۔

میرے ایک اور دوست ہیں ان کے ذمہ قرض بہت ہو گیا ہے۔ قرض خواہ نالش کرنا چاہتے ہیں اس سے وہ بیچارے بڑے پریشان ہو رہے تھے مجھے بھی اپنی پریشانی لکھی۔ میں نے لکھا کہ پریشان کیوں ہوتے ہو آخر وہ نالش کر دیں گے تو کیا ہو جائیگا بہت سے بہت تم کو قید کرا دیں گے تو تم قید خانہ میں چلے جانا یا زمین و مکان نیلام ہو جائیگا تم زمین و مکان نیلام کرا دینا جس خدا نے اب تک روزی دی ہے وہ پھر بھی روزی دیگا تم اپنی طرف سے اسی وقت ہر نتیجہ کے لئے تیار ہو جاؤ اور اس کے بعد مقدمہ میں تدبیر بس کی کرو کہ قرض کی قسطیں ہو جائیں۔ یہ خط پڑھ کر ان کو ایسا سکون و اطمینان ہوا کہ اب لکھتے ہیں کہ یوں جی چاہتا ہے کہ سب قرض خواہوں سے کہہ دوں کہ سب مل کر نالش کر دو جو ہونا ہو گا ہو جائیگا میں نے لکھا کہ ایسا بھی نہ کرنا کہ یہ بھی خلاف تفویض ہے اپنی طرف سے تم نہ بلا تجویز کرو نہ راحت بلکہ جو وہ تجویز کر دیں اس پر راضی رہو۔ حضرت یہ نسخہ اکسیر میں نے ایسا بتلا دیا جس سے نہ اہل دنیا کو استغنا ہے، نہ اہل دین کو نہ علماء کو استغنا ہے نہ عرفاء کو، بلکہ تمام عالم اس کا محتاج ہے اور اس کی زیادہ قدر ان سالکین کو ہو گی جو کسی بلائے باطنی میں پھنسے ہوئے ہوں کیونکہ بعض حالات سالکین کو

کو ایسے پیش آتے ہیں کہ اگر پہاڑ پر رکھے جائیں تو پہاڑ پھٹ جائیں ؎

آسماں بار امانت نتوانست کشید　　قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

(آسمان بارِ امانت نہ اٹھا سکا قرعۂ فال مجھ دیوانہ کے نام آیا)

یہ روح انسانی ہی کی طاقت ہے کہ وہ ایسے ثقیل و شدید امور کا تحمل کرتی ہے اسی کو حق تعالےٰ فرماتے ہیں انا عرضنا الامانۃ علی السمٰوات والارض والجبال فابین ان یحملنہا اور ایک آیت میں جو یہ فرمایا گیا ہے لخلق السمٰوات والارض اکبر من خلق الناس تو یہ باعتبار مادۂ انسانی کے ہے سو اس میں کیا شک ہے کہ مادۂ انسان مادہ سمٰوات سے اضعف ہے لیکن روح انسانی اَشَدُّ مِنَ الْجِبَالِ (پہاڑوں سے زیادہ سخت) ہے روح انسان کی قوت سمٰوت وارض سب سے زیادہ ہے جس کا تجربہ سالکین کو ہوتا ہے جن پر یہ احوال شدائد گذرتے رہتے ہیں اور اس وقت تفویض کے سوا کوئی آلہ راحت کا نہیں بس سالکین تفویض کر کے دیکھیں ان شاء اللہ سب شدائد کا تحمل آسان ہو جائیگا اور نہ بھی آسان ہو تو تفویض کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔ اسی کو حضرت حافظ فرماتے ہیں ؎

باغباں گر چند روزے صحبت گل بایدش　　بر جفائے خار ہجراں صبر بلبل بایدش

(باغبان کو اگر چند روز گل کی صحبت چاہیے تو خار ہجراں کی زیادتی پر بلبل کا سا صبر درکار ہے)

اگر کبھی وصال کے بعد فراق ہو جائے تو صبر سے کام لو تفویض کرو اگر تجلی جمال کے بعد تجلی قہر و جلال ہو تو اس وقت بھی تفویض سے ہی کام لو۔ حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک بار فرمایا کہ مجھے چین کیونکر ہو، اسرافیل صور منہ میں لئے ہوئے ہے اور کان جھکائے حکم کا منتظر ہے کہ ذرا حکم ہو تو عالم کو درہم برہم کر دوں۔ صحابہ اس کو سنکر لرز گئے گھبرا گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قُولُوْا حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ

(ہم کو اللہ کافی ہے اور وہی اچھا کارساز ہے) یعنی گھبراؤ نہیں بلکہ حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ کہو یعنی تفویض کرو اور رضا پر نظر رکھو۔ ارے جب سارے راستے ان کے ہی قبضے میں ہیں اور تم کہیں سے نکل کر بھاگ نہیں سکتے تو اب بجز تفویض کے چارہ ہی کیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

اے حریفاں راہ ہا را بست یار آہو لنگیم واو شیر شکار

(اے حریفوں یار نے تمام راستے بند کر دیے ہیں ہم لنگڑے ہرن کی طرح اور شکار کے ہرن کی طرح ہے)

واللہ سارے راستے بند ہیں تم کہیں ان کے قبضہ سے باہر نہیں جا سکتے بس ہماری ایسی مثال ہے جیسے لنگڑا ہرن شیر کے پنجہ میں ہو اب بتلاؤ لنگڑا ہرن شیر کے پنجہ سے چھوٹنے کی کوشش کرے تو یہ اس کی حماقت ہے یا نہیں بس اس کی خیر اسی میں ہے کہ اپنے کو شیر کے سامنے ڈالدے اور اس کے ہر تصرف پر راضی ہو جائے خواہ کھالے خواہ چھوڑ دے ؎

غیر تسلیم و رضا کو چارۂ در کف شیر نر خونخوارۂ

(سوائے تسلیم و رضا کے کوئی چارہ نہیں تم مثل خونخوار شیر نر کی مٹھی میں ہو)

ہائے اللہ ہائے اللہ اے اللہ اے اللہ آہ آہ اَلشَّیْخُ وَبَکٰی وَوَلْوَلَ وَاضْطَرَبَ اِضْطِرَابًا شَدِیْدًا لَمْ نُشَاہِدُ بِہٖ قَطُّ (شیخ چلائے اور روئے اور سخت مضطرب ہوئے اس سے پہلے کبھی ایسا مشاہدہ نہیں ہوا) دیر تک خاموش رہنے کے بعد فرمایا کہ (جامع) واللہ بجز تسلیم و رضا کے کچھ چارہ نہیں ؎

غیر تسلیم و رضا کو چارۂ در کف شیر نر خونخوارۂ

آہوئے لنگ کو یہی چاہیے کہ اپنے کو شیر کے آگے ڈال دے اور اپنا ضعف و عجز ظاہر کرے اب یہ ہوگا کہ شیر اس پر رحم کر کے خود اس کی پرورش کریگا اور جنگل سے

شکار لاکر اس کے آگے ڈالیگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو یہی علاج تبلایا ہے کہ قُولُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ (کہو ہم کو اللہ کافی ہے اور وہی اچھا کارساز ہے) جس پر وعدہ ہے ومن یتوکل علی اللّٰہ فہو حسبہ ان اللّٰہ بالغ امرہ قد جعل اللّٰہ لکل شیءٍ قدراً ۵ اس شعر کے بعد حافظؒ فرماتے ہیں ؎

اے دل اندر بند زلفش از پریشانی منال
مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش

(یعنی تمہاری مثال ایسی ہے جیسے مرغ جال میں پھنسا ہوا ہو اس کو تحمل ہی چاہیے کہ صبر و سکون کے ساتھ پابزنجیر ہو جائے ورنہ جتنا پھڑ پھڑائے گا اور زیادہ پھنسے گا تڑپو گے جتنا جال کے اندر جال گھسے گا کھال کے اندر

اس کے بعد فرماتے ہیں ؎

رند عالم سوز را با مصلحت بینی چہ کار
کار ملک ست آنکہ تدبیر و تحمل بایدش

(اندر عالم سوز یعنی عاشق کو مصلحت بینی سے کیا تعلق اس کو تو محبوب حقیقی کا کام سمجھ کر تحمل و تدبیر چاہیے)

یعنی تدبیر کے درپے ہونا اور اسی فکر میں رہنا غلام کا کام نہیں یہ کام بادشاہ کا ہے اور تم بادشاہ نہیں ہو بلکہ غلام ہو بادشاہ صرف ایک ہے اور سب اس کے غلام ہیں بس ان تدابیر پر نظر کرنا چھوڑ دو خدا پر نظر رکھو آگے علم و عمل پر بھروسہ کرنے کو منع فرماتے ہیں ؎

تکیہ بر تقویٰ و دانش در طریقت کافریست
راہرو گر صد ہنر دارد توکل بایدش

طریقت میں عقل و تقویٰ پر بھروسہ کرنا کفر ہے سالک اگر سو ہنر جانتا

ہو پھر اس کو توکل یعنی اپنے کو اہل اللہ کے سپرد کرنا چاہیئے۔

یہاں بڑے بڑے متقی اور عارف سالک کو توکل ہی لازم ہے اسی سے کام چلے گا ورنہ جہاں اُس نے اپنی عقل یا تقوی پر اعتماد کیا اور تباہ ہوا حضرت یہی تفویض اور یہی حقیقت ہے اسلام کی اور اسی کا حکم ہے اس آیت میں لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (سوائے اسلام کے اور کسی حالت میں مت جان دو) مگر ہم نے اسلام کا صرف لفظ یاد کر لیا ہے اس کی حقیقت پر کبھی نظر نہیں کی جن کو طرح طرح کے احوال پیش آتے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ جہاں تدبیر کے پیچھے پڑے اور اس پر نظر کی رہیں پریشانی اُٹھائی اور جب تفویض کی فوراً ہلکے پھلکے ہو گئے اور ایسا معلوم ہوا کہ گویا کوئی یوں کہہ رہا ہے

من غم تو می خورم تو غم مخور بر تو من مشفق ترم از صد پدر

(میں تیرا غم خوار ہوں تو غم مت کر میں تجھ پر سیکڑوں باپوں سے زیادہ شفیق ہوں)

پس ہمیشہ کے لئے یہی دستور العمل بنا لو کہ شریعت نے جس تدبیر مشروع تدبیر کی اجازت دی ہے خواہ دین کے متعلق ہو یا دنیا کے وہ کر کے آگے نتیجہ کو خدا تعالے کے سپرد کر دو بس اسی سے نجات ہو گی اب میں تمام دنیا سے کہتا ہوں کہ کوئی اس سے بہتر نسخہ تو لائے ذرا ہم بھی تو دیکھیں ان شاء اللہ قیامت آجائے گی اور اس سے بہتر نسخہ کوئی نہ لا سکیگا اسی کو حق تعالی اس جگہ بیان فرماتے ہیں وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (سوائے اسلام کے اور کسی حالت میں جان مت دو) اس کے بعد فرماتے ہیں وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا کہ اللہ کی رسی کو (یعنی قرآن واحکام قرآن کو جس میں حدیث وفقہ بھی سب شامل ہیں کیونکہ سب اسی ایک متن کی شروح ہیں) مضبوط پکڑ لو اور آپس میں افتراق نہ کرو کیونکہ اس سے دین کو بھی

سخت ضرر پہونچتا ہے جس کی بناء پر حدیث میں فساد ذات البین کو حالقہ فرمایا گیا ہے کما تقدم وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا اور اللہ کی اس نعمت کو اپنے اوپر یاد کرو کہ تم پہلے باہم دشمن تھے پھر اللہ تعالیٰ نے تمہارے قلوب میں الفت ڈال دی جس سے تم بھائی بھائی ہو گئے (یہ تو دنیوی نعمت ہے) وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا اور تم جہنم کے گڑھے کے کنارہ پر کھڑے تھے کہ جہنم میں جانے کے لئے صرف مرنے کی دیر تھی کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اس سے بچا لیا یہ دینی نعمت ہے، ان نعمتوں کو یاد کر کے ان کا شکر ادا کرو اور شکر وہی ہے کہ حبل اللہ کو مضبوط پکڑو، یہ تو ترجمہ تھا اور مقصود ظاہر ہے کہ حبل اللہ اسلام ہے اور اسلام کی حقیقت تفویض ہے جو تمام حالات کو شامل ہے خواہ حالات آفاقیہ ہوں خواہ انفسیہ ہوں پھر انفسیہ میں خواہ احوال حسیہ ہوں جیسے مرض و صحت و قوت و ضعف، خواہ باطنیہ ہوں جیسے قبض و بسط ہیبت و انس و محبت و شوق و امثالہا سب کو اپنے سر آنکھوں پر رکھے پس مقصود یہ ہوا کہ ہر حال میں تفویض پر بدرست رکھو چونکہ مجھے اس مضمون سے خود بہت نفع ہوا ہے اس لئے میں نے دوستوں کو بھی اس سے مطلع کرنا چاہا۔

بس اب میں ختم کرتا ہوں دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہم کو یہ دولت عظمیٰ نصیب فرمائیں اور فہم سلیم عطا فرمائیں آمین وصلے اللہ علیٰ سیدنا خیر خلقہ محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ وازواجہ وذریتہ اجمعین وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

الاِسلامُ الحقیقی

سے موسُوم یہ وعظ

حقیقی اسلام

حکیم الامّت مجدد الملّتہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے مظفر نگر میں برسرِ سڑک متصل مکان شیخ ولایت علی صاحب سوداگر۔ ۴۵ منٹ تک کھڑے ہو کر بعد میں کُرسی پر بیٹھ کر ۱۱ر شوال المکرم سنہ ۱۳۴۰ ھجر بمطابق ۸ر جون سنہ ۱۹۲۲ء شب جمعرات کو ارشاد فرمایا —— جو دس بجکر ۱۲ منٹ سے رات ایک بجے تک جاری رہا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ۵۰۰ (پانچ سو) تھی۔ اور کچھ مستورات بھی تھیں۔ حکیم محمد مصطفےٰ صاحب بجنوریؒ نے اسے قلمبند فرمایا۔

مختصر یہ ہے کہ اسلام کامل یہ ہے کہ ہر حال میں آدمی حق تعالیٰ کا منقاد ومطیع رہے۔ اغراض سے قطع نظر کرکے اتباع اختیار کرے۔ نہ مال کی پرواہ کرے، نہ جاہ کی، نہ حکومت کی۔ نہ بڑے ہونے کی۔ بس اس کا یہ حاصل ہوجائے کہ ؎

دلا را میکہ داری دل در و بند
دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند،

(از حضرت حکیم الامتؒ)

خطبہ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم o بسم اللہ الرحمٰن الرحیم o قل ان صلوتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین لا شریک لہ وبذالک امرت وانا اول المسلمین ط

حکم اظہار مشرب : اس آیت میں حق تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرمایا ہے کہ اپنا مشرب ظاہر کر دیجئے اسی واسطے امر کا صیغہ لایا گیا جس کے معنی یہ ہوتے کہ کہہ دیجئے اور سنا دیجئے لوگوں کو چنانچہ آپ نے اس حکم کی تعمیل کی اور حضور کو ایسا امر کرنے سے غرض یہ ہے کہ ہم لوگ بھی اس کا امتثال کریں کیونکہ رسول کے بھیجنے سے غرض یہی ہوا کرتی ہے کہ اس کے اقوال اور افعال کی تقلید کی جائے یہ رحمت ہے حق تعالیٰ کی کہ ہمارے واسطے اوامر اور نواہی کی کتاب بھی بھیج دی اور رسول کو خود نمونہ بھی بنا دیا تاکہ احکام کی تعمیل میں کوئی دقت نہ رہے۔ کیونکہ تعلیم کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ کسی کام کا طریقہ زبانی بتا دیا جاوے۔ اور ایک طریقہ یہ ہے کہ ہاتھ سے بھی کر کے دکھا دیا جاوے دوسری صورت تعلیم کی نہایت مکمل ہے اور پہلی صورت تعلیم کے لیے بسا اوقات کافی نہیں ہوتی مثلاً ایک باورچی اپنے شاگردوں کو کھانوں کے پکانے کی ترکیب زبانی بتلائے یا ان پر کتاب لکھ کر دیدے اور خوب اچھی طرح سمجھا کر پڑھائے اور ذہن نشین بھی کر دے مگر ہاتھ سے پکا کر نہ دکھائے تو یہ تعلیم کافی نہ ہوگی اور ممکن نہیں کہ شاگرد ان زبانی بتلائی ہوئی اور پڑھائی ہوئی ترکیبوں سے کھانا پکالیں۔ بخلاف اس کے کہ وہ باورچی کھانوں کی ترکیبیں زبانی بتلانے اور لکھانے کے ساتھ پکا کر بھی دکھلا دے اور شاگردوں کے ہاتھ سے پکوا بھی دے تو یہ تعلیم نہایت مکمل ہوگی اور اس استاد کو بہت شفیق کہا جاویگا۔ یہی حالت انبیاء علیہم السلام کی ہے کہ وہ احکام الٰہی کو لیکر آتے ہیں اور ان کو زبانی بھی سمجھایا ہے اور اپنے ہاتھ سے ان کی تعمیل کر کے بھی دکھلا دی ہے غرض تعلیم کو بالکل مکمل کر دیا ہے اور ظاہر ہے کہ جو افعال ان حضرات نے کر کے دکھائے ہیں اس سے غرض یہی ہے کہ دوسرے بھی ان کی تقلید کریں اور ان کو احکام بجا لانے میں کوئی دقت پیش نہ آئے اسی قبیل سے یہ آیت ہے جس میں یہ حکم ہے کہ اپنا مشرب ظاہر کر دیجئے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اس کی قدر ہم نے کہاں تک کی۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

یہاں میری مراد یہ معنی نہیں بلکہ وہ معنی مراد ہیں جس پر شریعت کی اصطلاح میں منافق کا اطلاق ہوتا ہے وہ یہ کہ زبان سے دعویٰ کرے اسلام کا اور واقع میں اسلام نہ رکھتا ہو چونکہ اس کے دل میں اسلام نہیں ہوتا لہذا اسلام سے بالکل خالی ہوتا ہے کیونکہ اسلام حقیقۃً قلب میں ہوتا ہے۔ اور اس کے قلب میں اسلام ہے نہیں تو اسلام کی صفت اس میں بالکل موجود نہیں صرف زبانی دعویٰ ہی دعویٰ ہے اور جب اس میں اسلام نہیں ہے تو کافر ہوا تو یہ آسی کہیں داخل ہوا جو دعویٰ کرتا ہے ایک صفت کا اور وہ صفت اس میں بالکل موجود نہیں ہے تو دعویٰ اس کا کاذب ہے اس لیے فرمایا ہے وَاللّٰهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ۔

اور ان منافقین کا وجود باعتبار حکم شرعی کے اب نہیں ہے اس اعتبار کے ساتھ ان کا وجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں تھا کیوں کہ قانون یہ تھا کہ یا تو دل سے کوئی ایمان لے آوے یا زبان سے مان لے اور یہ کہہ دے کہ میں مسلمان ہوں گو دل میں نہ ہو ورنہ قتل و قتال ہوگا تو اس وقت ایک جماعت ایسی تھی جس کے دل میں اسلام نہ تھا مگر قانون قتل و قتال کے ڈر سے زبان سے کہہ دیتے تھے کہ ہم بھی مسلمان ہیں تو وہ ظاہری احکام میں مسلمان سمجھے جاتے تھے نہ کہ حقیقت میں کیونکہ زبان کا اسلام کسی درجہ میں اسلام نہیں ہے کیونکہ اسلام تو دراصل قلب کا فعل ہے زبانی اسلام کو جو اسلام کہہ دیا جاتا ہے وہ صرف اس وجہ سے کہ زبان قلب کا عنوان ہے جب ایک شخص زبان سے کہہ رہا ہے کہ میں مسلمان ہوں اور اس کا کوئی مکذب نہیں تو اس کو کون کہہ دے کہ اس کے دل میں اسلام نہیں ہے اور گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی سے بعض کا منافق ہونا معلوم ہو جاتا تھا مگر یہ حکم تھا کہ ان کے ساتھ بھی اہل اسلام ہی کا سا معاملہ کیا جاوے اس بنا پر اس وقت تین درجے مقرر تھے مومن و منافق و کافر اور اب کسی کسی کے قلب کا قطعی طور پر حال معلوم نہیں ہو سکتا اس لیے اب یہ درجہ نہ رہا کہ گو دل سے کسی کا کافر ہونا معلوم ہو جاوے مگر اس کے ساتھ معاملہ کافر جیسا نہ کیا جاوے کیونکہ وحی نہ ہونے کے

سبب اب کسی کا دل سے کافر ہونا معلوم ہو ہی نہیں سکتا اس لیے اب تین درجے نہیں رہے صرف دو ہی درجے رہ گئے۔ مسلم یا کافر اور حضور کے زمانہ میں جو تین درجے تھے وہ بھی محض ظاہری احکام کے لحاظ سے تھے کہ ظاہر میں منافقین کے احکام مثل مسلمانوں کے تھے باقی حقیقت کے اعتبار سے تو ان منافقین کا کوئی تیسرا درجہ نہیں درجے درحقیقت دو ہی ہیں کفار اور مومنین۔ اور منافقین دراصل کفار ہی میں داخل ہیں اسی واسطے میں نے کہا تھا کہ منافقین بھی کفار ہی ہیں۔ یہ گروہ اب نہیں ہے صرف اسی زمانہ میں تھا اور ان کے واسطے یہ حکم تھا کہ ان کے ساتھ معاملہ اہل اسلام کا سا کرو نماز میں شریک ہوں تو ہونے دو مساجد میں آئیں تو آنے دو۔ غرض سب طرح ظاہری برتاؤ مسلمانوں کا سا رکھو لیکن حق تعالیٰ نے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلع فرما دیا تھا اجمالاً تو اس آیت سے وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ یعنی یہ لوگ زبان سے کہتے ہیں کہ ہم بھی مومن ہیں مگر یہ مومن نہیں ہیں اس آیت میں تو ابہام کے ساتھ اطلاع دی گئی ہے اور تعیین کے ساتھ بھی اطلاع کر دی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی ایک ایک کا نام بتلا دیا گیا تھا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس راز کے اعلان عام کی اجازت نہیں دی تھی کیوں کہ اس میں بعض مصلحتیں تھیں مثلاً یہ کہ اگر ان کے کفر کو تعیین کے ساتھ ظاہر کر دیا جاتا تو شاید کوئی ان کو قتل کر دیتا اور ان کے ساتھ معاملہ کفار کا سا کیا جاتا اور قتل و قتال کیا جاتا تو خبریں دور دور بھی پہنچتی ہی ہیں تو سب جگہ یہ شہرت ہو جاتی کہ وہاں تو مسلمانوں کو بھی قتل کیا جاتا ہے تو پھر کوئی مسلمان ہونے کیوں آتا۔ نیز حضور کے اخلاق پر دھبہ آتا کہ اپنوں کو بھی قتل کرتے ہیں اس وجہ سے ان کے ساتھ معاملہ کفار کا سا نہیں کیا گیا یہی وجہ ہے کہ بعض وقت کسی منافق کے منہ سے کوئی بات ایسی نکل بھی گئی جس سے اس کا مافی الضمیر ظاہر ہو گیا اور حضرت عمر فاروق ؓ نے حضور ؐ سے اجازت مانگی کہ دعنی اضرب عنقہ یعنی اجازت دیجئے کہ میں اس کی گردن مار دوں تو حضور ؐ نے اس کی اجازت نہیں دی وہ مصلحت یہی ہے کہ اگر اجازت دی جاتی تو خبر یہی مشہور ہو جاتی کہ ایک مسلمان کو مار دیا گیا اس وجہ سے منافقین کے ساتھ کفار کا سا برتاؤ نہیں کیا گیا اور حضور ؐ کو بھی

اطلاع عام کی اجازت نہ تھی یوں حضورؐ نے بعض خاص لوگوں کو مطلع فرما بھی دیا تھا۔ اور نام بنام بتلا دیا تھا۔ چنانچہ حضرت حذیفہؓ کو ان کے نام بتلاتے تھے یہ صاحب سر یعنی حضورؐ کے رازدار کہلاتے تھے۔ ان کو حضورؐ نے بتلا دیا تھا کہ فلاں فلاں شخص کا خاتمہ کفر پہ ہونیوالا ہے گو یہ زبان سے اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں، مگر دل میں ان کے اسلام نہیں ہے اور جس طرح حضورؐ نے عام طور سے اس کو ظاہر نہیں کیا تھا اسی طرح حضرت حذیفہؓ نے بھی اس کو راز میں رکھا اور کسی پر ظاہر نہیں کیا اور یوں فرمایا کرتے تھے کہ مجھے وہ باتیں معلوم ہیں کہ اگر میں زبان سے نکالوں تقطع هٰذَا الْبُلْعُوْمُ یعنی میرا گلا کاٹ دیا جائے مطلب یہ ہے کہ ایسوں کی حالت مجھے معلوم ہے جن کی نسبت کسی کو بھی برا خیال نہیں ہو سکتا۔ اگر میں زبان سے نکال بیٹھوں تو لوگ میرے ہی دشمن ہو جائیں اور میرا گلا کاٹ دیں۔

خشیتِ صحابہؓ

صحابہؓ کو یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ ان کو یہ بات معلوم ہے اس وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عادت تھی کہ جب کوئی جنازہ آتا تو یہ دیکھ لیتے کہ اس کے ساتھ حضرت حذیفہؓ بھی ہیں یا نہیں اگر حضرت حذیفہؓ نہ ہوتے تو حضرت عمرؓ بھی اس کی نماز میں شریک نہ ہوتے اس خیال سے کہ حضرت حذیفہؓ کا بدوں عذر شریک نہ ہونا خالی از علت نہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص بھی شاید ان ہی میں سے ہے جن کا خاتمہ ایمان پر ہونیوالا نہ تھا اور حضرت عمرؓ کی خشیت دیکھئے کہ باوجودیکہ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں اور ان کا تقویٰ طہارت علم سب کو معلوم ہے مگر خوف کی یہ حالت تھی کہ کبھی کبھی حضرت حذیفہؓ سے پوچھتے کہ سچ بتانا کہ میرا نام تو اس میں نہیں لیا گیا جنکی نسبت منافق ہونے کی خبر دی گئی ہے۔ یہ حضرت عمرؓ کی خشیت تھی ورنہ یہ تھوڑا ہی تھا کہ حضرت عمرؓ کو حدیث کے سچا ہونے میں کچھ شک تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کلام میں دس آدمیوں کو نام بنام جنت کی بشارت دی تھی ان میں حضرت عمرؓ بھی تھے تو حدیث نبویؐ میں یہ بشارت سننے کے بعد ان کو اپنے ایمان پر کوئی شک تھوڑا ہی ہو سکتا ہے پھر اس سوال کی وجہ کیا تھی۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ جس کو حق تعالیٰ کی

عظمت و قدرت منکشف ہو جاتی ہے وہ یہ تو بخوبی سمجھ جاتا ہے کہ وہاں وعدہ خلافی نہیں ہو سکتی۔ ایک ذرا سے با اختیار حاکم کے یہاں بھی ایسا نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ احکم الحاکمین کے یہاں کہ جہاں کسی قسم کی روک ٹوک اور مجبوری ہے نہیں پھر وہاں وعدہ خلافی ہو تو کیوں ہو مگر عظمت و قدرت پر نظر ہونے سے یہ خیال ہو سکتا ہے کہ اگر وہ وعدہ پورا نہ کریں تو کسی کا کیا اجارہ ہے وعدہ کرنے سے قدرت سلب نہیں ہو گئی پس جیسا کہ وعدہ پورا کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں اسی طرح قدرت کو کام میں لانے سے بھی تو کوئی رکاوٹ نہیں ہے یہ خیال اُن کی جان کو گھلا دیتا ہے۔ اور اُس وقت جو آثار بھی خشیت کے ان پر ظاہر ہوں تو کچھ تعجب نہیں۔ حضرت عمرؓ جیسے کامل الایمان ہیں۔ سب جانتے ہیں کیا ان کو حدیث کی بشارت میں کچھ شک ہو سکتا ہے ہرگز نہیں مگر وہی بات ہے کہ جس وقت خشیت کا غلبہ ہوتا ہے اور قدرت پر نظر ہوتی ہے تو بشارت کا خیال بھی نہیں رہتا۔

اہلِ حال تو اس کو سمجھ گئے ہوں گے، مگر اہلِ قال کی سمجھ میں نہ آیا ہو گا کیونکہ ابھی طالب علمانہ اشکال کچھ باقی ہیں اور قواعد علمیہ پر یہ مضمون منطبق نہیں ہوا۔ لیجئے میں ان کو بھی سمجھائے دیتا ہوں سمجھ لیجئے کہ یہ بات مسلم ہے کہ حق تعالیٰ کے وعدہ میں خلاف نہیں ہو سکتا، وعدے دو قسم کے ہیں مقید اور مطلق یعنی ایک تو وہ وعدہ ہوتا ہے جسمیں بلا کسی قید کے کہہ دیا جاتا ہے کہ ہم یوں کریں گے تو اس وقت اس بات پر ایمان لانا واجب ہے کہ وہ کام ویسا ہی ہو گا اور مقید کے یہ معنی ہیں کہ مثلاً یوں کہہ دیا جائے کہ یہ شخص فلاں عمل کرے گا تو اس کو جنت میں لیجائیں گے۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ قید پائی جائے گی یعنی وہ عمل کرے گا تو جنت اس کو ضرور ملیگی ورنہ نہیں۔

یہاں تک مضمون بالکل قواعد مشہورہ پر منطبق ہے۔ مگر یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ وعدہ مقیدہ کی بھی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس میں قید ظاہر بھی کر دی گئی ہو اور ایک وہ جس میں قید ظاہر نہ کی گئی ہو بلکہ حق تعالیٰ نے اپنے علم میں رکھی ہو غرض بعض مقید بصورت اطلاق ہوتا ہے تو اب حضرت عمرؓ کے خوف کی وجہ یہ تھی کہ مجھ سے وعدہ کیا گیا ہے کہ تم جنت میں جاؤ گے لیکن ممکن ہے کہ یہ

وعدہ کسی قید کے ساتھ مقید ہو اور اس قید کو ظاہر نہ کیا گیا ہو بلکہ حق تعالیٰ نے اپنے علم میں رکھی ہو اور ممکن ہے کہ مجھ میں اُس قید کا وجود نہ ہو تو اس صورت میں باوجود وعدے کے بھی خوف ہوسکتا ہے دیکھئے اب وہ مضمون قواعد علمیہ پر بھی منطبق ہو گیا۔

باوجود وعدہ کے خوف : حاصل یہ کہ باوجود وعدے کے بھی خوف ہوسکتا ہے۔ اور ہونا چاہئیے۔

اسی واسطے یہ دعا سکھلائی گئی ہے ربنا اٰتنا ما وعدتنا علیٰ رسلک ولا تخزنا یوم القیٰمۃ جس کا ترجمہ ہے کہ اے اللہ جن باتوں کا آپ نے رسول کی زبانی ہم سے وعدہ کیا ہے وہ ہم کو دینا اور ہم کو قیامت کے دن رسوا نہ کرنا اس میں ظاہرا یہ اشکال ہے کہ جس چیز کا وعدہ کیا گیا اُسمیں خلاف تو ہو ہی نہیں سکتا پھر اس کے مانگنے کی کیا ضرورت ہے جس سے وہم ہوتا ہے کہ کیا وعدہ پورا ہونے پر ایمان نہیں۔ اور یہ دعا خود حق تعالیٰ نے تعلیم فرمائی ہے تو یہ کیا بات ہے۔

اُس کی وجہ علماء نے یہی لکھی ہے کہ جس قید کے ساتھ وعدے کیے گئے ہیں ممکن ہے کہ وہ قید ہم میں باقی رہے یا نہ رہے اور ہم محل وعدہ رہیں یا نہ رہیں خدانخواستہ حالت ایسی متغیر ہو جاوے کہ ہم اُس وعدہ کے مصداق ہی نہ رہیں۔ مثلاً وعدہ کیا گیا ہے کہ جو کوئی ایمان لاتے گا اور عمل صالح کرے گا تو اسکو جنت ملے گی۔ اس میں وعدہ ہے جنت کا مگر مقید ہے بقاء ایمان اور عمل صالح کے ساتھ۔ فرض کر لیجئے ہم میں اس وقت ایمان بھی ہے اور عمل صالح بھی ہے اور اس وقت ہم اس وعدہ کے مصداق ہیں لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ خاتمہ کے وقت یہ حالت نہ رہے اور اس وعدہ کے مصداق نہ رہیں۔ اور جنت نہ مل سکے تو وعدہ بھی سچا رہا اور موعود ظاہری کے خلاف کا وقوع میں آنا بھی ممکن ہو گیا کیونکہ وہ حقیقۃً موعود ہی نہ تھا اسواسطے سوال کیا جاتا ہے۔ اب اس آیت پر وہ اشکال نہ رہا کہ جس چیز کا وعدہ ہے اُس کا سوال کیوں کیا جاتا ہے حاصل جواب کا یہ ہوا کہ سوال اس بات کا کیا جاتا ہے کہ حق تعالیٰ ہمارے اندر ان قیود کو پیدا کر دیں اور باقی رکھیں جن کے ساتھ وہ وعدہ مقید ہے تو اٰتنا ما وعدتنا کا حاصل یہ ہوا کہ ہم کو ان لوگوں میں سے کر دیجئے جو اس وعدہ کے مصداق ہیں۔ غرض وعدہ سچا ہے لیکن کبھی واقع میں وہ وعدہ مقید ہوتا ہے اور یہ کچھ ضروری نہیں کہ وہ قید ہم کو بتلا بھی دی جاتے

یہ بات اس قدر خوف کی ہے کہ جس کے کان میں ایک دفعہ پڑ گئی ہو اس کو کبھی چین نہیں آسکتا یہ تقریر اہل قال کے فہم کی لائق بھی ہو گئی باقی اہل حال کی تو وہی حالت ہے جو پہلے عرض کی گئی کہ اگر ان کو یہ بھی معلوم ہو چکا ہو کہ میں اس وعدے کا مصداق ہوں تب بھی چین نہیں آتا کیونکہ یہ بات ہی ایسی ہولناک ہے کہ جس وقت اس کی طرف خیال چلا جاوے تو اور سب خیالات کو محو کر دیتی ہے تو اعتقاد وعدہ کا زائل نہیں ہوتا لیکن اس کا استحضار نہیں رہتا۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ شیر خوفناک چیز ہے فرض کیجئے کہ وہ ایک بہت مضبوط لوہے کے کٹہرے میں بند ہو اور اس حالت میں ایک شخص اس کے سامنے کھڑا ہو اور وہ شیر کٹہرے کے اندر سے اس پر آنکھیں نکالے اور حملہ کرے تو اس شخص کی حالت کیا ہو گی کیا وہ اطمینان سے کھڑا رہے گا ہرگز نہیں، رنگ زرد پڑ جاتے گا اور کانپنے لگے گا اور دل دھک دھک کرنے لگیگا حالانکہ ظاہر میں اسکی کوئی وجہ نہیں ہے کیونکہ معلوم ہے کہ شیر کٹہرے سے باہر نہیں آسکتا اور اس کو ذرا بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ پھر یہ حالت اس کی کیوں ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ شیر کے واسطے ہیبت لازم ہے جس وقت شیر کا سامنا ہوتا ہے۔ ہیبت سے دوسرے تمام خیالات اس وقت محو ہو جاتے ہیں اور یہ یاد نہیں رہتا کہ میرے اور شیر کے درمیان کٹہرا حائل ہے یہی حالت ہے حق تعالیٰ کی عظمت اور قہر کی کہ جس کے سامنے وہ ہوتا ہے اس کے دوسرے خیالات بالکل محو ہو جاتے ہیں یہ وجہ ہے حضرت عمرؓ کے ڈرنے کی، حالانکہ اطمینان تھا کہ میں عشرہ مبشرہ میں سے ہوں مگر قہر خداوندی ایسی ہولناک اور ہیبت ناک چیز ہے کہ جس وقت اس کا خیال آتا تھا تو اور تمام خیالات مٹ جاتے تھے جس وقت حضرت عمرؓ پر اس کا انکشاف ہوتا تو ڈرتے اور حضرت حذیفہؓ سے پوچھتے تھے کہ میرا نام تو حضورؐ نے منافقین میں نہیں لیا وہ اطمینان دلاتے تو تسلی ہو جاتی پھر کبھی خشیت کا غلبہ ہوتا تو پھر اسی طرح پوچھتے پھر وہ اطمینان دلاتے تو تسلی ہو جاتی غرض یہی لوٹ پوٹ رہتی بحمد اللہ اس وقت اس کی وجہ اس طرح بیان کر دی گئی ہے کہ کوئی بھی علمی اشکال نہیں رہا باقی پورا انکشاف اور حل اشکالوں کا اس وقت

ہو سکتا ہے جبکہ ہم بھی اپنے اندر خوف اور خشیت پیدا کریں۔ اہل حال کی حالت بدون حال پیدا کیئے پوری طرح سمجھ میں آ نہیں سکتی۔

الحاصل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو منافقین کا علم تھا مگر ان کو رسوا نہ کیا گیا اور ان کے ساتھ ظاہری برتاؤ اہلِ اسلام سا ہی کیا گیا ان مصالح کی وجہ سے جن کو میں نے بیان کیا۔ بہر حال اُسوقت ایک جماعت منافقین کی تھی اور ایک جماعت کفار کی اور دونوں میں یہ امر مشترک تھا کہ دونوں میں ایمان نہ تھا تو حقیقت میں یہ دونوں ایک ہی جماعت کے فرد تھے۔ یہ جماعت وہ ہے جن کا دعویٰ غلط ہے اور یہ اس کے مشابہ ہیں جو دعویٰ کرے مالدار ہونے کا اور مال اس کے پاس ذرا بھی نہ ہو یہ مدعین کی پہلی قسم ہے سو اسوقت بحمد اللہ ایسا منافق نہیں ہے کوئی شاذ و نادر کہیں ہو تو ہو مگر کوئی جماعت منافقین کی نہیں ہے کوئی ایک دو آدمی دبا دبایا پڑا ہو کسی حکومت وغیرہ کے خوف سے یا کسی کے لحاظ سے تو اور بات ہے ورنہ درحقیقت آجکل کوئی عام دباؤ ایسا نہیں ہے جس کی وجہ سے کسی جماعت کو اس بات کی ضرورت ہو کہ ظاہر کچھ رکھا جاوے اور باطن کچھ آج کل جس کا جی چاہے کھلم کھلا کافر ہو سکتا ہے۔ اس لیئے منافقین کا ذکر اس وقت فضول ہے بلکہ اسوقت صرف مسلمانوں کا ذکر ہے کہ یہ اپنے دعوے میں غلطی پر تو نہیں اور اس شخص کے مشابہ تو نہیں کہ جو مالدار ہونیکا دعویٰ کرتا ہے اور مال سے بالکل ہی خالی ہے سو خدا تعالیٰ کا احسان ہے کہ ہم میں ایسا کوئی نہیں اس سے تو حق تعالیٰ نے محفوظ رکھا ہے کہ ہم زبان سے مسلمان بنتے ہوں اور دل میں ایمان سے خالی ہوں۔

کسی کو کافر کہنا یہاں سے ایک بات یہ بھی نکلتی ہے کہ یہ جو بعض لوگ تشدد کرتے ہیں کہ مسلمان کو کافر اور منافق کہہ دیتے ہیں یہ بڑی غلطی اور جرأت ہے۔ جب وہ زبان سے اسلام ظاہر کرتا ہے اور آج کل کوئی وجہ اس بات کی رہی نہیں کہ نفاق کا وتیرہ اختیار کیا جاتے تو پھر کسی کو کافر اور منافق کہنے کے کیا معنی؟ کافر بڑا سخت لفظ ہے بڑی احتیاط چاہیئے۔ کافر کسی کو اس وقت کہہ سکتے ہیں جب کہ وہ

کوئی فعل ایسا کرتا ہو جو محتمل تاویل کو بھی نہ ہو۔ مثلاً کوئی شخص بت پرستی بلا اکراہ کھلم کھلا کرتا ہو تو اس وقت اس کو کافر کہہ سکتے ہیں اور جب ایک شخص بت پرستی سے نفرت رکھتا ہے زبان سے کلمہ پڑھتا ہے تو اس کی تکذیب کرنا اور کافر کہنا کیا معنی؟ ظاہر بات ہے کہ کافر اصل میں تو اس کو کہتے ہیں جو دل سے منکر ہو حق تعالیٰ کا اور جو شخص زبان سے انکار کرتا ہے اُس کو کافر اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ ہمارے نزدیک وہ دل سے منکر ہے کیونکہ اس کی زبان سے انکار سنا گیا اور زبان ترجمان دل ہے تو کفر کا حکم اس واسطے لگایا گیا ہے کہ زبان کے ذریعے سے اس کا انکار قلبی معلوم ہو گیا۔ غرض کسی کو کفر لسانی کی وجہ سے کافر کہنا بھی دراصل کفر قلبی ہی کی وجہ سے ہے مگر چونکہ ہم کو انکار قلب کا علم ظاہر سے ہوتا ہے یعنی زبان سے اس واسطے زبان سے انکار کرنے والے کو کافر کہہ دیتے ہیں تو اس سے ثابت ہوا کہ ہم حکم اسی بات پر لگا سکتے ہیں جو ظاہر ہو اور زبان سے کہی جائے پس جب ایک شخص اسلام ظاہر کرتا ہے اس کو ہم کافر کیسے کہہ سکتے ہیں؟ اس کے تو یہ معنی ہوں گے کہ گو یہ اسلام ظاہر کرتا ہے مگر ہم کو کسی اور ذریعے سے دل کا حال معلوم ہو گیا ہے کہ اس میں کفر ہے سو وہ کونسا ذریعہ ہے؟ ہمارے پاس وحی نہیں آتی جس سے دل کا حال معلوم ہو جاتے اور نہ کسی صاحب وحی نے ہم کو بتلایا جیسا کہ حضرت حذیفہؓ کو بتلا دیا تھا۔ پھر دل پر حکم کیسے لگایا جا سکتا ہے یہ سخت غلطی ہے۔

فتویٰ کفر میں احتیاط

اور اس میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ ہم نے آج کل یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ اپنا جو ایک مسلک قرار دے لیا ہے بس وہی اسلام ہے اور وہی ایمان ہے جو اس کے خلاف ہو وہ کافر ہے یہ بہت سخت بات ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کو دیکھئے۔ صاحب مذہب تھے، مجتہد تھے۔ ان کا یہ منصب تھا کہ ایک مسلک قرار دے لیتے ہم تو اس کے بھی اہل نہیں مگر ان کی احتیاط دیکھئے اُن کے زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک شخص نے سوال کیا کہ آپ اُس شخص کے حق میں کیا فرماتے ہیں جو یہ کہتا ہے کہ لا یدخل النار کافر یعنی کوئی کافر دوزخ میں نہیں جائے گا آپ نے شاگردوں سے پوچھا

سب نے اُس شخص پر کفر کا فتویٰ لگا دیا کیونکہ یہ لفظ صراحۃً خدا تعالیٰ کے قول کے خلاف ہے
قرآن شریف میں صاف آیا ہے کہ کفار دوزخ میں جائیں گے اور یہ شخص کہتا ہے کہ کوئی
کافر دوزخ میں نہ جائے گا تو اس نے تکذیب کی حق تعالیٰ کے قول کی اور اس کا کفر ہونا ظاہر ہے
امام صاحبؒ نے فرمایا کہ ظاہر معنی تو یہی ہیں مگر اس میں کوئی تاویل بھی ہو سکتی ہے یا نہیں لوگوں نے
کہا ایسے صریح لفظ میں کیا تاویل ہو سکتی ہے۔ فرمایا نہیں میرے نزدیک ایک تاویل ہو سکتی ہے
اس کا یہ کہنا کہ دوزخ میں کوئی کافر نہیں جائیگا اس کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ دوزخ میں جاتے
وقت کوئی کافر نہ رہیگا کیونکہ قیامت میں کفار کو حق ظاہر ہو جائیگا اور یہ معلوم ہو جائے گا
کہ ہم غلطی پر تھے۔ جب اپنی غلطی ظاہر ہو جائے گی تو اسوقت انبیاء کی بھی تصدیق کریں گے
اور جنت کی بھی اور نار کی بھی تو وہ منکر نہ رہے تو اب یہ کہنا ٹھیک ہو گیا کہ دوزخ میں جو کوئی جائے
گا وہ منکر اور کافر نہ ہو گا یعنی اسوقت تو اس شخص نے کیا جھوٹ کہا پھر کفر کا فتویٰ کیوں
لگایا جاوے۔ یہ اور بات ہے کہ اُس وقت کا ایمان نفع نہ دیگا کیونکہ قیامت دار الجزاء ہے دار العمل
نہیں ہے دار العمل تو دنیا ہے دنیا کا کیا ہوا عمل کام دے سکتا ہے نہ کہ آخرت کا۔

علاوہ ازیں آخرت تو علم الیقین کا گھر ہے وہاں ہر شخص کو انکشاف
حقائق ہو جائے گا اور ایمان وہ کار آمد ہے جو بالغیب ہو۔ حق تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو اسی لیے
تو بھیجا ہے کہ بلا دیکھے ہوئے ان کی خبر پر اور ان کی کتاب پر یقین کر کے ایمان لایا جاوے۔ ایمان
مقبول ہے اور اگر تصدیق بالغیب مدار قبول ایمان نہ ہوتی تو حق تعالیٰ انبیاء کو کیوں بھیجتے نہیں
انکشاف حقائق فرما دیتے تاکہ سب ایمان لے آتے تو جو شخص آخرت میں ایمان لایا اس نے انبیاء کی
اور قرآن کی تصدیق نہیں کی بلکہ دیکھ کر ایمان لایا یہ ایمان بالغیب نہیں ہوا لہذا مقبول نہیں تو گو اس
شخص کا ایمان کار آمد تو بیشک نہیں رہے لیکن ایمان تو ہے۔

حاصل یہ ہوا کہ وہ شخص گو شرعاً کافر ہے مگر لغۃً کافر نہیں پس یہ جملہ تو صادق ہو گیا کہ وہ
نار میں داخل ہوتے وقت بمعنی لغوی کافر اور منکر نہ ہو گا سو لا یدخل النار کافر کہنے والے کو کیسے

کافر کہتے ہو جبکہ اُس کے قول میں یہ تاویل ہو سکتی ہے۔

دیکھئے امام صاحبؒ نے کس قدر احتیاط کی حالانکہ ایسا صریح کلمہ کفر تھا مگر سلف نے اس بارہ میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے یہی حالت ہمارے اساتذہ اور مشائخ اور بزرگوں کی تھی کہ کسی کو کافر کہنے میں بڑی احتیاط کرتے تھے۔ میں نے ایک حکایت ایک کتاب میں دیکھی اور اس کو دیکھ کر مجھے بڑا غصہ آیا اور اس کا حکم فوراً ذہن میں یہی آیا کہ یہ شخص کافر ہو گیا اور فوراً حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے پاس گیا کہ دیکھئے حضرت اس شخص کے کفر میں کیا کلام ہے وہ حکایت یہ تھی کہ ایک شیخ نے اپنے ایک مرید سے پوچھا کہ تو خدا کو جانتا ہے اس نے کہا جی میں کیا جانوں خدا کو میں تو آپ کو جانتا ہوں یہ کس قدر بیہودہ کلمہ ہے یہ شخص خدا کا انکار کرتا ہے اور خدا سے بھی زیادہ پیر کو سمجھتا ہے تو اس کے کفر میں کیا کلام ہے۔ مولانا ہنسے اور کہا کیا اس لفظ کے کوئی صحیح معنی نہیں ہو سکتے۔ میں نے کہا حضرت اس کے کیا معنی ہو سکتے ہیں جب ایک شخص خدا ہی کو جاننے کا منکر ہے تو اس کا ایمان کہاں؟ فرمانے لگے اچھا تم جانتے ہو خدا کو بس اب تو ہوش درست ہوئے۔ کہنے لگے بھائی خدا کو جاننا تو بڑا مشکل ہے وہ کون شخص ہے جو دعویٰ کرے کہ میں خدا کو جانتا ہوں یہی تو وہ مسئلہ ہے جس میں تمام فلاسفر گمراہ ہوئے اور یہی تو وہ مسئلہ ہے جس میں ہزاروں اب بھی گمراہ موجود ہیں۔ جو حق پر ہیں وہ بھی اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتے کہ خدا تعالیٰ کو اجمالاً کچھ پہچانتے ہیں باقی جس کا نام علم اور جاننا اور پہچاننا ہے اس کی تو خبر صلا ہے۔ یہی بات تو وہ شخص بھی کہتا ہے کہ میں خدا کو کیا جانوں تم کو جانوں یعنی خدا کا راستہ بتلانے والے کو۔ تو وہ کیا بیجا کہتا ہے پھر بیچارے کو کافر کیوں بناتے ہو۔ دیکھئے مولانا نے ایک تاویل بعید کر کے اس کو بچا لیا۔

کافر بنانا یا بتانا: اہل حق کا طریقہ یہی ہے کہ حتی الامکان جب تک کوئی بھی تاویل بن سکے کسی کو کافر نہ بتا دیں۔ ہاں اگر وہ خود ہی تاویل کو بھی رد کر دے تو مجبوری ہے کہ اب مدعی سست اور گواہ چست کا قصہ ہے یا تی اپنی طرف سے

کبھی کسی کو کافر نہیں بناتے اور جہاں کہیں بضرورت شرعی انہوں نے کسی کو کافر کہہ دیا ہے بعض جہلا اس پر بھی طعن کرتے ہیں کہ لوگوں کو کافر بناتے ہیں۔ میں اس کے متعلق بطور لطیفہ کہا کرتا ہوں کہ انہوں نے کافر بنایا نہیں بلکہ کافر بتایا ہے (دونوں میں ایک نقطہ کا فرق ہے۔) اس شخص نے واقعی ایسا ہی کام کیا ہے جس پر کفر عائد ہوتا ہے اور کوئی تاویل بھی نہیں بن سکتی تو وہ کافر تو خود بن گیا انہوں نے صرف بتا دیا ہے کہ اس پر کفر عائد ہوتا ہے اور اس بتانے میں بھی اتنی احتیاط کی ہے کہ بعید سے بعید تاویل بھی اٹھا نہیں رکھی جب کوئی تاویل بھی نہ بن سکی تب انہوں نے یہ لفظ منہ سے نکالا اور ان کی کوئی ذاتی غرض یا غیظ و غضب یا بات کی پچ اس میں شامل نہیں ہوتی بلکہ خوف خدا اور ترحم شامل ہوتا ہے کافر کے لفظ سے وہ کانپتے ہیں اور کسی کے لیے بھی اس کے استعمال کو حتی الامکان گوارا نہیں کرتے اور واقعی یہ لفظ ہے بھی ایسا ہی کیونکہ اس کے معنی ہیں ابدالآباد کیلئے رحمت خدا سے بالکل ناامید و محروم ہو جانیوالا سو یہ کتنی بڑی بات ہے کہ ارحم الراحمین کی رحمت سے کسی کو ایسا ناامید کر دیا جاوے اُن کی نظر میں دنیا کوئی چیز نہیں۔ ان کی نظر تو آخرت پر رہتی ہے چنانچہ جس وقت کسی گنہگار کو بھی دیکھتے ہیں اور یہ خیال آتا ہے کہ یہ شخص ایک گناہ میں مبتلا ہے اور آخرت میں اس کے لیے بڑی مصیبت ہو گی تو ان کو رحم آجاتا ہے خواہ ان کا دشمن ہی کیوں نہ ہو اور خواہ اس سے کتنی ہی تکلیفیں ان کو کیوں نہ پہنچی ہوں ان کے پیش نظر ہر وقت آخرت رہتی ہے وہاں کی راحت کو راحت اور وہاں کی تکلیف کو تکلیف سمجھتے ہیں۔ دنیا کی راحت ہوئی تو کیا اور تکلیف ہوئی تو کیا مگر وہاں کی تکلیف کسی کے لیے گوارا نہیں کرتے اور وہاں کی تکالیف گناہوں پر مبنی ہیں اس وجہ سے ادنیٰ سا گناہ بھی کسی کے ذمہ لگانا پسند نہیں کرتے چہ جائیکہ کفر کیونکہ کفر کسی کیلئے ثابت کر دینے کے تو یہی معنی ہیں کہ اس کو ابدالآباد کیلئے رحمتِ خداوندی سے مایوس اور محروم بنا دیا جاتے اور ہمیشہ ہمیشہ کی تکالیف اور عذاب اس کے لیے ثابت ہو جائیں یہاں سے کب ہو سکتا ہے ان کا تو اگر اختیار ہو تو مسلمان کو تو کافر کہنا درکنار کافر کو بھی کافر نہ رہنے دیں

غرض کفر بہت بڑا حکم ہے اس کا نام بھی اُن کی زبان پر آنا مشکل ہے یہ اور بات ہے کہ کوئی خود ہی کافر بنا اور رحمت الٰہی سے خارج ہونا چاہے یہ اس وقت بھی دل سے چاہتے ہیں کہ یہ کافر نہ بنے مگر جب وہ خود ہی ڈوبنا چاہتا ہے تو کسی کا کیا بس ہے حکم شرعی کو یہ بدل نہیں سکتے بدرجہ مجبوری فتویٰ دے دیں گے تو اس وقت انہوں نے کافر نہیں بنایا بلکہ وہ خود ہی کافر بنا انہوں نے صرف بتلا دیا ہے کہ یہ کفر ہو گیا انہوں نے تو بالکل ہی مضطر ہو کر یہ فتویٰ دیا اگر بعید سے بعید بھی تاویل ان کو مل جاوے تو وہ اس حکم کفر سے بچا لیتے ہیں اللہ والوں کا یہی طریق رہا ہے میرے پاس بہت فتوے آتے ہیں لوگ پوچھتے ہیں کہ فلاں شخص نے یہ کلمہ کہا اس سے کفر عائد ہوا یا نہیں میں اکثر یہ جواب دے دیتا ہوں کہ یہ کلمہ گستاخی کا ہے یہ شخص بہت بے ادب ہے اس نے بڑا گناہ کیا مگر کفر نہیں کفر کا نام لیتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے کیونکہ کسی کو کافر کہنا حق تعالیٰ کی رحمت سے بالکل نکال دینا ہے اور رحمت حق تعالیٰ کی اس قدر وسیع ہے کہ اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔

ضعیف ترین ایمان

اس کا پتہ اس حدیث سے چلتا ہے بڑی عبرت کی حدیث ہے اور وہ مشہور حدیث شفاعت کی ہے اس سے ہم لوگوں کو سبق لینا چاہیئے اور ذرا زبان اور قلم کو قابو میں رکھنا چاہیئے وہ حدیث یہ ہے کہ قیامت کے دن جب شفاعت کی اجازت ہوگی تو سب علی قدر مراتب شفاعت کریں گے۔ انبیاء علیہم السلام بھی کریں گے اور اُمتی بھی، جب سب کی شفاعت ختم ہو جاوے گی تو حق تعالیٰ فرما دیں گے کہ انبیاء بھی شفاعت کر چکے اور ملائکہ بھی کر چکے اب ارحم الراحمین باقی ہیں۔ یہ فرما کر دو ہتھڑ بھر کر دوزخیوں کو جنت میں داخل کر دیں گے۔ (اللہ میاں کی دو ہتھڑ خدا جانے کتنی ہوگی اس سے یہاں بحث کرنا نہیں ہے کیونکہ یہ لفظ متشابہات میں سے ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو کچھ مراد ہو حق ہے) یہاں مقصود یہ ہے کہ حق تعالیٰ بہت سے اُن دوزخیوں کو جہنم سے نکالیں گے جنکو دشفاعت اُمتیوں کی پہنچی نہ ملائکہ کی، نہ انبیاء علیہم السلام کی۔

اور اسی حدیث میں یہ لفظ بھی ہے اخرجوا من النار من کان فی قلبہ مثقال ذرۃ من ایمان یعنی انبیا علیہم السلام اور ملائکہ کو یہ حکم ہوگا کہ دوزخ سے اس شخص کو بھی نکال لو جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہو ان دونوں کے ملانے سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ شفاعت سے رہ گئے تھے ان میں ذرہ برابر بھی ایمان نہ ہوگا۔

تو اب اس پر اشکال ہوتا ہے کہ یہ لوگ مومن ہوں گے یا کافر؟ اگر کافر ہوں گے تو ان کی مغفرت بعد میں بھی کیسی ہوگی کیونکہ کافر کی مغفرت ممتنع ہے اور اگر مومن ہیں تو کسی شفاعت کرنیوالے نے مومنین نے یا ملائکہ نے یا کسی نبی نے کیوں شفاعت نہیں کی جبکہ یہ حکم ہوا تھا کہ جن کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہے ان کو بھی نکال لیا جاوے۔

اس اشکال کا جواب یہی ہے کہ یہ شق تو باطل ہے کہ وہ کفار ہوں کیونکہ کافر کی بخشش نہیں ہو سکتی بلکہ وہ مومن ہی ہونگے لیکن ان کا ایمان اتنا ضعیف اور اس قدر مخفی ہوگا کہ انبیا علیہم السلام کے ادراک میں بھی نہیں آئیگا حالانکہ حق تعالیٰ نے ان کو علم کامل عطا فرمایا ہے خصوصاً آخرت میں کہ وہ تو مقام ہی ہے انکشاف حقائق کا مگر اس پر بھی ان حضرات کو پتہ نہ چلا۔ اتنا ذرا سا ایمان تھا کہ سوائے حق تعالیٰ کے کسی کو علم نہ ہوگا غرض یہ لوگ حقیقت میں ہونگے مومن ہی لیکن ان کا ایمان اسقدر دھندلا ہوگا کہ انتہا درجہ کے تیز چشم بصیرت کے بھی ادراک میں نہ آئیگا اس سے ثابت ہوا کہ بعض کا ایمان ایسا ضعیف بھی ہے کہ انبیا علیہم السلام کو بھی اس کا پتہ چلنا مشکل ہے پھر مولویوں کو تو کیسے پتہ چل جاوے گا اور عوام تو کسی شمار ہی میں نہیں اس لیے بات بات میں کسی پر کفر کا فتویٰ لگا دینا کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟

تخصیص رحمت: یہ تو حق تعالیٰ کی رحمت کو تنگ کرنا ہے اس موقع پر اس اعرابی کا قصہ یاد کیجیے جس نے یہ دعا کی تھی اللھم ارحمنی ومحمدا ولا ترحم معنا احدًا قصہ اس کا یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں

ایک اعرابی مسجد نبوی میں آیا اور نماز پڑھی اور اس کے بعد دعا کی کیا مزے کی دعا ہے وہ کہتا ہے کہ اے اللہ میرے اوپر رحم کرنا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر رحم کرنا اور ہم دونوں کے سوا کسی اور پر رحم مت کرنا۔

یہ بھی خوشامد تھی حضورؐ کی کہ آپ کو شامل کر لیا ورنہ شاید وہ یہی چاہتا ہو کہ ساری رحمت حق تعالیٰ کی مجھ ہی کو مل جاوے خیر جس طرح بھی ہو اس نے آپ کو تو دعا میں شریک کر لیا حضورؐ نے اس کو اپنے پاس بلایا اور فرمایا لقد تحجرت واسعا یعنی تو نے ایک بہت بڑی چیز کو تنگ کر دیا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی رحمت میں کچھ کمی تھوڑا ہی تھی جو تو نے دو ہی آدمیوں پر منحصر کر دیا اللہ تعالیٰ کی رحمت تو وہ ہے کہ تمام دنیا کو محیط ہو جائے اور پھر بھی ختم نہ ہو اس حدیث سے ثابت ہوا کہ حق تعالیٰ کی رحمت کو تنگ نہیں کرنا چاہئے

اس قصہ کو سن کر تعجب کریں گے کہ وہ شخص کیسا گنوار تھا کہ ایسی دعا کی کہ بس ساری رحمت دو ہی شخصوں کے حصہ میں آجاوے۔ میں کہتا ہوں اسکو تو گنوار کہا جاتا ہے لیکن اپنی اس حالت پر تو نظر ڈالیے جو آجکل تعلیم یافتہ جماعت اور اہل علم کی ہو رہی ہے ان کا طرزِ عمل دیکھئے کہ انہوں نے بس اپنا ایک مسلک قرار دے لیا ہے جو اس سے ذرا اختلاف ہوا اُسی کو رحمتِ حق سے خارج کر دیا کیا یہ وہی اعرابی والی حالت نہیں ہے مگر اپنا عیب نظر نہیں آتا ورنہ حالت تو ان تعلیم یافتوں کی بھی اس اعرابی کی سی ہے جس نے رحمت کو تنگ کیا تھا۔ ویسے ہی انہوں نے تنگ رکھا ہے آخر کیا فرق ہے دونوں میں۔ اس نے دو ہی پر منحصر کیا تھا اور یہ دس بیس سو پچاس یا ہزار دو ہزار پر منحصر کرتے ہیں اس میں تو دونوں شریک ہیں کہ یہ واسع کو تنگ کرتے ہیں تو اس کو گنوار کہنا اور انپر اعتراض کرنا کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے؟

بلکہ اسکی حالت اہون تھی کہ دلائل کا علم نہ ہونے سے اس نے ایسا خیال کیا تھا اور یہاں بینات کے بعد یہ طرز ہے بہر حال حضرت حق تعالیٰ کی رحمت بہت بڑی چیز ہے کسی کو اپنے

تخصیص رحمت کا زعم اور دعویٰ نہیں چاہیے۔

ابو داؤد کی حدیث میں ایک قصہ آیا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک عابد اور ایک فاسق کا۔ عابد تو دن رات عبادت میں رہتا اور یہ دن رات گناہ اور فسق و فجور میں رہتا تھا وہ عابد اس کو نصیحت کیا کرتا تھا کہ تو یہ حرکتیں چھوڑ دے اُس نے کہا کہ میاں تم اپنے کام میں لگو مجھے میرے حال پر چھوڑ دو میں جانوں میرا خدا جانے۔ غرض ایسا فاسق تھا کہ نصیحت سے بھی باز نہ آتا تھا۔ ایک روز عابد نے اس کو کسی بُرے عمل میں دیکھا تو غصہ میں آکر کہا کہ تجھے خدا تعالیٰ ہرگز نہ بخشے گا۔ یہ دعوے کا لفظ تھا۔ اس کے بعد دونوں کی موت آگئی حکم ہوا کہ عابد کو دوزخ میں لے جاؤ اور فاسق کو جنت میں لے جاؤ اور عابد سے کہا گیا کہ کیا میری رحمت تیرے اختیار میں تھی جو تو نے میرے بندہ پر قطعی حکم لگا دیا کہ تجھ کو خدا تعالیٰ ہرگز نہ بخشے گا اب ہم تجھ کو دوزخ میں لے جاتے ہیں اور اس کو جنت میں اگر تجھ سے ہو سکے تو روک لے۔

یاد رکھو! جو شخص اسلام کا دعویٰ کرتا ہو یعنی زبان سے مسلمان ہونے کا اقرار کرتا ہو تو وہ اس وقت تک کافر نہیں ہوتا جب تک کسی ایسی بات کا انکار نہ کرے جو ضروریات دین میں سے ہے مثلاً نماز کے فرض ہونے کا انکار کرے یا روزہ کی فرضیت کا انکار کرے یا اور جو چیزیں ضروریات دین سے ہیں اُن میں کسی کا انکار کرے تب تو البتہ اسلام سے خروج ہوتا ہے اور جو ضروریات کا انکار نہ کرے، ہاں عمل میں سستی کرتا ہے تو وہ گنہگار ہے اس پر ایسا سخت حکم نہیں لگایا جا سکتا کہ یہ بالکل اسلام سے خارج ہو گیا اور ابدالآباد کیلئے حق تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہو گیا آخر کفر سے پہلے گناہ کا مرتبہ بھی تو ہے اور اس میں دو درجے ہیں صغیرہ اور کبیرہ۔ اہل حق کا عقیدہ ہے کہ گناہ کبیرہ سے بھی خروج عن الاسلام نہیں ہوتا اور اس پر خلود فی النار نہ ہوگا اور یہ بھی عقیدہ ہے کہ شفاعت اہل کبائر کو پہنچے گی۔ بڑے سے بڑا کبیرہ بھی اگر کوئی کرے اور ساری عمر کرتا رہے اور کبھی اُس پر نادم بھی نہ ہو نہ توبہ کرے اور مرتے وقت بھی توبہ نصیب نہ ہو تب بھی اہل حق کا یہ عقیدہ ہے کہ اس کو خلود فی النار نہ ہوگا

چاہے اس کو ہزار برس تک دوزخ میں رہنا پڑے اور گناہوں کی سزا میں چاہے کیسا ہی سخت سے سخت عذاب بھگتنا پڑے مگر کبھی نہ کبھی دوزخ میں سے ضرور نکال لیا جاوے گا۔

تعددِ ذرائع مغفرت

یہ بھی اس صورت میں ہے جبکہ فرض کر لیا جاوے کہ اس کو کسی کی بھی شفاعت نہ پہنچے گی اور کوئی ذریعہ مغفرت کا شفاعت کے علاوہ بھی اس کو نصیب نہ ہوگا حالانکہ ایسا ہوگا نہیں۔

کیونکہ حدیث میں آیا ہے شفاعتی لاھل الکبائر من امتی یعنی فرماتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم میری شفاعت میری امت کے کبیرہ گناہ والوں کو بھی پہنچے گی اور اس کے سوا اور بھی ذرائع مغفرت کے ہیں مثلاً کسی نے اس کے مرنے کے بعد دنیا میں اس کے لیے دعا کی ہو اور وہ دعا قبول ہو گئی ہو۔ یہ ایسی چیز ہے کہ گو ساری عمر وہ شخص کسی کبیرہ گناہ میں مبتلا رہا ہو لیکن ایک اللہ کے بندہ کی دعا اس کو پہنچ گئی تو حق تعالیٰ کو سب کچھ قدرت ہے اگر خدا تعالیٰ اس دعا سے اس شخص کے گناہ معاف کر دیں تو خدا تعالیٰ کو کون روک سکتا ہے غرض ایسے ذرائع بہت ہیں جن سے بڑے سے بڑے گناہ معاف ہو سکتے ہیں ایک کفر و شرک تو ایسی چیز ہے کہ اس کے معاف ہونے کا کوئی ذریعہ نہیں اور اس کے سوا چاہے کسی شخص میں دنیا بھر کے گناہ مجتمع ہوں مگر سب ایک لمحہ میں معاف ہو سکتے ہیں۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں عقیدہ اہل سنت کا یہی ہے اور قرآن شریف میں اس کی تصریح موجود ہے فرماتے ہیں ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر ما دون ذلک لمن یشآء یعنی حق تعالیٰ نہیں بخشیں گے اس کو کہ انکے ساتھ شرک کیا جاوے اور اس کے سوا جو بھی گناہ ہو بخش دینگے جس کے واسطے چاہیں گے اور اس مضمون میں بہت سی احادیث بالکل صریح موجود ہیں غرض بڑے سے بڑے کبیرہ کا کرنیوالا بھی حق تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہو سکتا۔ پھر جب حق تعالیٰ نے اپنی رحمت کو اتنا وسیع کیا ہے تو کسی دوسرے کو اس کے تنگ کرنے کا کیا مجاز ہے۔؟

پھر اول تو گناہوں کے معاف ہونے کے بہت سے ذرائع ہیں اور اگر فرض کر لیا جائے کہ کوئی

ذریعہ بھی ایک شخص کو حاصل نہ ہو اور وہ گناہ اس کے ذمہ رہ گیا تب بھی خلود فی النار نہ ہوگا۔ یہ بھی ان گناہوں میں ہے جو یقیناً گناہ ہیں جن کے گناہ ہونے میں کسی کو کلام ہی نہیں اور جن کے گناہ ہونے میں کلام ہے اس پر تو اس سزا کو بھی یقینی نہیں کہہ سکتے جو اس پر موعود ہے اس صورت میں گنہگار ہونے کا فتویٰ بھی نہیں لگ سکتا چہ جائیکہ کفر کا۔

اختلافِ مسائل کی حقیقت

چنانچہ آجکل جن مسائل میں اختلاف ہے ان میں اکثر جانبین میں گنجائش ہے تو کوئی فریق اپنے مقابل پر کوئی حکم قطعی کیسے لگا سکتا ہے اور حکم بھی کونسا کفر کا۔ لطف یہ ہے کہ ان مسائل میں اختلاف کفر اور عدم کفر کا ہے بھی نہیں بس جو کچھ اختلاف ہے وہ سنّت اور بدعت ہونے کا ہے کہ ایک فریق ایک فعل کو سنت اور باعث تقرب کہتا ہے اور دوسرا اس کو بدعت اور معصیت کہتا ہے تو ابھی تو خود معصیت اور عدم معصیت ہی میں اختلاف ہے، کفر اور عدم کفر کا کیا ذکر؟ اگر سنت کہنے والوں نے بہت زور مارا اور اس فعل کو سنت اور اس کے خلاف کو بدعت ثابت کر ہی دیا تب بھی سنت کے تارک پر اس سے زیادہ کیا حکم لگ سکتا ہے کہ وہ ایک سنت کا تارک ہے اور سنت کے تارک پر خلود فی النار کی وعید کہاں آئی ہے؟ اگر سنت کے ترک پر بھی خلود فی النار کی وعید ہے تو کفر اور شرک پر اس سے زیادہ کونسی وعید ہوگی تارک سنت اور کافر کو برابر کر دینا نامعلوم کہاں تک صحیح ہے۔

آخر اعمال میں باہم فرق مراتب بھی ہے یا نہیں اگر ادنیٰ سے ادنیٰ عمل کے ترک پر وہی حکم مرتب ہوتا ہے جو اعلیٰ گناہ پر ہوتا ہے تو ادنیٰ سے ادنیٰ نیک عمل کے کرنے پر بھی وہی حکم مرتب ہونا چاہیے جو اعلیٰ سے اعلیٰ نیک عمل کے کرنے پر ہوتا ہے۔ سب سے اعلیٰ عمل اسلام ہے اس میں کسی کو اختلاف نہیں تو اگر یہ بات تسلیم ہے کہ ادنیٰ اور اعلیٰ میں کچھ فرق مراتب نہیں تو ایک ادنیٰ عمل کسی میں فرض کیا جاوے مثلاً نرمی سے بولنا کہ یہ بھی کسی درجہ

میں نیک عمل ضرور ہے اس کو سب جانتے ہیں تو فرض کیجئے کہ ایک کافر یہ عمل کرتا ہے یعنی وہ ہمیشہ نرمی سے بولتا ہے تو چاہیئے کہ وہ مسلمان کے برابر ہو جائے اس قاعدہ کی رُو سے تو اسلام کی بھی ضرورت نہیں رہی کیونکہ وہ ادنیٰ عمل والا اور یہ اعلیٰ عمل والا دونوں حکماً برابر ہیں اس سے تو سارا دین کا کارخانہ ہی بگڑ جاتا ہے لامحالہ یہ ماننا پڑیگا کہ اعمال میں فرق مراتب ہے، پھر تارک سنت کو اور کافر کو برابر کیسے کیا جاسکتا ہے؟ اور دونوں کے واسطے خلود فی النار کا حکم کیسے لگا دیا جاتا ہے؟ ضرور ہے کہ دونوں میں فرق کیا جائے انشاء اللہ آپ سمجھ میں آگیا ہو گا کہ ہر بات پر کفر کا حکم لگا دینا عقل و شریعت کی رو سے کہاں تک صحیح ہے؟

اور یہ بھی اس وقت ہے جب کسی فعل کی نسبت سنیت کا دعویٰ کرنیوالا اپنے دعوے کو ثابت کر دے اور ثابت کر دینے کے بعد بھی اس کے تارک پر وہ ترک سنت کا حکم جاری کر سکتا ہے نہ کہ کفر اور شرک کا۔

فرقہ ناجیہ

جیسا کہ آجکل لوگوں نے عادت کر لی ہے ذرا اس غلطی کو غور سے دیکھئے۔ سلف نے اس میں بڑی احتیاط کی ہے خصوصاً امام ابو حنیفہؒ نے کہ انہوں نے کسی اسلامی فرقہ کو جب تک وہ ضروریاتِ دین کا منکر نہ ہو کافر نہیں کہا اور یہ قاعدہ مقرر کر دیا ہے لا نکفر اھل القبلۃ حالانکہ اسلامی فرقوں کے باہمی اختلافات اس قدر ہیں کہ ان کے سننے سے وحشت ہوتی ہے۔ لوگوں میں مسلّم ہے کہ مسلمانوں میں ۷۳ فرقے ہیں اور ایک کو ان میں سے ناجی سمجھتے ہیں اور ۷۲ کو ناری اور یہ کچھ لوگوں کا اختراع نہیں ہے بلکہ حدیث کا مضمون ہے مگر لوگ یاد رکھیں (طالب علموں کے کام کی بات ہے) کہ یہ جو حدیث میں آیا ہے کہ میری امت کے ۷۳ فرقے ہوں گے آیا اس سے کفار اور مسلمانوں کو ملا کر مجموعہ کے فرقے مراد ہیں یا کیا۔ ظاہر ہے کہ مجموعہ اہل اسلام اور کفار کے فرقے تو مراد نہیں ہیں کیونکہ وہ تو اس سے بہت زیادہ ہیں ہر مذہب

میں اس سے زیادہ فرقے موجود ہیں۔ ہندوؤں میں ۷۳ سے بہت زیادہ فرقے ہیں۔ عیسائیوں میں بھی زیادہ ہیں تو سب ملا کر بہت ہی زیادہ ہوں گے۔ بلکہ حدیث میں اسلامی فرقے مراد ہیں تو یہ سب ۷۳ فرقے وہ ہوتے جن کو اسلام سے خارج نہیں کہہ سکتے تو ان کے لیے خلود فی النار کے قائل بھی نہیں ہو سکتے اور ایک مضمون یہ بھی ذہن میں حاضر رکھئے کہ قرآن اور حدیث سب میں یہ مضمون موجود ہے کہ گناہوں پر سزا ہو گی اور دخول فی النار ہوگا مثلاً چور کو بھی دوزخ میں جانا ہوگا اور زانی کو بھی اور قاتل کو بھی دوزخ میں جانا ہوگا اور تارکِ صلوٰۃ اور تارکِ زکوٰۃ کو بھی وغیرہ وغیرہ۔ تو جو ایک فرقہ ناجی ہے اس کے افراد بھی اگر اِن اعمالِ معصیت کا ارتکاب کریں تو وہ دوزخ میں جائیں گے یا نہیں ظاہر ہے کہ ان اعمال کی سزا میں وہ بھی دوزخ میں جائیں گے گو خلود فی النار نہ ہو اور اوپر یہ بھی ثابت ہو چکا کہ فرقہ ناجیہ کے علاوہ جو ۷۲ فرقے ہیں وہ سب اسلامی فرقے ہیں تلود فی النار ان کے لیے بھی نہیں ہے تو یہ بھی دوزخ میں جائیں گے اور وہ ایک فرقہ بھی جا سکتا ہے جسکو ناجی کہا گیا تھا تو پھر حدیث کے اس جزو کے کیا معنی ہوتے کلھم فی النار الا واحدۃ جب دوزخ میں جانے میں دونوں برابر ہوتے تو ایک کے ناجی ہونے اور باقی کے ناری ہونیکے کیا معنی؟

اس شبہ کا حل یہ ہے کہ ۷۲ فرقوں کو جو ناری کہا گیا اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ فساد عقائد کی وجہ سے بھی دوزخ میں جائیں گے اور فساد اعمال کی وجہ سے بھی اور وہ ایک فرقہ جس کو ناجی کہا گیا ہے وہ صرف خرابی اعمال کی وجہ سے دوزخ میں جائیگا۔ خرابی عقائد کی وجہ سے نہ جائیگا اور دونوں کے دخول نار میں قواعد سے اتنا فرق ہوگا کہ عقائد کی غلطی اشد ہے۔ اعمال کی غلطی سے لہٰذا عقائد کی غلطی پر عذاب بھی سخت ہوگا اور اس کی مدت بھی زیادہ ہوگی بخلاف اُس ایک فرقہ کے جو خرابیٔ اعمال کی وجہ سے دوزخ میں جائیگا انکی غلطی اتنی سخت نہیں ہے جتنی کہ دوسروں کی تھی، لہٰذا عذاب بھی اتنا سخت نہ ہوگا اور نہ اتنا ممتد ہوگا حاصل یہ کہ ۷۳ فرقوں سے مراد مسلمانوں ہی کے فرقے مراد ہیں ان میں سے ایک فرقہ

اہلِ حق ہے وہ خرابی عقائد کی وجہ سے دوزخ میں نہیں جائیں گے۔ ہاں خرابی اعمال کی وجہ سے جائیں گے جیسے چوری نظر بد وغیرہ۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ ان اعمال پر بھی عذاب موعود ہے۔ آخر وہ کس کے واسطے ہے پس جو کوئی ان کا ارتکاب کرے گا اسی کو عذاب بھگتنا پڑے گا اور گو بمقتضائے قواعد یہ عذاب بہ نسبت اہلِ باطل کے خفیف ہے اور مدت بھی کم ہے مگر خدا بچا دے وہاں کا تو ایک دن بھی دنیا کے ہزار برس کے برابر ہے۔

پھر بلحاظ کیفیت کے بھی دوزخ کا عذاب ایسا ہے کہ اس کی نظیر ہی کہیں موجود نہیں ایک منٹ کے لیے بھی دوزخ کا عذاب ایسا ہے کہ دنیا کا عذاب سو برس کا بھی اسکے برابر نہیں ہو سکتا۔ مگر پھر بھی یہ صحیح ہے کہ اہلِ باطل کے عذاب سے یہ عذاب ہلکا ہے اور اہلِ باطل کو عذاب بہت زیادہ ہو گا۔ لیکن خلود ان کو بھی نہ ہو گا آخر میں کبھی نہ کبھی سزا پا کر نجات پا جائیں گے کیونکہ مومن تو وہ بھی ہیں جیسا کہ بیان کیا گیا اور دیکھئے قرآن میں یہ حکم ہے فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ خَیۡرًا یَّرَہٗ یعنی جو کوئی ایک ذرہ کے برابر بھی عمل خیر کریگا تو اسکو قیامت کے دن دیکھے گا یعنی اس کا نتیجہ پائے گا اور سب جانتے ہیں کہ ایمان عمل خیر ہے (خیر کیا رأس الخیرات ہے) تو آیت کے بموجب ضرور ہوا کہ اس خیر کا نتیجہ ان کو ملے اور اس کے ساتھ بہت سے اعمال شر بھی یعنی عقائد باطلہ بھی موجود ہیں تو ان کا نتیجہ پانا بھی ضروری ہے تو دونوں کے نتیجے ان کو دیکھنا ہیں عقاب بھی اور ثواب بھی۔ ثواب دو احتمال ہیں ایک یہ کہ پہلے ان کو ثواب دیا جائے یعنی جنت میں داخل کیے جائیں اور اس کے بعد ہمیشہ کے لیے عذاب دیا جائے مگر یہ صورت نص کے خلاف ہے یہ کسی کے واسطے نہ ہو گا کہ جنت میں جانے کے بعد نکالا جائے تو اب دوسرا ہی احتمال متعین ہو گیا وہ یہ کہ ان کو اول عذاب دیا جائیگا اور جو وقت سزا کے لیے خدا تعالیٰ کے علم میں مناسب ہو چاہے وہ ہزاروں برس کیوں نہ ہوں اس کے گذرنے کے بعد ثواب دیا جائے اور جنت میں داخل کیے جائیں پھر جنت میں خلود ہو گا۔

اس تمام تقریر سے آپ نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ حق تعالیٰ کی رحمت کس قدر وسیع ہے کہ جس میں ذرا سا بھی ایمان ہے اس کے لیے خلود نہیں ہے پھر کسی کی نسبت بات بات پر کفر کا حکم لگا دینا جس کے واسطے خلود لازم ہو کیسے درست ہوگا۔ کیا جو لوگ آپ کے مشرب پر نہیں ہیں ان میں ذرا سا بھی ایمان نہیں ہے کچھ تو انصاف کیجئے ایسا جوش نہیں چاہئے اس کی بنا سوائے اس کے کچھ بھی نہیں کہ آپ نے اپنا ایک مسلک قرار دے لیا اور سمجھ لیا کہ بس ہم ہی ہیں مومن اور کوئی اس کے ذرا بھی خلاف ہو وہ ایمان سے خارج ہے اور جنت آپ کے حصہ میں نہیں آسکتی بس گویا جنت ان کی ملک ہے کہ جس کو دیں اسی کو ملے گی جس کو نہ دیں اس کو نہ ملے گی یہ طریقہ غلط ہے۔

یہ بحث لفظ منافق پر چلی تھی کہ کسی کو منافق اور کافر کہنا کیسا ہے گو اس کو طول ہو گیا مگر اس کے ضمن میں مفید باتیں بیان ہو گئیں گفتگو یہ تھی کہ اب منافقوں کا وجود نہیں اب یا تو کھلم کھلا کافر ہیں یا مسلمان تو خدا کا شکر ہے کہ ہم لوگ مومن ہیں ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ دوسرے درجے کے مومن ہیں یعنی ناقص جیسے بعضے آدمی اندھے ہوتے ہیں یا چوندھے اور بعضے تیز نظر اور دوربین ہوتے ہیں آدمی دونوں ہیں اور ایک مثال میں ادراک مبصرات بھی دونوں کو ہے مگر ایک کو صحیح اور کامل ہے اور ایک کو ناقص ہے حاصل یہ ہے کہ اسلام کے دعویٰ میں تین درجے نکلتے ہیں ایک یہ کہ اس صفت کا بالکل وجود نہ ہو اس صورت میں تو اسلام کا دعویٰ کرنا کذب اور غلط ہے اور اس سے بحمد اللہ اہل اسلام بری ہیں دوسرا درجہ یہ کہ اسلام کی صفت تو موجود ہو مگر ناقص اور ادنیٰ درجہ کی ہو اور تیسرا یہ کہ صفت اسلام موجود ہو اور کمال کے ساتھ اسلام کا وجود ان دونوں درجوں میں پایا جاتا ہے مگر ناقص کو اسلام کے ساتھ متصف کہنا ایسا ہے جیسے اس شخص کو مالدار کہا جاتا ہے جس کے پاس صرف چار پیسے ہیں کہ باعتبار لغت کے بیشک صحیح ہے کسی کو اس میں کلام کی گنجائش نہیں لیکن پھر یہ کیا بات ہے کہ چار پیسے والے کو کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ میں مالدار ہوں اور کسی مالدار سے آنکھ ملانے کی اس کو ہمت نہیں ہوتی

ہر صفت میں یہی حالت ہے کہ ناقص کو اس صفت کے ساتھ متصف نہیں کہا جاتا۔ اور اس کے لیے وہ احکام ثابت نہیں کیے جاتے جو اس صفت کے ساتھ کامل متصف ہونیوالے کیلئے کیے جاتے ہیں جب ہر صفت کی یہ حالت ہے تو اسلام بھی ایک صفت ہے اس میں بھی یہی تقسیم جاری ہوگی ایک قسم جس میں دعویٰ اسلام کذب اور غلط ہو وہ تو ہماری بحث سے خارج ہے جیسا کہ بیان ہو چکا تو اب دو قسمیں باقی رہ گئیں ناقص اور کامل مگر محاورات کے موافق جس میں اسلام ناقص ہو اس کا دعویٰ اسلام کرنا شرمناک ہے گو لغۃً صحیح ہے مگر یہ دعویٰ ایسا ہی ہے جیسا چار پیسے والا مالدار ہونے کا دعویٰ کرے بلکہ اس دعوے پر ہر شخص ہنستا ہے کہ لو صاحب گانٹھ میں پیسہ نہیں اور مالدار بنتے ہیں حالانکہ پیسہ ہے اور ایک پیسہ نہیں چار پیسے ہیں مگر ان کے وجود کو مالدار بننے کے بارے میں کالعدم مانا جاتا ہے اور کوئی یہ نہیں کہتا کہ لغت کے اعتبار سے یہ دعویٰ صحیح ہے جس کا حاصل یہی ہے کہ صفتِ ناقص کا عادۃً وجود ہی نہیں مانا جاتا اسی لیے عرف میں نقصان وصف کی صورت میں اس صفت کو صاحب صفت سے سلب کرنا راجح مانا جاتا ہے اور متمول ناقص کو مالدار نہ کہنا ہی اقرب الی الصحت سمجھا جاتا ہے اور یوں ہی کہا جاتا ہے کہ وہ شخص بالکل غریب اور نادار ہے اگرچہ یہ بھی معلوم ہو کہ اس کے پاس چار پیسے ہیں۔

اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ ایک شخص کو صرف قل ہو اللہ یاد ہو اس کو حافظ کہنا کسی معنی کر ضرور صحیح ہے لیکن ایک شخص وہ ہے جو پورے قرآن کا حافظ ہے اور قاری بھی ہے سبعہ جاننے والا بھی ہے اس کی موجودگی میں اگر کوئی شخص حافظ قل ہو اللہ کی نسبت یوں کہے کہ آپ سے بھی ملاقات کیجیے آپ بھی حافظ ہیں تو بتلایئے اس کی کیا حالت ہوگی یقیناً پسینہ پسینہ ہو جائے گا اور مارے شرم کے گڑ جائے گا اور آنکھ اوپر کو نہ اٹھیں گی اور یہ حالت ہوگی کہ اگر کوئی اس سے پوچھے کہ آپ حافظ ہیں تو وہ یہ بھی نہ کہہ سکیگا کہ جی ہاں تھوڑا سا حافظ ہوں بلکہ یہی کہتے بنے گی کہ استغفر اللہ میں حافظ کہاں سے آیا حالانکہ حافظ وہ بھی ہے گو لغۃً ایک سورت کا ہی سہی مگر پھر بھی وہ اپنے کو حافظ نہیں کہہ سکتا کیوں کہ عرف یہی ہے

کہ صفتِ ناقص لائق اثبات نہیں ہوتی۔

مسئلہ وحدۃ الوجود

یہاں سے ایک مسئلہ کی بنا بھی معلوم ہوتی ہے وہ مسئلہ وحدۃ الوجود کا ہے یعنی اصل مذکور کی موافق کہ اس کی حقیقت صرف یہ ہے کہ چونکہ وجود کامل سوائے ذاتِ حق کے کسی کے لیے نہیں ہے اور وجود کائنات نہایت ہی ضعیف اور حقیر اور مثل لاشئے کے ہے اس لیے بجائے اس کے ثابت کرنے کے نفی کرنا ہی اولیٰ ہے مگر جہل کے سبب اس مسئلہ کو آج کل ایسے عنوان سے شائع کیا ہے کہ اس میں بہت سے لوگ سخت غلطی میں پڑ گئے اور جو حقیقت تھی اس کا بالکل عکس کر دیا یہ لوگ جاہل صوفیوں کا گروہ ہے۔

حقیقت تو یہ تھی کہ اپنے وجود کی نفی کی جاتی اور اپنے کو کچھ نہ سمجھتے مگر انہوں نے یہ کر دیا کہ اپنے آپ کو خدا ہی کہنے لگے اس بنا پر کہ خدا کے لیے بھی وجود ثابت اور ہمارے لیے بھی وجود ثابت اور وجود ہے ایک کیونکہ وحدۃ الوجود کے معنی ہی یہ ہیں تو اس کی صورت کیا ہو کہ وجود ایک ہی ہے اور وہ خدا کے لیے بھی ثابت ہے اور ہمارے لیے بھی سوائے اس کے کہ ہمارا وجود اور خدا کا وجود ایک ہی ہو تو ہم اور خدا ایک ہوئے تو وحدت سے چل کر اتحاد کے قائل ہو گئے وجود کا واحد یا متعدد ہونا یہ تو مسئلہ کلامیہ ہے اور علمی بحث ہے مگر وحدت کو مستلزم اتحاد ماننا یہ تو محض الحاد ہے یہ اُن لوگوں کی توحید ہے کہ چلے تھے خدا کو ایک ثابت کرنے اور ثابت ہو گئے ہزاروں خدا، کیونکہ ہر فرد عالم کے وجود میں بھی تقریر ہو سکتی ہے تو سب کا اتحاد لازم ہو گیا یہ کیسی غلطی ہے مسئلہ تو سیدھا سا تھا مگر اس کی ایسی مٹی خراب کی گئی کہ الٰہی توبہ اس کا مقتضا تو یہ تھا کہ اپنے وجود کو حق تعالیٰ کے وجود کے سامنے لاشئے سمجھتے اگر وجود صرف حق تعالیٰ ہی کے لیے ثابت ہو تب تو ممکن کا وجود معدوم ہی ہے اور اگر ممکن کیلئے بھی ثابت ہوا ...... تو ممکن کا وجود کالمعدوم ہے۔

بہر حال ممکن کا وجود کسی حال میں مستقل نہیں سو مسئلہ کا تو حاصل یہ تھا لیکن ہو گیا یہ کہ اپنے وجود

کو خدا کے وجود کے برابر کر دیا۔

اس کا سہل حل اس مثال سے ہوتا ہے کہ قل ہو اللہ کا حافظ یوں سمجھنے لگے کہ سبعہ جاننے والا بھی حافظ ہے اور میں بھی ایک سورت کا حافظ ہوں تو ہم اور وہ یکساں ہوئے مگر واقعہ یہ ہے کہ قل ہو اللہ کا حافظ تو حافظ سبعہ کی برابری نہیں کر سکتا حالانکہ وہ اس کا ہم جنس ہے اور اس صفت خاص میں برابر نہ سہی لیکن دوسری بہت سی صفات میں اس کا شریک ہے۔ اور یہ ایک ناچیز بندہ خدا کی برابری کرتا ہے جس کے ساتھ کسی صفت میں شرکت تو کیا معتد بہ تشابہ بھی نہیں رکھتا غور کیجئے کس قدر فاش غلطی ہے یہ سب خرابی جہالت کی ہے کسی جاننے والے کے پاس رہتے نہیں، کسی محقق سے پوچھتے نہیں، علم حاصل کرتے نہیں اور ہمت اس قدر کہ پہلی ہی دوڑ خدا پر جا کر ختم ہوتی ہے اور ایک جست میں خدا ہی سے جا ملتے ہیں۔ ایسی ہمت بھی جہالت ہی سے پیدا ہوا کرتی ہے علم کے بعد یہ ہمت نہیں ہو سکتی غرض ان لوگوں نے تو وحدۃ الوجود کے یہ معنی سمجھے اور کفر میں مبتلا ہوتے۔

اور بعض نے دوسری جانب تفریط کی کہ اس مسئلہ کا انکار ہی کر دیا اور صاف کہہ دیا کہ یہ مسئلہ بالکل غلط ہے یہ فریق اپنے دعویٰ پر عقلی اور نقلی دلیل بھی لاتا ہے اور یوں کہتا ہے کہ وجود کا واحد ہونا مشاہدہ سے باطل ہے ہم دیکھتے ہیں کہ ہزاروں چیزیں اپنے اپنے وجود سے موجود ہیں اور مشاہدہ کا انکار بداہت کا انکار ہے اور بداہت سے زیادہ کیا دلیل ہو سکتی ہے اور نقلی دلیل یہ ہے کہ اس میں قرآن کا انکار اور نص کی تکذیب لازم آتی ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے خالق کل شیئ اس میں حق تعالیٰ نے اپنی صفت بیان فرمائی ہے کہ ہم خالق ہیں ہر شئے کے اور خلق کے معنی ہیں اعطاء وجود، تو معنی یہ ہوئے کہ ہم نے ہر شئے کو وجود عطا فرمایا۔ پس اگر یوں کہا جائے کہ حق تعالیٰ نے اشیا کو وجود عطا کیا لیکن ان کے واسطے وجود ثابت نہیں ہوا تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ حق تعالیٰ نے اشیا کا وجود چاہا مگر نہ ہوا اس صورت میں مشیت وارادۂ الٰہی کا تخلف لازم آتا ہے اور یہ باطل ہے تو ثابت ہوا کہ اشیا کیلئے بھی

وجود ثابت ہے بس جو لوگ کہتے ہیں کہ سوائے ذات حق کے کسی چیز کے لیے وجود ثابت نہیں ان کا دعویٰ نص قرآنی کے خلاف ہے لہٰذا انہوں نے صوفیہ وجودیہ پر کفر کا فتویٰ لگا دیا دیکھئے کتنا فرق ہو گیا ایک فریق نے مسئلہ کو ایسا صحیح کہا کہ سب کو خدا بنا دیا اور ایک فریق نے ایسا اُڑا دیا کہ اسپر کفر کا فتویٰ لگا دیا اور تحقیق کی نظر سے دیکھئے تو بات ذرا سی تھی مگر چوں ندانند حقیقت رہ افسانہ زدند ؎ ایک نے افراط کی ایک نے تفریط اور مسئلہ جیسا تھا ہے اور بالکل صحیح ہے نہ اس میں آیت کی تکذیب ہے اور نہ اس میں سب کو خدا بنایا جاتا ہے نہ اس سے بداہت کا انکار لازم آتا ہے کیونکہ عطاء وجود سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کو جداگانہ وجود دیا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حقیقی وجود کے ساتھ ایک قسم کا تلبس دیدیا یہی عطاء وجود ہے تو نقل کے خلاف نہ ہوا اور مشاہدہ صرف آثار وجود کا ہوتا ہے وجود کی کنہ کا تو نہیں ہوتا مگر یہ بات ہر شخص کی سمجھ میں نہیں آسکتی اس لیے عامہ افہام کے مناسب اس مسئلہ وحدۃ الوجود کا سہل حاصل صرف اتنا کہنا مناسب ہے کہ وجود تمام اشیاء کے لیے ثابت ہے مگر یہ وجود اس قدر ضعیف اور حقیر اور مضمحل اور ناقص ہے کہ وجود حق کے سامنے اس قابل نہیں کہ اسکو وجود کہا جائے بلکہ کالعدم ہے گو کسی درجہ میں ہستی اشیاء کے لیے بھی ثابت ہے جیسا کہ متکلمین نے کہا ہے حقائق الاشیاء ثابتۃ مگر یہ ہستی اس قابل ہرگز نہیں ہے کہ اس کو حق تعالیٰ کی ہستی کے سامنے ہستی کہا جائے اس بناء پر کہہ سکتے ہیں کہ ایک ہی ہستی ایسی ہے جس کو ہستی کہا جا سکتا ہے اور دوسری ہستیاں ایسی ہیں کہ گویا ہے ہی نہیں اسی کو عارف شیرازی ایک حکایت کے پیرایہ میں ظاہر فرماتے ہیں ؎

یکے قطرہ از ابر نیساں چکید — خجل شد چو پہنائے دریا بدید

یعنی ایک قطرہ پانی کا بادل میں سے ٹپکا وہ نہایت صاف شفاف تھا اسکو دعویٰ ہوا کہ میں پاک صاف ہوں غبار کی آمیزش مجھ میں ذرا نہیں ہے اور طاہر مطہر ہوں اور منور و آبدار ہوں غرض بہت ہی کچھ خودی اس کے دل میں تھی مگر جب نیچے پہنچا اور سمندر کو دیکھا تو خجل شد

چو دریا تے پتہا بدید۔ بس اب اس کی یہ حالت ہوئی کہ کہتا ہے ؎

کہ جائیکہ دریا است من کیستم گر او ہست حقا کہ من نیستم

مارے شرمندگی کے بالکل پانی پانی ہو گیا اور وہ سب دعویٰ بھول گیا کہ میں مدور ہوں مطہر ہوں منور ہوں یہاں ایسے مدور اور منور اور مطہر سینکڑوں ہزاروں، لاکھوں کروڑوں اور بے تعداد قطرے موجود ہیں اور ایسے ایسے قطرے ہزاروں سے زیادہ جو تیوں میں لگ جاتے ہیں ظاہر ہے کہ اس قطرہ کے لیے وجود تو ثابت ہے خواہ لغت کے اعتبار سے کہو یا کسی اعتبار سے کہو اس سے انکار نہیں ہو سکتا مگر کیا اس کا وجود سمندر کے سامنے اس قابل ہے کہ اس کا نام وجود رکھا جائے اسی واسطے کہتا ہے گر او ہست حقا کہ من نیستم۔ اس کے سامنے اپنے آپ کو نیست کہتا ہے ظاہر ہے کہ اس جگہ نیست کا لفظ معنی حقیقی میں مستعمل نہیں ہے کیونکہ وہ تو حقیقت میں ہست ہے پھر نیست کیسا لامحالہ یہی معنی ہیں کہ بمقابلہ سمندر کی ہستی کے اس کی ہستی عدم نہ سہی تو کالعدم ضرور ہے پھر شیخؒ خود ہی فیصلہ فرماتے ہیں ؎

ہمہ ہرچہ ہستند ازاں کمتر اند کہ با ہستیش نام ہستی برند

یعنی ماسوا اللہ جو کچھ بھی ہے اس قابل نہیں کہ حق تعالیٰ کی ہستی کے سامنے اپنی ہستی کا نام لے اس کا حاصل یہی ہے کہ گو کسی معنی کو وجود تمام مخلوقات کے لیے ثابت ہے مگر وہ اس قدر حقیر اور غیر قابل اعتبار ہے کہ اس کو حق تعالیٰ کے وجود کے سامنے وجود ہی نہ کہنا چاہیے۔ شیخؒ نے اس کی ایک اور مثال دی ہے ؎

مگر دیدہ باشی کہ در باغ و راغ بتابد بہ شب کرمکے چوں چراغ

یکے گفتش اے کرمک شب فروز چہ بودت کہ بیروں نیائی بروز

کہتے ہیں تم نے دیکھا ہے کہ ایک چھوٹا سا جانور درختوں اور جھاڑیوں میں رات کو کیا چمکتا ہے (رہٹ بیجنا مراد ہے جسکو جگنو بھی کہتے ہیں) اس سے کسی نے کہا کہ تو دن کو کہاں رہتا ہے۔ رات ہی میں کیوں نکلتا ہے دن کو کیوں نہیں نکلتا آگے اس کا جواب بیان کرتے ہیں ؎

ببیں کا تشیں کر مکِ خاک زاد — جواب از سر روشنائی چہ داد،

کہ من روز شب جز بصحرا نیم — ولے پیش خورشید پیدا نیم

یعنی وہ کہتا ہے کہ میں دن کو بھی کہیں چلا نہیں جاتا۔ کہیں چھپ نہیں جاتا اسی جگہ رہتا ہوں جہاں رات کو رہتا ہوں مگر دن کو میری چمک نظر نہیں آتی۔ میری چمک بہت ذرا سی ہے دن کو آفتاب کا نور ہوتا ہے اس نور کے سامنے میری چمک ایسی ماند ہو جاتی ہے کہ مطلق نظر نہیں آتی۔ اس مثال کا حاصل یہ ہے کہ جو نسبت جگنو کو آفتاب کیساتھ ہے وہی بلکہ اس سے بھی سو حصہ بلکہ بےشمار حصہ کم تمام کائنات کے وجود کو حق جل شانہ کے وجود سے ہے وہ نسبت یہ ہے ؎

اگر آفتاب است یک ذرہ نیست — دگر ہفت دریا است یک قطرہ نیست

اگر آفتاب است یک ذرہ نیست — دگر ہفت دریا است یک قطرہ نیست

اور فرماتے ہیں ؎

چو سلطان عزت علم بر کشد — جہاں سر بجیب عدم بر کشد

اور یہ مثال جو جگنو اور آفتاب کی دی جاتی ہے یا ذرہ اور آفتاب یا قطرہ اور دریا کی دی جاتی ہے یہ بھی صرف سمجھانے کے لیے ہے ورنہ کائنات کے وجود کو حق تعالیٰ کے وجود سے کیا نسبت کائنات ممکن اور حق جل شانہٗ واجب۔ کائنات فانی اور حق جل شانہٗ باقی۔ کائنات کے تمام صفات متناہی اور حق تعالیٰ جل شانہٗ کے تمام صفات لامتناہی پھر دونوں میں کوئی نسبت قائم کی جاتے تو کیوں کر کی جاتے کوئی نسبت قائم ہی نہیں کی جا سکتی ہاں اگر کی جا سکتی ہے تو یہی عدم اور وجود کی کہ ذات حق کے واسطے وجود کو ثابت کیا جائے اور کائنات کے لیے عدم کو جب ایک جگنو کا وجود آفتاب کے سامنے کچھ نہیں رہتا۔ حالانکہ اس کے لیے آفتاب کے ساتھ کچھ نہ کچھ نسبت قائم کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ دونوں متناہی ہیں لیکن باوجود دونوں کے متناہی ہونے کے قوی ضعیف کو ایسا دبالیتا ہے کہ اس کو معدوم ہی کہنا پڑتا ہے تو کائنات کے لیے جو کہ فانی اور ممکن اور متناہی ہے غیر فانی اور واجب اور لامتناہی کے سامنے

کیا وجود ہو سکتا ہے ؟ یہ بہت ہی موٹی بات ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کامل کے سامنے ناقص کالعدم ہوتا ہے بس اسی معنی صوفیہ نے وجود کو کائنات سے سلب کیا ہے اور اس کو صرف ذات حق کے واسطے مانا ہے یہ ہے حقیقت وحدۃ الوجود کی کہ حق تعالیٰ کا وجود من کل الوجوہ کامل مکمل ہے اور کائنات کا وجود من کل الوجوہ ناقص اور لاشئی ہے لہٰذا اس وجود کے سامنے اس وجود کو کالعدم کہا جاتا ہے یہ ہے وہ مسئلہ جس میں ایک دنیا گمراہ ہے حالانکہ یہ مسئلہ تو بالکل سچا ہے اور عین ایمان ہے اس میں کفر کی کیا بات ہے اس پر تو کوئی بھی غبار نہیں نہ اس پر کوئی اشکال عقلی یا نقلی ہے جیسا کہ جہلاء نے سمجھ لیا کہ تمام مخلوقات کو خدا بنا دیا۔

غرض یہ مسئلہ بہت ہی سہل اور سمجھ میں آتا ہوا اور ظاہر ہے جیسا کہ آپ لوگوں نے سن لیا اس پر اگر کوئی کہے کہ پھر صوفیہ نے اس مسئلہ کو غامض اور راز کیوں بنا دیا یہ تو عقلی مسئلہ ہے اور بہت ظاہر ہے اس کی تو ہزاروں مثالیں موجود ہیں مثلاً کنسٹیبل کو بھی کچھ حکومت حاصل ہے اور وائسرائے بھی حاکم ہے لیکن دونوں کی حکومتوں میں قوت اور ضعف کا فرق ہے جس کا اثر یہ ہے کہ وائسرائے کے سامنے کنسٹیبل کو کبھی یہ خیال بھی نہ آئے گا کہ میں بھی کچھ حاکم ہوں بلکہ وائسرائے کے سامنے یہی کہیگا کہ حضور ہی حاکم اور مالک ہیں حتیٰ کہ اگر کوئی تیسرا آدمی وائسرائے کے سامنے کنسٹیبل کی نسبت یوں کہنے لگے کہ آپ کو بھی تو کچھ حصہ حکومت کا حاصل ہے تو وہ مارے شرمندگی کے گڑ جاہیگا اور ڈر جائے گا کہ خدا جانے وائسرائے کیا سمجھے اور میرے اوپر کوئی بلا نازل کر دے ۔ میں پوچھتا ہوں یہ بات کیوں ہے کیا یہ بات واقع کے خلاف ہے کہ کنسٹیبل کو حکومت حاصل ہے پھر اس کا نام لیتے ہوئے کیوں شرماتا ہے اور کیوں ڈرتا ہے یہ ایسی واضح مثال ہے جس سے یہ مسئلہ بہت ہی سہولت سے سمجھ میں آجاتا ہے جب کنسٹیبل وائسرائے کے سامنے حکومت کا نام لیتے ہوئے شرماتا ہے۔ مخلوق خالق کے سامنے وجود کا نام لیتے کیوں نہ شرماوے اور جب کنسٹیبل وائسرائے کے سامنے اپنی حکومت کی نفی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ حضور ہی حاکم اور مالک ہیں تو مخلوق خالق کے سامنے کیوں نہ کہے کہ حضور ہی

موجود ہیں اور کوئی موجود نہیں یہ مسئلہ تو بالکل عقلی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ضعیف کی ہستی کو قوی کی ہستی کے سامنے معدوم کہنا چاہیے جب یہ مسئلہ ایسا صاف اور ظاہر ہے تو اس کے لیے صوفیہ نے ایسے مشکل عنوان کیوں اختراع کیے کہ اس سے بہت لوگ وحشت میں پڑ جاتے ہیں کوئی کہتا ہے ہمہ اوست اور کوئی کچھ کہتا ہے غرض اس کو چیستاں بنا دیا ہے۔ واقع میں یہ سوال صحیح ہے کہ مسئلہ تو ایسا ظاہر اور سمجھ میں آتا ہوا ہے مگر ایک دنیا اس سے ناآشنا ہے اور اس کو معرکۃ الآرا سمجھتی ہے۔

درجاتِ وحدۃ الوجود

بات یہ ہے کہ اس مسئلہ کے دو درجے ہیں ایک علم کا اور ایک حال کا۔ تو یہ مسئلہ درجہ علم میں تو عقلی اور بدیہی ہے کوئی شخص بھی اس کا انکار نہیں کر سکتا اور اس درجہ میں یہ مسئلہ تصوف کا نہیں اور نہ معرکۃ الآرا ہے مگر صوفیہ یوں کہتے ہیں کہ اس درجہ میں یہ مسئلہ مقصود نہیں اور نہ کوئی کمال ہے اس درجہ میں تو اس مسئلہ کا علم ایسا ہے جیسے کھانے کا علم پینے کا علم اور سوتے جاگنے کا علم کہ یہ سب باتیں ضروری ہیں اور سبکو معلوم ہیں اور ان کا معلوم ہونا کچھ بھی کمال نہیں۔ اور ایک درجہ حال کا ہے صوفیہ کو وہی مقصود ہے وہ کہتے ہیں کہ اے سالک وہ حال حاصل کرے کہ اگر تمام دنیا کو اور تمام کمالات کو حضرت حق کے سامنے دیکھے تو سوائے حضرت حق کے کچھ بھی نظر نہ آوے اور وہ حال ایسا راسخ ہو کہ سوچنے کی ضرورت نہ ہو یہ نہ ہو کہ ایک ایک چیز کو سوچ کر اس کے وجود کی حقارت ذہن میں حاضر کرے بلکہ یہ حالت ہو کہ کسی چیز پر سوائے حضرت حق کے نظر ہی نہ پڑے بس ایک حال طاری ہو جاتے پہلا درجہ علم کا تھا یہ درجہ عمل کا ہے وہ درجہ عقلی تھا اور یہ درجہ ذوقی ہے۔ پہلے درجہ میں یہ کچھ کمال نہ تھا اس درجہ میں کمال ہے اور پہلے درجہ میں یہ مسئلہ کچھ مشکل بھی نہ تھا اس درجہ میں بہت مشکل ہے یعنی باعتبار حصول کے اس کے لیے جس قدر مجاہدات چاہئیں ان کے لیے بڑے حوصلہ کی ضرورت ہے یہ کھانے پینے اور سونے جاگنے کی طرح نہیں ہے کہ ہر شخص کو

باآسانی اس کا علم حاصل ہے اس کا نام لینے کے لیے منہ چاہیے غرض اس درجہ میں یہ مسئلہ عقلی نہیں اس واسطے اس کو اہلِ حق نے تصوف میں داخل کیا ہے۔

صاحبِ حال کی خطا

اب یہاں سے یہ بات بھی نکل آئی کہ جب حال طاری ہوگا تو تعبیر صحیح نہ ہوسکیگی کیونکہ قاعدہ ہے کہ جس بات کا آدمی پر حال طاری ہوتا ہے اس میں وہ محو ہو جاتا ہے اور اس کے متعلق الفاظ و عنوانات کی طرف التفات نہیں رہتا بس مطلب کو ادا کرتا ہے جس لفظ سے بھی ہو جائے اس کی ایسی مثال ہے ایک شخص بادشاہ پر عاشق ہو جائے تو جب تک عشق کا حال اس پر طاری نہیں تھا اسوقت تک تو ادب کے الفاظ سے بادشاہ کو خطاب کرتا تھا اور سوائے حضور اور جہاں پناہ کے کوئی لفظ نہیں کہہ سکتا تھا اور جب عشق کا حال طاری ہوگیا تو اب خطاب ان الفاظ سے کریگا

؎ جانِ من جانانِ من سلطانِ من   اے تو ئی اسلام من ایمانِ من

اور یوں کہے گا، میری جان میرے مالک میرے پیارے جو عین گستاخی کے الفاظ ہیں اور عقلاء کے نزدیک پسند نہیں ہیں اسپر قاعدہ کی رو سے یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ یہ شخص کیسا عاشق ہے کہ بادشاہ کو بادشاہ نہیں سمجھتا کیونکہ الشیئ اذا ثبت ثبت بلوازمہ۔ بادشاہ تو وہ ہے جس کے واسطے عظمت و شوکت و ہیبت و ادب لازم ہو اس نے یہ سب باتیں اٹھا کر رکھ دیں تو اس کے یہ معنی ہوتے کہ یہ اس کو بادشاہ اور معظم تسلیم نہیں کرتا لہٰذا اس کو باغی کہنا چاہیے لیکن انصاف سے کہیے کہ وہ باغی ہے یا مطیع؟ اور دشمن ہے یا دوست؟ واللہ وہ ایسا مطیع ہے کہ اس سے زیادہ کوئی مطیع نہیں ہو سکتا اور وہ ایسا دوست ہے کہ اس سے زیادہ کوئی دوست ہو نہیں ہو سکتا۔ وہ جان و مال سب کو بادشاہ پر قربان کرنے والا ہے۔ یہی حالت ان لوگوں کی ہوتی ہے جنپر وحدۃ الوجود کا حال طاری ہو تکہ ہے کہ بعض وقت ان کے منہ سے ایسے الفاظ نکلتے ہیں جو خلاف ادب ہوتے ہیں جن کو سن کر کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ کیسا محب ہے جو محبوب کی تعظیم نہیں کرتا یہ ضابطہ کا اعتراض ہے جو حقیقۃ

اسپر کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ معذور ہے وہ الفاظ کو بھول گیا ہے اس کی نظر سے تمام چیزیں سوائے ذات محبوب کے غائب ہو گئیں اسے ضابطہ اور قاعدہ کچھ یاد نہیں رہا اسی واسطے کہا ہے ؎

ملت عاشق ز ملت ہا جداست　　عاشقاں را ملت و مذہب خداست

اور اس کا عذر ظاہر کرتے ہیں ؎

گر خطا گوید ورا خاطی مگو　　ور شود پر خوں شہیداں را مشو
خون شہیداں را ز آب اولیٰ تر است　　این خطا از صد صواب اولیٰ تر است

ظاہراً اس کے خطابات اور افعال خطا اور خبط معلوم ہوتے ہیں مگر یہ وہ خطا ہے کہ سو صواب سے بہتر ہے اس کو خطا کہنا خود خطا ہے اسکو خود محبوب سے پوچھئے اس کی نظر میں جو وقعت اس خطا کی ہے وہ آپ کے صواب کی نہیں ہے۔

اہلِ حال کا احترام

اور یہ خبط وہ خبط ہے کہ خدا ہر شخص کو نصیب کرے اس خبط کی وقعت بھی ادھر ہی سے معلوم کیجئے کہ اس خبطی سے کسی کو آنکھ ملانے کا حکم نہیں ہے بعض وقت ایسے خبطیوں کی بے ادبی ہو جانے سے عقوبت عاجلہ نازل ہو جاتی ہے ان خبطیوں کا نام مجذوب ہے یہ خدا کے دیوانے ہیں ان کے ساتھ بے ادبی نہ کرو خدا تعالیٰ کی نظر ان پر مہر کے ساتھ پڑی ہوئی ہے ان کا حال بھی ہر شخص کو معلوم نہیں ہوتا درحقیقت ان کے خطابات بے ادبی نہیں ہیں اور ان کے افعال خبط اور قابل ملامت نہیں ہیں کیونکہ بے ادبی کی حقیقت یہ ہے کہ مخاطب کی عظمت دل میں نہ ہو اور یہاں یہ بات نہیں ہے یہاں تو عظمت کا ہیضہ ہو گیا ہے اس عظمت ہی نے تو ان کو محو کر دیا ہے اور الفاظ تک بھلا دیے ہیں اب ان کے منہ سے جو کچھ نکلتا ہے اس میں سراپا عظمت ہی بھری ہوئی ہے گو صورت ان کی کیسی ہی ہو یہ حقیقت ہے ان کے اقوال کی۔ اور ان کے افعال پر بھی ملامت کرنے کا کس کو حق ہو سکتا ہے جب کہ خود وہی ملامت نہیں کرتے جن کا یہ

نام لیتے ہیں۔ انہوں نے ان کو مرفوع القلم فرما دیا ہے ان کے افعال میں بھی محبوب کی عظمت بھری ہوتی ہے پھر وہ خلاف ادب اور قابلِ ملامت کیسے ہو سکتے ہیں رہا یہ کہ ان کے افعال وحرکات جنون اور خبط کے سے معلوم ہوتے ہیں تو یہ واقع کے خلاف ہے اور آپ کی نظر کا قصور ہے آپ اپنی نظر کی اصلاح کیجئے ان کی اصلاح کے پیچھے پڑیئے یہ حالت ہے اہلِ حال کی۔ اور یہ عذر ہے ان کا۔ مگر یہ حال اہلِ حال کا ہے نہ اس کا جو کہ مکار ہو اور بناوٹ سے حال دکھلاتا ہو ان کے بارے میں کہتے ہیں ؎

ظالم آں قومیکہ چشماں دوختند　　　از سخن ہا عالمے را سوختند

وہ شخص نہایت ظالم ہے جس نے اہل حال کی سی باتیں کر کر کے لوگوں کو اپنا معتقد بنایا۔ واعظ بن کر بیٹھ گئے پیر بن گئے شیخ بن گئے لوگوں کو طریق کی تعلیم دیتے ہیں مگر درحقیقت وہاں کچھ بھی نہیں جو کچھ ہے بناوٹ ہے۔ ان کی تعلیم کی بھی حقیقت سنئے کہ وہ کیا تعلیم دیتے ہیں اور اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے اول مطلق تعلیم کو سمجھئے کہ وہ کیا چیز ہوتی ہے۔

اہلِ حال کی نقالی

تعلیم کی حقیقت یہ ہوتی ہے کہ معلم وہ اثر جو اس کے قلب میں ہے بذریعۃ الفاظ کے متعلم پر ڈالتا ہے اسی واسطے ہر تعلیم کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو حال معلم کے قلب میں ہوتا ہے وہی متعلم پر پڑتا ہے الفاظ کا چنداں اثر نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ اہل حال گو کوئی بات معمولی الفاظ میں کہیں مگر وہ اثر کر جاتی ہے اور غیر اہل حال کیسے ہی رنگین اور زوردار الفاظ سے کچھ کہے مگر اثر نہیں ہوتا اب سمجھئے کہ یہ مکار لوگ بھی تعلیم دینے بیٹھتے ہیں اور الفاظ اہل حال کے سے نقل کرتے ہیں مگر دل میں تو حال ہے نہیں بلکہ کچھ اور ہی ہے لہذا وہی اثر جو ان کے دل میں ہے متعلم پر پڑتا ہے۔ ان کے دل میں کیا ہے۔ تکبر۔ ترفع۔ تصنع بڑا بننا معتقد بنانا۔ بس وعظ کے پاکیزہ الفاظ کے ذریعے سے یہ نجاسات اور گندگیاں متعلم کے دل میں پہونچتی ہیں اور اس کا ستیاناس ہوتا ہے اسی کو مولانا نے فرمایا ہے۔ "از سخن ہا عالمے را سوختند" اچھی اچھی باتوں سے متعلمین کو غارت کر دیا یعنی

بجائے اچھی باتوں کے ذریعہ سے بری بری باتیں ان کے دلوں میں اتار دیں اور امراضِ قلبی ان میں پیدا کر دیئے جنہوں نے ان کو جلا کر خاک کر دیا بعض وقت یہ لوگ اہل حال کے ان اقوال کو بھی نقل کرتے ہیں جو ان سے بحالت سکر نکلے ہیں اور جو ظاہراً ادب سے گرے ہوتے ہیں اور گستاخی میں داخل ہیں۔

سو خوب سمجھ لیجئے کہ غیر صاحب حال کو ان الفاظ کا منہ سے نکالنا ہر گز جائز نہیں بلکہ سراسر گستاخی اور بے ادبی ہے یہ الفاظ حقیقت میں جائز تو کسی کو بھی نہیں کیونکہ گستاخی اور بے ادبی کے الفاظ ہیں اور بے ادبی بھی کس کی حضرت حق کی جو احکم الحاکمین اور قادر مطلق ہے۔ ایک ادنیٰ سے حاکم کے سامنے بھی کوئی شخص تہذیب سے گرا ہوا لفظ یا بے تکلفی کا کلمہ نہیں کہہ سکتا سوا حضور اور عالیجناب کے بلکہ تم اور آپ بھی نہیں کہہ سکتا چہ جائیکہ احکم الحاکمین کی شان میں کوئی لفظ ادب کے خلاف کہہ سکے ان کی تعلیم تو وہ ہونی چاہیئے جو کسی کی بھی نہ ہو سکے ان کے واسطے تو وہ لفظ چاہئیں جو کسی کے واسطے بھی نہ ہوں ان کے سامنے تو وہ خشوع و خضوع چاہیئے جو کسی کے سامنے بھی نہ ہو بے تکلفی اور گستاخی کے کیا معنی تو اس کی اجازت تو در حقیقت کسی کے واسطے بھی نہیں ہو سکتی لیکن حال والا معذور ہے وہ اپنے ہوش میں نہیں اُس کی تو یہ حالت ہے ؎

گہہ ترا گوید ز مستی بوالحسن   یا صغیر السن یا رطب البدن

اس کی طرف خطاب بھی امر و نہی کا متوجہ نہیں ہوتا کیونکہ مجنون ہے اور مجنون مرفوع القلم ہوتا ہے اس لیے حال والے پر غیر حال والے کو قیاس نہیں کر سکتے۔ وہ بعض وقت ایسے الفاظ بھی حق تعالیٰ کی شان میں کہہ بیٹھتا ہے جو مخلوق ہی کو کہے جا سکتے ہیں۔

جیسے وہ شبان موسیٰ علیہ السلام کہتا تھا کہ اے خدا تو کہاں ہے مجھے مل جاوے تو میں تجھے روٹی کھلاؤں اور تیرے کپڑے پھٹ گئے ہوں تو سی دوں اور تو تھک جاوے تو بدن دبا دوں گھی چپڑ چپڑ کر روٹی کھلاؤں سر میں کنگھی کر دوں۔ ساری بکریوں کا دودھ تجھ

بھی کو پلاؤں اور جانے کیا کیا فرطِ محبت میں کہہ رہا تھا یہ صاحب حال تھا حق تعالیٰ کی شان میں وہ باتیں کہہ رہا تھا جو مخلوق سے کہی جاتی ہیں اس کی ریس میں اگر کوئی دوسرا شخص کہے تو اس پر حکم شرعی لگا دیا جاوے گا اور اس چرواہے پر کوئی حکم نہیں لگ سکتا حتیٰ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اس سے یہ الفاظ سنے تو چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام صاحبِ مقام تھے ان الفاظ کو سن کر آپ اُٹھے اور اس کو زجر کیا کہ کیا بک رہا ہے اور کس کی شان میں یہ کہہ رہا ہے وہ بیچارا چپ ہو گیا اس زجر پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خطاب فرمایا گیا کہ تم نے اس کو کیوں روک دیا دیکھئے یہ کلمات گستاخی کے تھے کیونکہ وہ باتیں ہیں جو مخلوق کے واسطے کہی جاتی ہیں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس شبان نے خالق کو مخلوق کے برابر کر دیا اس سے زیادہ کیا گستاخی ہو سکتی ہے مگر اس بات پر شبان پر تو عتاب نہ ہوا اور اس سے روکنے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خطاب کیا گیا۔

اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ شبان معذور تھا فرطِ محبت میں بیہوش ہونے کی وجہ سے اس پر حکم اہلِ ہوش کا سا نہیں لگایا گیا اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے قصد سے گستاخی اور بے ادبی نہیں کرتا تھا بلکہ جان و مال کو خالق پر فدا کر رہا تھا سوا خالق کے کسی کی طرف اس کی نظر نہ تھی جو کچھ اس کے خیال میں تھا مال اور جان سب کو خالق کے سامنے پیش کرتا تھا۔

ہاں وہ دیہاتی آدمی جنگل کا رہنے والا تھا اس کے خیال میں یہی چیزیں تھیں گھی چپڑی روٹیاں دودھ دہی بکریاں یہ سب اس نے محبوب کے سامنے پیش کر دیں یہ تو مالی خدمت تھی اور وہ جان سے بھی حاضر تھا اس طرح کہ جو کام اس کو آتے تھے یعنی سر میں کنگھی کرنا۔ کپڑوں کی جوئیں دیکھنا۔ پھٹا کپڑا سی دینا۔ بدن دبا دینا ان سب خدمات کے لیے بھی حاضر تھا تو یہ تو غایت درجہ کی محبت ہوئی کہ جان و مال دونوں سے حاضر ہو گیا اسی واسطے حق سبحانہ و تعالیٰ کے یہاں اس کی قدر ہوئی۔ جان و مال دو ہی چیزیں ہیں جب یہ دونوں چیزیں کسی نے حاضر کر دیں تو اور کس چیز کا مطالبہ اس سے کیا جائے؟ یہ اور بات ہے کہ اس نے پیش

کرنے کی صورت ذاتِ حق کے شایان شان نہ تھی تو اس میں اُس کو معذور رکھا گیا اس واسطے کہ اُس کو اس سے زیادہ اچھی صورت بنانا آتا ہی نہ تھا اگر اس سے زیادہ کا مطالبہ اس سے کیا جائے اور جاہل مدہوش کو طرزِ کلام میں عقلا کے اتباع کا مکلف کیا جائے تو یہ تکلیف مالایطاق ہوگی جو حق تعالیٰ نے بندوں پر نہیں رکھی غرض حقیقت ان خدمات کے پیش نظر کرنے کی بالکل ٹھیک تھی گو صورت اچھی نہ تھی۔

صاحبِ حال معذور ہے

، باقی اور لوگ جو اہلِ حال نہیں ہیں اور اہلِ حال کی نقل اتارتے ہیں وہ اہلِ حال کے حکم میں کیسے ہو سکتے ہیں کیونکہ اہلِ حال میں حقیقت تو ہے صورت نہ سہی اور یہاں تو صورت بھی نہیں اور حقیقت بھی نہیں یہ تو محض گستاخی اور بے ادبی ہے کہ خالق کو صورۃً و حقیقۃً مخلوق کے برابر کیا جاتا ہے کاش ان پر حق تعالیٰ کی عظمت منکشف ہوتی تو نظر آتا کہ ہم کیا کر رہے ہیں یہ بالکل اندھے ہیں حق تعالیٰ پر ان کی نظر نہیں پڑی اس وجہ سے ایسے الفاظ منہ سے نکالنے کی جرأت ہوتی ہے اور اہلِ حال پر حق تعالیٰ کی عظمت اسقدر منکشف ہے کہ وہ اس کے سامنے سب چیزوں کو بھول گئے حتیٰ کہ الفاظ کو بھول گئے ان سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ سوچ کر الفاظ زبان سے نکالتے کتنا فرق ہے دونوں کی حالت میں ایک بینا ہے اور ایک نابینا پھر کیسے دونوں کو برابر کر دیا جائے نابینا اگر بینا کیطرح دوڑ کر چلنے لگے تو ضرور چوٹ کھائے گا اور سر پھوڑے گا اور کنوئیں میں گرے گا اب سمجھ میں آگیا ہوگا کہ ہوش کی حالت میں اور بیہوشی کی حالت میں کتنا فرق ہے۔ غیر اہلِ حال کو اہلِ حال کی ریس ہرگز نہیں کرنا چاہیے اس واسطے مولانا مستوں کے لیے ایک جگہ تو کہتے ہیں ؎

گہہ ترا گوید ز مستی بوالحسن — یا صغیر السن یا رطب البدن

اور جس میں مستی نہیں ہے تو اس کی طرف سے کہتے ہیں ؎

اے بروں از وہم و قال و قیل من — خاک بر فرق من و تمثیل من

یعنی میری مثال پر خاک اور میرے منہ میں بھی خاک ہو۔ لیکن پھر عذر بیان کرتے ہیں کہ گو یہ مثالیں ناقص ہیں مگر ان کو ایک عذر سے بیان کیا جاتا ہے وہ عذر کیا ہے سے

بندہ نشکیبد ز تصویر خوشت　　　　ہر دست گوید کہ جانم مفرشت

غرض صاحب حال جب ایسے الفاظ کہتا ہے جو بظاہر ادب سے گرے ہوتے ہیں تو وہ مستی کی حالت میں کہتا ہے اسوقت یہ معذور ہے اس کی نظر سوائے ذات حق کے کسی طرف نہیں ہے اس پر وحدۃ الوجود کا حال طاری ہے اور جو صاحب حال نہیں ہے وہ اگر ایسے الفاظ بکے گا تو وہ معذور نہیں ہے اس کی گردن ناپی جائے گی۔

غرض اہل حال اور مکار دونوں کا ایک حکم نہیں ہو سکتا۔ اہل حال تعبیر صحیح پر قادر ہی نہیں اس کے منہ سے جو کچھ نکلتا ہے وہ بے اختیار نکلتا ہے اور مکار کے منہ سے جو کچھ نکلتا ہے وہ اس کے اختیار اور تصنع سے نکلتا ہے پھر اہل تصنع اور غیر اہل تصنع کیسے برابر ہو جائیں گے۔ بہرحال یہ مسئلہ وحدۃ الوجود کا حال کے درجہ میں تصوف کا مسئلہ ہے اور مشکل مسئلہ ہے اس کے حاصل کرنے کے لیے ہمت کی ضرورت ہے، اور قال کے درجہ میں یا علم کے درجہ میں عقلی مسئلہ ہے اور بہت واضح اور مسلم مسئلہ ہے یہ حقیقت ہے وحدۃ الوجود کی۔

اس کا ذکر اس مناسبت سے آگیا تھا کہ ہستی کامل کے سامنے ہستی ناقص ہستی کہنے کے قابل ہی نہیں ہے اس کی بہت سی مثالیں دی گئی تھیں مثلاً یہ کہ شجاعت کامل کے سامنے شجاعت ناقص کو شجاعت کہنا ٹھیک نہیں وغیرہ وغیرہ۔ اصل بیان یہ تھا کہ ہر صفت میں تین درجے ہوتے ہیں ایک عدم اس درجہ میں اس صفت کا نام لینا کذب اور غلط ہوتا ہے اور اس سے یہاں بحث بھی نہیں اور ایک درجہ نقصان کا ہے اس درجہ میں گو اس صفت کا نام کسی اعتبار سے لے سکتے ہیں مگر عرف یہی ہے کہ اس درجہ میں بھی اس کا نام لینا قابل شرم سمجھا جاتا ہے جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے۔

کمالِ اسلام مطلوب ہے

اب سمجھئے کہ منجملہ صفات کے اسلام بھی ہے اور ہم اس کے ساتھ متصف کیے جاتے ہیں اور الحمدللہ کہ اس صفت کا اطلاق ہمارے اوپر درجہ کذب میں تو نہیں ہے یعنی ایسا نہیں ہے کہ ہم ظاہر میں مسلمان کہے جاتے ہوں اور دل میں مسلمان نہ ہوں یہ حال تو منافقین کا تھا اور منافقین اس زمانہ میں نہیں ہیں جیسا اوپر تحقیق گذر چکی۔ تو اب دو درجے رہے ایک نقصان دوسرا کمال۔ ظاہر ہے کہ اسلام صفت مطلوب ہے اور متعدد مثالوں اور متعدد عنوانوں سے ابھی ثابت کیا گیا ہے کہ کوئی صفت درجہ نقصان میں مقصود نہیں ہوتی چنانچہ کوئی شخص جو متمول بننا چاہتا ہے وہ ایک پیسہ حاصل کر کے بیٹھ نہیں رہ سکتا اور اس طرح منطقی مقدمات سے اپنے دل کو نہیں سمجھا سکتا کہ متمول کہتے ہیں مالدار کو اور مالدار کے معنی ہیں مال رکھنے والا اور پیسہ مال ہے تو ہم مالدار اور متمول ہو گئے نہیں بلکہ متمول بننے کے معنی ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ اس صفت کو علی وجہ الکمال حاصل کیا جاتے اور درجہ نقصان میں کوئی اس صفت کو مقصود نہیں سمجھتا بنا بریں جب صفت اسلام مطلوب ہے تو اس کے ساتھ اس کا کمال بھی مطلوب ہوگا یہ تو عقلی دلیل تھی کمال کے مطلوب ہونے کی۔

اب شرعی دلیل سنئے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں یایھا الذین امنوا ادخلوا فی السلم کافۃ یعنی حکم ہے کہ اسلام میں پورے پورے داخل ہوں دیکھئے صاف حکم موجود ہے کہ صفت اسلام کو علی وجہ الکمال حاصل کرنا چاہئے حالانکہ اگر یہ امر صریح بھی موجود نہ ہوتا تب بھی اس قاعدہ کے موافق کہ کسی صفت کا اطلاق جب ہوتا ہے تو درجہ کمال ہی میں ہوتا ہے اسلام کامل ہی مطلوب ہوتا چہ جائیکہ امر صریح بھی موجود ہے تو اب کیا کلام ہو سکتا ہے اس بات میں کہ اسلام کامل ہی مطلوب اور مقصود ہے، کمال اسلام کا مطلوب اور مامور بہ ہونا تو ثابت ہو گیا گو لفظ اسلام لغۃً ہر اس جگہ صادق آسکتا ہے جہاں ذرا سا بھی اسلام ہو یعنی کیسا ہی ناقص اسلام ہو تب بھی لغت کے اعتبار سے

اس کو اسلام کہہ سکتے ہیں مگر اہلِ تحقیق کے نزدیک جب ہی صادق آسکتا ہے جب کہ کمال کے ساتھ ہو جیسا کہ مدلل اور مفصل بیان کیا گیا۔

اسلامِ کامل کی تعریف

ہمارے دعوے اسلام کے صحیح ہونے کے لیے ضرورت ہے کمالِ اسلام کی۔ اور اس کے لیے ضرورت ہے اس علم کی کہ اسلام کامل کیا چیز ہے تاکہ اس کو سمجھ کر حاصل کیا جاوے اسی کو حق تعالیٰ نے اس آیت میں بتلایا ہے جو پڑھی گئی۔ قل ان صلوٰتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین یعنی کہہ دیجئے کہ میری نماز اور کل عبادتیں اور جینا اور مرنا سب اللہ ہی کے واسطے ہے۔

اس میں سب سے پہلے دیکھنا یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے حضورؐ کو لفظ قل سے امر فرمایا ہے یعنی کہہ دیجئے اور سنا دیجئے حالانکہ ظاہر ہے کہ اگر یہ امر بھی نہ ہوتا اور قل کا لفظ نہ فرمایا جاتا تب بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وحی کو سناتے ہی پھر باوجود اس کے بھی سنانے کا حکم فرمایا گیا تو اس سے مقول قل کی شان کا اہتمام پیدا ہوا کہ یہ بات ایسی ہے کہ اس کے سنانے کا خاص اہتمام مقصود ہے اور جس بات کے سنانے کا حکم ہے اس کا حاصل اسلام کامل ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہوئی کہ اسلام کامل قابلِ اہتمام چیز ہے اسی واسطے بیان کے لیے اس آیت کو میں نے اختیار کیا۔

اب سمجھئے کہ بحمد اللہ ہم صفتِ اسلام کے ساتھ متصف تو ہیں اور اسلام ہم میں موجود ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ وہ کامل ہے یا ناقص؟ تو اب پہلے کامل کو سمجھئے اس سے خود معلوم ہو جاتے گا کہ ہم میں وہ درجہ ہے یا نہیں۔ فرماتے ہیں اپنا مسلک ظاہر کر دیجئے کہ ان صلوٰتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین لا شریک لہ، میں اس کا ترجمہ کرتا ہوں کہ (میرا مسلک تو یہ ہے کہ) میری نماز عبادت مرنا جینا سب اللہ کے لیے ہے (وہ کیسے ہیں) وہ رب العلمین ہیں ان کا کوئی شریک نہیں ہے وبذلک امرت

اور مجھ کو اسی کا حکم کیا گیا ہے وانا اول المسلمین اور میں سب سے پہلے اسلام لانے والوں میں ہوں۔ یہ لفظ مسلمین کو خوب مل گیا ہے یہ لفظ دلالت کرتا ہے کہ آیت میں اسلام ہی کی شرح کی گئی ہے کیونکہ مامور بہ با جزائہ بیان کرنے کے بعد اس کی تعمیل کرنے والوں کا لقب مسلمین فرمایا گیا ہے تو اس کے یہی معنی ہوتے کہ اس مامور بہ کے اجزا جمع کرنے سے یہ لقب مسلم حاصل ہوتا ہے اور مسلم وہی ہے جس میں یہ امور ہوں جن کا یہاں ذکر ہے تو یہ معنی ہوتے کہ یہ مامور بہ کا مجموعہ عین اسلام ہے لیجئے تصریح ہو گئی کہ آیت میں اسلام کامل کی تفسیر بتائی گئی ہے فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

اس کی مثال یہ ہے کہ کسی کو تعلیم کی جاوے کہ کھڑے ہو کر اللہ اکبر کہو پھر الحمد اور سورت پڑھو پھر کمر جھکاؤ پھر کھڑے ہو پھر زمین پر ماتھا رکھو پھر کھڑے ہو جاؤ اور اسی ترکیب سے چار دفعہ ان سب کاموں کو کرو اور بعد میں کہہ دیا جاتے کہ جب تم چار دفعہ ایسا کرو گے تو سمجھ لینا کہ نمازی بن گئے تو اس تعلیم میں گو اس نے شروع سے یہ نہیں کہا کہ میں تم کو نماز سکھلاتا ہوں لیکن اخیر میں یہ لفظ کہہ دینے سے کہ ان افعال کے کرنے سے تم نمازی بن جاؤ گے صاف یہ مطلب نکلتا ہے کہ ان افعال کا کرنے والا نمازی ہے اور ان افعال کا مجموعہ نماز ہے۔ اور یہ سب اجزا نماز کے ارکان ہیں اسی طرح یہ تعلیم فرما کر کہ اپنا مسلک یہ رکھے کہ نماز بھی خدا کے لیے ہو اور ہر عبادت بھی خدا کے لیے ہو اور مرنا بھی خدا کے لیے ہو اور جینا بھی خدا کے لیے ہو اس کے بعد یہ فرمایا کہ بس مجھے اسی کا امر ہے اور میں اپنے آپ کو سب سے پہلا مسلم کہتا ہوں یہ بالکل ویسا ہی ہے جیسے مثال میں کہا گیا تھا کہ ان افعال کے کرنے سے تم نمازی بن جاؤ گے تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسلک اختیار کرنا مسلم بننا ہے اور یہ مسلک اسلام ہے اور یہ اجزا اسلام کے اجزا ہیں اور اول کا لفظ صاف بتلاتا ہے کہ اسلام کامل مراد ہے کیونکہ اولیت سے مراد اولیت زمانی نہیں ہے بلکہ اولیت فی الرتبہ ہے جس کا ترجمہ ہے سب سے بڑھ کر مسلمان ہونا یہی

بعینہٖ ترجمہ ہے اسلام کامل کا جیسا کہ ظاہر ہے لیجئے اب تو میرے مدعا کے لیے بالکل صاف صاف الفاظ مل گئے

اسلام کامل کے اجزاء

اب سمجھئے کہ یہاں اسلام کامل کی حقیقت چار اجزاء میں بیان فرمائی گئی ہے کہ یہ چار چیزیں اللہ ہی کے لیے خالص کردو۔ نماز۔ عبادت۔ موت۔ حیات ان سب کو اللہ ہی کا کردو بس اتنی حقیقت ہے اسلام کامل کی اجمال تو یہ ہے جو بہت ہی ذرا سا ہے مگر اس کی تفصیل کچھ شرح اور طول چاہتی ہے اور تفصیل بھی ایک تو اختصار کے ساتھ ہو سکتی ہے اور ایک طول و بسط کے ساتھ۔ اختصار کیساتھ تو یہ ہے کہ یہاں جو حقیقت اسلام کامل کی چار اجزاء میں بتلائی گئی ہے کہ ان چار کو یعنی نماز اور عبادت اور موت اور حیات کو اللہ ہی کے لیے خالص کردو اس کے معنی صرف یہ نہیں ہیں کہ ان چاروں کو صرف عقیدہ کے مرتبہ میں اللہ کی سمجھتے رہو کیونکہ اس سے تو کوئی ادنیٰ درجہ کا مسلمان بھی خالی نہیں ہر مسلمان ان چار چیزوں کو ہی کیا بلکہ ہر چیز کو اعتقاداً اللہ ہی کی سمجھتا ہے، تو پھر کامل اور ناقص میں فرق ہی کیا ہوا؟ بلکہ معنی یہ ہیں کہ ان چار چیزوں کو اعتقاداً اللہ کی سمجھ کر حالاً بھی ان کو ان کے ہی سپرد اور تابع کردو جب اپنے کو اللہ کی ملک سمجھا تو ان کو اعتقاداً بھی تصرف کا مستحق سمجھو اور حالاً بھی منقاد ہو جاؤ یعنی دل سے عقیدہ یہ رکھو کہ یہ سب چیزیں خدا کی ہیں اور حالاً بھی ان کے تصرف کو تسلیم کر کے بالکل منقاد اور مطیع اور فرماں بردار بن جاؤ کہ ان چاروں میں جسطرف چلائیں اسی طرف کو چلو تو حاصل یہ ہوا کہ حق تعالیٰ جو تصرف بندہ کی نماز میں عبادت میں حیات میں موت میں کریں اس کا اعتقاداً و حالاً منقاد اور فرماں بردار ہونا اسلام کامل ہے یہ تفصیل ہوئی اختصار کے ساتھ۔

کمال اسلام کے بارے میں تفصیل

اب قدرے طول اور بسط کے ساتھ تفصیل سنیے وہ یہ ہے کہ یہاں دو باتیں سمجھنے کی ہیں چنانچہ میں نے ابھی کہا ہے کہ حق تعالیٰ کو تصرف کا مستحق سمجھو اور تم انقیاد کرو تو یہ چیزیں دو ہوئیں

تصرف اور انقیاد۔ تصرف تو حق تعالیٰ کا فعل ہے اور انقیاد ہمارا فعل ہے اب خدا تعالیٰ کے فعل یعنی تصرف کی حقیقت بھی سمجھنا اور اس کا اعتقاد رکھنا ضروری ہے اور اپنے فعل یعنی انقیاد کی حقیقت معلوم کرنا اور اس پر عمل کرنا بھی ضروری ہے تو چار چیزیں ہوئیں۔ تصرف کی حقیقت سمجھنا اور عقیدہ رکھنا تصرف پر۔ اور اپنے فعل یعنی انقیاد کی حقیقت سمجھنا اور عمل کرنا اس پر۔ بس اسی سے اسلام کامل ہوگا ان چاروں کو ترتیب وار سن لیجئے۔ اول حقیقت سمجھنا تصرف حق کی ان چار چیزوں میں یعنی نماز میں عبادت میں موت میں حیات میں۔ اس کی تفصیل عنقریب آتی ہے مگر اس کے قبل اس کے متعلق ایک بات اور سمجھ لیجئے کہ یہ جو چار چیزیں بتلائی گئیں یہ چار برائے نام ہیں عنوانات چار ہیں ورنہ مضمون حقیقت میں تین ہیں یا دو اس طرح کہ صلوٰۃ کے معنی ہیں نماز اور نسک کے معنی ہیں عبادتیں اور نماز بھی عبادت میں داخل ہے تو یہ تعمیم بعد تخصیص ہے اس لیے دراصل صرف نسک کا لفظ بھی کافی تھا نماز بھی اسمیں آجاتی لیکن نماز کا نام جدا لیا گیا بغرض اہتمام کے تو یہ معنی ہو گئے کہ ساری عبادتیں ملک ہیں اللہ کی، تو اب ان دو جزو میں سے ایک جزو رہ گیا یعنی عبادت جس میں نماز بھی آگئی جب چار جزو میں سے ایک کم ہوگیا تو تین جزو رہ گئے۔ یہ تو تین جزو ہونے کی تقریر ہوئی اور دو جزو ہونے کی تقریر یہ ہے کہ اس کے بعد محیای ومماتی آیا ہے اس کے معنی ہیں میرا مرنا اور میرا جینا۔ اس میں دو احتمال ہیں ایک تو یہ ہے کہ ان سے حالت حیات اور حالت موت مراد ہو۔ دوسرا یہ کہ حیات و موت کے احکام مراد ہوں اگر حالت حیات اور حالت موت مراد ہو تو پھر یہ دونوں ملکر ایک ہو سکتے ہیں کیونکہ دونوں غیر اختیاری امور ہیں اور صفت غیر اختیاری دونوں میں مشترک ہے اور پیشتر صلوتی ونسکی کا متحد ہونا معلوم ہو چکا ہے تو مضمون کے درجہ میں بجائے چار کے دو جزو رہ گئے اس طرح کہ موت اور حیات تو حالت غیر اختیاری ہوئی اور عبادت فعل اختیاری ہے تو معنی آیت کے یہ ہو جائیں گے کہ ہمارے تمام حالات اختیاریہ وغیر اختیاریہ اللہ تعالیٰ کے ملک ہیں۔ اور دوسری شق پر یعنی

جب کہ حیات اور موت سے مراد احکام حیات اور موت ہوں دو ہونے کی تقریر یہ ہے کہ احکام موت سے مراد میراث وغیرہ وہ احکام ہیں جو بعد موت کے جاری ہوتے ہیں اور احکام حیات تمام ان احکام کو شامل ہے جو زندگی کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اس میں تمام عبادتیں آگئیں نماز بھی آگئی اور بقیہ احکام متعلقہ حیات بھی آگئے تو اس طرح سے تین چیزیں تو احکام میں آگئیں یعنی نماز اور عبادتیں اور بقیہ احکام متعلقہ حیات۔ اور ایک چیز احکام موت میں آگئی۔ تو پھر بھی دو چیزیں ہو گئیں۔ غرض تین چیزیں کہو یا دو کہو سب کا حاصل یہ ہوا کہ ہمارے حالات اختیاریہ اور غیر اختیاریہ پھر وہ حالات موت کے ہوں یا حیات کے سب ملک اللہ کے ہیں یہ حاصل ہے آیت کا۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ مضمون بہت مختصر الفاظ میں بھی آسکتا تھا مثلاً یوں ہوتا کہ احوال الاختیاریۃ وغیر الاختیاریۃ للہ۔ پھر ان سب کو الگ الگ کیوں بیان کیا گیا ایجاز کی جگہ اطناب کو کیوں اختیار کیا گیا۔ اس کی ایک توجیہ تو یہ ہے کہ لوگوں کے مذاق مختلف ہیں اور ان سب مذاقوں پر اصلاح مقصود ہے سو ایک مذاق جو آجکل غالب ہے یہ بھی ہے کہ ان کے خیال میں عبادات تو حقوق اللہ ہیں اور ان میں ہر طرح اللہ کو اختیار تصرف کا ہے جس فعل کو چاہیں عبادت قرار دے دیں اور جس کیفیت سے چاہیں اسکو مقرر فرمادیں نماز میں چار رکعتیں رکھدیں تو بھی ٹھیک ہے اور تین رکھ دیں تو بھی ٹھیک ہے اور دو رکھدیں تو بھی ٹھیک ہے، غرض عبادات میں ہر قسم کے تصرف کا حق تعالیٰ کو حق حاصل ہے۔

احکامِ تمدن و معاشرت اور مولوی حضرات

یہ مذاق والے اسی کو دین سمجھتے ہیں ان کو احکام متعلقہ عبادات سے وحشت نہیں ہوتی۔ لیکن ان کو اُن احکام سے جو معاشرت کے متعلق ہیں یا حیات اور موت کے انتظام کے متعلق ہیں یعنی جو احکام عادات کے اور تمدن و معاشرت

کے متعلق ہیں ان کے سننے سے وحشت ہوتی ہے۔

بعض کو میں نے خود سنا ہے یوں کہتے ہوئے کہ مولویوں نے دین کو خوب بنایا ہے کہ پاجامہ ایسا ہو یہ بھی ایک مسئلہ ہو گیا اور ڈھیلے سے استنجا کرو اور اس کے بعد پانی سے استنجا کرو یہ بھی ایک مسئلہ ہو گیا اسی طرح داڑھی کا بھی ایک مسئلہ ہے اور چلنے پھرنے کا بھی ایک مسئلہ ہے غرض زندگی تنگ کر دی، کپڑا پہنو تو مولویوں سے پوچھ کر ہگو موتو تو مولویوں سے پوچھ کر وضع بناؤ تو مولویوں سے پوچھ کر چلو تو مولویوں سے پوچھ کر پھرو تو مولویوں سے پوچھ کر، غرض کوئی کام بھی کرو پہلے مولوی صاحبان کو سلام کرلو۔ اچھی مطلب کی گانٹھی ہے اس میں مولویوں کو کیا دخل؟ مولوی لوگ تو اللہ کا راہ بتلانے کے لیے اور آخرت درست کرنے کے لیے ہیں۔ دنیا کے کاموں میں خواہ مخواہ ٹانگ اڑاتے ہیں دنیا کی ضرورتیں ہم زیادہ جانتے ہیں اور اسی کے موافق سب کام کر سکتے ہیں ان صاحبوں کو کیا ضرورت ہے تکلیف کرنے کی؟

اتنا غنیمت ہے کہ جو کچھ کہا مولویوں کو ہی کہا۔ انہی کی مخالفت کرتے ہیں شریعت اور شارع کے ساتھ گستاخی کرنا مقصود نہیں ورنہ کفر ہو جاتا اگرچہ یہ بات بھی وہیں تک پہنچ جاتی ہے کیونکہ مولوی تو ان احکام کے بتلانے والے ہیں کہ شریعت میں یوں ہے تو ان کے بتائے ہوئے احکام کا انکار کرنا درحقیقت شریعت ہی کا انکار ہے مگر خیر ان صاحبوں نے اپنے ارادہ سے شریعت کا انکار نہیں کیا بلکہ یوں سمجھا ہے کہ یہ احکام شریعت کے ہیں ہی نہیں یہ مولویوں کا اختراع ہے اس وجہ سے صریح فتوے سے بچ گئے غرض ان صاحبوں نے مولویوں کو بیچ میں تختہ مشق بنا لیا اور یوں کہتے ہیں ارے میاں علماء بھی کوئی مسئلے ہیں کہ یوں کھاؤ یوں پیو یوں رہو یوں لین دین کرو یہ تو ہماری مصلحت اور ہمارے معاملات ہیں جیسا مقتضائے وقت دیکھو کرلو، زمانہ بدلتا جاتا ہے ضرورتیں بھی بدلتی جاتی ہیں جس طرح سے ضرورت پوری ہو وہی کر لینا چاہیے۔ غرض عادات

اور تمدن اور معاشرت کے متعلق ان لوگوں کا خیال یہ ہے کہ شریعت کو ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں شریعت تو دین کا نام ہے اور یہ باتیں دنیا کی ہیں اس میں شریعت کو کیوں داخل کیا۔ ہمیں اپنی دنیا کا اختیار ہے جیسے چاہیں ویسے کریں۔ اس بارہ میں ایسے ایسے مقالات ہیں جس میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں ان کا صاف مطلب یہی ہے کہ دین اور شریعت منحصر ہے عبادات میں اور عبادات کے سوا کوئی چیز دین میں داخل نہیں یہ گویا مولویوں کی گھڑت ہے کہ سب چیزیں دین میں داخل کر دی ہیں اور ہر کام میں لیسے لیسے فتوے نکال دیئے ہیں اور ایسی ایسی قیدیں لگا دیں کہ آدمی کوئی کام دنیا کا کر ہی نہ سکے دین کا نام لگا کر دنیا کو غارت ہی کر دیا اور قوم کو ترقی سے روک دیا تمام قومیں ترقی کرتی چلی جاتی ہیں اور مسلمان روز بروز تباہ اور غارت ہوتے چلے جاتے ہیں مگر ہمارے پیشواؤں کو اس بات کی حس ہی نہیں کہ قوم کی کیا حالت ہے۔ **بھوکے مرجاؤ، روپیہ مت کماؤ**

الٰہ آباد میں ایک بیرسٹر نے ایک مولوی صاحب سے کہا تھا کہ حضرت ذرا قوم کی حالت بھی تو دیکھئے سود کو حرام تو کہے جاتے ہو مگر یہ بھی تو دیکھو کہ مسلمان کس حالت کو پہنچ گئے تمام دوسری قومیں اس کی بدولت ترقی کرتی چلی جاتی ہیں اور تم مسئلے ہی بگھارے جاتے ہو اس سود کو تو نظر ثانی کر کے حلال ہی کر ڈالو۔ قرآن میں غور کر دا ایسا کیا بالکل ہی حرام ہے۔ مولوی صاحبان غور نہیں کرتے سود کے حرام ہونے کی تو کوئی وجہ ہی نہیں مولوی صاحب نے کہا توبہ کر و توبہ۔ مولوی کیا حرام کرتے اللہ نے حرام کیا ہے۔ قرآن میں صریح حرمت کی آیت موجود ہے اب بیرسٹر صاحب آہستہ آہستہ منہ پر طمانچے مارنے لگے کہ اللہ توبہ اللہ توبہ اگر قرآن میں واقعی حرام ہے تو بھائی میں توبہ کرتا ہوں، خدا کی قسم میں تو سمجھتا تھا کہ یہ مولویوں ہی کا فتویٰ ہے یہ صاحب بمبئی کے میمن تھے انہوں نے غنیمت ہے اظہار ندامت تو کیا بہت ایسے موجود ہیں جنکو نصوص سن کر بھی اپنی جہالت پر اصرار ہے اور دیدہ و دانستہ آیات کا انکار ہے حاصل ان سب کا یہی ہے کہ ان لوگوں نے

دین نام کہلاتا ہے صرف عبادات کا اور تمدن اور معاشرت اور عادات کے متعلق یوں کہتے ہیں کہ اس میں شریعت کو کیا دخل؟

مسئلہ تشبہ کہتے ہیں کہ لیجئے صاحب تشبہ کا بھی ایک مسئلہ نکل آیا ہے کہ ایسی صورت مت بناؤ ایسے کپڑے مت پہنو، ارے میاں! یہ بھی کوئی شریعت کی بات ہوئی یہ بھی کوئی خدا کا کام ہے خدا کو خدا کہنا، رسول کو رسول ماننا یہ تو دل کے متعلق ہے اگر کپڑے کسی نے ایک طرح کے چھوڑ کر دوسری کی طرح کے پہن لیے تو کیا دل سے خدا کو بھلا دیا کیا اسلام نام کپڑوں کا ہے اگر ایسا ہے تو چاہیے کہ کسی مسلمان کو کوئی ننگا کر دے تو بس وہ مسلمان نہ رہے کیونکہ اسلام تو نام کپڑوں کا تھا اور وہ اتر گئے تو اسلام بھی اتر گیا مولویوں نے بھی خوب گھڑی ہے یہ حدیث کہیں سے نکال لی ہے من تشبہ بقوم فھو منھم۔

میں کہتا ہوں کہ جب جرمن اور برطانیہ میں لڑائی تھی اور برطانیہ کا سپاہی وردی جرمن کی پہن کر لڑائی میں کھڑا ہو تو اس کو برطانیہ کے افسر کس نظر سے دیکھیں گے کیا اس کے فعل کو جائز رکھیں گے یا منع کریں گے اگر منع کریں گے تو میں پوچھوں گا کہ اس کی بنا من تشبہ بقوم فھو منھم کے سوا کیا ہے معلوم ہوا کہ یہ ایسی بات ہے کہ اہل دنیا کے نزدیک بھی مسلم ہے اور کوئی قوم دوسری قوم کی وضع بنانے کو پسند نہیں کرتی تو یہ مسئلہ عقلی ہوا اگرچہ حدیث بھی اس کے موافق مل گئی تو اس کو نہ ماننا عقل کے بھی خلاف ہے اور نقل کے بھی۔

اب میں کہونگا کہ افسوس اور حیرت ہے کہ حکام مجازی کو تو یہ کہنے کا حق ہو کہ مَن تَشَبَّہَ بِقَومٍ فھو منھم اور حق تعالیٰ کو یہ کہنے کا حق نہ ہو، ذرا تو غور کیجئے یہ ایک تشبہ کے متعلق مختصراً عرض کیا گیا۔ تمام عادات اور معاشرات اور تمدن کے متعلق اسی طرح کہا جا سکتا ہے بہرحال اس فریق کے خیال میں دین منحصر ہے صرف عبادات میں

اور موت وحیات میں اس کو کوئی دخل نہیں ہے اس خیال کی تردید کرنے کے لیے آیت میں مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ کو صراحۃً بڑھا دیا جس کا حاصل یہ ہوا کہ دین کو صرف صلوٰتی اور نسکی میں منحصر مت سمجھو بلکہ محیای اور مماتی یعنی موت اور حیات کو بھی ہمارا ہی سمجھو جیسے عبادات میں ہم کو ہر قسم کے تصرف کا اختیار ہے جس نماز میں چاہا چار رکعت رکھ دیں اور جس میں چاہا تین رکھ دیں اور جس میں چاہا دو رکھ دیں اسی طرح ہم کو اختیار ہے حیات اور موت کے احکام میں بھی تصرف اور دخل دینے کا اختیار ہے پس جس طرح ہم کہیں اسی طرح زندگی بسر کرو اور بعد موت کے بھی جس طرح ہم کہیں اسی طرح عمل کرو یہ توجیہ اس صورت میں ہے کہ محیای ومماتی سے احکام موت اور حیات کے مراد ہوں۔

احکام شرع اور مصالح دنیوی

اور اگر محیای ومماتی سے مراد موت اور حیات کے احکام نہ ہوں بلکہ خود موت اور حیات مراد ہو تو اس صورت میں ایک دوسرے مذاق کے موافق دوسرا نکتہ ہوگا وہ مذاق یہ ہے کہ بعض لوگ اس خیال کے بھی ہیں کہ موت اور حیات اور جو کچھ بھی دنیا میں ہوتا ہے وہ سب حق تعالیٰ کے حکم سے ہی ہوتا ہے اور ہر طرح کے تصرف کا حق تعالیٰ کو حق حاصل ہے لیکن عبادات اور احکام میں تصرف کا اختیار حق تعالیٰ کے لیے نہیں سمجھتے۔

اس سے کوئی تعجب نہ کرے اس خیال کے لوگ بھی موجود ہیں جیسا کہ آگے معلوم ہوگا۔ یہ لوگ وہ ہیں جو احکام کو دبے دبائے مانتے تو ہیں صریح انکار تو نہیں کرتے مگر اُن میں تاویل ایسی کرتے ہیں کہ اس کی حقیقت تحریف اور انکار ہے۔ یہ مذاق ان لوگوں کا ہے جو شرعی احکام کی بنا محض دنیوی مصالح پر مانتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے نزدیک اس خیال کو بڑا اچھا خیال سمجھتے ہیں اور دل خوش کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ علیم وحکیم ہیں اُن کا ہر حکم مصلحت اور حکمت کے ساتھ ہے کوئی حکم فضول دیکھا نہیں یہ بات بادی النظر

میں تو ایسی ہے کہ جو کوئی سنتا ہے اُن کا دل دلدادہ ہو جاتا ہے اور ان کی تحریروں اور تقریروں کی تعریف کرنے لگتا ہے کہ دیکھے وہ حکمتیں بیان کی ہیں جن سے شریعت کی خوبی دلوں کے اندر اتر جاتی ہے اور نقلی باتوں کو عقلی کر کے دکھا دیا ہے۔ یہ بات ہمارے علماء کو بھی نصیب نہیں ہوئی۔ علماء کوئی شریعت کا حکم بتلاتے ہیں تو لٹھ مار دیتے ہیں، مخاطب کی سمجھ میں آوے یا نہ آوے اور یہ لوگ اس کو دل میں اتار دیتے ہیں اور اس کو منوا دیتے ہیں کہ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔

یہ بات صورۃً تو اس قدر اچھی ہے مگر حقیقت اس کی سنئے، حقیقت اس کی سوائے اس کے کچھ نہیں کہ یہ لوگ خدا تعالیٰ کے احکام کو یہ سمجھ کر تسلیم نہیں کرتے کہ حق تعالیٰ احکم الحاکمین اور مالک اور مختار ہیں بلکہ اس وجہ سے ان احکام کے قائل ہوتے ہیں کہ ان احکام میں اُن کی بھی کوئی دنیوی مصلحت ہے چنانچہ انہی مصلحتوں کو بیان بھی کرتے ہیں جن کو سن کر بھولے بھالے آدمی عش عش کرتے ہیں اور تعریفیں کرنے لگتے ہیں۔ حاصل ان کے مذاق کا یہ ہے کہ اصل چیز تو دنیوی مصلحت ہے اور اسی قانونِ فطرت پر احکام مرتب ہیں کیوں کہ فطرت اور طبیعت اپنے مصالح کو خوب جانتی ہے بس خدا کا کام یہ ہے کہ اس کو جاری کر دیا ہے جیسے ایک کلکٹر ضلع میں قانونی احکام کو جو اوپر سے صادر ہوتے ہیں جاری کرتا ہے اور وہ احکام ایسے ہی ہوتے ہیں جو ضلع کی مصلحتوں سے وضع کیے جاتے ہیں لیکن یہ احکام وہ ہیں جنمیں کلکٹر کو اختیار ذرا بھی نہیں۔ یہ احکام اوپر سے آتے ہیں کلکٹر اپنے اختیار سے ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں کر سکتا اس کو پیش نظر رکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ کلکٹر صرف احکام کو جاری کرنے والا ہے احکام کو بنانیوالا نہیں ہے۔ بلفظِ دیگر محافظ قانون ہے واضع قانون نہیں۔ اور بلفظ دیگر بادشاہ کا نوکر ہے بادشاہ نہیں ان کے اس مذاق پر خدا کی حقیقت بھی یہی رہ جاتی ہے کہ ایک قانون مصالح فطریہ کی موافق مبین ہے۔ خدا کا کام اس کا اجراء اور اس کی محافظت ہے خدا کو مخالفت مصالح کا حق نہیں ہے نعوذ باللہ۔

یہی وجہ ہے کہ ان کا طرز عمل یہ ہے کہ اگر ایک وقت تک شریعت کے احکام ان کی مصلحت کے موافق رہے تو ان کو اس طرح تسلیم کیا جس طرح شریعت نے بتلایا تھا اور ایک وقت میں مصلحت کے موافق نہ رہے اور مصلحت بدل گئی تو ان کو بھی بدل دیا اور اُسی اصل پر لے آئے جس پر ان کے نزدیک احکام مبنی تھے یعنی مصلحت پر۔۔۔۔۔۔ صاحبو! خدا کلکٹر کی طرح بے اختیار نہیں ہے بااختیار اور مختار مطلق ہے اور خود بادشاہ اور شہنشاہ ہے کسی کا محکوم نہیں ہے بلکہ حاکم اور احکم الحاکمین ہے۔

اب معلوم ہو گیا ہو گا کہ ان کا وہ جملہ کہ خدا علیم و حکیم ہے اُس کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں اس کی حقیقت کیا ہے۔ صورت اس کی اسقدر اچھی مگر حقیقت اس قدر بری کہ اس سے خدا خدا ہی نہیں رہتا۔ اب یہ بات سمجھ ہو گئی یا نہیں کہ ان کی تاویل نہیں ہے بلکہ تحریف ہے ان لوگوں کا احکام کو ماننا برائے نام ہے حقیقت میں حکم الٰہی کو ماننا نہیں بلکہ اپنی رائے کا اتباع ہے اور ہوا پرستی ہے۔

اور یہ بالکل اس آیت کا مصداق ہے ارأیت من اتخذ الٰھہ ھواہ یعنی اس شخص کی حالت دیکھئے جس نے اپنی خواہش اور رائے کو خدا بنالیا۔ سب کو معلوم ہے کہ دنیا میں کوئی فرقہ اور کوئی گروہ ایسا آج تک نہیں ہوا جس نے کہا ہو کہ میرا خدا میری رائے ہے۔ دنیا میں پتھر پوجنے والے بھی ہوئے آتش پرست بھی ہوئے مگر رائے پرست اور ہوا پرست کسی فرقہ کا نام آپ نے نہیں سنا ہو گا پھر اس آیت میں یہ کس کو فرمایا گیا ہے کہ اس نے اپنی رائے کو خدا بنایا سوا اُس کے اور کون مراد ہو سکتا ہے جو اپنی رائے کو خدا کے برابر یا نعوذ باللہ اس سے بھی بڑھ کر سمجھے۔ یہ برابر اور بڑھ کر سمجھنے کے اور کیا معنی ہیں یہی تو معنی ہیں کہ اپنی رائے کو خدا کے حکم کے برابر سمجھے یا اپنی رائے کو خدا کے حکم سے بھی مقدم رکھے۔ اب اس گروہ کی حالت کا خود اندازہ کر لیجئے۔ ان کے اقوال بطور جزئیات سنئے۔ یہاں تک نوبت آ گئی ہے کہ مثلاً نماز کا حکم شریعت میں ہے مگر یہ لوگ کہتے ہیں کہ نماز جیسی مولوی بتاتے ہیں یہ مقصود نہیں

یہ کیا کہ کبھی کھڑے ہوں، کبھی جھک جاؤ، کبھی سر زمین پر رکھ دو، کبھی بیٹھ جاؤ، کبھی داہنے بائیں منہ پھیر دو۔ یہ مولویوں کی ظاہر پرستی ہے یہ نماز کی صورت تھی بس مولویوں نے اسی کو لے لیا حقیقت کچھ اور تھی اس کو چھوڑ دیا بس ایک لکیر کے فقیر ہو کر رہ گئے وہ حقیقت کیا تھی اصلاح اخلاق کہ ابتداً اسلام میں لوگ وحشی تھے اخلاق کو جانتے ہی نہ تھے، بڑے بڑے لوگ بڑے لڑنے والے اور تکبر کے پتلے تھے ان کو اخلاق سکھلانے اور تکبر توڑنے کے لیے نماز کی تعلیم کی گئی تھی اور اس میں ایسے ہی حرکات رکھے گئے تھے جو تکبر کے خلاف ہیں جھکنا سر زمین پر رکھ دینا ادب اور عاجزی کی صورت بنانا یہ سب تکبر کے خلاف افعال ہیں اس سے ان میں انسانیت اور اخلاق اور تواضع پیدا ہو گئے۔ بس اصل مقصود یہ تھا اُس وقت میں یہ مقصود ان ہی افعال سے حاصل ہو سکتا تھا اس واسطے ان کی تعلیم کی گئی اور اب زمانہ بدل گیا اب تعلیم کا زمانہ ہے اب لوگ وحشی نہیں رہے، اچھے بُرے کو سمجھنے لگے اخلاق اور تواضع عادت انسانی میں داخل ہو گئے۔ حقیقت شناس کو چاہیے کہ نظر اصل مقصود پر رکھے جب تواضع اور اخلاق داخل عادت ہو گئے ہیں تو اب ان افعال کی کیا ضرورت رہی کیونکہ وہ افعال ذریعہ تھے اور اصلاح اخلاق مقصود تھا سو جب مقصود حاصل ہو گیا تو ذریعہ کی کیا ضرورت باقی رہی۔

اس کی مثال یہ ہے کہ آلو بخارا بخار والے کو قطع صفرا کے لیے دیا جاتا ہے جب صفرا کا قلع قمع ہو گیا تو آلو بخارا کی کیا ضرورت رہی یہ ہم نے کسی کو نہیں سُنا کہ صفرا دور ہونے کے بعد تندرستی کی حالت میں بھی آلو بخارا کھائے جاؤ مگر کیا کیجیے کہ مولوی صاحبان نے طبیب کو آلو بخارا دیتے ہوئے دیکھا تھا وہ اب تک برابر دیئے جاتے ہیں اس سے کچھ بحث نہیں کہ طبیب نے کس وقت دیا تھا اور کس ضرورت سے دیا تھا۔ لکیر کا فقیر اسی کو تو کہتے ہیں۔

علیٰ ہذا روزہ کو لیجیے کہ اس سے مقصود قوت بہیمیہ کا توڑنا تھا اور وہ بھوکے رہنے سے

ٹوٹتی تھی اس واسطے یہ صورت اختیار کی گئی تھی کہ صبح سے شام تک پیٹ میں ذرہ برابر چیز بھی جانے پائے بی بی سے مطلق نہ بولو عرب کے لوگ اُس وقت ایسے ہی سخت مزاج تھے جن کے سختی بدول اس قدر تشدد کے جا ہی نہیں سکتی تھی اب لوگ کمزور ہیں اور تعلیم کی وجہ سے بھلے بُرے کو سمجھتے ہیں تعلیم یافتوں کی صحبت میں رہتے ہیں اب قوت بہیمیہ کا غلبہ کہاں اور یوں کسی گنوار غیر تعلیم یافتہ میں ہو تو اس کے توڑنے کیلئے وہی پرانی ترکیب ہی مگر تعلیم یافتوں کو تو اس کی ضرورت نہیں کہ اسی طریق سے روزہ رکھوایا جائے انکو روزہ کا حکم دینا ہلاک کرنا ہے۔

تو بیچاروں کے تعلیم ہی میں ختم ہو چکے اب اور انکو بھو کا مارو تاکہ جلدی تمام ہو جائیں۔ خلاصہ یہ کہ روزہ کی حقیقت کیا ہوئی قوت بہیمیہ کا توڑنا اور وہ تعلیم وغیرہ سے حاصل ہے تو روزہ کی حقیقت حاصل ہے لہذا الطریق متعارف روزہ کی ضرورت نہیں رہی یہ انکا روزہ کا حکم ماننا ہے

علیٰ ہذا جماعت کی فلاسفی بیان کیجاتی ہے (ان کی فلاسفی ہر چیز میں چلتی ہے) وہ کیا ہے آپس میں میل جول ایک دوسرے کی خبر رکھنا تعلقات پیدا کرنا اس سے تمدن میں ترقی ہوتی ہے ایسی خرافات پیش کر کے کہتے ہیں کہ دیکھئے اسلام نے کیسے کیسے طریقے بتلا دیئے ہیں ترقی کے۔ اور اس پر بڑے بڑے مضامین لکھے جاتے ہیں تقریریں کیجاتی ہیں اپنے نزدیک اسکو دین سمجھتے ہیں۔

اسلام کے نادان دوست

قادیہ درحقیقت دین کو غارت کرنا ہے اور ہلاک کرنا۔ یہ ان کی خدمت دین اور خیر خواہی ایسی ہے جیسے ایک ریچھ نے اپنے مالک کی خدمت کی تھی۔ قصہ اس کا یہ ہے کہ ایک شخص نے ریچھ پالا تھا اور اس کو یہ تعلیم دی تھی کہ جب وہ سوتا تو ریچھ مکھیاں اڑایا کرتا تھا وہ بے تکلف سوتا اور ریچھ مکھیاں اڑاتا رہتا۔ حسب عادت ایک روز وہ شخص سو رہا تھا اور وہ معتمد علیہ خادم اپنی خدمت پر تعینات تھا کہ ایک مکھی کو اس نے کئی مرتبہ اڑایا مگر بعض مکھی ضدن ہوتی ہے اڑائے جاؤ مگر وہ دفع ہی نہیں ہوتی وہ لوٹ لوٹ کر اس کی ناک پر آکر بیٹھتی تھی ریچھ کو غصہ آگیا اور کہا ابکی مرتبہ آکر بیٹھ تو تجھ کو ٹھیک کردوں اور ایک

بڑا پتھر لاکر منتظر بیٹھا جیسے ہی وہ آکر ناک پر بیٹھی اس نے وہ پتھر پوری طاقت سے کھینچ مارا مکھی تو اڑ گئی پتھر ان کی ناک پر لگا ناک بھی اڑ گئی اور سر کا بھیجا بھی اڑ گیا پس سر پیغلط تعلیم کا حاصل ہو گیا۔ یہی حالت ان خادمان اسلام کی ہے کہ اپنے نزدیک تو اسلام کی خدمت اور خیر خواہی کرتے ہیں مگر درحقیقت اسلام کی بیخ کنی اور بدخواہی ہوتی ہے جیسے اس ریچھ نے اپنے نزدیک تو مالک کی خیر خواہی اور خدمت ہی کی تھی کہ اس مکھی کو مارنا چاہا تھا مگر ہوگئی بدخواہی اور دشمنی ؎

دوستی بے خرد چوں دشمنی است — حق تعالیٰ زیں چنیں خدمت غنی است

ریچھ نے بھلا کرنا چاہا تھا مکھی کا اور ہو گیا بھلا مالک کے سر کا اسی طرح یہ حضرات بزعم خود حق تعالیٰ کے احکام پر سے مخالفین کے اعتراضات کو رفع کرنا چاہتے ہیں کہ یہ احکام خلاف عقل و مصلحت ہیں اور رفع ہو جاتی ہے خدا کی خدائی تو کیا اچھی خدمت ہے کہ مخدوم کی مخدومیت ہی نہیں رہتی اور احکام ہی منہدم و منعدم ہوتے جاتے ہیں۔

ارکان اسلام کی فلاسفی

چنانچہ اس وقت جس جزئی کا بیان کر رہا ہوں اسی کو دیکھ لیجئے۔ یہ کہتے ہیں کہ جماعت کی فلاسفی یہ ہے کہ حضرت شارع علیہ السلام کو اس سے مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں میں پانچ وقت باہم اختلاط ہو ایک دوسرے سے تعلقات بڑھیں اور تبادلہ خیالات ہو اور علوم کی ترقی ہو اور جانے کیا کیا الفاظ ہیں جو اس کی غایت میں بیان کیے جاتے ہیں۔ ہمیں تو ان کے الفاظ یاد بھی نہیں ہوتے (اور خدا کا شکر ہے کہ یاد نہیں ہوتے) ایک محلہ کے اختلاط کے لئے پانچ وقت کی جماعت مقرر ہوئی اور تمام شہر کے اختلاط کے لیے آٹھ دن میں جمعہ کی نماز مقرر ہوئی اور گاؤں والوں اور شہر والوں کے اختلاط کے لیے عیدین کی نماز مقرر ہوئی جس سے سال بھر میں دو دفعہ تبادلہ خیالات ہو سکتا ہے اور تمام دنیا کے مسلمانوں کے باہم اختلاط کے لیے حج مقرر ہوا تاکہ ایک دفعہ تمام عالم کو تبادلہ خیالات کا موقع ملے اور ہر قسم کے علوم اور فنون جاننے والے

آپس میں ملیں اور علوم کو ترقی ہو بس ترقی کی ہوا سر میں ہے وہی ہر جگہ نظر آتی ہے، حج کرنے والے جانتے ہوں گے کہ وہاں کیا تبادلۂ خیالات ہوتا ہے اور کیسی ہمدردی ہوتی ہے ایک کو دوسرے کی خبر بھی نہیں ہوتی وہ سفر ہی ایسا دشوار ہے کہ سب کو اپنی اپنی پڑی ہوتی ہے کوئی ایک دوسرے کے کام نہیں آتا اور کسی کو اپنے ہی قصوں سے فرصت نہیں ہوتی۔

اور یہ عجیب بات ہے کہ حج میں ایسی عبادات رکھی گئی ہیں جنکی وجہ سے کسی سے بات کرنے ہی کا موقع نہیں مل سکتا کچھ تو مسلسل سفر کرتے رہتے ہیں اور جو وقت ان سے بچے اور فرصت ملے تو اس میں تلبیہ تکبیر تہلیل تسبیح ادعیہ طواف نماز۔ عرفات کو جانا مزدلفہ میں پہنچنا۔ منیٰ میں آنا اور وہاں ٹھہرنا۔ قربانی۔ حلق۔ رمی جمار۔ پھر مکہ آنا۔ طواف کرنا وغیرہ' یہ اجزاءِ حج کے ایسے ہیں کہ جنہوں نے حج کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان سے کون سا وقت بچتا ہے جس میں تبادلۂ خیالات اور علوم اور فنون کی ترقی کا موقع مل سکے حج کے لیے ان اجزا کو مقرر کرنا خود ہی بتلا رہا ہے کہ حق تعالیٰ کو مقصود ہی کچھ اور ہے۔ تبادلۂ خیالات اور اختلاط مقصود نہیں' وہ مقصود صرف ایک طرف خیال کا مجتمع کرنا اور سب کو ایک جگہ حاضر ہو کر بہیئت اجتماعی ایک وحدہٗ لاشریک لہٗ کے دھیان میں لگنا ہے تمام اجزاءِ حج کے اسی پر ہیں۔ انہوں نے اس میں غور ہی نہیں کیا اور خیالی بندشیں کر کے حج کا موضوع لہٗ تبادلۂ خیالات کو بنا دیا۔

یہ تو شیخ چلی کا سا قصہ ہو گیا کہ اس نے ذرا سی دیر میں گھر آباد کر لیا تھا۔ قصہ اس کا یہ ہے کہ ایک شیخ چلی تھے مزدوری کیا کرتے تھے ایک روز ایک شخص کا تیل کا گھڑا دو پیسہ مزدوری کے بدلے سر پر رکھ کر لے چلے راستہ میں آپ نے خیال باندھا کہ دو پیسے مزدوری کے ملیں گے تو ان سے دو انڈے خریدیں گے اور ان کو مرغی کے نیچے رکھیں گے۔ اس میں سے ایک مرغی اور مرغا نکلے گا۔ مرغی انڈے دیگی تو بچے نکلوا دیں گے بس بہت سے مرغی مرغے ہو جاویں گے پھر ان سے انڈے بچے ہوں گے اور بہت مرغی مرغے ہو جاویں گے پھر ان کو بیچ کر ایک بکرا بکری لیں گے پھر ان کی نسل چلے گی انکو بیچ کر بھینس لیں گے اس کا دودھ گھی بیچ کر

بہت سارا روپیہ جمع کریں گے۔ ایک مکان بنائیں گے اور وزیر زادی سے شادی کریں گے پھر اس سے لڑکا ہوگا اسے کھلایا کریں گے پھر وہ ذرا بڑا ہو جائے گا ہمارے ساتھ پیار کرے گا پھر وہ ہم سے پیسہ مانگے گا تو ہم کہیں گے ہشت۔ بس یہ کہنا تھا کہ سر جو ہلا تو گھڑا گر کے ٹوٹ گیا اور تیل والے کا تیل بھی بہہ گیا وہ بہت بگڑا کہ واہ بے یہ کیا کیا میرا ایک روپیہ کا نقصان کر دیا کہنے لگے میاں جاؤ بھی اپنے ایک روپیہ کو لیے پھرتے ہو میرا سارا کنبہ غارت ہو گیا وہ میں کس سے لوں۔ تو جیسا انہوں نے ذرا دیر میں دو پیسہ سے روپیہ اور مال دولت اور اولاد اور کنبہ سب کچھ بنا لیا تھا اسی طرح ان حضرات نے خیالی بندش کر کے حج میں تبادلۂ خیالات بھی خیال کر لیا اور علوم اور فنون اور صنعت اور حرفت اور جانے کس کس چیز کی ترقی کر لی حالانکہ وہاں نہ تبادلۂ خیالات ہوتا ہے نہ کچھ بلکہ وہاں تو تبادلۂ جنگ و جدال ہوتا ہے کہ وہ اس سے لڑ رہا ہے اس کو اپنی پڑی ہوئی ہے اُس کو اپنی پڑی ہوئی ہے۔

دیکھئے عجیب بات ہے کہ حق تعالیٰ نے بھی جن باتوں سے حج میں خاص طور سے ممانعت فرمائی ہے اس میں جدال کا لفظ بھی ہے یعنی حج میں لڑو جھگڑو مت۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حج میں یہ ضرور ہوگا۔

مصالح شرعیہ حکمت ہیں نہ کہ علت

حضرت یہ سب خیالی بندشیں ہیں نہ نماز اس واسطے ہے جس واسطے آپ نے سمجھ رکھی ہے نہ جماعت اس کے لیے ہے اور نہ حج کی غرض یہ ہے جو آپ نے قرار دے رکھی ہے ان سب کی غرض تو عبادت ہے اور یہ سب اللہ کے راضی کرنے کیلئے ہیں نہ اور کسی کام کیلئے۔

اگر کوئی کہے کہ یہ مانا کہ یہ سب کام اللہ کے راضی کرنے کیلئے ہیں مگر یہ بھی تو ہے کہ حق تعالیٰ کے احکام دنیائی مصلحتوں سے بھی تو خالی نہیں۔ تو ان مصلحتوں کو اگر کسی نے بیان کر دیا تو اس میں کیا حرج ہوا ایسا علماء نے بھی تو کیا ہے اور اس بات میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں ان پر تو کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا...... اور آج کل ایسا کیا جاتا ہے تو اس پر اعتراض ہے

اگر نو تعلیم یافتہ ترغیب کے لیے ایسا کرتے بھی ہیں تو کیا حرج ہے؟ میں کہتا ہوں حرج یہ ہے کہ مصلحتوں کے ایسے پیچھے پڑے ہیں کہ بعض وقت کلب میں جانے کو ترجیح دیجاتی ہے نماز اور روزہ پر' نماز کا وقت قضا ہو جاتے مگر کلب کے جانے کا وقت قضا نہ ہو اور روزہ نہ رکھا جائے مگر کلب کی شرکت ضرور ہو کیونکہ کلب میں مجمع ہوتا ہے وہاں تبادلہ خیالات ہوتا ہے اور ہر قسم کے علوم وفنون کو ترقی ہوتی ہے اور یہی مقصود تھا ان کے نزدیک نماز اور روزہ سے اور یہ کلب میں بہت سہولت اور آرام وعیش سے تنعم کے ساتھ حاصل ہوتا ہے پھر نماز روزہ کی ان کو کیا ضرورت ہے جس میں بہت سے بکھیڑے کرنے پڑیں پانی لاؤ جا نماز لاؤ سب کو چھوڑ کر ایک طرف کھڑے ہو کر منہ چھوڑو بھوکے مرو اس سے وہی صورت کیوں نہ اختیار کرو جس میں بہت سے مزے ہیں اور کوئی تکلیف نہیں اور اصل مقصود بھی حاصل ہے حضرت یہ حرج ہے ان مصالح کے بیان کرنے میں۔ علماء کی ریس تو کی جاتی ہے مگر علماء نے کلب کے لیے کون سے دن نماز چھوڑی تھی انہوں نے تو صف قتال میں بھی نماز نہیں چھوڑی۔ علماء نے احکام کی مصلحتیں ضرور بیان کی ہیں اور اس مضمون میں کتابیں لکھی ہیں لیکن انہوں نے مصلحتوں کو حکمت کے درجہ میں رکھا ہے نہ علت کے درجہ میں۔ اور آپ نے ان کو علت قرار دیا ہے یہ فرق ہے آپ کے اور ان کے فعل میں تو اپنے فعل کو اُن کے فعل پہ قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے انہوں نے احکام کی بنا مصالح پر نہیں رکھی جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ جہاں وہ مصلحت ہو حکم بھی ہو اور جہاں نہ ہو حکم بھی نہ ہو بلکہ ان مصالح کو حکمت کے درجہ میں رکھا جس کے معنی یہ ہیں کہ اصل بنا تو حق تعالیٰ کے حکم پر ہے۔ ہمارا نفع ہو یا نقصان لیکن چونکہ حق تعالیٰ حکیم ہیں ہر حکم میں کوئی تو حکمت بھی ضرور ہوتی ہے اس لیے ممکن ہے کہ اسمیں فلاں فلاں حکمت ہو مگر اس کے ساتھ اسپر بھی کوئی دلیل نہیں کہ ہر حکم میں وہی حکمت ہو جو ہماری سمجھ میں آوے ممکن ہے کہ کوئی حکمت ایسی ہو جو ہماری سمجھ میں نہ آئی ہو ہم کیا اور ہمارا علم کیا۔ خدا تعالیٰ کی حکمتوں کو سمجھنے کا دعویٰ وہ کرے جو علم میں

بھی نعوذ باللہ خدا کی برابری کا دعویٰ کرے علم میں تو ہم کچھ بھی نہیں اور حوصلہ رکھیں خداتعالیٰ کے احکام کی حکمتیں معلوم کر لینے کا یا ان سے حکم کی وجہ پوچھنے کا، حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے اُن کاموں کی حکمت بھی ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ جو ہمارے ہی جیسے آدمیوں کے تجویز کئے ہوئے ہیں بہت سے قانونی احکام ایسے ہیں جن کی وجہ ہم کو معلوم نہیں اور ظاہراً ہماری مصلحت کے خلاف بھی ہیں اور بسا اوقات ان سے ہمکو نقصان بھی پہنچ جاتا ہے مگر ان کی وجہ پوچھنے کا کبھی حوصلہ نہیں ہوتا بلکہ دل میں اطمینان ہوتا ہے کہ گو ظاہراً یہ حکم خلاف مصلحت معلوم ہوتا ہے اور ہم کو اس سے کچھ نقصان پہنچا مگر واقع میں اسمیں کوئی مصلحت ہوگی اور کوئی ضرورت ہوگی جسکی وجہ سے عقلاء کی ایک جماعت نے اس قانون کو پاس کیا ہے۔

قانون الٰہی کے سامنے حجت

حیرت کی بات ہے کہ آدمیوں کے بنائے ہوئے احکام پر تو اطمینان ہو اور ان میں کسی تعلیل اور حجت کی ضرورت نہیں حالانکہ ان کے نقصان بھی خود مشاہدہ کر لئے اور خداتعالیٰ کے احکام پر اطمینان نہ ہو حالانکہ ان کا علیم وحکیم ہونا بھی تسلیم ہے اور ساتھ ہی اس کے ان کا ماں باپ سے زیادہ مہربان اور رؤف ورحیم ہونا بھی مسلم ہے جس کا مقتضا یہ ہے کہ کوئی حکم غیر حکیمانہ ہرگز نہ ہوگا کیونکہ علیم اور حکیم ہیں اور ہمارے واسطے خلاف مصلحت بھی نہ ہوگا کیونکہ مہربان اور رحیم ہیں مگر غضب ہے کہ اُن احکام کو ایسی بیقدری کی نظر سے دیکھا گیا کہ کسی اپنے برابر والے کے حکم کو بھی اس نظر سے نہیں دیکھ سکتے ہر حکم کی وجہ پوچھی جاتی ہے اور اس کی حکمت خود تراش کر اُس پر حکم کی بنا کیجاتی ہے اور ایسی تراش خراش کی جاتی ہے کہ وہ حکم بالکل ہی اُڑ جاتا ہے اور اس کو کہا جاتا ہے اسلام کی ہمدردی اور طرفداری اور خدمت۔ اگر یہی خدمت اور طرفداری اور ہمدردی ہے تو بس سلام ہے۔

اصل یہ ہے کہ اس ہمدردی کی آڑ میں نفس ان احکام سے آزادی چاہتا ہے اس واسطے نفس نے ان لوگوں کو یہ سمجھایا ہے کہ احکام مقصود نہیں بلکہ مصالح مقصود ہیں بس ان مصلحتوں

نظر رکھو جس صورت میں وہ پوری ہو جائیں اسی کو حکم الٰہی اور دین سمجھو۔ اب آپ کی سمجھ میں اچھی طرح آ گیا ہو گا کہ آج کل بعض مسلمانوں میں یہ مذاق بھی موجود ہے کہ حق تعالیٰ کو حق تصرف صرف موت وحیات ہی میں ہے احکام میں نہیں احکام اسی قانون کا نام ہے جس کی بنا مصالح پر ہے پس اس کی تردید فرمائی ہے حق تعالیٰ نے لفظ محیای ومماتی میں اس طرح کہ اول حکم دیا نماز اور عبادات کا جو افعال اختیاریہ ہیں پھر اس کے ساتھ حالات غیر اختیاریہ کو بیان فرمایا تاکہ اس سے ان کی سمجھ میں آ جائے کہ ان کے اختیار کو کہاں تک دخل ہے وہ حالت غیر اختیاری موت اور حیات ہے محیای ومماتی کے یہی معنی ہیں اس میں بتلا دیا ہے کہ تم اپنے حالاتِ اختیاریہ میں تصرف کرنا چاہتے ہو تو دیکھ لو کہ تمہاری دو حالتیں غیر اختیاری اور بھی ہیں۔

تکوینیات میں حق تعالیٰ کا تصرف

اے آزاد لوگو اس میں غور کرو کہ تم کو ان دونوں حالتوں میں کسی قسم کا اختیار ہے۔ معلوم ہو گا کہ ان میں ذرا بھی اختیار نہیں ہے ان دونوں میں پورا اختیار اور تصرف حق تعالیٰ ہی کو حاصل ہے تو اس نظیر سے سمجھ لو کہ دوسری حالت میں بھی اختیار ہم ہی کو ہونا چاہئے کہ ہم جو چاہیں حکم دیں اور جس چیز سے چاہیں منع کریں۔ دیکھو وہ حالت غیر اختیاری یعنی موت اور حیات کس طرح ہمارے قبضہ میں ہے کہ کسی تمہاری مصلحت اور مضرت کے تابع نہیں ایسے ہی اس حالت اختیاریہ کو بھی سمجھو اور اس میں تعلیلیں اور تاویلیں مت نکالو حالت تکوینی اور تشریعی دونوں ہم نے اپنے قبضہ میں رکھی ہیں اگر تم حالتِ تشریعی میں آزادی چاہتے ہو تو تکوینی میں بھی کر کے دکھاؤ لیکن وہاں آزادی نہیں چلتی تو امور تشریعیہ میں کیوں آزادی کا دم بھرتے ہو ہمارے اختیار دینے پر مت بھولو ہم نے تم کو فی الجملہ اختیار امتحان کے لئے دیا ہے کہ دیکھیں کون ہمارا حکم اپنے قصد سے بے چون وچرا مانتا ہے اور کون اس میں تاویلیں

کرتا ہے اختیار دینے کا یہ مطلب نہیں کہ تم کو ہمارا حکم بدل دینے کا بھی اختیار ہے تم اس درجہ سے فاعل مختار نہیں ہو۔

اس کے ثبوت کے لیے اپنے اختیار کو اُس حالت میں دیکھو جس میں ہم بالجبر حکومت کرتے ہیں اس میں غور کر کے تم کو معلوم ہو جائے گا کہ تم بالکل بے بس ہو ذرہ برابر تم کو اپنے اوپر اختیار نہیں کبھی ہم ایک شخص کو مارتے ہیں ایسی حالت میں کہ اس کی صدہا مصلحتیں فوت ہو جاتی ہیں اس نے کیا کیا منصوبے دل میں گانٹھ رکھے تھے کہ یوں کروں گا اور یوں کروں گا جب ہمارا حکم پہنچا ان سب کو ناتمام چھوڑ کر اور ایک دم قطع کر کے چل دینا پڑا ہزاروں آدمی روتے اور کلیجہ پھاڑتے رہ گئے کسی سے یہ نہ ہو سکا کہ ایک لمحہ کی بھی مہلت دلا دے بچے روتے رہ گئے بی بی سر پیٹتی رہ گئی احباب منہ تکتے رہ گئے اور ہم نے انہی سب کے ہاتھوں بلا لیا اے انسان تو اس سے سمجھ لے کہ تجھ کو اپنے اوپر قبضہ نہیں تو بالکل دوسرے کے قبضہ میں ہے سہ

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے ۔۔۔ اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

یہ موت کی حالت ہے زندگی میں دیکھئے کہ انسان کو اپنے اوپر اتنا بھی اختیار حاصل نہیں کہ جو چیز بھول جائے اس کو پھر اپنے اختیار سے یاد کر لے یا جو چیز یاد ہو اس کو اپنے قصد سے بھلا دے جب اپنے کسی تکوینی حالت پر اتنا بھی قبضہ اور اختیار نہیں تو دوسری حالت پر یعنی تشریعی پر کیوں اختیار سمجھتے ہو اور اس میں کیوں آزادی ڈھونڈتے ہو اس میں بھی اپنے آپ کو ہمارے تصرف میں سمجھو اور جو کہیں بے چون و چرا مان لو۔ یہ نکتہ محیای دماغی کے اضافہ میں کہ ایک ایسی نظیر بتلا کر جس میں آزاد نہ ہونا مسلم اور مشاہد ہے سمجھا دیا کہ دوسری حالت میں بھی اپنے آپ کو آزاد نہ سمجھو اور احکام شرعیہ میں تعلیلیں اور حجتیں نہ نکالو اور مصلحتیں نہ تراشو جیسا کہ احکام تکوینیہ میں تمہاری تراشی ہوئی کوئی مصلحت نہیں چلتی اور نہ کسی تعلیل اور حجت سے کام نکلتا ہے۔

آیت کی بلاغت، حاصل یہ کہ مقصود بیان کرنا اس بات کا ہے کہ ہمارے حالات اختیاریہ وغیر اختیاریہ سب اللہ تعالیٰ کی ملک ہیں اسی کے واسطے

اتنے لمبے الفاظ کو کیوں اختیار کیا۔ ان صلوتی ونسکی ومحیای ومماتی کیوں کہ اس کے لئے کوئی مختصر لفظ بھی ہو سکتا تھا۔ مثلاً کوئی ایسا لفظ جس کے معنی یہ ہوتے کہ ہمارے حالات اللہ کے ملک ہیں کافی ہو جاتا تو اس کو اتنا طول کیوں دیا اس کے لیئے دو توجیہیں بیان کی گئی ہیں۔ خلاصہ ان کا یہ ہے کہ لوگوں کے مذاق مختلف ہیں ایک مذاق یہ ہے کہ عبادات تو حقوق اللہ ہیں اور ان میں حق تعالیٰ کو تصرف کا اختیار ہے اور اُس کے احکام کا نام دین ہے باقی احکام موت وحیات یعنی معاشرت اور تمدن تو ان سے دین کو کچھ علاقہ نہیں اس مذاق کی تردید کے لیئے لفظ محیای ومماتی بڑھایا۔ اس صورت میں محیای ومماتی سے مراد احکام حیات وموت ہوں گے اور دوسرا مذاق یہ ہے کہ موت اور حیات میں تو تصرف حق تعالیٰ کا مانتے ہیں کیونکہ مشاہدہ ہے اور یہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس صورت میں محیای ومماتی سے نفس حیات اور موت مراد ہے احکام حیات وموت مراد نہیں مگر یہ لوگ احکام اور عبادات میں حق تعالیٰ کے تصرف کو نہیں مانتے اور اس کے معنی میں نے بیان کر دیئے ہیں کہ گو زبان سے اس تصرف کا انکار نہیں کرتے اور حق تعالیٰ کو حاکم مانتے ہیں مگر ان احکام کی بنا اپنی اختراعی مصالح پر مانتے ہیں جس سے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ حق تعالیٰ کو کسی حکم کا اختیار نہیں ہے بلکہ حکم ہمیشہ مصلحت کے موافق ہوتا ہے اور مصلحت ہی پر احکام کی بنا ہے اس مذاق کی تردید کے لیئے صلاتی و نسکی کو بڑھایا تو ایک توجیہ پر محیای ومماتی کو بڑھایا اور ایک توجیہ پر صلاتی ونسکی بڑھایا تو کیا مزہ کا مضمون ہو گیا جس کے ہر جملہ سے ایک ایک مذاق فاسد کی تردید ہو رہی ہے یہ بات اختصار میں حاصل نہ ہوتی اس واسطے ایجاز کو چھوڑ کر اطناب کو اختیار کیا گیا۔ حاصل یہ ہے کہ ان چاروں اجزا میں حق تعالیٰ کو تصرف کا حق ہے ان چاروں کے نام یہ ہیں صلاتی اور نسکی اور محیای اور مماتی۔ ان کا خلاصہ دو لفظوں میں بھی آ جاتا ہے وہ دو لفظ یہ ہیں حالاتِ اختیاریہ وغیر اختیاریہ۔ اختیاریہ میں نماز وغیرہ آ گئیں اور موت وحیات غیر اختیاریہ ہیں

غرض ہمارے تمام حالات حق تعالیٰ کے قبضہ میں ہیں اور اُن کو ہر قسم کے تصرف کا حق حاصل ہے میں نے بیان کیا تھا کہ اسلام کامل کے دو جزو ہیں، ایک یہ کہ ان چاروں باتوں میں حق تعالیٰ کے تصرف کو مانا یہ تو فعل حق تعالیٰ کا ہے دوسرے اس تصرف کو ماننے کا حق ادا

کرنا جس کا نام انقیاد ہے یہ فعل بندہ کا ہے اس کے لئے ضرورت تھی دونوں اجزا کی حقیقت سمجھنے کی سو اب تک ان چاروں چیزوں کو بیان کیا گیا ہے جن میں حق تعالیٰ کا تصرف ماننے کی ضرورت ہے ابھی حقیقتِ تصرف کا بیان نہیں ہوا جس کا وعدہ اوپر اس جملہ میں کیا گیا ہے کہ اس کی تفصیل عنقریب آتی ہے۔

حق تعالیٰ کی تصرف کی حقیقت

اب حسب وعدہ اس کے بیان کرنے کی ضرورت ہے تب ایک جزو پورا ہوگا اس کے بعد دوسرے جزو کو جو کہ انقیاد ہے اور وہ بندہ کا فعل ہے بیان کیا جائے گا۔

اب اس تصرف کی حقیقت کو سمجھئے کہ حق تعالیٰ نے ان چار جزوں میں تصرف کیا کیا؟ ان چاروں کا خلاصہ دو لفظ میں ہے یعنی حالت تکوینی اور تشریعی سو اب سمجھئے کہ حق تعالیٰ نے تکوینی میں کیا تصرف کیا اور تشریعی میں کیا تصرف کیا تکوینی میں تو یہ تصرف کیا ہے کہ موت اور حیات اور صحت اور مرض کو اور جو کچھ ان کے اسباب ہیں مثلاً گرمی سردی بارش وغیرہ ان سب کو اپنے قبضہ میں رکھا ہے ان میں جو چاہتے ہیں تصرف کرتے ہیں جس کو چاہتے ہیں موت دے دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں زندہ کرتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں تندرستی دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں مرض دیتے ہیں جب وہ چاہتے ہیں گرمی ہو جاتی ہے اور جب وہ چاہتے ہیں سردی ہو جاتی ہے اور جب وہ چاہتے ہیں بارش ہو جاتی ہے اور جب وہ چاہتے ہیں بارش نہیں ہوتی۔ غرض جتنی تکوینیات ہیں سب میں تصرف اُن ہی کا ہے انسان کو ان میں کوئی حق تصرف کا حاصل نہیں۔

لوگ یہ سن کر تعجب کرتے ہوں گے کہ کیا ان امور میں ہم کو کسی قسم کا تصرف حاصل نہیں اور خصوصاً آجکل کے عقلاء تو اس بات کو مانتے ہی نہیں کہ ہم کو تکوینیات میں تصرف کا اختیار نہیں کیونکہ آجکل ایجادوں کی کثرت ہے اُن میں کامیابی دیکھ دیکھ کر عقلا کو یہ خیال ہو گیا ہے کہ کوئی تصرف ایسا نہیں جو ہمارے اختیار میں نہ ہو چنانچہ دیکھا بھی جاتا ہے کہ بہت سے

وہ کام جو انسانی قوت سے باہر سمجھے جاتے تھے آج کل ذرا اشارہ میں ہو جاتے ہیں پھر کیسے مان لیا جاتے کہ ہم کو کسی قسم کے تصرف کا اختیار نہیں۔

تصرفِ انسانی کی حقیقت

اس کا جواب سنئے آپ نے غور نہیں کیا جو تصرفات آپ کے اختیار میں ہیں اور جن کاموں کو آپ بزعم خود ذرا اشارہ میں کر لیتے ہیں اُن میں آپ نے تصرف کیا کیا اور آپ کی قدرت کو کتنا دخل ہے آپ کا تصرف ان میں صرف ترکیب و تحلیل کا ہے ایک چیز کو ایک چیز کے ساتھ ملا دیا اور ایک اثر پیدا ہو گیا یا ایک چیز کو دوسری چیز سے الگ کر دیا اور وہ اثر جاتا رہا اس میں آپ کا کام صرف ملا دینا یا الگ کر دینا ہے باقی اثر کا پیدا ہو جانا یا اثر کا جاتا رہنا یہ آپ کے اختیار سے نہیں ہوتا جیسا کہ میں بیان کروں گا اس میں دھوکہ اس وجہ سے ہوا ہے کہ ترکیب اور تحلیل پر اثر کا ترتب دائمی دیکھا جاتا ہے چنانچہ ہم کسی سے یہ کہیں کہ آگ بجھانا تیرے اختیار میں نہیں تو ہرگز نہیں مانے گا اور کہے گا کہ لاؤ میں ابھی بجھا کر دکھا دوں اور لا کر پانی ڈال دے گا فوراً آگ بجھ جائے گی تو چونکہ ہمیشہ یہی دیکھا ہے کہ پانی ڈالنے سے آگ بجھ جاتی ہے اس واسطے عام طور پر ذہنوں میں یہ سما گیا کہ آگ بجھانا ہمارے اختیار میں ہے حالانکہ یہ دھوکا ہے۔

میں اس کو ثابت کرتا ہوں کہ آگ بجھانا آپ کے اختیار میں نہیں کیونکہ عقلی مسئلہ ہے، القدرۃ تتعلق بالضدین یعنی قدرت کی حقیقت یہ ہے کہ اس کا تعلق مقدور کی دونوں طرفوں سے ہوتا ہے عدم سے بھی وجود سے بھی یعنی کسی کام پر قدرت جب کہہ سکتے ہیں کہ وہ اور اس کی ضد دونوں ہمارے اختیار میں ہوں جب یہ حالت ہو تو کہا جائیگا کہ ہم کو اس کام پر قدرت ہے مثلاً آنکھ کھول کر دیکھنا یہ ہماری قدرت میں ہے کہ اس کے دونوں جانب یعنی دیکھنا اور نہ دیکھنا ہمارے اختیار میں ہیں ہم چاہیں تو دیکھیں اور نہ چاہیں تو آنکھ بند کر لیں اس وقت کہا جائے گا کہ ہم کو دیکھنے پر قدرت ہے یا پیسہ سائل کو دینا کہ ہم کو اس

پر اور اس کی ضد پر دونوں پر قدرت ہے چاہیں دیں اور چاہیں نہ دیں اس صورت میں کہا جائے گا کہ ہم کو پیسہ دینے پر قدرت ہے غرض قدرت کے لئے شرط یہ ہے کہ مقدور اور اس کی ضد دونوں کے ساتھ اس کا تعلق ہو۔

اب سُنئے ہم یہ مانتے ہیں کہ آگ پر پانی ڈالنے سے آگ بجھ جاتی ہے اور آپ اس طرح آگ کو بجھا سکتے ہیں مگر آپ کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ آگ پر پانی ڈالنے سے آگ کا بجھ جانا یہ درحقیقت دو کام ہیں ایک پانی ڈالنا دوسرا ایک آگ کا بجھ جانا۔ پانی ڈالنا بیشک آپ کا فعل اختیاری ہے اور اس پر آپ کو ضرور قدرت ہے کیونکہ اس کا تعلق ضدین سے ہو سکتا ہے کہ چاہیں آپ پانی ڈالیں اور چاہے نہ ڈالیں۔ اور دوسرا کام یعنی آگ کا بجھ جانا یہ آپ کا فعل اختیاری نہیں ہے کیوں کہ قدرت کے معنی اس پر صادق نہیں آتے قدرت کے معنی اس پر جب صادق آتے جبکہ آپ کو اتنا اختیار ہوتا کہ پانی ڈالنے کے بعد اگر آپ چاہیں تو آگ بجھے اور اگر نہ چاہیں تو باوجود پانی ڈالنے کے بھی نہ بجھے اور ایسا ہے نہیں کیونکہ پانی ڈالنے کے بعد آگ بجھ ہی جاتی ہے خواہ آپ چاہیں نہ چاہیں تو قدرت کا اطلاق اس پر کیسے ہو گا اور یہ کیسے کہا جا سکے گا کہ آگ کا بجھنا آپ کا فعل اختیاری ہے ذرا غور سے کام لینا چاہیئے جس کام کو آپ تحقیق کی نظر سے دیکھیں گے اس سے زیادہ نہیں پائیں گے کہ آپ کو اختیار ترکیب وتحلیل اور اسباب کے جمع کرنے کا ہے ہاں عادت اللہ یوں جاری ہے کہ ترکیب وتحلیل اور اسباب کے جمع کرنے کے بعد اُس کام کو وہ اپنی قدرت سے پورا کر دیتے ہیں چونکہ اس کو ہمیشہ دیکھتے ہیں اس واسطے سمجھ لیا ہے کہ تحلیل وترکیب کا نتیجہ بھی ہمارے اختیار میں ہے اور اسباب پر مسببات کا ترتب بھی ہمارے قبضہ میں ہے حالانکہ یہ غلط ہے جیسا کہ دلیل سے ثابت کیا گیا۔

اسباب کی حقیقت

یہ ایسا دھوکہ ہے جیسے کوئی شخص چوکیدار کو سرخ جھنڈی دکھاتے ہوتے اور اس سے ریل کو رُک جاتے ہوتے بارہا بلکہ علی الدوام دیکھ کر یہ سمجھ لے کہ سرخ جھنڈی میں خاصیت ہے ریل کو روک لینے کی

اور یہ ایسی زبردست چیز ہے کہ ریل جیسی زوردار چیز بھی اس کے سامنے کچھ نہیں تو کیا اس کا یہ سمجھنا صحیح ہے ہرگز نہیں بس یہی حالت ہے اسباب کی کہ انپر ترتب اثر کو دس بیس دفعہ دیکھ کر ان کے معتقد ہو گئے ہیں اور چونکہ وہ اسباب اپنے اختیار میں ہیں لہذا اس اثر کو بھی اپنے اختیار میں سمجھ لیا ہے اور یوں کہتے ہیں کہ ہم اس فعل کے فاعل ہیں اور ہم آگ بجھانے والے ہیں اور یہ خبر نہیں کہ ع کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں ؛ آپ کا اختیار صرف اسباب کو جمع کرنے تک ہے آگے اس کام کا ہو جانا دوسرے کے فعل و اختیار سے ہے چوکیدار کا کام صرف سرخ جھنڈی دکھا دینا ہے باقی ریل کا رکنا یہ اس وجہ سے کہ ڈرائیور نے اصطلاح مقرر کر رکھی ہے کہ جب چوکیدار سرخ جھنڈی دکھائے گا تو میں ریل کو اپنے ہاتھ سے اور اپنے اختیار سے روک لوں گا۔ سرخ جھنڈی ایسی زوردار چیز نہیں ہے جو ریل جیسی چیز کو روک دے اور آگے چلنے نہ دے بلکہ یہ زور ڈرائیور کے ارادے اور اختیار کا ہے حتی کہ اگر کسی وقت ڈرائیور غلطی سے یا شرارت سے نہ روکے تو سرخ جھنڈی تو کیا چیز ہے چوکیدار خود بھی سامنے آجائے تو ریل سے پستا ہوا چلا جائے گا۔ ریل کا روکنا اور چلانا یہ کام سب اس کے ہیں جو ریل کے اندر ہے ہم نے اس طرف نظر نہیں اٹھائی اور یہ سمجھ لیا کہ سرخ رنگ میں کچھ طاقت یا خاصیت ہے۔

اسی طرح دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اس ذات واحد کے تصرف و ارادہ سے ہوتا ہے جو ہر چیز کے خالق اور مالک ہیں اور دنیا والوں نے اپنی کوتاہ نظری سے اسباب میں اثر سمجھ لیا ہے

شعر
عشق من پیدا و معشوقم نہاں ۔۔۔ یار بیروں فتنۂ او در جہاں
ماہمہ شیراں ولے شیران علم ۔۔۔ حملہ شاں از باد باشد دمبدم
حملہ شاں پیدا و ناپیدا است باد ۔۔۔ آنکہ ناپیدا است ہرگز کم مباد

اس تقریر سے یہ سمجھ میں آگیا ہوگا کہ اسباب کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ حق تعالیٰ نے گویا یہ اصطلاح مقرر کر رکھی ہے کہ جب تم پانی ڈالو گے تو ہم اپنی قدرت مستقلہ سے آگ کو بجھا

دیں گے چنانچہ وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتے ہیں تمام اسباب کی یہی حقیقت ہے کہ حق تعالیٰ نے گویا ایک اصطلاح مقرر کر دی ہے کہ فلاں سبب کی مباشرت کیجائے گی تو فلاں چیز کا وجود یا فلاں چیز کا عدم مرتب کر دیا جائے گا ہم اس کو دیکھ کر سمجھ گئے کہ اس سبب میں یہ اثر ہے کہ اس سے وہ چیز موجود یا معدوم ہو جاتی ہے اس کا نام خاصیت رکھا ہے اور کہتے ہیں پانی میں خاصیت ہے آگ کے بجھانے کی اور آگ میں خاصیت ہے جلا دینے کی اور خاصیت کے معنی یہی لیے جاتے ہیں کہ ان میں ذاتی اثر ہے اس کی طرف کبھی توجہ نہیں ہوتی کہ ان میں ذاتی اثر کہاں سے آیا اگر اس اثر کو اسی حد تک رکھتے جتنا جھنڈی کا اثر ریل کے رک جانے میں سمجھتے ہیں تو مضائقہ نہ تھا کیونکہ اس نظیر میں جھنڈی کو فاعل یا مؤثر کوئی نہیں سمجھتا۔ پانی اور آگ کے بارہ میں اس کے خلاف عکس ہے کہ عام طور سے ذہنوں میں یہی بات بیٹھی ہوئی ہے کہ پانی میں آگ کو بجھا دینے کی خاصیت ہے اور جب یہ لفظ کہتے ہیں کہ پانی نے آگ کو بجھا دیا یا آگ نے فلاں چیز کو جلا دیا تو ذہن میں متبادر معنی یہی آتے ہیں کہ ان میں خاصیت اور اثر ذاتی ہی ہے اس کی طرف ذہن کم جاتا ہے کہ یہ کام کسی اور کے کرنے سے ہوتا ہے اگرچہ بحمد اللہ مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ کوئی کام بلا اذن حق تعالیٰ کے نہیں ہو سکتا۔

خوارق اور اسباب

اور یہی وجہ ہے کہ جب ان کے سامنے کسی خرق عادت کا ذکر ہوتا ہے تو ان کا انکار نہیں کرتے اور دل سے اقرار کر لیتے اور مان لیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ خدا کی بڑی قدرت ہے لیکن اب ایک جماعت مدعیان اسلام کی ایسی بھی موجود ہے جو زبان سے تو گو خدا کی قدرت کا اقرار کرتے ہیں مگر اسباب کے مؤثر ہونے کا خیال ان کے ذہنوں میں اس درجہ مرکوز ہے کہ یہ کہنا کچھ بیجا نہیں کہ وہ اسباب کو مؤثر بالذات مانتے ہیں اور اس درجہ میں ہرگز نہیں سمجھتے جس درجہ میں جھنڈی کو ریل کے رک جانے میں دخیل سمجھتے ہیں۔

اس خیال کا پتہ ان کے الفاظ سے اور برتاؤ سے چلتا ہے جھنڈی کے بارہ میں تو کبھی

یہ لفظ نہیں کہتے کہ اس نے ریل کو روک دیا اور اسباب کے بارہ میں یوں ہی کہتے ہیں فلاں نے یوں ترقی کی اور یوں عزت حاصل کی اسوقت اگر کوئی ان کے سامنے یوں کہدے کہ وہ کیا ترقی کرتا بلکہ اس کو خدا تعالیٰ نے ایسی ترقی اور ایسی عزت دی ہے گو زبان سے انکار تو نہ کریں گے کیونکہ آخر مسلمان ہیں اور خدا کو مانتے ہیں لیکن اس لفظ سے ان کو کچھ بشاشت نہ ہو گی بلکہ گونہ انقباض ہوگا اس کی وجہ کیا ہے سوائے اس کے کہ ان کی نظر اسباب پر ہے قدرت پر نہیں۔

اور اس کی نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ یہ لوگ خوارق و معجزاتِ انبیاءؑ کا بھی انکار کرنے لگتے ہیں اور ان میں ایسی بعید بعید تاویلیں کرتے ہیں جو سچ مچ تحریف ہے اسکی بنا سوا اس کے کیا ہوسکتی ہے کہ اسباب کے لئے مسببات کو لازم لاینفک مانتے ہیں۔ دنیا کے اسباب کی تاثیرات کو دیکھ کر حق تعالیٰ کی طرف خیال نہیں جاتا بلکہ اس طرف خیال جاتا ہے کہ اس سبب میں یہ خاصیت اور یہ اثر ہے میں پوچھتا ہوں کہ اگر آگ میں ذاتی خاصیت ہے جلا دینے کی تو اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کیوں نہ جلایا؟ اس وقت یہ خاصیت کہاں چلی گئی تھی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آگ اپنی ذات سے جلانے والی چیز نہیں ہے بلکہ جلانے والی چیز کوئی اور ہے اور آگ کا وجود صرف علامت ہے اس بات کی کہ اب وہ فاعل جلانے کا فعل کریگا جیسے کہ سرخ جھنڈی خود روکنے والی نہیں بلکہ سرخ جھنڈی کا دکھائی دینا علامت ہے اس بات کی کہ اب ڈرائیور ریل کو روک دیگا چنانچہ ادھر جھنڈی ہلی ادھر ریل رک گئی ایسے ہی ادھر آگ روشن ہوئی اور ادھر جلانے کا اثر ظاہر ہوا بس دیکھنے والوں نے سمجھ لیا کہ آگ میں خاصیت ہے جلا دینے کی حالانکہ جس طرح ریل کا رکنا ڈرائیور کے ارادہ سے ہوا ہے اسی طرح آگ سے جل جانا خالق نار کے ارادہ سے ہوا ہے۔

دوامِ ترتبِ تاثیر کی حقیقت

یہ دھوکہ دوامِ ترتبِ مسبب علی السبب سے ہوا ہے مگر یہ کوئی بات نہیں ہے

کیوں کہ دوامِ وجودِ شئی مع الشئی مستلزم صدورِ فعل عن غیر الفاعل کو نہیں ہے ایک شخص ایک مکان میں بیٹھ کر کوئی کام ہمیشہ کرتا ہو تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کام کی نسبت مکان کے دیواروں اور اینٹوں کی طرف کی جائے حالانکہ دوام یہاں بھی ہے جب تک وہ فعل ہوا ہے دیواریں اور اینٹیں برابر موجود رہی ہیں لیکن کسی بے وقوف سے بیوقوف کو بھی یہ خیال کبھی نہیں آتا کہ شاید یہ کام اینٹوں نے کیا ہو کیونکہ ان میں قابلیت ہی نہیں بلکہ کام کے بارہ میں جب خیال کیا جائے گا تو اسی طرف جائے گا کہ کسی فاعل مختار ذی ارادہ نے یہ کام کیا ہے چاہے کسی فاعل کا پتہ نہ چلے مگر یہ کوئی نہ کہے گا کہ ان اینٹوں نے یہ کام کیا ہے بہت سے بہت بعض دفعہ حیران ہو کر رہ جائے گا کہ معلوم نہیں کس نے کیا ہے غرض دوام سے دھوکہ نہ کھانا چاہئے اور خوب سمجھ لینا چاہئے کہ سب تصرفات اللہ تعالیٰ کے ہیں تمام تکوینیات موت و حیات صحت و مرض اور ان کے تمام اسباب جیسے گرمی سردی بارش وغیرہ سب کو حق تعالیٰ نے اپنے قبضہ میں رکھا ہے آپ کو صرف ترکیب و تحلیل کا اختیار دیا ہے جب آپ ترکیب یا تحلیل کرتے ہیں فوراً حق تعالیٰ اُس فعل کو موجود کر دیتے ہیں اُس وقت بس وہی مثال یاد کیجئے کہ جھنڈی والے کا اختیار صرف جھنڈی دکھا دینا ہے اور ریل کا رک جانا یہ اس کی طاقت سے نہیں ہے بلکہ جھنڈی دکھاتے ہی ریل کا چلانے والا اس کو روک دیتا ہے اور مجازاً کبھی رو کنے کی نسبت جھنڈی کی طرف کر دینا بھی درست ہے سو اسی طرح برائے نام اگر افعال کی نسبت اسباب کی طرف بھی کبھی کر دی جاوے تو مضائقہ نہیں مگر دل میں یہی ہونا چاہئے کہ سبب اصلی کوئی چیز نہیں یہ سب تصرفات اللہ تعالیٰ کے ہیں۔

تشریعیات میں حق تعالیٰ کا تصرف

یہ تو اس تصرف کا بیان ہوا جو حق تعالیٰ نے تکوینیات میں کیا ہے اب تشریعیات میں تصرف سنئے وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے تمام افعال کے متعلق جیسے نشست برخاست۔ اکل و شرب۔ بولنا چالنا۔ بات کرنا وغیرہ۔ غرض تمام افعال کے متعلق

احکام مقرر کئے ہیں آدمی کو چاہئے کہ ان تصرفات کو حق تعالیٰ کے سپرد کر دے اور ان میں بھی اس کو حاکم مطلق سمجھے کسی حکم میں وجہ نہ پوچھے جیسا کہ آجکل مذاق ہوگیا ہے کہ ہر حکم کی وجہ اور فلاسفی پوچھی جاتی ہے ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ نماز پانچوقت کیوں مقرر ہوئی ہیں میں نے کہا تمہاری ناک سامنے منہ پر کیوں لگی ہوئی ہے پیچھے گدی پر ہوتی کیا حرج تھا بس خاموش ہی تو ہو گئے اس جواب سے میری مراد یہ تھی کہ جب تم کو تکوینیات میں اور اپنی پیدائش میں کسی قسم کا دخل نہیں ہے جیسا خدا تعالیٰ نے بنا دیا بن گئے تو اُن کے احکام تشریعیہ میں دخل دینے کا کیونکر اختیار ہے؟

بعض لوگوں نے تکوینیات میں بھی کچھ وجوہات تراشے ہیں اس پر مجھکو یاد آیا کہ کسی سے پوچھا گیا کہ چیتا گلدار کیوں ہوتا ہے جو توحید کے قائل ہیں اور خدا تعالیٰ ہی کو متصرف مانتے ہیں ان سے تو ایسا سوال ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ سیدھا سا جواب دیدینگے کہ گلدار ہونے کی وجہ کیا ہوتی اللہ نے اسکو ایسا ہی بنانا چاہا بس ایسا ہی بن گیا اور عقل والوں نے جو ہر بات کی فلاسفی ڈھونڈا کرتے ہیں اس کی وجہ گھڑی وہ یہ کہ چیتوں کا جد امجد جسکی اولادیں یہ سب چیتے ہیں کسی وقت میں ایک کافی زمانہ تک ایسی جگہ بیٹھا کرتا تھا کہ کہیں سایہ تھا اور کہیں دھوپ یعنی کسی درخت کے نیچے اس سے یہ دو رنگی اور گل پیدا ہوگئے دھوپ کی جگہ سفیدی ہوگئی اور سایہ کی جگہ سیاہی خوب دل کو سمجھایا ان سے کوئی پوچھے کہ اگر گل اس سے پیدا ہوتے ہیں تو ایک کپڑے کو اسی طرح کہ اس پر کہیں سایہ ہو اور کہیں دھوپ اور دو برس تک اسی طرح رکھا رہنے دو۔ دیکھیں تو کیسے گل پیدا ہو جاویں گے اور دروغ گو را حافظہ نباشد ان کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ سایہ اور دھوپ تو متحرک چیزیں ہیں یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ جس جگہ ایک دفعہ دھوپ پڑی تھی اور جس جگہ پہلی دفعہ سایہ پڑا تھا ہمیشہ دونوں اسی جگہ پڑتے رہے دھوپ بھی سرکتی رہی اور سایہ بھی سرکتا رہا پھر اس صورت میں ایک جگہ سیاہی اور ایک جگہ سفیدی کہاں سے آئی کیونکہ دھوپ اور سایہ کو ایک جگہ قیام ہوا ہی نہیں جس سے سفیدی اور سیاہی کا استقام ہو۔ قیام اثر کے لئے سبب کا کچھ تو قیام چاہیے اور یہاں تو سبب ہر آن میں منتقل ہے۔

اگر یہ کہا جاوے کہ وہ چیتا بڑا ہوشیار تھا وہ بھی سایہ اور دھوپ کی حرکت کے ساتھ حرکت کرتا رہتا تھا روزانہ دھوپ اور سایہ میں ایک ہی دن کی طرح بیٹھتا تھا تو وہ چیتا کیا ہوا وہ تو بڑا ریاضی داں انجینیر ہوا۔ بات بنائی تو مگر بنتی نہیں افسوس ان تک بندیوں سے تو ان کا اطمینان ہو جاتا ہے اور دلیل سے نہیں ہوتا۔ مگر یہ تک بندیاں کہاں کہاں چلیں گی یہ ساری خرابی دین کو چھوڑنے سے پیدا ہوئی کہ ہر چیز کی وجہ تراشنی پڑتی ہے اس لئے چیتے کے گلدار ہونے کی وجہ گھڑنی پڑی ورنہ دیندار اور توحید کے ماننے والے کو سیدھا سا جواب ہر بات کا یہ کافی ہے کہ سب اللہ تعالیٰ نے بنا دیا۔ چیتا گلدار کیوں ہے اللہ تعالیٰ نے بنا دیا اور گھوڑا سفید یا سُرخ وغیرہ کیوں ہے اللہ تعالیٰ نے بنا دیا یا ہاتھی کالا کیوں ہے اللہ نے بنا دیا۔

اسی طرح تشریعیات میں بھی یہی جواب کافی ہے کہ پانچ نمازیں کیوں ہوئیں اللہ نے مقرر کر دیں اور چار رکعت کیوں ہوئیں۔ دو رکعت کیوں ہوئیں اور تین رکعت کیوں ہوئیں سب اللہ نے مقرر کر دی ہیں یہ ہے حقیقی جواب جو ہر جگہ چل سکتا ہے تکوینیات میں بھی تشریعیات میں بھی اور جو اس جواب کو چھوڑ کر دوسرے جواب اور وجوہ اور فلاسفی نکالتے ہیں وہ ہر جگہ ٹھوکریں کھاتے ہیں کہ چیتا تو دھوپ سایہ میں بیٹھا تھا اس لئے گلدار ہو گیا اور ہاتھی کالا شاید اس واسطے ہو گیا ہو کہ ساری عمر تیز دھوپ میں رہا ہو گا کھال جل کر کالی پڑ گئی اور گھوڑا سفید اس واسطے ہوا ہو گا کہ ساری عمر برف میں رہا ہو گا مگر بعض کالے بھی ہوتے ہیں وہ شاید کسی ایسے گھوڑے کی نسل میں ہوں گے جو دھوپ میں بندھا ہو گا لیکن یہ مشاہدہ کے خلاف ہے ایک ہی گھوڑی کے پیٹ سے ایک بچہ سفید رنگ پیدا ہوتا ہے اور ایک سیاہ رنگ پیدا ہو جاتا ہے تو یہ گھوڑی کب برف میں دبی تھی اور کب دھوپ میں بندھی تھی پھر لطف یہ ہے کہ اس گھوڑی پر تو برف کا یا دھوپ کا اثر ہوا نہیں یہ تو جیسی تھی ویسی ہی رہی ہے سفید تھی تو سفید ہی ہے اور سیاہ تھی تو سیاہ ہی ہے اور بچہ پر اثر ہو گیا یہ کیا خرافات ہے۔ نعوذ باللہ۔

فلاسفہ کی سوچ ، یہ آجکل کے فلاسفر ہیں ان کو تو یہ بھی خبر نہیں کہ فلسفہ کیا چیز ہے کس علم کا نام ہے اور اس کا موضوع کیا ہے اور ثبوت کیا چیز ہے اور اس کے لیئے کس قسم کی دلیلوں کی ضرورت ہوتی ہے ۔ آج کل کے فلسفہ کے دلائل قطعی تو کیا ظنی بھی نہیں ہوتے اور اقناعی بھی نہیں ہوتے ۔ دیکھ لیجئے یہ بھی کوئی دلیل ہے کہ جیتا اسواسطے گلدار ہوگیا کہ دھوپ چھاؤں میں بیٹھا تھا اسکو اقناعی بھی جب کہا جاتے کہ اس کے علاوہ کسی ایک مادہ میں تو اور چلے لیکن یہ تو ایک مادہ میں بھی نہیں چلتی بس یہ وجہ کچھ انہی کی سمجھ میں آتی ہوگی ۔ یہ آج کل کے فلاسفروں کے دماغ ہیں کہ فلاسفی تو دریافت کرتے ہیں ہر بات کی مگر جو وجہ خود گھڑتے ہیں وہ ایسی لچر ہوتی ہے کہ مدعا کو ایک مادہ میں بھی ثابت نہیں کر سکتی ۔ ہاں فلسفہ یونان کچھ کچھ فلسفہ کہلانے کا مستحق ہے گو ان کے جواب بھی اخیر میں جاکر آجکل کے فلاسفروں کے جواب سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے لیکن اتنا فرق ضرور ہے کہ آجکل کے فلاسفروں کا جواب ایک قدم بھی نہیں چلتا اور ان کا جواب دو چار قدم چل جاتا ہے گو اس کے بعد وہ بھی گر پڑتا ہے وہ ایسے موقعوں پر یوں کہتے ہیں کہ جیتا گلدار کیوں ہوا اور گھوڑا یا ہاتھی گلدار کیوں نہیں ہوا کہ جیتے میں مادہ اسی قسم کا تھا جس سے گل پیدا ہونے چاہئیں تھے لہذا مبدأ فیاض کی طرف سے اس پر یہ صورت فائض ہوئی کیونکہ مبدأ فیاض میں بخل نہیں اور ترجیح بلا مرجح ہو نہیں سکتی اس لیئے جو مادہ جس صورت کا مقتضی تھا مبدأ فیاض کی طرف سے وہی صورتیں فائض ہو گئیں ۔

یہ جواب آج کل کے فلاسفروں کے جواب سے کچھ چلتا ہوا معلوم ہوتا ہے انہوں نے مادہ اور اثرات کا سلسلہ ملا کر حساب تو پورا کر دیا گو وہ حساب بھی ایسا ہی ہے جیسے ایک منیب جی حساب جوڑ رہے تھے کہ چار اور چھ دس ۔ دس اور دو بارہ کے دو ہاتھ لگا ایک اور اسی طرح ہزاروں لاکھوں کی جمع کر رہے تھے اور بلا بار کہتے جاتے تھے ہاتھ لگے اتنے ہاتھ لگے اتنے ۔ ایک سائل کھڑا سن رہا تھا اس نے کہا منیب جی کچھ ہمیں بھی دلواؤ کہو گے جاؤ میرے پاس کچھ نہیں ہے

اس نے کہا ابھی میرے سامنے آپ کے ہاتھ میں تو بہت آچکے ہیں اور پھر آپ کہتے ہیں کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے انہوں نے کہا بھائی یہ تو کاغذی حساب کتاب اور زبانی جمع خرچ ہے اس میں کچھ ملتا تھوڑا ہی ہے بس جیسا کہ ان منیب جی نے گھنٹہ بھر مغز مارا مگر زبانی ہی دل خوش کرتے ہے کہ ہاتھ لگے اتنے اور ہاتھ لگا کچھ بھی نہیں اسی طرح ان یونانی فلاسفروں نے بھی مادہ اور اتنا کا سلسلہ ملا کر حساب پورا کر دیا لیکن ہاتھ کچھ بھی نہیں آیا سوائے اس کے کہ مغز خالی کیا اور تقریر کو طول دیا اور اخیر میں دیکھو تو ہاتھ خالی نتیجہ وہی سب ہے جو اس سائنس جدید کی تقریر کا تھا کہ چیتا گلدار اسواسطے ہے کہ دھوپ چھاؤں میں بیٹھا تھا جیسا یہ لغو ہے ایسے ہی یونانی فلاسفروں کی یہ تقریر بھی لغو ہے فقط اتنا فرق ہے کہ اس میں الفاظ بھی معمولی تھے اور اس میں ذرا معقولی اور اصطلاحی الفاظ ہیں اور یہ پہلے قدم پر گر پڑا تھا اور یہ ایک دو قدم چل کر گر پڑے درنہ حاصل دونوں کا ایک ہے کیونکہ انہوں نے کہا کہ چیتے میں کوئی مادہ ایسا تھا جس کی وجہ سے مبدأ فیاض کی طرف سے گلوں کی صورت فائض ہوئی اور یہ وجہ اس واسطے تراشی کہ ترجیح بلا مرجح لازم نہ آوے ان سے کوئی پوچھے کہ چیتے میں وہ مادہ کیوں آیا دوسرے جانوروں میں کیوں نہ آیا کہ مبدأ فیاض سے ان پر بھی گل فائض ہو جاتے یہ پھر ترجیح بلا مرجح ہو گئی اور جس الزام سے بچنے کے لئے وہ وجہ تراشی تھی وہ بجنسہ قائم رہا تو اس تقریر میں اور اس تقریر میں کیا فرق ہوا جیسے وہ بیکار تھی ایسے ہی یہ بھی بیکار ہے۔

اہل توحید کا فکر

اور ما شاء اللہ اہل توحید پر کوئی بھی اشکال نہیں پڑتا یہ شروع سے وہ وجہ بیان کرتے ہیں جو سب کو اخیر میں اختیار کرنی پڑتی ہے وہ یہ کہ خدا تعالیٰ نے ایسا کر دیا کوئی کتنی ہی لمبی چوڑی تقریریں کرے مگر اخیر میں اسی پر آنا پڑے گا چنانچہ یونانی فلاسفروں نے پہلے تو مادہ نکالا اور اس کی وجہ سے گلوں کی صورت کا کو مبدأ فیاض سے فائض مانا لیکن جب یہ سوال ہوا کہ وہ مادہ دوسرے جانوروں میں کیوں نہیں ہے اب اگر وہ اس کے لیے کوئی اور وجہ بھی تراشیں

تب بھی سوال بدستور رہیگا کہ وہ وجہ اور جانوروں میں کیوں نہیں پائی گئی اگر اس کے لیے بھی کوئی اور وجہ نکالیں اسپر بھی یہی سوال رہیگا اب یا تو کہیں یہ سلسلہ ختم کریں گے یا تسلسل لازم آئے گا تسلسل کو خود ہی محال مانتے ہیں لامحالہ ختم کرنا پڑے گا اور ختم کہیں پر ہو نہیں سکتا بدون اس کے کہ یوں کہا جاوے کہ اس مادہ کو یا اور کسی چیز کو جسکو وہ وجہ قرار دیتے ہوں خدا تعالیٰ نے چلتے ہیں پیدا کیا جس سے گل پیدا ہوئے اور اس کو کسی اور جانور میں پیدا نہیں کیا اور یہ وہی لفظ تو ہے جس کو اہلِ توحید نے کہا تھا اتنا فرق رہا کہ انہوں نے پہلے ہی کہدیا تھا اور انہوں نے جھک مار کر کہا تمام اشکالوں سے اگر بچنا ہے تو اسی جواب سے بچ سکتے ہیں جس کو اہلِ توحید نے اختیار کیا ہے اور رہی ترجیح بلا مرجح تو اسکا جواب یہ ہے کہ مرجح باری تعالیٰ کا ارادہ ہے اس کے سوا کوئی مرجح نہیں ہو سکتا اور جو کوئی کسی اور مرجح کی تلاش کرتا ہے اس کو پھیر پھیر کر کے اسی پر آنا پڑتا ہے جیساکہ بیان کیا گیا۔

اور اگر یہ سوال ہو کہ ارادہ ایک کے ساتھ کیوں ہوا اور دوسرے کے ساتھ کیوں نہیں ہوا تو اس کے دو جواب ہیں ایک تو یہ کہ یہ سوال صرف ہم سے کیوں ہے تم نے بھی تو ابتدا میں یا انتہا میں اسی کو اختیار کیا ہے جیسا ابھی بیان ہوا اگر ہمارے ذمہ اس کا جواب ہے تو تمہارے ذمہ بھی ہے اور دوسرا جواب یہ ہے کہ حق تعالیٰ فاعل مختار ہیں ان کے افعال اور ارادہ کیلئے کسی وجہ کی ضرورت نہیں وجہ ہر چیز کی ان کا ارادہ اور حکم ہے ان کے ارادہ اور حکم کے لیے کوئی وجہ نہیں اور حقیقت اس کی یہ ہے کہ ارادہ کی ذات میں یا اُس کے لوازم میں یہ داخل ہے کہ ترجیح ماشاء متی شاء اور ذات اور ذاتیات کے درمیان میں اسی طرح ملزوم ولوازم کے درمیان تخلل جعل کا نہیں ہوتا لہٰذا اس ترجیح کی علت دریافت کرنا عقلاً باطل ہے اور عامہ افہام کی موافق اسکو دوسری طرح سمجھو کہ چونکہ ہم نے فاعل مختار کی کوئی ایسی نظیر نہیں دیکھی جس کے ارادہ اور حکم کے لیے کوئی وجہ نہ ہو اس واسطے حضرت جنکو انہی چیزوں پر قیاس کر کے یہ سوال کیا جاتا ہے بیشک ہم نے جن کو دیکھا ہے وہ سب ایسے ہی ہیں جن کے افعال کیلئے وجہ ہوتی

ہے لہذا ہم نے یہی حکم فاعل مختار پر بھی جاری کر دیا اس کو قیاس الغائب علی الشاہد کہتے ہیں مگر یہ طریقہ ہی بالکل غلط ہے۔

یہ ایسا ہی ہے جیسے اُس بھولے بھالے شبان نے فرط محبت میں باری تعالیٰ کے واسطے ہاتھ پاؤں اور کپڑا اور بھوکا ہونا اور تھک جانا سب کچھ ثابت کیا تھا۔ اس قیاس الغائب علی الشاہد کو کسی عقلمند نے جائز نہیں رکھا دیکھو تمام دنیا اپنے افعال میں آلات کی محتاج ہے کوئی کام بلا آلات یعنی ہاتھ پیر وغیرہ کے نہیں ہو سکتا اور حق تعالیٰ کے لیے کوئی صاحب ملت یا عاقل اس بات کا قائل نہیں کہ وہاں بھی ہاتھ پیر اور آلات کی ضرورت ہے حالانکہ اس کی کوئی نظیر دوسری موجود نہیں مگر دلیل کی وجہ سے قائل ہونا پڑتا ہے عقول سافلہ سے یہ بات باہر ہے کہ بلا آلات کے کوئی کام کر سکے مگر ذاتِ باری تعالیٰ کے واسطے یہی ثابت ہے ورنہ احتیاج لازم آئے گی جو ذات واجب الوجود اور الوہیت کے خلاف ہے دیکھئے یہاں قیاس الغائب علی الشاہد کو منع کیا گیا۔

اسی طرح اس مسئلہ میں بھی سمجھو کہ گو اس کی کوئی نظیر موجود نہیں اور کوئی فرد کائنات میں سے ایسا نہیں جس کے افعال کے لیے وجہ کی ضرورت نہ ہو مگر اس حکم کو ذاتِ باری تعالیٰ تک مت پہنچاؤ اور ان کو کائنات پر مت قیاس کرو کیونکہ کائنات میں کوئی فاعل مختار مطلق نہیں ہے اور وہ فاعل مختار مطلق ہیں فاعل مختار مطلق کہتے ہی اُسکو ہیں جس کے فعل کے لیے کسی وجہ کی ضرورت نہ ہو۔ تمہاری سمجھ میں یہ مضمون پوری طرح اس لیے نہیں آتا کہ اس کی کوئی نظیر ہم نے نہیں دیکھی باقی مختار مطلق تو وہی ہے جو کسی بات سے بھی مجبور نہ ہو اور وہ صرف ایک ذات وحدہٗ لاشریک ہے اس کے افعال و احکام کے لیے وجہ کی ضرورت ماننا احتیاج کو ثابت کرنا ہے اور یہ الوہیت کے منافی ہے اس دلیل سے تو آلات کے احتیاج کی نفی کی گئی ہے۔ یہاں تک بقدر کفایت اس بات کا بیان ہوا کہ ارادہٗ باری تعالیٰ نے ایک جگہ ایک وصف کو کیوں ترجیح دی اور دوسری جگہ کیوں نہیں دی پہلا جواب الزامی تھا اور یہ تحقیقی ہے حاصل یہ کہ ارادہٗ باری تعالیٰ

کا خود مرجح ہے اب وہ اشکال نہ رہا کہ ترجیح بلا مرجح لازم آتی ہے پس اہل توحید پر کوئی اشکال نہیں پڑتا بلکہ فلاسفروں کا اعتراض ترجیح بلا مرجح کا انہیں پر لوٹ کر پڑتا ہے کیونکہ یہ کہہ کر انہوں نے ایک دفعہ تو دل کو سمجھا لیا کہ ایک جگہ میں مادہ ایسا موجود تھا جس میں خاص قابلیت تھی اسواسطے مبدأ فیاض نے اس صورت کو اس کے واسطے ترجیح دی اور دوسری جگہ یعنی کسی اور حیوان میں ایسا مادہ موجود نہ تھا اس واسطے یہ صورت اس پر فائض نہ ہوئی لیکن جب یہ پوچھا جائے کہ ایسا مادہ ایک ہی حیوان میں کیوں تھا دوسرے کسی حیوان میں کیوں نہ تھا کیونکہ وہ مادہ بھی تو از قسم ممکنات ہے جو مرجح کا محتاج ہے اب یہاں وہی سوال ان پر عائد ہوتا ہے کہ ذات واجب الوجود یا مبدأ فیاض نے اس مادہ کو ایک میں کیوں پیدا کیا اور دوسرے میں کیوں پیدا نہیں کیا یہ وہی ترجیح بلا مرجح کا سوال ہے غرض اس قسم کے اشکالوں سے سوائے اہل توحید کے کوئی بچ نہیں سکتا تاہم پرانے فلاسفروں نے کچھ وجہ گھڑ گھڑا کر حساب کی خانہ پری کر کے تو دکھلا دی گو ان کا حساب واقع میں ایسا ہی ہے جیسے منیب جی کہہ رہے تھے ہاتھ لگے اتنے اور ہاتھ لگا کچھ بھی نہیں تاہم پرانے فلاسفر ایک دو قدم چلے تو سہی اور آجکل کے فلاسفر تو ایک دو قدم بھی نہ چلے۔

اس چیتے کی مثال سے پتہ چلتا ہے کہ آجکل جو لوگ وجوہ تلاش کرتے ہیں ان کی عقلیں ایسی بھدی ہیں کہ ایسی مہمل باتیں ان کے ذہن میں آتی ہیں ان سے تو پرانے فلاسفر پھر غنیمت تھے۔ کہ کسی درجہ تک تو بات ڈھنگ کی کہہ سکتے تھے گو منزل مقصود تک ایک بات بھی نہیں پہنچتی تو دونوں کی مثال ایسی ہے جیسے دو گھوڑے ہیں ایک دس کوس چلنے کی طاقت رکھتا ہے اور ایک بیس کوس کی اور فرض کیا جائے کہ منزل سو کوس ہے تو اگرچہ بیس کوس کی طاقت رکھنے والا گھوڑا دس کوس والے سے دو چند طاقت رکھتا ہے مگر بے کار دونوں ہیں منزل مقصود تک ایک بھی نہیں پہنچا سکتا منزل مقصود تک پہنچانیوالی ریل ہی ہے تو کیا یہ عقل کی بات ہے کہ ان دونوں گھوڑوں میں سے کسی کو اختیار کیا جاوے کہ ایک دس کوس پر

چھوڑ دے گا دوسرا بیس کوس پر چھوڑ دیگا مقصود تک پہنچنا کسی سے بھی میسر نہ ہوگا لہذا شروع سے ریل ہی کو کیوں نہ اختیار کیا جائے دس کوس والا گھوڑا تو آج کل کا فلسفہ ہے اور بیس کوس والا فلسفہ یونان ہے وہ اس سے دو چند طاقت رکھتا ہے مگر منزل مقصود تک وہ بھی نہیں پہنچاتا اور ریل دین ہے یہ سو کوس بھی پہنچا سکتا ہے اور ہزار کوس بھی پہنچا سکتا ہے جو اس کو چھوڑ دیگا اُن میں کوئی تو دس کوس پر گر جائیگا اور کوئی بیس کوس پر گر جائے گا دیکھ لیجئے ایک ذرا سے پتے کے ہرا ہونے کے بارہ میں ایک فلسفی ایک ہی قدم پر چل کر رہ گئے دوسرے فلسفی نے ایک قدم رکھا کہ مادہ ثابت کیا اور دوسرے قدم پر گر گئے یہ سب خرابی عقل پر چلنے اور دین کو چھوڑنے سے ہوئی دین سیدھا منزل پر پہنچاتا ہے اور اول ہی سے یہ جواب سکھلاتا ہے کہ سب اللہ تعالیٰ نے بنایا اس کے سوا جو وجہ بھی کوئی تراشے گا وہ سب نہ چلنے والی اور بیکار ہوں گی۔

حق تعالیٰ اور بندے میں تعلق

اس طویل بیان سے آپ کی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ تکوینیات میں بھی کسی کو دخل نہیں جب تکوین کی یہ حالت ہے کہ اس کی وجہ تمہاری سمجھ میں نہیں آتی اور تم کو اس میں کچھ دخل نہیں تو تشریعیات میں کیوں دخل دیتے ہو؟ اس واسطے میں نے اس شخص سے کہا جس نے سوال کیا تھا کہ نمازیں پانچ کیوں مقرر ہوئیں کہ تیری ناک آگے کیوں لگی؟ جب اس کی وجہ عقل سے نہیں معلوم کر سکتے تو اس عقل کو تشریعیات میں کیوں دخل دیتے ہو۔ بس سمجھ لو کہ جیسے حق تعالیٰ کو تکوینیات میں ہر قسم کے تصرف کا حق حاصل ہے کوئی کام تکوینیات کے متعلق تم سے پوچھ کر نہیں کرتے اور جو کرتے ہیں وہی ٹھیک ہو جاتا ہے ایسے ہی تشریعیات میں بھی ہر قسم کے تصرف کا حق ہے کسی حکم میں تم سے پوچھنے اور رائے لینے کی ضرورت نہیں جو چاہیں حکم دیں اور جو حکم دیں وہی ٹھیک ہے۔ حضرت کچھ خدا ہی کو سستا پالیا ہے کہ اس کے متعلق سوالات کی ہمت کرتے ہو ذرا غور تو کیجئے کہ آپ کا ایک باورچی ہو اور آپ اسکو حکم دیں

کہ پچاس آدمی کا کھانا پکاؤ اور اسوقت پانچ آدمی موجود بھی نہ ہوں تو اس کو یہ خیال ہو سکتا ہے کہ آدمی تو پانچ بھی نہیں پچاس کا کھانا کیوں پکوایا جاتا ہے لیکن اس کی یہ مجال نہ ہوگی کہ آپ سے اس حکم کی علت دریافت کرے کہ اس میں کیا مصلحت ہے کھانے والے تو موجود ہیں نہیں پھر پچاس آدمیوں کا کھانا کیوں پکوایا جاتا ہے اگر وہ ایسا کرے گا تو آپ اس کو علت اور حکمت سمجھانے نہیں بیٹھیں گے بلکہ ایک دھول اس کے سر پر لگائیں گے کہ نالائق تیرا کیا منہ ہے وجہ پوچھنے کا ہم کسی کو کھلائیں یا کہیں بھیجیں یا فرض کرلو کہ ہم پھینک ہی دیں گے تو تیرے باوا کا کیا آتا ہے تو جس کام کا نوکر ہے وہ کر جب آپ کو اپنے ایک ہمجنس پر یہ اختیار ہے کہ بلا بیان علت کے آپ اسکو حکم دے سکتے ہیں اور اسپر آپ کی حکومت کا یہ اثر ہے کہ وہ علت نہیں پوچھ سکتا تو خداوند جل جلالہٗ کو کیوں بندوں پر ایسا اختیار نہیں حالانکہ ان کے اختیار میں اور آپ کے اختیار میں بڑا فرق ہے آپ اپنے باورچی کے مالک نہیں خالق نہیں آپ کو جو کچھ اسپر اختیار ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ آپ اسکو کچھ پیسے دیدیتے ہیں اور وہ بھی جب سے جب اس نے ان پیسوں کو لینا اپنی خوشی سے منظور ہی کر لیا ہو گویا اپنی زبان کی وجہ سے وہ خود مجبوری میں پڑ گیا ہے ورنہ اس سے پہلے آپ کو یہ بھی حق نہ تھا کہ اس کو نوکری پر مجبور کرتے اور حق تعالیٰ کو تم پر پورا اختیار حاصل ہے کیوں کہ وہ مالک ہیں اور خالق ہیں وہاں آپ کو خوشی کا سودا نہیں کہ اگر چاہیں ان کے پابند رہیں اور چاہیں نہ رہیں جیسے باورچی کو تھا کہ چاہے نوکری کرے اور چاہے نہ کرے اور چاہے کرنے کے بعد چھوڑ دے آپ ان کی پابندی اور طاعت سے کسی وقت باہر نہیں ہو سکتے نہ ابتداءً نہ انتہاءً کیونکہ ان کی پابندی اور طاعت آپ کی زبان دینے سے آپ کے ذمہ نہیں ہوئی بلکہ یہ جبر ہوئی ہے آپ ان کی مٹھی میں ہیں جسطرح چاہیں آپ کو رکھیں جب آپ کو باورچی کا علت دریافت کرنا اتنے سے اختیار کی بدولت جو آپ کو چار پیسے کی بدولت اس پر حاصل ہے ناگوار ہوتا ہے تو حق تعالیٰ کو آپکا

اُن کے احکام میں لِم پوچھنا باوجود ان اختیارات کاملہ کے جوان کو بوجہ خالق اور مالک ہونے کے حاصل ہیں کیوں ناگوار نہ ہوگا ذرا تو غور کیجئے اور ہوش سے کام لیجئے۔ صاحب مسلمان کا مذہب تو یہ ہونا چاہیے ؎

زباں تازہ کردن باقرار تو ۔ نہ انگیختن علت از کار تو،

اور یہ مذہب ہے مومن کا ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو ۔ جاں شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

ہر حال میں منقاد اور فرمانبردار رہے ان کے حکم کے سامنے آنکھ نہ اٹھا دے سر جھکا کر مان لے وجہ اور علت کیا چیز ہوتی ہے اور حکمت کس کو کہتے ہیں ان کا حکم ہی ہر چیز کی علت ہے اور وہی حکمت ہے اصل مذہب یہی ہے۔

نماز پنجگانہ کی حکمت

اور یوں تسکینِ خاطر کے لیئے دو چار علل اور حکمتیں سمجھ بھی لیں تو کیا ہوا کوئی علت تھوڑا ہی ہیں یا حکمت یقینہ تھوڑا ہی ہے۔ خدا جانے حقیقی حکمت کیا ہو ہمارا علم کیا اور فہم کیا مثلاً پانچ نمازوں کی وجہ کوئی یوں بیان کرے کہ صبح کو تفریح کا وقت ہوتا ہے خدا تعالیٰ کی نعمت ہے کہ رات بھر سلایا اور یہ وقت تفریح کا نصیب کیا لہذا اس کا شکریہ چاہیئے فجر کی نماز اس کا شکر ہے ظہر کو بھی یہی حالت ہے کہ دوپہر کو قیلولہ کیا آرام پایا دوپہر ختم ہونے کے بعد اس کا شکریہ چاہیئے یہ ظہر کی نماز ہے مغرب کے وقت دن ختم ہوتا ہے دن خیریت سے گذرا اس کا شکریہ چاہیے عصر کا وقت دونوں کے درمیان میں ہے یعنی ظہر اور مغرب کے دنیا کے اکثر کاموں کا وقت یہی ہے بازار اسی وقت لگتے ہیں۔ ممکن ہے کاروبار میں زیادہ مصروفیت ہو جاوے اور خداوند تعالیٰ کی طرف سے ذہول ہو جاوے اس واسطے بیچ میں ایک مختصر سی عصر کی نماز بھی رکھی گئی کہ بندہ کی یاد کا امتحان ہے رات کو سونے کے وقت تمام کام ختم ہو جاتے ہیں دن بھر خیر و عافیت سے گذرا کھایا پیا سارے کام انجام کو پہنچے اب اخیر وقت ہے

نیند مثل موت کے ہے خدا جانے سونے کے بعد اٹھنا نصیب ہوگا یا نہیں اسواسطے ضرور ہوا کہ خدا کا نام لیکر سوئیں یہ عشا کی نماز ہے پانچوں نمازوں کی حکمتیں ہوگئیں یہ حکمتیں کتابوں میں لکھی بھی ہیں اور تقریب الی الفہم کے لیے کچھ نہ کچھ مفید بھی ہیں اور اسی غرض سے علماً نے کتابوں میں لکھی بھی ہیں مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پانچوں نمازوں کی بنا ایسی حکمتوں پر ہے باین معنی کہ اگر یہ حکمتیں کسی دوسری طرح بھی حاصل ہو جاویں تو نماز کی ضرورت نہ رہیگی بلکہ مطلب یہ ہے کہ احکام الٰہی بسر و چشم منظور ہیں اور اصل بنا انکی امرِ خداوندی پر ہے لیکن ان میں یہ فائدے بھی ہیں

بنائے احکام اور مصلحت

اس کی مثال یہ ہے کہ ہم کو بازار جانا ہے گیہوں لینے کے لیے اور گیہوں کی ہم کو ضرورت ہے کیونکہ بقائے حیات اسی پر موقوف ہے لیکن جانے میں یہ بھی فائدہ نکل آیا کہ چہل قدمی بھی ہوگئی اور کھانا ہضم ہوگیا اب اگر کوئی یہ سمجھ لے کہ بازار جانے کی بنا چہل قدمی اور کھانا ہضم کرنا ہی ہے اور یہ بات بجائے بازار کے جنگل کی طرف جانے میں بھی حاصل ہو سکتی ہے لہذا بازار کو نہ جایا کرے اور جنگل ہو آیا کرے تو فرمائیے کیا یہ خیال اس کا صحیح ہے اور اس صورت میں بغیر روٹی کے کیسے زندہ رہے گا ہمارے بھائیوں نے یہی کیا ہے کہ احکام الٰہی کی اُن مصلحتوں کو جو اُن میں تبعاً و ضمناً آگئی ہیں اصل اور بنا قرار دے لیا ہے لیکن سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اسی طرح غلطی پر ہیں جیسے بازار کو چھوڑ کر جنگل کو چہل قدمی کے لیے جانیوالا کہ اس صورت میں چہل قدمی تو واقعی ہو جائے گی لیکن اناج ہاتھ نہیں آئیگا اور بھوکوں مرجائے گا کتابوں میں جو مصلحتیں احکام الٰہی کی لکھی ہیں وہ ضمنی ہیں ان کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ انہی کی وجہ سے وہ احکام مقرر ہوئے ہیں نہ کسی کتاب میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے اسی واسطے کتابوں میں حکمتوں کے بیان کے ساتھ یہ لفظ بھی لکھے جاتے ہیں واللہ اعلم جس کا مطلب ہے کہ

ذرا وہ اس میں تو زبان چلا دے کہ صبح کی رکعتیں دو کیوں ہیں اور مغرب کو تین کیوں ہیں کہاں تک ذہانت سے کام لے گا اگر یہاں بھی کوئی وجہ گھڑ دی تو ہم آگے چلیں گے کہ زکوٰۃ میں چالیسواں حصہ کیوں لیا ہے اور دوسو درہم کا نصاب کیوں مقرر ہوا اس سے کمی بیشی میں کیا مضرت اور کیا نقصان تھا۔ اور آگے چلئے حج ذیحجہ میں کیوں مقرر ہوا شوال یا ذیقعدہ یا اور کسی مہینے میں کیوں نہیں رکھا گیا اور مکہ ہی میں کیوں ہوتا ہے بمبئی کلکتہ وغیرہ میں کیوں نہیں ہو جاتا؟ کم از کم اتنا تو ہوتا کہ جن کے پاس روپیہ کم ہے یا سفر زیادہ نہیں کر سکتے وہ تو بمبئی وغیرہ جا کر کر لیا کرتے۔

یہاں بیچ میں ایک لطیفہ یاد آ گیا مجھ سے ایک شخص نے پوچھا کہ گاؤں میں جمعہ کیوں نہیں ہوتا میں نے کہا بمبئی میں حج کیوں نہیں ہوتا بس اب بالکل خاموش ہو گئے۔ غرض کہاں تک ہر حکم کی علت چھانٹی جائے گی ہر جگہ رائے نہیں چلتی اور عقل سے کوئی ایسی وجہ نہیں نکل سکتی جو یقینی ہو بس اس سے زیادہ کوئی بات نہیں پیدا ہوتی کہ گونہ تقریب الی الفہم ہو جاتا ہے اور اخیر میں یہی کہنا پڑتا ہے کہ اصل وجہ تو معلوم نہیں ہاں ظاہر میں ایک حکمت یہ سمجھ میں آتی ہے اس لفظ کو پہلے ہی سے کیوں نہ کہدو عقل احکام الٰہی میں کہاں تک چل سکتی ہے اسی واسطے کہتے ہیں ؎

آزمودم عقل دور اندیش را
بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

مغیبات اور عقل نارسا

حقیقت میں عقل بہت محدود چیز ہے اور مخلوق ہے وہ خالق کے اسرار میں کیسے حکم کر سکتی ہے ان حضرات نے عقل کی ماہیت کو خوب سمجھ لیا۔ اسی واسطے اُس کو چھوڑا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ عقل نکمی چیز ہے اور سب اس کو چھوڑ کر بے عقل اور پاگل دیوانے بنجاویں۔ یہ تعلیم کسی نے نہیں دی بلکہ مطلب یہ ہے کہ احکام الٰہی کے دریافت کرنے میں عقل کافی نہیں عقل کی رفتار اور رسائی محدود ہے جہاں تک اس کی رسائی ہے وہاں تک بڑے کام کی چیز ہے اس سے ضرور کام لینا چاہئے

اور جہاں اس کی رسائی نہیں ہے وہاں اس کے بھروسہ رہنا غلطی ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک پہاڑ کی اونچی چڑھائی ہے اور چوٹی تک چڑھنا ہے ایک شخص نے تو یہ کیا کہ گھوڑے کو گھر ہی سے چھوڑ دیا اس خیال سے کہ آخر چھوڑنا پڑے ہی گا لہٰذا پہلے ہی سے الگ کیا اور پیدل چلنا شروع کیا پیروں میں چھالے پڑ گئے اور دامن کوہ تک بھی پہنچنا مشکل ہو گیا اور چڑھائی ساری باقی رہ گئی یہ بھی حماقت ہے اور ایک ایسے زور میں آئے کہ چوٹی تک گھوڑے ہی پر جانا چاہتے ہیں زور سے جو گھوڑا مارا تو بس اڑائے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ بالکل کھڑی چڑھائی پر بھی دوڑائے چلے جاتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گھوڑا کھڑی چڑھائی سے رپٹا اور یہ حضرت کسی کھڈ میں گر پڑے اور دنیا و دین دونوں سے گئے اور ایک تیسرا شخص وہ ہے کہ دامن کوہ تک تو گھوڑا کو لے گیا اور جب کھڑی چڑھائی شروع ہوئی تو وہاں گھوڑے کو چھوڑ دیا اور پیدل ہو لیا اس کا طریقہ بالکل صحیح ہے نہ اس نے گھوڑے کو بالکل بیکار سمجھا جس سے پیر ٹوٹتے اور نہ ایسا کار آمد سمجھا کہ کھڑی چڑھائی پر بھی لیجاتا اور کھڈ میں گرتا یہ شخص منزل مقصود پر پہنچے گا اور بے خطر پہنچیگا سمجھ لیجئے کہ غیبیات پہاڑ کی چوٹی کی مانند ہیں اور عقل گھوڑا ہے اس گھوڑے سے چوٹی پر چڑھنے کا کام مت لو ورنہ کھڈ میں گرو گے جہاں تک اس کی رسائی ہے یعنی کھڑی چڑھائی سے نیچے نیچے وہیں تک اس سے کام لو اور ضرور لو ورنہ تھک جاؤ گے اور پیروں کو تکلیف ہوگی۔

حاصل یہ ہے کہ عقل نہ تو بیکار چیز ہے کہ اس کو بالکل چھوڑ دیا جائے اور نہ اتنی کام کی ہے کہ ہر جگہ اس سے کام لیا جائے اسکو یاد کر لیجئے یہ بالکل صحیح فیصلہ ہے۔

عقل سے کام لینے کا صحیح طریقہ

عقل سے معاش میں کام لیجئے اور دین کے بارہ میں بھی اتنا کام لیجئے کہ یہ بات عقل سے معلوم کر لیا کیجئے کہ یہ بات دین کی ہے یا نہیں جب یہ معلوم ہو جائے کہ یہ بات دین کی ہے تو عقل کو وہیں سے رخصت کر دیجئے یہ دامن کوہ ہے عقل کے گھوڑے نے آپکو یہاں تک پہنچا دیا

اب چڑھائی شروع ہوتی ہے اس گھوڑے کی دوڑ ختم ہو چکی اب اس کو چھوڑیئے اور پیروں سے چلئے ورنہ کھڈ میں گرے گا۔

لیکن آج کل لوگوں نے عقل کو ایسا سمجھا ہے کہ بس جو کچھ ہے عقل ہی ہے اور یہ سمجھتے ہیں کہ عقل ایسی چیز ہے کہ کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں اس کی رسائی نہ ہو حالانکہ غور کرکے دیکھیں تو معلوم ہو جاوے گا کہ اس کی دوڑ تو بہت تھوڑی ہے ان باتوں میں بھی اس کی رسائی نہیں جو بہت ہی معمولی ہیں اور روزمرہ ہماری نظروں کے سامنے موجود ہیں مگر غور کرنے کی عادت ہم لوگوں نے چھوڑ دی ہے ورنہ بخوبی سمجھ میں آجاتے کہ ہر روز کے معتاد کارخانے بھی عقل میں نہیں آتے مثلاً دانہ کی کاشت کہ یہ اپنے ہاتھوں سے کرتے ہیں اور اپنی نظروں سے اس کا درخت دیکھ لیتے ہیں اور اس کو کاٹ بھی لیتے ہیں اور دانہ بھی نکال لیتے ہیں اور کھا بھی لیتے ہیں یہ روزمرہ کا حکم ہے اسی پر دنیا کی بسر ہے اور ایسا موٹا کام ہے جسے گنوار لوگ کرتے ہیں جو بالکل بے عقل اور وحشی ہوتے ہیں اور ہم ان کو عوام کالانعام یعنی جانوروں کے مانند سمجھتے ہیں ایسے لوگوں کے ہاتھوں یہ کام ہوتا ہے لیکن کبھی غور تو کیا ہوتا کہ دانہ جب ہم نے زمین میں ڈالا تو وہ پھوٹتا ہے اس عقل سے ذرا یہاں تو کام لیجئے اور پوچھئے کہ اس کو کس نے پھوڑا معلوم ہو جائے گا کہ عقل کی رسائی کہاں تک ہے اتنی سی بات تک بھی رسائی نہیں ہے جو لوگ عقل کے پیرو ہیں وہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ مادہ میں طبیعت نوعیہ نے یہ کام کیا ہے کہ دانہ کو پھوڑا اور اب اس میں سے شاخیں اور پتے اور پھول نکالیگی اور دانے بنائے گی۔

عجائباتِ قدرت

میں کہتا ہوں کہ انہوں نے طبیعتِ نوعیہ کے لفظ سے دل کو سمجھا تو لیا مگر ذرا یہ تو دیکھا ہوتا کہ یہ سب کام کسقدر باریک ہیں دانہ پھوٹتا ہے تو اس کا پھوٹنا ایسا نہیں ہے جیسے ایک پتھر مار دیا کہ کچل کر پھٹ گیا بلکہ ایک قاعدہ کے ساتھ ہے جس کو پھوٹنا نہ کہیے بلکہ کھل جانا کہیے کہ نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ اس کا منہ کھلا یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اندر بیٹھا ہوا ایک انداز سے

اور ناپ کے ساتھ اور اتنے ہی مقدار سے کھوتا ہے۔ جس سے اس کے اندر سے ایک شاخ نکل آوے۔ اب شاخ نکلتی ہے تو اس کو دیکھئے کہ کس آتار چڑھاؤ کی ہے رنگ اس کا کیسا ہے کہیں بدرنگی نہیں کہیں دھبہ نہیں پڑا زردی اور سبزی ہے تو نہایت مناسب کہ آنکھوں کو اچھی معلوم ہوتی ہے۔ اس میں سے پتیاں نکلتی ہیں تو کس قدر باقاعدہ ان کی نوک پلک کیسی درست ہوتی ہے ہر درخت کی پتی علیحدہ۔ رنگت علیحدہ ذائقہ علیحدہ بوباس علیحدہ۔ صورت علیحدہ شکل علیحدہ بعض پتیاں ایسی باریک ہوتی ہیں کہ ان کو شمار کرنا بھی مشکل ہے مگر ان کو ایک ایک کو دیکھ لیجیے کہ بنانے والے کا کہیں ہاتھ نہیں چوکا کوئی پتی چھوٹی بڑی نہیں ہوئی رنگ کسی کا خراب نہیں ہوا ذائقہ کسی کا نہیں بدلا خاصیت کسی کی نہیں بدلی موٹے پتلے ہونے میں فرق نہیں ہوا اگر پچاس پودے ایک قسم کے ہیں تو سب کی پتیاں یکساں ہیں بنانے والا بناتے بناتے تھکا بھی نہیں۔ نوک پلک صورت شکل کو بھولا بھی نہیں۔ کس قدر عجیب کام ہے۔

پھر آگے چل کر پھول کو لیجیے شاخ کیسی تھی پتیاں کیسی تھیں پھول ان میں سے کیسا نکلا نہ ٹہنی اور پتی کی سی رنگت ہے نہ ویسی بو ہے بعض نباتات کی شاخ اور پتیوں میں بدبو اور ذائقہ میں تلخی ہوتی ہے لیکن ان میں جو پھول نکلتا ہے تو کیا کہا جاتے بس سبحان اللہ رنگت ایسی کہ اس کو دیکھا کیجیے خوشبو ایسی کہ سونگھا کیجیے

غرض پھول ایک علیحدہ چیز پیدا ہوئی ٹہنی میں نہ یہ رنگ تھا نہ یہ خوشبو تھی نہ یہ صورت تھی نہ یہ شکل تھی خدا جانے ایسی چیز میں سے ایسی خوشرنگ اور خوشبودار چیز کیسے نکل آئی اور یہ اس کے اندر کہاں رکھی ہوئی تھی اور کس طرح رکھی ہوئی تھی ٹہنی اور پتیاں سبز رنگ تھیں اور ان میں رطوبت اور تری بھی تھی یہ چیز لپٹی لپٹائی اس کے اندر رکھی رہی اس پر ہری چیز کے اندر سرخ رنگ کیسے چڑھ گیا اور اس ہری چیز کی سبزی کا ایک دھبہ بھی اس پر نہ آیا۔ کس قدر حیرت کی بات ہے۔

اب آگے چل کر لیجیے اس میں بھی ہزاروں باریکیاں اور صنعتیں ہیں۔

عقل پرستوں کی بے عقلی

کہاں تک بیان کروں اور کوئی ضرورت بھی بیان کی نہیں ہے یہ وہ کام ہیں جو ہم روز اپنے ہاتھوں میں ہوتے ہیں اور ہر وقت نظروں سے گذرتے ہیں مقصود میرا یہ ہے کہ یہ کس کے کام ہیں ان کا فاعل کس کو قرار دیا ہے طبیعت نوعیہ کو جس کی صفت خود ہی بیان کرتے ہیں کہ وہ غیر ذی شعور ہے یعنی اس میں کسی قسم کا حس اور سمجھ نہیں ہے حیرت کی بات ہے کہ ایک غیر ذی شعور چیز ایسا کام کرے جو کسی ذی شعور سے بھی نہ ہو سکے تمام دنیا کے ذی شعور اگر جمع ہو کر ایک پتی گھانس کی بھی بنانا چاہیں تو ہرگز نہیں بنا سکتے پھر کیا یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جو کام ذی شعور اور بڑے بڑے حکما اور عقلا اور کاریگروں سے نہ ہو سکے وہ ایک غیر ذی شعور چیز کر دے یہ تو ایسا ہوا جیسے کہیں کہ ریل کو کون چلاتا ہے ایک مٹی کا ڈھیلا جو ریل کی سڑک پر پڑا رہتا ہے کیونکہ طبیعت نوعیہ بھی غیر ذی شعور بلفظ دیگر جماد ہے ایسے ہی ڈھیلا بھی جماد ہے جب طبیعت نوعیہ سے ایسے باریک کام ہو سکتے ہیں تو ایک ڈھیلے سے ریل کے چلانے کا کام کیوں نہیں ہو سکتا جس کی عقل ایسی بھدی بات تسلیم کر لے وہ جانے ہماری سمجھ میں تو یہ بات آتی نہیں۔

یہ ایسا ہے جیسے کہیں کہ یہ گھڑی کس نے بنائی ہے ایک بے شعور جانور چیز نے۔ سبحان اللہ کون سی طبیعت ایسی ہے جو اس بات کو مان لیگی کہ بے شعور چیز نے گھڑی بنائی ہے واقعہ تو یہ ہے کہ ہم لوگوں نے گھڑی کے بنانیوالے کو دیکھا بھی نہیں اس جگہ کو بھی نہیں جانتے جہاں وہ رہتا ہے لیکن گھڑی کے کیل پرزوں اور اس کی ساخت کو دیکھ کر بیساختہ دل کہتا ہے کہ جس نے یہ گھڑی بنائی ہے بڑا صانع اور بڑا سمجھ دار اور بڑا سائنسداں اور بڑا تجربہ کار ہے کہ ہر چیز ایسے تناسب کے ساتھ رکھی ہے کہ اس میں حرکت پیدا ہو گئی اور وقت بتلانے لگی اگر دنیا بھی ایک طرف ہو کر یوں کہے کہ اس گھڑی کو ایک جانور یا پتھر نے بنایا ہے تو دل اس کو ہرگز قبول نہیں کرے گا حیرت اور صد حیرت ہے کہ ایک گھڑی تو بے شعور چیز سے نہ بن سکے اور اتنے

لے جوڑے ہزاروں اور لاکھوں درخت جن میں اسقدر باریک کام ہیں جن کا احاطہ بھی عقل اب تک نہیں کر سکی وہ بے شعور چیز سے بن جاویں۔

پھر حافظہ اس کا ایسا صحیح ہے کہ دانے کو پھوڑتا ہے تو اوپر ہی کو نکلتا ہے ادھر اُدھر کو جھکا ہوا اور ٹیڑھا نہیں نکلتا۔ دانہ مٹی کے اندر دبایا گیا تھا پھر اس میں سے ذرا سی سبز شاخ زمین کو توڑ کر نکلی جس کی ضعف کی حالت یہ ہے کہ اگر اس کو ہم اپنے ہاتھ میں لیکر زمین میں چبھوئیں تو وہ زمین میں گڑ نہیں سکتی کیونکہ نہایت نرم و نازک ہے حالانکہ اس وقت ہمارے ہاتھ کی طاقت بھی اس کے چبھونے میں شریک ہے مگر اس پر بھی وہ مٹی کو نہیں توڑ سکتی خدا جانے اس نے دانہ میں سے نکلتے وقت زمین کو کیسے توڑا کیا یہ بات عجیب نہیں ہے جو کوئی عقل سے کام لے اور غور کرے وہ تو حیرت میں رہ جاتا ہے۔

پھر یہ کہ وہ جسم ثقیل ہے اس کا میلان تو مرکز کی طرف ہونا چاہیے یعنی نیچے کو یہ اوپر کو نکلنا کیسا؟ آپ اسکو توڑ کر اپنے ہاتھ میں لے لیجیے پھر کوشش کیجیے کہ اوپر کو جائے دیکھیں کیسے جاتا ہے اب تو اوپر کو جانا کیسا وہ ایک جگہ ٹھہرے گا بھی نہیں جب چھوٹے گا نیچے ہی کو جائے گا کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ ایسا جسم جو طالب مرکز ہے اوپر کو چلا جاتا ہے اور کس قوت کے ساتھ کہ درخت کا تنا ذرا موٹا ہو جائے پھر اس کو کوئی اوپر کو جانے سے روک تو لے یہ سب باتیں کسقدر حیرت انگیز ہیں اور ایک اوپر کو میلان کیا اور طرح طرح کی صنعتیں ہیں جو فہم سے بالکل باہر ہیں یہ نباتات کی حالت ہے جسمیں عقل حیران ہے کیسے مانا جا سکتا ہے کہ یہ کام طبیعت نوعیہ کے ہیں ایک گھاس کی پتی کے بننے میں بھی یہ بات قابل تسلیم نہیں کہ اس کو طبیعت نوعیہ نے بنایا ہے۔

غضب ہے کہ عقل پرستوں نے تمام دنیا کے کاروبار کو طبیعت نوعیہ کے سپرد کر دیا ہے انسان جس طرح پیدا ہوتا ہے کیا سمجھ میں آتا ہے کہ کیسے بن جاتا ہے یہاں بھی عقلاء زمانہ نے یہی کہہ دیا ہے کہ رحم کی قوت طبیعہ بچے کو بناتی ہے اور اسی سے اس کا گوشت پوست

بڑی سب بنجاتی ہے اور اس سے اس میں جان پڑجاتی ہے اور جب اس کی خلقت پوری ہو جاتی ہے تو اسی کے اثر سے بچہ باہر آجاتا ہے میں کہتا ہوں کہ یہ صرف دل کو سمجھا لینے کی باتیں ہیں

تکرارِ مشاہدے کا اثر:

دراصل اس کی صرف اتنی ہے کہ دن رات پیدائشیں دیکھنے اور سننے سے استبعاد رفع ہو گیا ہے اور اس کو ایک معمولی کام سمجھ لیا گیا ہے اگر یہ کام اس کثرت سے نہ ہوتا اور کہیں سے اتفاقیہ ایک واقعہ ایسا سنا ہوتا کہ کسی عورت کے پیٹ میں سے جیتا جاگتا بچہ پیدا ہوا ہے تو آپ ہی مارے تعجب کے انکار کر دیتے میں دعوی کرتا ہوں کہ ایک بچہ کی جس وقت سے وہ ہوش سنبھالے اس بات کی پوری نگرانی کرو کہ ولادت کا طریقہ کبھی اس کے کان میں نہ پڑنے پاوے یہاں تک کہ وہ بڑا ہو جاتے اور تمام علوم و فنون اور صنعت و حرفت اور سائنس کی تعلیم پالے اور کالج کا پروفیسر بھی ہو جاتے اسوقت اس سے ایک دن یوں کہو کہ ایک بات عجیب سنی ہے کہ ایک عورت کے بچہ اس طرح پیدا ہوا تو میں دعوی کے ساتھ کہتا ہوں کہ وہ اس کے جواب میں فوراً یہی کہے گا کہ یہ بات عقل کے خلاف ہے اور ایسا ہونا ناممکن ہے۔

اور واقعی یہ بات دراصل ہے ہی عقل سے باہر لوگوں کی عقلیں دیکھتے دیکھتے عادی ہو گئیں ہیں اور جس چیز کا بار بار مشاہدہ ہو جاتا ہے اس سے استبعاد جاتا رہتا ہے سمجھ میں تو نباتات کی بھی پیدائش نہیں آتی تھی مگر بار بار دیکھنے سے استبعاد رفع ہو گیا۔ اب یہ انسان کی پیدائش اس سے بھی عجیب ہے جس میں ان تمام صنعتوں کے ساتھ جو کہ نباتات میں تھیں یعنی نوک پلک رنگ روغن صورت شکل نشو ونما وغیرہ وغیرہ ایک صفت متحرک بالارادہ ہونا یعنی جاندار ہونے کی بھی موجود ہے جو ان سے بدرجہا بڑھی ہوئی اور حیرت انگیز ہے اور نرا متحرک بالارادہ بھی نہیں بلکہ عاقل اور سمجھ دار اور سمیع اور بصیر ہونا بھی ہے جسکی وجہ سے انسان تمام متحرک بالارادہ چیزوں (حیوانوں) سے بھی ممتاز ہے۔ نباتات ہی کی صنعتیں حیرت میں ڈال دیتی ہیں چہ جائیکہ اس میں ارادہ پورا ہونا اور ارادہ کے ساتھ عقل و فہم ادراک کلیات و جزئیات فلسفہ کی

کتابوں میں حواس کی بحث دیکھئے۔ عقلا حیران ہو گئے ہیں اور یہ کہہ اٹھے ہیں کہ ان کی ماہیت اور کیفیت معلوم نہیں سوائے اس کے کہ یہ حواس انسان میں موجود ہیں جن چیزوں کی ماہیت عقلاً کی بھی سمجھ میں نہ آوے ان کی نسبت یوں کہنا کہ ان کو بے عقل اور بے ارادہ والی چیز نے پیدا کیا ہے ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح صحیح ہے یہ روزمرہ کے کارخانے ہیں جن کو برابر دیکھتے ہیں یہ بھی ہماری سمجھ سے باہر ہیں عقل اتنی بھی کام کی نہیں جو ان کو بھی سمجھ لے۔

قوتِ عقل کی حد

اس سے معلوم ہوا کہ عقل کی طاقت بہت محدود ہے تو صحیح طریقہ یہی ہوگا کہ اس کی طاقت کو محدود سمجھا جائے اور جہاں تک اس سے کام لینا چاہئے وہیں تک کام لیا جائے اس کی طاقت کی حد یہ ہے کہ احکام الٰہی کو سمجھ لے اور اسکی تعمیل کرے اور یہ اس کی طاقت سے باہر ہے کہ ان کی لم کو سمجھ لے جیسا کہ تکوینیات میں بھی عقل کو اتنا ہی دخل ہے کہ اسباب کو سمجھ کر ان کو استعمال کرتا ہے جس سے اسپر نتائج مترتب ہو جاتے ہیں اور اگر انکی لم دریافت کرنے کو چلے تو ایک قدم بھی نہیں چل سکتی اور نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اسباب کے استعمال سے بھی رہ جاتے اور مسببات سے منتفع نہ ہو سکے اس طرح دنیا کا کوئی مقصود بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً آگ سے کھانا پکتا ہے تو اتنا دخل تو عقل کو ہے کہ آگ جلانے کی ترکیب کو سمجھے اور اس کے موافق عمل کرے اس سے کھانا پک جائے گا اور مقصود حاصل ہو جائے گا اور اگر اس میں دخل دے کہ اس کی لم کیا ہے اور آگ سے کھانا کیوں پک جاتا ہے اور یوں چاہے کہ جب تک لم معلوم نہ ہوگی اس وقت تک آگ کا استعمال نہ کروں گا تو اس لم کے دریافت کرنے میں سارا وقت بلکہ ساری عمر ختم ہو جائے گی اور لم معلوم نہ ہو سکے گی اور جو مقصود ہے یعنی کھانا تیار ہونا وہ کبھی حاصل نہ ہوگا۔

غرض عقل کو اس کی حد تک رکھنے کی ضرورت ہے تو ثابت ہوا کہ عقل بیکار چیز تو نہیں ہے اس سے کام لینا چاہئے مگر جب تکوینیات میں اس کی یہ حالت ہے کہ ایک حد تک

کام دے سکتی ہے اور اس سے آگے کام نہیں دے سکتی تو تشریعیات ہیں اس کی طاقت غیر محدود کیسے ہوگی تو صحیح طریقہ یہی ٹھہرا کہ تشریعیات میں بھی اسکو ایک حد تک تو خاص دخل دیتے دو اور اس سے آگے معطل سمجھو وہ حد یہی ہے کہ احکام شرعی کو سمجھو کہ کس طرح ادا ہو سکتے ہیں اور اس کے موافق ادا کرو پھر اس نتیجہ کے منتظر رہو جو اس پر موعود ہے حق تعالیٰ اس نتیجہ کو ضرور مرتب کریں گے جیسے تمہارے آگ جلانے اور ہانڈی چولہے پر رکھ دینے پر نتیجہ مرتب کر دیتے ہیں کہ کھانا پک جاتا ہے نہ آپ کو آگ کے گرم ہونیکی اور اس سے کھانا پک جانے کی لِم دریافت کرنے کی ضرورت ہے اور نہ احکام الٰہی میں علت نکالنے اور مصالح دریافت کرنے کی حاجت ہے اور اگر علت چھانٹو گے تو ان مقاصد سے ایسے ہی رہ جاؤ گے جیسے آگ کے گرم ہونے کی لِم دریافت کرنے میں کھانا نصیب ہونے سے رہ جاتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب حق تعالیٰ نے تکوینیات میں آپ کو تصرف نہیں دیا تو تشریعیات میں بھی یہی سمجھ لو کہ تصرف نہیں دیا دونوں باتوں میں تصرف کا حق صرف حق تعالیٰ ہی کے واسطے مجھو بس آپ کا کام تو محض انقیاد ہے۔ یہ بیان ہوا اس کام کا جو حق تعالیٰ کا ہے یعنی تصرف۔

مومن کا کام

اب اس کام کا بیان سنو جو تمہارا ہے وہ انقیاد ہے اور یہ انقیاد دو طرح کا ہوتا ہے ایک اضطراری اور ایک اختیاری۔ اضطراری تو یہ ہے کہ جتنے کام دنیا میں ہو رہے ہیں ان سب میں ہم مجبور ہیں اور جیسا حق تعالیٰ چاہتے ہیں ویسا ہی ہوتا ہے موت حیات صحت مرض کوئی چیز ہمارے اختیار میں نہیں اور نہ وہ اسباب ہمارے اختیار میں ہیں جو ان میں موثر ہیں جیسے گرمی سردی بارش وغیرہ ان سب میں ہم کو انقیاد زبردستی کرنا پڑتا ہے کہ جو وہ چاہتے ہیں ویسا ہی ہوتا ہے ہمارے ارادہ کے موافق کچھ بھی نہیں ہوتا پس جیسا یہ اضطراری انقیاد ہم کو کرنا پڑتا ہے ایسا ہی انقیاد اختیاری بھی کرو اور وہ یہ ہے کہ ان تکوینیات پر جزع فزع ناشکری بے صبری مت کرو۔ موت ہو تو اس میں حدود شرعیہ سے نہ بڑھو حیات ہو تو اس میں بھی احکام و حدود شرعیہ کا خیال رکھو

بیماری ہو تو تب بھی بیہودہ کلمات مت بکو صبر کرو۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ بیماری میں صبر کرنا اختیار سے خارج ہے یہ غلط ہے صبر یہ نہیں کہ اس تکلیف کا کوئی اثر ہی ظاہر نہ ہو یہ بیشک اختیار سے خارج ہے اسی حد تک آدمی صبر کا مکلف ہے جہاں تک اس کا اختیار ہے مثلاً اگر شدت تکلیف میں کراہے یا بضرورت اپنا حال ظاہر کرے یا بے اختیار تڑپے تو اس میں کچھ حرج نہیں لیکن اس حالت میں بھی آدمی خدا تعالیٰ کی شان میں بیہودہ کلمات منہ سے نکالنے پر مجبور نہیں یہ فعل اس کا فعل اختیاری ہوگا اگر ایسا کرے گا تو گناہ ہوگا یہ شخص انقیاد اختیاری کا ایسے وقت بھی مکلف ہے۔

مثلاً کسی کے گردہ میں درد ہے تو اس کو چاہیے کہ صبر کرے اور قضاء و قدر پر راضی رہے اور جو افعال اُس سے بے اختیار سرزد ہوں مثلاً تڑپنا چلانا یہ خلاف رضا کے نہیں یہ فعل طبعی ہے خلاف رضا یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی شکایت دل میں ہو مثلاً یوں سمجھے کہ مجھ ہی کو اس مصیبت کے ساتھ خاص کیوں کیا کچھ میں نے ہی خطا کی تھی اور لوگ بڑے بڑے گناہ کرتے ہیں اور کچھ بھی نہیں ہوتا یا زبان سے شکایت کے کلمات کہے یہ باتیں بیشک رضا کے خلاف ہیں جن میں طبعاً انسان مجبور نہیں باقی تڑپنا اور چلانا طبعی بات ہے یعنی طبعاً انسان اس میں مجبور ہے۔ غرض مصیبت میں صبر کرنا اور حدود شرعیہ کا خیال رکھنا یہ انقیاد اختیاری ہے اور عقل کی بات بھی یہی ہے کیوں کہ اگر کوئی مر گیا یا کوئی چیز جاتی رہی تو جو چیز گئی وہ تو گئی وہ تو لوٹ نہیں سکتی لیکن اس کے جانے کے ساتھ ایک چیز ایسی وابستہ ہے جو اب بھی ہمارے اختیار میں ہے وہ رضائے حق ہے اگر ہم صبر کریں گے اور یہ سمجھیں گے کہ یہ جو کچھ ہوا حق تعالیٰ کے حکم سے ہوا اور ان کے حکم کو دل سے راضی ہو کر تسلیم کر لیں گے تو ان کی رضا ہم کو حاصل ہوگی اس کا حاصل کر لینا ہمارے اختیار میں ہے تو اس کو بھی کیوں کھویا اور اگر بے صبری کی اور جزع فزع کیا اور حق تعالیٰ کے حکم کو خوشی سے تسلیم نہ کیا تو وہ چیز تو لوٹنے کی نہیں یہ بھی ہاتھ سے گئی دنیا کا بھی نقصان ہوا اور آخرت کا بھی۔ ظاہر ہے کہ یہ بات عقل کے بالکل خلاف ہے۔

پھر اکثر یہ بھی ہے کہ جو کوئی صبر کرتا ہے اس کو اس چیز کا نعم البدل مل جاتا ہے اور اگر دنیا میں نہ بھی ملا تو آخرت کا وعدہ تو ہے ہی آخرت میں جب آدمی اس بدل کو دیکھیگا تو آنکھیں کھل جائیں گی کیونکہ اسوقت وہ چیز ملے گی جس سے اس گمشدہ چیز کو کچھ بھی نسبت نہیں ہوگی سہ

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد ۔۔۔ آنچہ در وہمت نیاید آں دہد

جب عقل کی بات بھی یہی ہے اور حق تعالیٰ کا حکم بھی یہی ہے تو آدمی ہمت کر کے اس کو کیوں نہ اختیار کرے اور یوں سمجھ لے کہ انقیاد اضطراری تو کرتا ہوتا ہی ہے انقیاد اختیاری بھی کیوں نہ کریں تاکہ آخرت کا سامان ہو جاتے ۔

یہ انقیاد تو تکوینیات میں ہوا ہے، رہے تشریعیات یعنی احکام تو اس میں انقیاد اضطراری ہوتا ہی نہیں کیونکہ انسان احکام شرعیہ میں کسی عمل پر مجبور نہیں ہے جیسا کہ تکوینیات میں تھا کہ کوئی واقعہ تکوینی انسان کے اختیار سے نہیں ہوتا تشریعیات میں یہ بات نہیں ہے یہاں انسان کو اختیار دیا گیا ہے کیونکہ امتحان مقصود ہے اسی لئے اس کو خیر و شر بتلا دیا گیا لیکن ساتھ ہی اختیار بھی دیا گیا ہے کہ چاہے وہ خیر کو اختیار کرے اور چاہے شر کو، تو یہاں صرف انقیاد اختیاری ہو سکتا ہے انقیاد اضطراری یہاں نہیں ہے اور وہ انقیاد اختیاری تشریعیات میں یہ ہے کہ احکام کو بے چون و چرا بجالاؤ ہمت کرو اور کسی کی ملامت سے مغلوب مت ہو بعض احکام تو اس قسم کے ہیں جن پر خلق کی طرف سے عادۃً ملامت نہیں ہوتی جیسے نماز و روزہ زکوٰۃ وغیرہ اور بعض احکام اس قسم کے ہیں جن پر ملامت بھی ہوتی ہے وہ شادی غمی کے احکام ہیں

۲ آیت میں موت و حیات کا لفظ صلوٰۃ و نسک کے بعد جو خصوصیت سے لایا گیا ہے اس سے بھی اشارۃً معلوم ہوتا ہے کہ حیات و موت کے متعلق احکام میں کوئی خاص بات ہے وہ بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ ان کی تعمیل سے ایک مانع موجود ہے اس واسطے ان کو خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا لہذا ان کے احکام میں انقیاد زیادہ اہم ہوا اور ہمت کی زیادہ ضرورت ہوئی ان میں خاص اہتمام سے انقیاد کرو یعنی ملنے جلنے میں شادی بیاہ میں موت میں خاص طور سے

۲ آیت میں لفظ حیات و موت کا نکتہ

خیال رکھو کہ کوئی کام خلاف شریعت نہ ہونے پائے ان میں جس قدر گڑبڑ ہو رہی ہے محتاج بیان نہیں خصوص موت کے احکام میں اور اسی طرح میراث کے احکام میں جو کہ موت ہی کے احکام کا ایک جزو ہے بڑی ہی بے احتیاطی ہو رہی ہے مثلاً میت کے وصیت کی پرواہ نہیں کی جاتی حالانکہ جہاں تک شریعت نے وصیت کا حق قائم کیا ہے یعنی ایک ثلث وہ اس کی ملک ہے وصیت کرنے کے بعد کسی کو اس میں مداخلت کا حق نہیں اگر اس کے خلاف کیا گیا تو اس کی حق تلفی ہو گی اور حق العبد رہ جائے گا علیٰ ہذا ورثہ کے حقوق کی پرواہ نہیں کی جاتی بعضوں کو تو محروم ہی مان لیا گیا ہے جیسے بہنیں کہ ان کو تو کوئی حصہ ہی دیتا نہیں اور جن کو محروم بھی نہیں مانا گیا ہے انہیں بھی تقسیم نہیں کرتے جس کے قبضہ میں جو مال ہے وہی اس کا مالک ہے جو چاہتا ہے تصرف کرتا ہے اس غلطی میں پڑھے لکھے لوگ بھی گرفتار ہیں اور یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم سب ایک ہی ہیں باہم ایک دوسرے کو تصرف کی اجازت بھی ہے پھر تقسیم کی کیا ضرورت ہے یہ تاویل وہی شخص کرتا ہے جو قابض ہے کیونکہ اس کا اس میں نفع ہے اس کو چاہیے کہ زمین جائیداد پر قبضہ دوسرے کو دیدے اور جب اس کو ہر قسم کا تصرف حاصل ہو جاوے اس وقت اس کے تصرف کی نسبت یہ کہے کہ ہم سب ایک ہی ہیں باہم ایک دوسرے کو تصرف کی اجازت ہے اس نے اگر فائدہ اٹھایا گویا ہم ہی نے اٹھایا ایک ہی بات ہے ایسے کوئی کرے تو ہم جانیں۔ صاحب الحقوق کا معاملہ ہے باوجود قدرت کے کوئی اپنا ایک پیسہ کا حق چھوڑنے پر بھی راضی نہیں ہوتا اس کو اس معیار سے دیکھ لیجئے کہ آپ خود تصرف نہ کیجئے دوسرے کو تصرف کرنے دیجئے پھر دیکھئے آپ کا دل اس کو گوارا کرتا ہے یا نہیں ہرگز گوارا نہیں کرے گا اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ دوسرے وارث شرما شرمی سے کچھ نہ کہیں مگر دل سے اجازت کوئی نہیں دیتا ہے تو یہ اجازت بطیب خاطر نہیں ہوتی پس ایک وارث کا قبضہ کل مال میں حرام ہوا خصوصاً اس صورت میں کہ بعض وارث نابالغ بھی ہوں کہ اس صورت میں تو اگر وہ زبان سے تصریحاً بھی اجازت دیں اور طیب خاطر بھی ہو تب بھی یہ اجازت معتبر نہیں کیونکہ نابالغ کا کوئی تبرع کا تصرف

صحیح نہیں۔ یہ سب حقوق العباد ہیں ان میں بڑی احتیاط چاہئے خلاصہ یہ کہ ہمارا ضروری کام انقیاد ہے ہم کو تمام احکام تشریعیہ و تکوینیہ اور موت و حیات کے احکام میں انقیاد چاہئے ذرا بھی کوتاہی نہ ہو اور جتنی کوتاہی ہوگی اتنا ہی اسلام ناقص ہوگا۔

اس لئے ضرورت ہے کہ ایک ایک شعبہ کو لیا جائے اور اس میں دیکھا جائے کہ ہماری حالت کیا ہے آیا وہ شعبہ ہم کو علی درجہ الکمال حاصل ہے یا نہیں؟ احکام تشریعیہ کو ہم پورا پورا بجالاتے ہیں یا نہیں؟ اور احکام تکوینیہ کے محل میں ہمارا اختیاری انقیاد پورا ہے یا نہیں؟ اور موت کے احکام کی تعمیل ہم پوری کرتے ہیں یا نہیں پھر اس کے لئے ضرورت ہوگی علم دین کی۔ کیونکہ کسی حکم کی تعمیل جب تک اس کا علم نہ ہو کیسے ہوسکتی ہے اور مجموعہ احکام کا نام دین ہے تو علم دین کی ضرورت ہوتی۔

معیارِ اسلام کامل

اس تقریر سے اسلام کامل کا معیار نکل آیا وہ معیار یہ ہے کہ تمام حالات ہمارے حق تعالیٰ کے حکم کے موافق یعنی شریعت کے مطابق ہوں ہم احکام تشریعیہ اور تکوینیہ اور احکام موت اور حیات میں سب میں شریعت کے موافق کام کریں اب اس معیار سے دیکھ لیا جائے کہ اسلام ہمارا کامل ہے یا نہیں لیکن جب ہم اس میں غور کرتے ہیں تو حالت یہ نظر آتی ہے ؂

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

احکام تشریعیہ کو دیکھتے ہیں تو ان کی تعمیل نہیں اور تکوینیہ کو دیکھتے ہیں تو ان کی تعمیل نہیں موت ہماری شریعت کے موافق نہیں حیات ہماری شریعت کے موافق نہیں پھر کیسے یہ خیال کیا جائے کہ ہمارا اسلام کامل ہے اور ہم کس بات پر بھولے ہوئے ہیں اور امید لگائے بیٹھے ہیں کہ ثمرات کامل ملیں گے۔

اگر اس کے ماننے میں کچھ شک ہو تو میں اس کے جانچنے کی ایک سہل ترکیب بتلاتا ہوں جس سے یہ شک رفع ہو جائے گا وہ یہ ہے کہ ایک کتاب فقہ کی لیجئے اور ایک کتاب حدیث کی

لیجیے اور اپنے حالات کو ان سب پر منطبق کرتے جائیے اس وقت یہ شک رفع ہو جائے گا اور آنکھوں سے نظر آجائے گا کہ ہمارا کوئی حال بھی صحیح نہیں سب سے اول تو یہی معلوم ہوگا کہ ہم بہت سے احکام کی تعمیل ہی نہیں کرتے پھر جن کی تعمیل بھی کرتے ہیں ان کے اجزا بھی ناقص اور ادھورے نظر آئیں گے چنانچہ بعض جزئیات کو لے لیجیے مثلاً نماز کہ اس کے جس جزو کو لے لیجیے وہی صحیح نہیں قیام ہے وہ ٹھیک نہیں قعود ہے وہ ٹھیک نہیں سجود ہے وہ ٹھیک نہیں تو جس چیز کے اجزاء ٹھیک نہیں وہ مجموعہ بھی ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ ثابت ہوا کہ ہماری نماز ٹھیک نہیں۔ نماز عبادات کا ایک فرد اکمل ہے بطور مثال کے میں نے اس کو بیان کر دیا جب اس کی یہ حالت ہے تو اور باقی عبادات کی حالت اس سے بھی گری ہوئی ہوگی غرض عبادات کا ایک فرد تو ناقص ثابت ہوا اور صلوٰۃ اور نسکی میں ہم قاصر ثابت ہوئے

اب آگے چلئے محیای و مماتی میں زندگی کے احکام دیکھئے شادی بیاہ میں تمام بدعات موجود ہیں شریعت کے موافق ایک کام بھی نہیں تو محیای و مماتی میں بھی ہم قاصر ثابت ہوئے غرض زندگی اور موت کا ہر کام ہمارا اپنے نفس کے موافق ہے صورت ہماری شریعت کے موافق نہیں لباس ہمارا شریعت کے موافق نہیں اٹھنا بیٹھنا ہمارا شریعت کے موافق نہیں۔ لین دین ہمارا شریعت کے موافق نہیں۔ اخلاق کو دیکھئے عجب ہم میں موجود ریا ہم میں موجود دوسرے کی تحقیر ہم میں موجود غرض اخلاق ذمیمہ ہم میں سب موجود ہیں۔ اور اخلاق حمیدہ میں سے ایک بھی نہیں صبر نہیں شکر نہیں تسلیم نہیں رضا نہیں جس وقت آپ کتابوں سے اپنے حالات کو ملائیں گے تو آنکھیں کھل جائیں گی اور معلوم ہو جائے گا کہ ہم کس دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں اور کس بات پر ہم نے خیال جما رکھا ہے کہ ہم کو ثمرات آخرت ملیں گے۔ غرض ہمارا ظاہر اور باطن اور اخلاق اور اعمال کچھ بھی درست نہیں۔ ہماری حالت یہ ہے کہ سر سے پیر تک ہم گناہوں ہی میں ملوث رہتے ہیں۔ ہاتھ ظلم میں مشغول ہے زبان غیبت میں آنکھ نظر بد میں دل غیر اللہ میں اٹکا ہوا ہے کس حالت کو کہا جائے کہ

درست ہے اسی سے متاثر ہو کر حکیم سنائی رح کہتے ہیں ؎

اے بسرا پردۂ یثرب بخواب	خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

آج کا تمدن اور ہمارا مذاق

اور معاشرات تو ہمارے اسقدر گندے ہیں کہ بیان نہیں ہو سکتا لوگ تمدن پکارتے پھرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آجکل زمانہ تمدن کا ہے آج کل تمدن کو بہت ترقی ہے۔ اس کی ہر قسم کی اصلاح ہو گئی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ مذاق ہی الٹے ہو گئے ہیں ان کو یہی نہیں معلوم ہے کہ صحیح تمدن کا ہے سے حاصل ہوتا ہے اور کس چیز سے اس کی اصلاح ہوتی ہے۔ مختصراً سن لیجئے کہ تمدن کی بنا تمام تر تواضع اور انکسار پر ہے کیوں کہ تمدن کی روح یہ ہے کہ آرام سے بسر ہو کسی کو کسی سے تکلیف نہ پہنچے اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے جب ہر شخص دوسرے کو آرام پہنچانے کی کوشش کرے اور یہ بات جب حاصل ہو سکتی ہے کہ دوسرے کو یا دوسرے کے حق کو اپنے آپ یا اپنے حق سے بڑا سمجھے اور اپنے آپ کو یا اپنے حق کو اس سے یا اس کے حق سے کمتر سمجھے اسی کا نام تواضع ہے پس تمدن کی بنا تواضع پر ہوئی اور آج کل کا یہ مذاق اور تعلیم ہے کہ آدمی کے لئے خودداری بھی ضروری چیز ہے یعنی اپنے آپ کو بڑا ثابت کرنا ہر بات میں اسی کی کوشش کی جاتی ہے افعال میں حرکات و سکنات میں بول چال میں غرض سر سے پیر تک ہمہ تن خوددار بنے ہوئے ہیں اس کا دوسرا نام کبر ہے یہ ضد ہے تواضع کی جس پر تمدن کی بنا تھی افسوس تمدن کا نام لیا جاتا ہے اور اس کے لئے وہ چیز اختیار کی جاتی ہے جو اس کی ضد ہے ماشاء اللہ کیا صحیح مذاق ہے حیرت کی بات ہے کہ آج کل تمدن اس کا نام رکھا گیا ہے کہ ہر شخص اپنے آپ کو بڑا سمجھے اور دوسرے کے نظر میں اپنے آپ کو بڑا ثابت کرے جب ہر شخص میں یہی مادہ ہو گا تو وہ صرف اس بات کی کوشش کرے گا کہ مجھ کو آرام پہنچے خواہ دوسرے کو تکلیف ہو یا کچھ ہو پھر تمدن کی روح یعنی آرام کی زندگی کیسے میسر ہو گی۔ میری سمجھ میں تو یہ بات نہیں آتی۔

یہ تو ایسا ہے جیسے کسی کو اپنی صحت منظور ہو اس کے لئے وہ چیز استعمال کرے جو ضد ہے صحت کی یعنی سنکھیا کھالے تو اس سے ایسی صحت حاصل ہوگی معلوم ہے۔ مگر کچھ ایسے مذاق بگڑے ہوئے ہیں کہ تمدن کے لئے وہ چیز استعمال کی جاتی ہے جو اس کی ضد اور اس کی جڑ کاٹنے والی ہے یعنی کبر اگر سنکھیا کھا کر صحت ہو سکتی ہے تو کبر سے تمدن بھی حاصل ہو سکتا ہے لیکن ایک زمانہ ہے جو اس بات پر متفق ہو رہا ہے کہ تمدن کی ترقی جو کچھ بھی ہو سکتی ہے وہ خودداری اور تکبر سے ہو سکتی ہے اور علی قدر مراتب تقریباً ہر شخص اس میں مبتلا ہے کوئی دوسرے سے چھوٹا بننا نہیں چاہتا یہی چاہتا ہے کہ میں ہی بڑا ہوں کسی بات میں دوسرے سے پیچھے نہ رہوں اور اس کی یہاں تک نوبت ہے کہ اگر دوسرا کسی بات میں آگے بڑھنے لگے تو اس کے روکنے کی تدبیر کی جاتی ہے کہ یہ ہم سے نہ بڑھ جائے اگرچہ ہم کو بھی بڑھنا نصیب نہ ہو مگر یہ بھی نہ بڑھنے پائے کسی کی خوش عیشی تمول فارغ البالی عزت دیکھ کر چین نہیں آتا اور یہی جی چاہتا ہے کہ یہ نعمت اس سے چھن جائے یہ اسی بڑے بننے کے نتائج ہیں۔

اور یہ دوسرا مرض پیدا ہوا اس کا نام حسد ہے تمام عقلاء نے ان اخلاق کو اخلاق ذمیمہ میں شمار کیا ہے مگر آجکل یہ اخلاق اخلاق فاضلہ میں شمار ہیں اور انہی پر ترقی وتمدن وجملہ فضائل کی بنا کی گئی ہے

اخلاق ذمیمہ کے دنیوی نتائج

، صاحب! ذرا ہوش سے کام لو حسد اور کبر تو وہ چیزیں ہیں جو تمام برائیوں کی جڑ ہے ان سے نتیجہ کبھی اچھا نہیں نکل سکتا شرعاً تو یہ گناہ ہیں ہی، دنیا کے نتائج بھی جو ان سے پیدا ہوتے ہیں وہ بھی ایسے ہیں جس سے ایک مخلوق کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے سب جانتے ہیں کہ انسان کی طبیعت میں تمدن ہے یعنی مل جل کر رہنا اور انسان دوسرے حیوانات کی طرح نہیں ہے جن کو مل جل کر رہنے کی ضرورت نہیں ان کے کھانے پینے کی چیز

ہر جگہ موجود ہے صبح کو اٹھے اور جنگل میں چر کر پیٹ بھر لیا اور شام کو اپنے ٹھکانے میں آکر آرام کرنے لگے انسان میں یہ بات کہاں اس کی تمام ضروریات ایک دوسرے کی اعانت سے مہیا ہوتی ہیں اسی کا نام تمدن ہے بدون اس کے انسان کی زندگی نہیں ہو سکتی جب اس کو ضرورت ہے تمدن کی تو دوسرے سے بھی ملنے کی ضرورت ہے دو باتوں کے لئے ایک اپنا کام نکالنے کے لئے کیونکہ اس کا کام دوسرے پر موقوف ہے۔ دوسرے اس دوسرے شخص کو مدد دینے کے لئے کیونکہ وہ بھی اس کا محتاج ہے یہ حقیقت ہے تمدن کی اور یہ جب ہو سکتا ہے کہ دوسرے کو نفع پہنچانے کا خیال بھی ہو اور یہ خیال حسد کی ضد ہے اور حسد اس کی ضد ہے کیونکہ حسد کے معنی ہیں دوسرے کی نعمت کی زوال کی تمنا کرنا اور تمدن میں ضرورت تھی کہ دوسرے کو فائدہ پہنچانے اور اس کے حصول کے لئے نعمت کی کوشش کرنے کی تو ثابت ہو گیا کہ حسد ضد ہے تمدن کی۔

اسی طرح اس کام بھی جب ہی نکل سکتا ہے کہ دوسرے کے سامنے اپنی احتیاج لے جائے اور یہ مقتضی ہے اس بات کو کہ اس کے سامنے بڑا بن کر نہ جایا جائے ورنہ وہ التفات کیوں کرے گا یہ حقیقت ہے تواضع کی جو ضد ہے کبر کی اور کبر اس کی ضد ہے تو ثابت ہوا کہ کبر اس کی ضد ہے ——— لیجئے عقلاً ثابت ہو گیا کہ حسد اور کبر تمدن کے منافی ہیں سو یہ ان میں عقلی خرابیاں ہیں قطع نظر اس سے کہ یہ شرعی گناہ بھی ہیں۔ شریعت مطہرہ کی خوبی دیکھئے کہ ہر کام میں وہ بات سکھلائی جو تمام خوبیوں کی جڑ ہے اور اُن باتوں سے منع کیا ہے جو برائیوں کی جڑ ہیں۔ شریعت ایک ایسی چیز ہمارے ہاتھ میں دی گئی ہے کہ آنکھیں بند کر کے اس کے ساتھ چلے جائیے۔ کبھی کوئی خرابی پیش نہ آئے گی دنیا کی بھلائی بھی اس میں ہے اور آخرت کی بھلائی بھی۔ مگر ہم لوگوں نے اس کو ایسا چھوڑا ہے کہ ہمارے کسی کام میں بھی اس کا دخل نہیں رہا ہمارا ظاہر شریعت کے موافق نہیں ہمارا باطن نہیں ہمارا اخلاق نہیں ہمارے اعمال نہیں ہماری معاشرت نہیں پھر اس کے نتائج سامنے آتے ہیں جن کو

فرماتے ہیں ظهر الفساد فی البر والبحر تمام عالم فساد سے پُر ہو رہا ہے اسی فساد عام کو حکیم سنائی کہتے ہیں ؎

اے بسا پردہ یثرب بخواب ۔ خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

ہماری حالت یہ ہے ؎

چوں گرسنہ میشوی سگ میشوی ۔ چونکہ خوردی تند و بدرگ میشوی

نہ ہمارے عیش کی حالت درست اور نہ مصیبت کی درست ۔ دو ہی حالتیں انسان پر آتی ہیں عیش یا مصیبت اور دونوں درست نہیں تو مطلب یہ ہے کہ کوئی حالت بھی درست نہیں اور یہ حالت صرف عوام کی نہیں بلکہ اکثر خواص کی بھی قریب قریب یہی حالت ہے۔

مصلحینِ قوم کی حالت :۔

اور لطف یہ ہے

کہ ہر فرد کی اپنی حالت تو یہ ہے اور اس پر دوسروں کی اصلاح کرنے کا خیال ہے۔ جب خود اپنی ہی اصلاح نہیں کرتے تو دوسروں کی اصلاح کیا خاک کریں گے۔

یہی وجہ ہے کہ اصلاح کرنے چلے تو ایسی اصلاح کی جیسے کوئی شخص طبیب بن گیا تھا اس کو تمام دواؤں میں صرف جمال گوٹہ یاد تھا ہر مریض کو یہی دیتا تھا قصہ اس کا یہ ہے کہ ایک طبیب کے یہاں ایک شخص رہتا تھا جو دوائیں گھوٹا پیسا کرتا تھا کبھی اس نے حکیم صاحب کے حکم سے جمال گوٹے کی گولی بنائی تھی وہ گولی مطب میں اکثر ایسے لوگوں کو دی جاتی تھی جن کو مسہل کی ضرورت ہوتی تھی ۔ انہوں نے دو چار مرتبہ جو بنائی تو نسخہ یاد ہو گیا ۔ حکیم صاحب کا انتقال ہو گیا کوئی ان کا جانشین تھا نہیں ان کی نوکری جاتی رہی تو انہوں نے سوچا کہ حکیم صاحب یہ گولی اکثر دیا کرتے تھے اس کا نسخہ ہم کو یاد ہے لاؤ ہم بھی یہ کام شروع کر دیں چنانچہ حکیم بن بیٹھے اب جو آتا ہے دیدو گولی دو چار جگہ اتفاق صحیح موقع پر کامیابی ہوئی اس واسطے شہرت ہو گئی اور ان کا دماغ چڑھ گیا اور سمجھے کہ جمال گوٹہ ہی سب کچھ ہے اب ہر مریض پر اسی کی مشق

ہونے لگی کوئی آیا کہ حکیم صاحب میرا گدھا کھو گیا ہے کہا دید و گوُل کسی عورت نے کہا میرا خاوند مجھ سے ناراض رہتا ہے کہا دیدو گوُل غرض جو کچھ تھا جمال گوٹہ تھا ایک مریض آیا اس کے لئے آپ نے تجویز کیا کہ مادہ بہت بڑھ گیا ہے اس واسطے تنقیہ کی ضرورت ہے۔ دے دو گوُل۔ گوُل اتفاقاً کچھ تیز بنی ہوئی تھی۔ اور کچھ مریض کا معدہ ضعیف تھا بہت کثرت سے دست آئے ضعف بہت ہو گیا خبر آئی کہ حکیم صاحب دست بہت آ گئے ہیں کمزوری زیادہ ہو گئی کہا آنے دو مادہ نکلتا ہے تھوڑی دیر میں پھر خبر آئی کہ اس کا برا حال ہے دستوں کے بند کرنے کی تدبیر کیجئے کہا نہیں مادہ رہ جائیگا تو برا ہو گا نکلنے دو پھر خبر آئی کہ جناب وہ مرا جاتا ہے کہا کوئی ڈر نہیں۔ مادہ نکل رہا ہے نکلنے دو حتی کہ تھوڑی دیر میں خبر آئی کہ وہ مر گیا تو آپ اس کو دیکھنے گئے اور کہنے لگے اللہ رے مادے جس کے نکلنے پر یہ حال ہوا اگر وہ رہ جاتا تو کیا ہوتا۔ ہوتا کیا موت سے آگے بھی کوئی درجہ باقی رہا ہو گا وہ بھی حاصل ہو جاتا۔ یہی حالت ہماری ہے کہ قوم کا علاج کرنے چلے تو کیسا خوبصورت علاج کیا ہے ہم خود اپنے امراض تک تو جانتے نہیں مگر دوسروں پر مشق شروع کر دی ہمارے اندر نہ لحاظ ہے نہ شرم ہے نہ ادب ہے۔ نہ عقل ہے۔ نہ انجام بینی ہے بس اتنی لیاقت ہے کہ جس نے ہمارا کہنا نہ مانا اس پر فتویٰ لگا دیا کہ کافر ہے مشرک ہے دشمن دین ہے بددین ہے تمام قوم میں فرقہ بندی کرا دی اور قوم کی قوت رہی سہی بھی کھو دی۔ بس یہی ایک فتویٰ یاد ہے جیسے اس شخص کو جمال گوٹہ (یا جلال گوٹہ) یاد تھا۔ آپس میں لڑا لڑا کر سب کی قوت کو کھو دیا یہ علاج کیا قوم کا کہ جتنے امراض قوم میں پہلے نہ تھے وہ بھی پیدا ہو گئے عداوت بغض کینہ حسد غیبت تحقیر وغیرہ وغیرہ۔ جس طبیب کا علاج ایسا خوبصورت ہو جس سے ایسے مہلک امراض پیدا ہوتے ہوں تو اس کی بد پرہیزی تو خدا جانے کیسی ہو گی کیا کہا جائے۔

خرابی کی جڑ

ساری وجہ یہ ہے کہ طبیعت کو رائے کے تابع بنا لیا اور اہل رائے ہو گئے (بلکہ گنبت رائے) صاحبو! ہماری آپ کی رائے کیا چیز ہے

حق تعالیٰ کے حکم کے سامنے۔ پس رائے کو چھوڑیئے اور اطاعت وانقیاد اختیار کیجئے اطاعت اور انقیاد اور بندگی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ جس کے ساتھ اس تعلق کا دعویٰ کیا جاوے اس کے حکم کے سامنے اپنی رائے بھی باقی رہے اس کو اہلِ تحقیق سے پوچھو، کہتے ہیں ؎

فکرِ خود رائے خود در عالمِ رندی نیست — کفر است دریں مذہب خود بینی و خود رائی

اس شعر میں رائے کی کسقدر مذمت ہے کہ اس کو کفر کہا ہے جو مقابل ہے ایمان کا معلوم ہوا کہ رائے کے اتباع کرنے سے کسی درجہ میں ایمان بھی جاتا رہتا ہے۔

اور واقعی اتباعِ رائے کے بعض مراتب وہ بھی ہیں جن میں ایمان نہیں رہتا دیکھو شیطان کو سجدہ کا حکم ہوا تو اُس نے اُسمیں رائے کی ٹانگ اڑائی اور کہا انا خیر منہ اس کی سمجھ میں یہ آیا کہ ادنیٰ کو اعلیٰ کے سامنے سجدہ کرنا چاہیے نہ کہ اُلٹا اعلیٰ سجدہ کرے ادنیٰ کو اور میں اعلیٰ ہوں آدم سے کیونکہ میں آگ سے پیدا ہوا ہوں جو نورانی ہے اور وہ خاک سے پیدا ہوئے ہیں جو ظلمانی، یہ اس کی رائے تھی جس کا اس نے حکم الٰہی کے مقابلہ میں اتباع کیا پھر دیکھئے اس پر کیا حکم لگایا گیا کہ اس کو کافر اور ملعون کہا گیا۔ ثابت ہوگیا کہ خود رائی کی انتہا کفر تک پہنچ جاتی ہے تو یہ حکم بالکل صحیح ہوگیا جو اس شعر میں ہے ؎

کفر است دریں مذہب خود بینی و خود رائی

صاحبو! مسلمان کے لئے رائے کیا چیز ہے تمہارا مذہب تو یہ ہونا چاہیے ؎

رشتہ در گردنم افگندہ دوست — میبرد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

اپنی رائے کو فنا کر کے حکم الٰہی کے پیچھے پیچھے چلنا چاہیئے اس کا مطلب یہ نہیں کہ عقل کو بالکل چھوڑ دیا جائے بلکہ یہ مطلب ہے کہ عقل سے صرف اتنا کام لیا جائے کہ اس سے حکم الٰہی کو سمجھ لیا جائے اور بس اس کے آگے عقل کو دخل نہ دیا جائے اور بعد علم احکام کے پھر حکم میں چوں چرا اور حیلہ حجت نہ نکالی جائے۔

توضیح انقیاد اس کی ایک مثال ہے جس سے بخوبی یہ مضمون واضح ہو جاتا ہے

کہ بچے کو استاد پڑھانے بیٹھتا ہے اور قاعدہ سامنے رکھتا ہے اس میں کچھ حرف بنے ہوئے ہیں پہلے حرف پر انگلی رکھواتا ہے اور بچے سے کہتا ہے کہو الف اور دوسرے حرف پر انگلی رکھواتا ہے اور کہتا ہے کہو ب سب جانتے ہیں کہ بچہ کے ذمہ استاد کا انقیاد ہے یہاں سے انقیاد کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ بچہ اپنی عقل اور سمجھ کو بالکل چھوڑ کر بے سمجھے استاد کے الفاظ کی بعینہٖ نقل اتار دے مثلاً استاد کہتا ہے کہ اس حرف کو کہو الف تو بچہ بھی کہتا ہے اس حرف کو کہو الف، اور ایک صورت انقیاد کی یہ ہے کہ اتنا کام اپنی عقل اور سمجھ سے لے کہ ان پورے الفاظ کی نقل تو نہ اتارے بلکہ صرف اتنا کہے الف اور ب یہ دو صورتیں ہوئیں اور ایک تیسری صورت یہ ہے کہ لڑکا افراط کے درجہ میں عقلمندی سے کام لے اور استاد سے پوچھے کہ آپ جو اس حرف کو الف اور اس حرف کو ب کہلواتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے اس کا الٹا کیوں نہ کہا جائے کہ پہلے حرف کو ب کہا جائے اور دوسرے کو الف، اب میں پوچھتا ہوں کہ ان تینوں صورتوں میں سے صحیح صورت کون سی ہے آیا یہ صحیح ہے کہ بالکل عقل اور سمجھ سے کام نہ لے اور بے عقل سے استاد کی نقل اتارے جائے یا یہ صحیح ہے کہ اتنی عقلمندی بگھارے کہ استاد سے الف کو الف کہنے کی وجہ پوچھے اور ب کو ب کہنے کی۔

میں خود ہی اس کا جواب دیئے دیتا ہوں کہ یہ دونوں شقیں غلط ہیں اور صحیح شق وہی درمیانی ہے کہ نہ تو استاد کی نقل اتارے اور نہ اُس کے حکم میں حیل وحجت کرے کہ اُس سے الف کو الف کہنے کی اور ب کو ب کہنے کی وجہ پوچھنے لگے ان دونوں باطل شقوں میں کیا غلطی ہے یہی غلطی تو ہے کہ ایک شق میں تو عقل کو بالکل چھوڑ دیا گیا اسی واسطے اگر کوئی بچہ ایسا کرے تو استاد اور سب سننے والے یہ کہیں گے کہ ابھی یہ بچہ بالکل ناسمجھ ہے بات کو سمجھتا ہی نہیں ابھی اس کو پڑھانا فضول ہے اور دوسری شق میں یہ ہوا کہ عقل اور ذہانت سے اتنا کام لیا گیا کہ بچہ کی عقل کا وہ کام نہ تھا پس عقل سے بالکل کام نہ لینا بھی برا اور حد سے زیادہ کام لینا بھی برا، اس وقت اس کو چاہیے تھا کہ بے قیل و قال استاد کا انقیاد کرتا اور الف کو الف اور ب کو ب کہتا۔

چند روز کے بعد انکشاف خود ہو جاتا کہ استاد جو کچھ بتلاتا تھا وہ صحیح اور واقع کے مطابق تھا یہ استاد کی زبردستی نہ تھی کہ ایک حرف کو الف اور دوسرے کو ب کہلواتا تھا وہ وہی بات کہلواتا تھا جو واقع میں ہے۔

اسی طرح جو لوگ احکام شرعیہ میں علتیں نکالتے ہیں بس وہ اس بچہ کے موافق ہیں جو حد سے زیادہ عقل سے کام لیتا ہے اس لئے ان سے یہی کہا جاتا ہے کہ اس طریقہ کو چھوڑ کر چند روز شریعت کا انقیاد بھی اختیار کیجئے اور اس کو درجہ حال میں لے آئیے اس کے بعد آپ کو خود اس بات کا انکشاف ہو جائے گا کہ احکام شرعی حکمتوں سے خالی نہیں ہیں اور واقع کے اور فطرت اور عقل کے بالکل موافق ہیں اس وقت یہ حالت ہو گی کہ آپ کے رگ و پے سے یہی آواز نکلیگی

ع ہر چہ آں خسرو کند شیریں بود

بس صحیح طریقہ یہ ہے اور جس طرح آپ چاہتے ہیں احکام کی حکمتیں معلوم کرنا اس طرح قیامت تک بھی نہیں معلوم ہوں گی یہ چال ہی غلط ہے۔ بچہ والی مثال سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ عقل سے کام لینے کے کیا معنی ہیں اور کہاں تک اس کی ضرورت ہے اور عقل کو چھوڑنے کے کیا معنی ہیں اور اس کی ضرورت کہاں ہے اس سے وہی تیسری درمیانی شق پیدا ہوتی ہے جو صحیح ہے اور جو حصول علم و انکشاف حقائق کی منتج ہے بچہ اسی طریقہ سے علم حاصل کر سکتا ہے کہ نہ تو استاد کی نقل آتارے اور نہ اس سے الف کو اف کہنے کی وجہ پوچھے بلکہ اپنی عقل سے اتنا سمجھ جائے کہ استاد کا یہ مطلب نہیں کہ اس کی نقل اتاری جائے اور کہو الف کہو ب کہا جائے بلکہ الف اور ب کہے اور جس حرف کا جو نام بتلاتا جائے وہی لیتا چلے اس میں حیلہ و حجت اور قیل و قال نہ کرے یہاں عقل کو چھوڑ دے۔ دیکھئے اس بچہ نے صحیح حد تک تو عقل سے کام لیا اور اُس حد کے آگے چھوڑ دیا اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ دن بدن اس کے معلومات بڑھتے جائیں گے اور عالم ہوتا جائے گا حتی کہ ایک دن وہ بھی آئیگا کہ حقائق کا اس پر انکشاف ہو جائے گا یہی طریقہ آپ کو بھی احکام الٰہی کے متعلق اختیار کرنا چاہئے کہ نہ تو اتنے بیوقوف بنئے

کہ عقل سے کام ہی نہ لیجئے اس کا نتیجہ تو یہ ہوگا کہ غیر شریعت کو بھی شریعت سمجھ لوگے اور اس وقت آپ کی حالت اسی بچہ کی سی ہو جائے گی جس کو استاد کہتا ہے کہو الف اور کہو ب تو وہ بھی کہتا ہے کہو الف کہو ب کہ اس نے اس بات کو جو داخلِ امر نہ تھی یعنی لفظ کہو کو بھی داخل سمجھ لیا اور نہ عقل سے اتنا کام لیجئے کہ احکامِ الٰہی کی حکمتیں اور علتیں پوچھنے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ علم اور معرفت سے کورے رہ جائیں گے اس بچہ کی طرح جو استاد سے پہلے ہی دن پوچھتا ہے کہ الف کو الف کیوں کہوں اور ب کو ب کیوں کہوں یہ مرتبہ عقل کو چھوڑ دینے کا ہے۔ یہاں چھوڑ دینا ہی اچھا اور ضروری ہے اسی کو کیا کہا گیا ہے ؎

آزمودم عقل دور اندیش را　　　بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

اس مثال سے صدہا اشکالات رفع ہو جاتے ہیں۔ البتہ مجتہدین کو احکام کی علتیں نکالنے کی اجازت ہے دو وجہ سے ایک ضرورت دوسرے اہلیت باقی اہلِ رائے کو علت نکالنے سے ممانعت جس کا آج کل غلبہ ہو رہا ہے اور اس کو دین کی خیر خواہی سمجھا جاتا ہے کہ فلاں شخص نے احکام کی علل و حکم خوب بیان کئے ہیں۔

صاحبو! شریعت کی یہ خیر خواہی نہیں ہے محض ہوا پرستی ہے اس کو چھوڑیئے آپ کے لئے صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہر حال میں حکم الٰہی کے سامنے اتقیا ہو اور شریعت پر عمل ہو۔ سب حالات عبادات۔ عادات۔ اخلاق۔ معاملات۔ معاشرات سب شریعت کے موافق ہوں اپنی عقل سے صرف اتنا کام لیجئے کہ ہر کام میں یہ تحقیق کر لیا کیجئے کہ اس میں شریعت کا حکم کیا ہے جب شریعت کا حکم معلوم ہو جاوے تو اس کو تسلیم کیجئے اور اس کے موافق عمل کیجئے اور اس میں تعلیلیں نہ نکالئے۔

رائے کی شریعت

مگر میں ضرورت سمجھ کر یہ بھی بتلائے دیتا ہوں کہ شریعت سے مراد کون سی شریعت ہے۔ میری مراد وہ شریعت ہے جو اغراض کے تابع نہ ہو آپ سوال کریں گے کہ کیا شریعتیں دو ہیں؟

تو میں کہتا ہوں کہ جی ہاں آج کل دو ہی ہیں اصل میں تو ایک ہی تھی مگر آج کل دو ہو گئی ہیں اس زمانہ میں ایک نئی شریعت ایجاد ہوئی ہے وہ ایسی سہل ہے کہ جو جا ہو کرتے رہو اس شریعت کے خلاف کوئی کام ہوتا ہی نہیں۔ بُرے سے بُرا کام کرتے رہو اور گناہ نہ ہو اور دین ہاتھ سے نہ جائے اور جنت کی میراث قائم ہے اور یہ میری کوئی خیالی بندش نہیں ہے بلکہ واقعی آجکل ایسے قصے ہو رہے ہیں ابھی حال کا واقعہ ہے وہ فتوئی میں نے بھی دیکھا ہے ایک صاحب اپنی ساس پر مفتون ہوئے کیسا زمانہ آگیا کہ آدمی انسان سے گدھے گھوڑے بن گئے اجنبی عورتوں سے تو پردے کو اس لئے کہا جاتا ہے کہ ان میں فتنہ کا احتمال ہے اور محرمات سے پردہ کو اس لئے نہیں کہا جاتا کہ وہاں فتنہ کا خوف نہیں کیونکہ حرمت شرعی موجود ہے جو مسلمان کے لئے یقیناً مانع ہو سکتی ہے اور اگر طبیعت سلیم ہو تو محرمات سے کراہت طبعی بھی موجود ہے مگر کیا کیا جاوے کہ دین اور شریعت کا تو ذکر ہی کیا ہے آجکل طبیعتیں بھی انسانی طبیعتیں نہیں رہیں بلکہ گدھے اور بندر کی سی طبیعتیں ہو گئیں اس کا تو مقتضیٰ یہی معلوم ہوتا ہے کہ ساس سے بھی پردہ کا حکم دیا جائے بلکہ ایک ساس ہی کیا تمام محرمات سے پردہ کرایا جائے کیونکہ جب بھلے بُرے کی تمیز باقی نہیں رہی تو کیا عجب ہے کہ بہن بیٹی اور ماں کی طرف بھی میلان ہونے لگے بلکہ ایسے واقعات ظہور میں آنے لگے ہیں (معاذ اللہ معاذ اللہ)

غرض وہ صاحب ساس پر مفتون تھے مگر بدنامی کے خیال سے یہ فکر ہوئی کہ ناجائز تعلق نہ رکھیں بلکہ جائز کر کے رکھیں لہذا ایک دین فروش نام کے مولوی کے پاس گئے یہ مولوی تھے ایسے نالائق بیہودہ کہ مولوی کیسے کہوں ایسے لوگوں نے تو مولوی کے نام کو بھی بدنام کر دیا

غرض تھے کوئی نام کے مولوی، نام کے مولوی اس لئے کہا کہ ظاہر میں پڑھے لکھے تو تھے مگر اعمال ایسے تھے کہ جاہل کے بھی نہ ہوں چنانچہ اس نے ساس جیسی محرمہ موبدہ کو بھی حلال کر دیا چنانچہ آگے آتا ہے غرض اس جاہل نے اس دین فروش سے اپنی خواہش ظاہر کی کہ ساس پر میری طبیعت آگئی ہے اور کھلم کھلا ناجائز کام کرنا منظور نہیں کیونکہ بدنامی بہت ہو گی

لہذا کسی طرح جائز کر کے تم اس سے میرا نکاح کر دو اس نے کہا ساس سے بھلا نکاح کس طرح ہو سکتا ہے دنیا جانتی ہے کہ ساس ماں کے برابر ہے، کہا کوئی صورت بھی ہے کہنے لگے تم مجھ سے ایسا مشکل کام لینا چاہتے ہو مگر خیر سوچیں گے لیکن اس میں بہت دماغ خرچ ہوگا اس لئے ایک ہزار روپیہ فیس لیں گے اس کی تو طبیعت آئی ہوئی تھی ایک ہزار روپیہ کیا بڑی بات تھی۔ افسوس کسی نے صحیح کہا ہے زلۃ العالِم زلۃ العالَم۔ ایک گناہ تو جاہل کا ہوتا ہے وہ تو اس کی ذات تک محدود رہتا ہے وہ اس کا نتیجہ بھگتے گا دوسرے تک اس کا اثر نہیں پہنچتا اور ایک گناہ عالم کا ہوتا ہے یہ متعدی ہوتا ہے اس کی ذات تک محدود نہیں رہتا بلکہ دوسروں تک اس کا اثر پہنچتا ہے کیونکہ وہ اس کو جائز بنا کر کرتا ہے جس سے جہلا حرام کو حلال سمجھنے لگتے ہیں یہ دین فروش خود تو ڈوبا ہی دوسرے کو بھی ڈبویا اور اس کیلئے ساس کو کھینچ تان کر جائز کر ہی دیا اور زبردستی نہیں بلکہ دلیل سے اور شرعی فتویٰ سے، اسی واسطے تو میں نے کہا تھا کہ شریعتیں دو ہیں۔

اس کی دلیل سنئے فرماتے ہیں کہ ساس کی حرمت آیت کے اس لفظ سے ثابت ہے وامہاتُ نسائکم اس کے معنی ہیں کہ تمہاری بیبیوں کی مائیں بھی حرام ہیں بی بی کی ماں کو ساس کہتے ہیں اس سے ساس کی حرمت ثابت ہوئی اس میں اس جاہل نے ایک مقدمہ قائم کیا وہ یہ کہ ساس کہتے ہیں بی بی کی ماں کو اور بی بی کس کو کہتے ہیں جس سے نکاح ہوا ہو اور سب جانتے ہیں کہ نکاح سے مراد نکاح واقعی ہے لفظی نہیں اب یہ دیکھو کہ بیوی سے تمہارا نکاح واقعی ہوا تھا یا نہیں بس اس میں کلام ہے کیونکہ واقعی نکاح جب ہوتا ہے کہ مرد اور عورت دونوں مسلمان ہوں اور بیوی تمہاری جاہل ہے (یہ پہلے سے معلوم کر لیا تھا کہ بیوی جاہل ہے اور یہ بھی پوچھ لیا تھا کہ نکاح کے وقت کلمے پڑھائے گئے تھے یا نہیں معلوم ہوا کہ نہیں پڑھائے گئے) بس اب کام بن گیا اور گنجائش نکل آئی کہا جاہل بسا اوقات کفر کے کلمے بکا کرتے ہیں تو جاہل آدمی کے ایمان ہی کا کیا ثبوت ہے اور نکاح کے وقت بھی کلمے نہیں پڑھائے گئے جس سے یہ کہا جا سکتا کہ پہلے سے وہ مومن نہ ہو مگر اس وقت تو مومن ہو گئی غرض بیوی کا ایمان ثابت نہیں

اور نکاح کے لئے ایمان شرط ہے جب یہ شرط نہیں پائی گئی تو نکاح صحیح نہیں ہوا تو وہ منکوحہ نہیں ہوئی اور اس کی ماں ساس نہیں ہوئی بلکہ ایک اجنبی عورت ہے لہذا نکاح جائز ہے باقی حرمت مصاہرت وہ مختلف فیہ مسئلہ ہے کچھ ضرور نہیں کہ امام صاحب ہی کا قول لیا جاوے۔

دیکھئے سب موانع مرتفع ہو گئے اور ساس کا نکاح دلیل سے جائز ہو گیا اور دین کے اندر بھی داخل ہو گیا اور اس سے کتنا بڑا کام نکل آیا کہ ایک شخص کا دل خوش ہو گیا اور جہلاء کے نزدیک وہ گناہ سے بھی بچ گیا۔ سو حضرت ایک شریعت تو یہ ہے اس شریعت سے تو خدا بچائے اس کے انقیاد کی ضرورت نہیں یہ شریعت وہ ہے جو رائے کے تابع ہے۔

شریعتِ حقہ اور ایک وہ شریعت ہے جو رائے کے تابع نہ ہو اس کا انقیاد کرو اور اپنے اغراض کو بیچ میں سے نکال دو اس بات پر پکے ہو جاؤ کہ شریعت کو ہر چیز پر مقدم رکھیں گے چاہے زمینداری رہے یا نہ رہے اولاد مرے یا زندہ رہے خدا اور رسول کا حکم مانیں گے زمینداری میں کوئی حق شریعت کے خلاف نہیں رکھیں گے چاہے ساری زمین بھی نکل جاوے اولاد کے لئے کوئی ٹوٹکا ٹونا خلاف شروع نہ کریں گے چاہے اولاد سب مر جاوے' یہ ہے شریعت اس کا انقیاد چاہئے راہ حق اس طرح ملتا ہے کہ اپنی اغراض وغیرہ سب کو چھوڑ کر شریعت ہی کو اصل غرض قرار دو پھر وہ کوئی چھپی ہوئی چیز نہیں ہے اور اس میں کچھ کھینچ تان کی ضرورت نہیں اور نہ وہ ایک ہزار دینے سے پیدا ہوتی ہے یہ شریعت نہیں ہے کہ حلت نکاح کو غرض قرار دے کر حکم تلاش کیا گیا اور شریعت کو اس کے مطابق کیا گیا ایسی ہی شریعت کے لئے ضرورت ہے کھینچ تان کی اور ایک ہزار روپیہ کی۔ ایک ہزار کا مسئلہ تو کہیں نہ کہیں سے اپنی خواہش کے موافق مل ہی جاتے گا مگر وہ حق نہ ہو گا نہ خدا اور رسول کا حکم ہو گا بلکہ اپنا حکم ہو گا خوب کہا ہے ؂

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد — صد حجاب از دل بسوئے دیدہ شد

غرض اور دلسوز کو آگے رکھ لینے کے بعد انکشاف حقیقت نہیں ہو سکتا اور حق کا پتہ نہیں چل سکتا

اس وقت جس چیز کا پتہ چلے گا وہ شریعت نہیں ہوگی بلکہ نفس اور شیطان کا حکم ہوگا، شریعت وہ ہے جو ہمارے تابع نہ ہو۔

اتباعِ شریعت کی پہچان

شریعت کی اتباع کے یہ معنی ہیں کہ دو شخصوں میں ایک مکان پر جھگڑا ہو تو دونوں عزم کر لیں کہ اگر شریعت کا حکم ہمارے خلاف نکلا تو ہم اس پر بالکل راضی ہیں اگر شریعت سے ہمارا حق مکان میں نکلا تو لیں گے ورنہ بالکل چھوڑ دیں گے اس بات پر پکے ہو کر حکم معلوم کرو اب جو حکم نکلے گا وہ شریعت ہوگی اور ایک یہ صورت ہے کہ پہلے سے یہ قرار دے لیا کہ مکان ہم کو مل ہی جاوے اور یہ دل میں ٹھان کر مسئلہ معلوم کرنے کو چلے اور مولوی صاحب سے فرمائش کی گئی کہ کسی طرح ایسا مسئلہ نکال دو کہ ہم کو مکان مل ہی جاوے اگر مولوی صاحب بھی آپ کے کہنے میں آگئے تو مسئلہ ایسا مل ہی جاوے گا (دیکھئے اس طرح سود جائز ہو ہی گئی جس کی حرمت متفق علیہ اور منصوص اور آیت میں صراحۃً موجود ہے۔ اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے) مگر وہ مسئلہ شریعت الٰہی کا نہ ہوگا شریعت شیطانی کا ہوگا۔ اس طریقے کو چھوڑ دو اور اپنے اغراض بالائے طاق رکھو کر شریعت کا حکم معلوم کرو اور ہمت سے کام لو مگر آج کل یہ بلا طبیعتوں کے اندر ایسی گھس گئی ہے کہ رگ و پے میں سرایت کر گئی اور بہت کم طبیعتیں اس سے خالی ہیں جو لوگ شریعت پر عمل کرنے کے لیے آمادہ ہیں وہ بھی اس کی تلاش ضرور کر لیتے ہیں کہ کسی طرح شریعت کا مسئلہ اپنے موافق نکل آئے تو اچھا ہے اور اپنی غرض اور دنیا ہاتھ سے نہ جائے ایک جگہ سے ہمارے مدرسہ میں میت کے کچھ کپڑے آئے تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ ان میں نابالغوں کا بھی حصہ تھا لہٰذا واپس کر دیئے گئے اسوقت کوئی سیاح مولوی وہاں وارد ہو گئے وہ کپڑے ان کے سامنے بھی پیش کئے گئے اور مدرسہ والوں کا واپس کر دینا بھی سنا دیا گیا مگر انہوں نے قبول کر لئے اور فرمایا کہ آخر نابالغوں کو ان کی شادیوں کے وقت تو ان کے حصہ سے زیادہ دیدیا جائے گا یہ سب اس میں لگ جاوے گا یہ انہوں نے بڑی ذہانت کا کام کیا غرض جو چیز آجائے وہ ہاتھ سے

نہ جانے پائے آج کل ذہانت کا ایسا استعمال بہت ہو رہا ہے سو یہ شریعت نہیں ہے اور اس میں برکت نہیں ہو سکتی شریعت یہ ہے کہ آدمی اس بات کے لئے آمادہ ہو کر چاہے میرا نفع ہو یا نقصان اور میری مرضی کے موافق ہو یا مخالف' وہی کروں گا جو شریعت کا حکم ہوگا ؂

ناخوش تو خوش بود بر جان من　　دل فدائے یار دل رنجان من'

یہ نیت پکے طور سے کر کے استفتاء کرو اور ہر شخص سے استفتا بھی نہ کرو ایسے شخص سے استفتاء کرو جو عالم ہو اور متدین ہو اور کسی سے دبنے والا نہ ہو اور لوگوں کی رائے سے متاثر ہونے والا نہ ہو تب شریعت کا اصل حکم معلوم ہوگا پھر ہمت کرو اور اس کے موافق عمل کرو یہ ہے صحیح طریقہ شریعت کے انقیاد کا۔

حاصل یہ کہ اپنے حالات میں غور کرتے رہو جو حالت اختیاری ہو اس میں شریعت پر عمل کرو اور جو غیر اختیاری ہے اس میں تفویض تام کرو اور کچھ چون وچرا مت کرو جو تصرف بھی حضرت حق تمہارے اندر کریں کرنے دو بس اس کو اپنا حال بنالو تو تب یہ کہہ سکو گے ان صلوتی و نسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین۔

لفظ رب العالمین کا نکتہ

اور دیکھئے قرآن شریف کی بھی کیا بلاغت ہے۔ اللہ اکبر۔ یہاں رب العلمین کا لفظ کیا موقع سے بڑھایا ہے جس کے معنی ہیں تمام جہاں کا پالنے والا۔ اس میں یہ تبلا دیا کہ ہمارے احکام میں وسوسہ بھی نہ لاؤ ہم نے ربوبیت اور تربیت کے لئے احکام مقرر کئے ہیں تم کو نقصان پہنچانا مقصود نہیں ہے ہم تم کو پرورش کرنے والے ہیں اگر کسی حکم میں کچھ تکلیف بھی معلوم ہوتی ہو تو اس کی ایسی مثال ہے ؂

طفل میلرزد زنیش احتجام　　مادر مشفق ازاں غم شادکام

ایک بچے کے پھوڑا نکلتا ہے اور سب جانتے ہیں کہ ماں سے زیادہ کوئی اس کے واسطے بھی خواہ اور مہربان اور مشفق نہیں ہے اپنی تکلیف کو ماں گوارا کرلے مگر بچے کی تکلیف گوارا نہیں کرسکتی مگر اس پھوڑے کا آپریشن اپنی آنکھوں کے سامنے کراتی ہے بچہ چیخ رہا ہے مگر وہ رحم نہیں کرتی بلکہ دل میں خوش ہوتی جاتی ہے کہ اب میرے بچے کو آرام ہوگا کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ بے رحمی ہے، نہیں عین رحم ہے کیونکہ وہ جانتی ہے کہ اگر آپریشن نہ ہوگا تو یہ پھوڑا دوچند سہ چند ہوکر ناسور بن جائے گا پھر علاج بھی نہ ہوسکے گا اور ساری عمر کو زندگی تلخ ہوجائیگی۔ اس ساری عمر کی تکلیف سے بچانے کیلئے وہ بچہ کا آپریشن کراتی ہے اسی واسطے خوش ہوتی ہے تو یہ تکلیف سے بچانا رحم ہے یا بے رحمی؟

اسی طرح حق سبحانہٗ تربیت کرتے ہیں کہ گناہ سے بچنے کے لئے بندوں کو احکام کی تکلیف دیتے ہیں کیوں کہ گناہ کا انجام دوزخ ہے اگر اس وقت اس سے بچنے کی تکلیف نہ دی جاوے تو آخر میں دوزخ میں جانا ہوگا اور ممکن ہے کہ ابدالآباد کی زندگی تلخ ہوجائے اس لئے وہ ہم کو احکام کا مکلف کرکے اس تلخی سے بچاتے ہیں یا دنیا کی کوئی مصیبت نازل کردیتے ہیں تو اس کے ذریعہ سے معاصی کا کفارہ کرتے ہیں گویا مادہ فاسدہ کا آپریشن کرتے ہیں مگر مرہم بھی اس کے ساتھ ساتھ ہے۔ ھ

درد از یار است و درمان نیز ہم   دل فدائے او شدہ جان نیز ہم

تکلیف بھی وہی دیتے ہیں اور اس کی جزا بھی وہی دیں گے ناگوار حالت آپریشن ہے اور گوارا حالت مرہم ہے اصل مرہم تو آخرت میں ملیگا اور دنیا میں بھی تھوڑا سا مرہم ملتا ہے وہ مرہم کیا ہے دل کی راحت اور چین، جو شخص احکام الٰہی کا اتباع کرتا ہے اور گناہ سے بچتا ہے اور اپنی حالت اختیاری و غیر اختیاری کو حق تعالیٰ کے سپرد کردیتا ہے اس کے قلب میں وہ اطمینان و راحت پیدا ہوتی ہے کہ اس کے سامنے ناگوار حالت اور مصیبت کچھ بھی اثر نہیں کرسکتی اُن کے واسطے مصیبت بھی صرف صورۃً مصیبت ہوتی ہے اور حقیقت میں راحت ہوتی ہے جنھوں نے اس حقیقت

کو سمجھا ان سے پوچھتے بعض وقت عین کلفت میں ان پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے انہی کی حالت اس طرح بیان کی گئی ہے ؎

خوشا وقت شوریدگان غمش | اگر ریش بینند وگر مرہمش
گدایانے از بادشاہی نفور | بامیدش اندر گدائی صبور
دمادم شراب الم درکشند | وگر تلخ بینند دم درکشند

ان کی حالت ناگواری میں بھی وہی ہوتی ہے جو خوشی میں ہوتی ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ ان کی نظر ہر وقت ہر حالت میں حق تعالیٰ پر ہوتی ہے اور ہر چیز کو حق تعالیٰ کی طرف سے سمجھتے ہیں اور حق تعالیٰ محبوب ہیں تو جیسا کہ راحت محبوب کا عطیہ ہے ایسے ہی مصیبت کو بھی اسی محبوب کا عطیہ سمجھتے ہیں لہٰذا جس طرح وہ راحت کو سر آنکھوں پر لیتے ہیں ایسے ہی مصیبت کو بھی سر آنکھوں پر لیتے ہیں جب دونوں کا تعلق محبوب سے ہے تو دونوں میں فرق کرنے کی کیا وجہ؟ سبحان اللہ، ان لوگوں کی کیسی پاکیزہ زندگی ہے کہ ناگواری ان کے پاس ہی نہیں آتی اور کسی حالت میں وہ ناخوش نہیں ہوتے اگر موت بھی آجائے تو وہ یہی کہیں گے ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت | سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اور وہ موت پر اس طرح راضی ہوں گے جس کو عارف شیرازیؒ کہتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم | راحت جاں طلبم وز پے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے | تا در میکدہ شاداں وغزل خواں بروم

اس کی وجہ وہی ہے کہ ان کے قلب میں یہ بات مرکوز ہے کہ ہر چہ از دوست میرسد نیکوست حیات بھی ہے تو اُدھر ہی سے ہے اور موت بھی ہے تو اُدھر ہی سے ہے اور درد بھی ہے تو اُدھر ہی سے ہے اور درمان بھی ہے تو اُدھر ہی سے ہے جب ہر چیز محبوب کے یہاں کی ہے تو وہ ہر چیز بھی محبوب ہے حق تعالیٰ یہ حالت نصیب کریں کہ حقیقت سمجھ میں آجائے اور ہر وقت یہ امر منکشف ہوتا ہے کہ ہر چیز حق تعالیٰ کی طرف سے ہے اور وہ رب العٰلمین ہیں ہمارے بدخواہ

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اُولی الامر کا مطلب

[illegible]

آیت میں ایسے بلیغ عنوان سے یہ تعلیم دی گئی ہے کہ کوئی پہلو نظر انداز نہیں ہوا۔

اصلی دولت

مختصر یہ ہے کہ اسلام کا دل یہ ہے کہ ہر حال میں آدمی حق تعالیٰ کا منقاد و مطیع رہے اغراض سے قطع نظر کرکے اتباع اختیار کرے نہ مال کی پرواہ کرے نہ جاہ کی نہ حکومت کی نہ بڑے ہونے کی بس اس کا یہ حاصل ہو جاوے کہ

دلا را میکہ داری دل درو بند ... دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

بس ایک اللہ پر نظر ہو اس پر کچھ دنیا بھی عطا ہو جاوے تو رحمت ہے ورنہ اصلی دولت وہی ہے وہ ضرور ملے گی۔ اس دولت کی قدر ہم لوگ کیا جانیں اُس کی قدر ان سے پوچھئے جن کو یہ دولت حاصل ہوئی ہے ایک صاحب فرماتے ہیں کہ جو چیز ہم کو حاصل ہے سلاطین دنیا کو اسکی خبر نہیں اگر ان کو خبر ہو جاوے تو ہمارے اوپر اس کے چھیننے کے لئے فوج اور ہتھیار لے کر چڑھ آدیں

ہمارے سمجھنے کے لئے ایک موٹی دلیل یہ کافی ہے کہ اہل اللہ کے حالات پڑھئے ان حضرات نے اکثر تنگی سے گذر کی ہے اور دنیا ملتی رہی تب بھی اس پر نظر نہیں اٹھائی اور اپنے اللہ ہی سے تعلق بڑھایا آخر کوئی بات تو وہ اپنے پاس پاتے تھے جس کی وجہ سے دنیا کی طرف نظر نہیں اٹھاتے تھے وہ وہی بات تھی جس کو میں نے اصلی دولت کہا ہے اب میں ترقی کرکے کہتا ہوں کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ پھر دنیا عطا نہ ہو۔ اس سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ جو اللہ کا نام لینے والا ہے وہ مالدار ضرور ہو جائے گا یا اسکو بادشاہی دنیا کی ضرور مل جائیگی بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو مالداری اور بادشاہت اور عزت اور جاہ اور تمام دنیا کا حاصل اور روح ہے یعنی راحت اور اطمینان یہ اس کو ضرور حاصل ہوگا اس کو روح اس لئے کہا کہ دنیا کے ان تمام بکھیڑوں اور ساز و سامان کی جو کوشش کی جاتی ہے وہ صرف ایک چیز کے واسطے ہے جس کا نام راحت ہے اس بیان کو میں طول نہیں دیتا ہوں اس واسطے کہ اسوقت موضوع بحث یہ نہیں ہے اسپر میرے مستقل بیان ہو چکے ہیں غرض راحت اور اطمینان اس کو ضرور حاصل ہوگا۔

ے وعظ راحت القلوب میں اس کا مستقل و مفصل بیان ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ اس کو رنج پیش نہیں آئے گا یا اس پر حوادث نہیں آئیں گے بلکہ یہ کہتا ہوں کہ کیسا ہی رنج پیش آئے اور کیسے ہی حوادث پڑیں لیکن وہ متزلزل نہ ہوگا اگر اس پر کوئی مقدمہ قائم ہو گیا تب بھی اس کا دل پریشان نہ ہوگا یہ ضرور نہیں کہ وہ تدبیر بھی نہ کرے وہ تدبیر ہی کرے گا کیونکہ دنیا کو حق تعالیٰ نے عالم اسباب بنایا ہے مگر حالت یہ ہوگی کہ ظاہر میں تدبیر ہے اور دل میں رضا بالقضا کہ اگر تدبیر سے کامیابی نہ بھی ہوئی تب بھی دل اس پر راضی ہے

اس کا راز یہ ہے کہ وہ تمام تعلقات کو فنا کئے ہوئے ہوتا ہے۔ اس کو نہ دنیا کی خوشی سے تعلق رہتا ہے نہ رنج سے اور خوشی اور رنج آنے جانے والی چیزیں ہیں اگر ان سے تعلق ہوتا تو خوشی کی بات پیش آنے سے خوش ہوتا اور اس کے زوال سے ناخوش ہوتا اس کو ان چیزوں سے تعلق تو ہے ہی نہیں پھر اس کی حالت میں ان تغیرات سے تغیر کیوں ہو اس کو اس چیز سے تعلق ہے جو غیر متغیر ہے اور ہر حالت اور ہر وقت میں یکساں باقی ہے تو اس کو تغیر کیوں ہو۔

اس واسطے میں کہتا ہوں کہ حق تعالیٰ کے انقیاد میں دنیا کی بھی راحت ہے اہل دنیا ذرا سے تغیر میں متغیر ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کو دنیا سے تعلق ہے اور دنیا ہر وقت متغیر ہے برخلاف اس کے جو اللہ کا نام لینے والا ہے کہ اس کا تعلق متغیر چیز یعنی دنیا سے ہی نہیں اس کا تعلق ایسی ذات سے ہے جس میں تغیر نہیں لہذا اس کو بھی کسی حال میں تغیر نہیں ہوتا اور اس کی راحت دائمی ہے دنیا میں بھی راحت میں ہے اور عقبیٰ میں بھی اور ظاہری راحت بھی اس کو حاصل ہے اور باطنی بھی

نسخہ برائے معالجہ

صاحبو! اس راحت کے حاصل کرنے کی کوشش کرو اور اس کے لئے ضرورت ہے علم کی یعنی یہ معلوم کیا جائے کہ وہ کیا چیزیں ہیں جن سے یہ راحت حاصل ہوتی ہے کیونکہ جب تک کسی چیز کے اسباب کا علم نہ ہو اس وقت تک وہ کیسے میسر ہو سکتی ہے اور نرا علم بھی کافی نہیں علم کے بعد ضرورت ہے عزم کی یعنی ہمت کی کیونکہ اگر ایک چیز معلوم بھی ہو گئی اس سے فائدہ جب ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ جب کہ فائدہ حاصل کرنے کا ارادہ کیا جائے۔

مثلاً ایک شخص کے سامنے کھانا رکھا ہے اور اس کو معلوم بھی ہے کہ کھانا رکھا ہے تو نرے اس معلوم ہونے سے مقصود حاصل نہ ہوگا مقصود جب ہی حاصل ہوگا جب ارادہ بھی کرے یعنی کھالے اب مقصود یعنی پیٹ بھرنا حاصل ہوگا اور علم حاصل کرنے سے یہ مطلب نہیں کہ سب کے سب مولوی بن جاؤ بلکہ جو فکر معاش سے فارغ ہیں وہ مولوی بنیں اور جو فارغ نہیں ہیں وہ ہر بات کو مولویوں سے پوچھ لیا کریں ان کے پاس آمدورفت رکھیں ان سے تعلق پیدا کریں۔ جو لوگ کچھ لکھے پڑھے ہیں وہ اردو یا فارسی میں دین کی کتابوں کو دیکھتے رہیں مگر یہ خوب سمجھ لیجئے کہ یہ کتابیں وہ ہوں جن کا دیکھنا علماء تجویز کردیں ہر ایک کتاب بھی دیکھنے کے قابل نہیں ہے علماء سے اپنی حالت اور علمی لیاقت بیان کر کے پوچھو کہ ہم کو کون کون سی کتاب دیکھنی چاہئے جو وہ بتلادیں وہ کتاب دیکھو بعض لوگوں کو کسی اچھی کتاب کے دیکھنے سے بھی منع کیا جاتا ہے نہ اس وجہ سے کہ وہ کتاب دیکھنے کے قابل نہیں ہے بلکہ اس وجہ سے کہ ان میں قابلیت اس کے دیکھنے کی نہیں ہے چنانچہ عوام کو تصوف کی کتابیں دیکھنے اور قرآن شریف کا ترجمہ از خود پڑھنے سے اسی وجہ سے منع کیا جاتا ہے۔ غرض جن کو پڑھنا آتا ہے وہ اپنی لیاقت کے موافق علماء سے پوچھ کر دین کی کتابوں کو پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھادیں اور سنادیں اس طرح سب عالم بن سکتے ہیں۔ اصطلاحی مولوی بننا سب کے لئے ضروری نہیں۔ غرض کمال اسلام کیلئے ضرورت ہے علم اور ہمت کی۔

اور تیسری چیز ایک اور ہے جس سے علم وہمت میں قوت ہوتی ہے وہ اہل اللہ کی صحبت ہے یہ عجیب چیز ہے جس سے اس مردہ جسم میں روح پڑجاتی ہے اسی کو کہا ہے ؎

مقام امن ومے بے غش ورفیق شفیق گرت مدام میسر شود زہے توفیق

اگر ہمیشہ میسر نہ ہو تو گاہے گاہے سہی جب بھی موقع ہو اور ایک چیز اس کی قائم مقام بھی ہے کیونکہ جب مرواریدمیسر نہ ہوں تو صدف سے ہی کام نکال لیا جاتا ہے اس کا بیان اس شعر میں ہے

؎ دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است صراحی مئے ناب وسفینہ غزل است

یعنی بزرگوں کے تذکرے اور حالات جن میں برقی اثر ہے کہ کیسا ہی کم ہمت آدمی ہو ان کو پڑھ کر

ایک دفعہ تو مستعد ہو ہی جاتا ہے ان میں بھی صحبت کی سی برکت ہے اگر صحبت میسر نہ ہو تو اسی کو اختیار کرو بہت کام دے گی پس یہ تین جزو کا نسخہ ہے۔ علم اور ہمت اور صحبت اہل اللہ ، بس یہ نسخہ معالجہ کے لئے کافی ہے مگر معالجہ میں پرہیز کی بھی ضرورت

پرہیز ہوتی ہے وہ معاصی ہیں جن سے پرہیز ضروری ہے اور اس کا سہل طریقہ یہ ہے کہ محاسبہ کی عادت ڈالئے اس طرح کہ سوتے وقت پندرہ بیس منٹ کا وقت اس کے لئے مقرر کر لیجئے اس میں یہ سوچا کیجئے کہ آج ہم سے کیا کیا معصیت ہوئی اس سے توبہ کیجئے اور عزم کر لیجئے کہ کل کو یہ معاصی نہیں کریں گے جب صبح کو اٹھئے تو اس عہد کو یاد کیجئے کہ رات فلاں فلاں معاصی سے توبہ کی تھی اور عہد کیا تھا کہ آج یہ کام نہ کریں گے اور دن بھر اس کا خیال رکھئے جس سے وہ معاصی تو ہرگز نہ ہونے پائیں اور ہمت کیجئے کہ اور کوئی معصیت بھی نہ ہو اگر آج وہ پرانی معصیت یا کوئی نئی معصیت ہو گئی تو سوتے وقت اس کو شمار میں لائے اور اس سے پھر توبہ کیجئے اور عمر بھر یہی سلسلہ جاری رکھئے دیکھئے گا کہ کتنی جلدی معاصی چھوٹ جاتے ہیں اور پرہیز مکمل ہو جاتا ہے پھر دیکھئے گا کہ معالجہ سے کتنا نفع ہوتا ہے وہ نفع یہ ہوگا کہ آپ کی عبادات اور حیات و موت سب خدا کی مرضی کے موافق ہو جائیں گی یہی کمال اسلام ہے جس کا ہر مسلمان طالب ہے اور اسی کا بیان اس آیت میں مذکور ہے اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ فہم اور علم اور ہمت اور حقیقت شناسی عطا فرمادیں۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین

التماس از جانب کاتب وعظ ھذا

احقر محمد مصطفےٰ عرض کرتا ہے کہ یہ وعظ میں نے اپنے والدین کے ایصال ثواب کے لئے لکھا ہے جو کوئی اس کو مطالعہ کرے وہ میرے اور میرے والدین کے لئے دعائے خیر کرے۔

جس کے لئے بہترین الفاظ یہ ہیں۔ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا رَبَّنَا اغْفِرْلِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ ۔ رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ ط

اور سب سے زیادہ حضرت مولانا صاحب مدظلہ کے لئے دعا کریں کیونکہ یہ جو کچھ ہے وہ حضرت ہی کا فیض ہے اور منشی ولی محمد صاحب کے لئے بھی دعا کریں جنہوں نے کتابت وعظ میں بہت مدد دی۔

والسلام

اشرف علی

۲۵ رجب المرجب ۱۳۵۳ھ